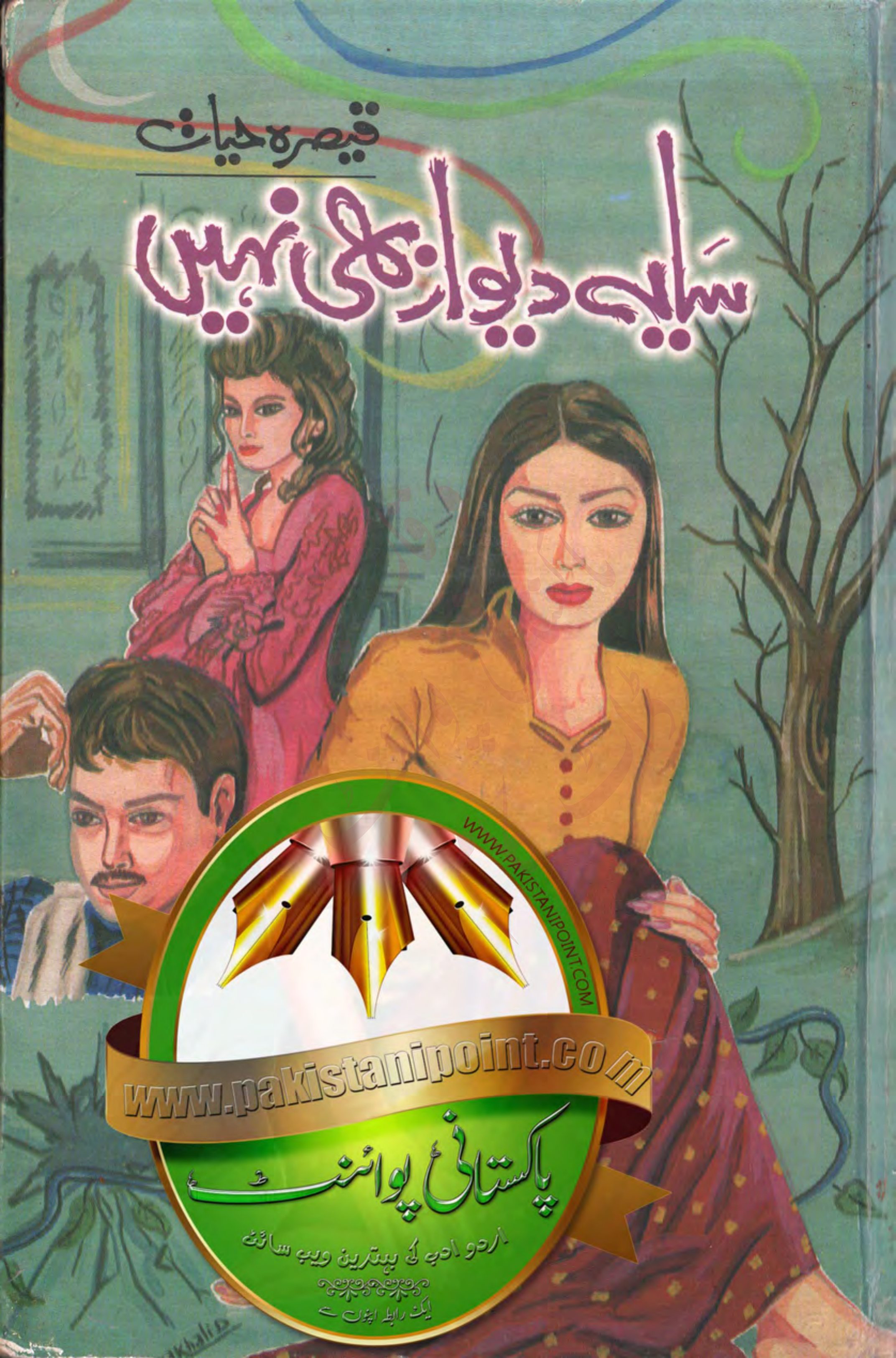
قیصرہ حیات
سایہ دیوار بھی نہیں
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ
ایک رابطہ اپنوں سے

سایہ دیوار بھی نہیں

قیصرہ حیات

علم و عرفان پبلشرز
34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7232336 فیکس: 7352332
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

جملہ حقوق بحق محفوظ

نام ناول	....	سایہ دیوار بھی نہیں
مصنفہ	....	قیصرہ حیات
ناشر	....	گل فراز احمد علم وعرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور
کمپوزنگ	....	رفاقت علی
پروف خوانی	....	محمد اکرم شاہد
سن اشاعت	....	جنوری 2007ء
مطبع	....	جوہر رحمانیہ پرنٹرز، لاہور
قیمت	....	[redacted] روپے

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ

40- اُردو بازار لاہور

علم وعرفان پبلشرز

34- اُردو بازار لاہور

فون: 042-7352332-7232336

انتساب!

بہت پیار اور دعاؤں کے ساتھ

اپنی سب سے چھوٹی بہن "سنبل" کے نام

جسے میں بہت محبّت کرتی ہوں۔

دیباچہ

یہ ناول پاکیزہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا میرا پہلا ناول ہے جو عام روایتی ناولوں سے قدرے مختلف ہے کیونکہ اس میں کوئی بھی کردار مخصوص انداز میں ہیرو یا ہیروئن بن کر نمودار نہیں ہوا بلکہ یہ معاشرے کے ان چلتے پھرتے کرداروں کی کہانی ہے، جو اپنی اپنی سوچ کے مطابق زندگیاں گزارتے ہیں اور دنیا کی اسٹیج خالی کر کے چلے جاتے ہیں، جو سوچتے تو بہت کچھ ہیں مگر اس کے مطابق عمل نہیں کر سکتے۔ جو احساسات و جذبات تو رکھتے ہیں مگر بر وقت ان کا اظہار نہیں کر پاتے۔ ایسے کردار ہمیں ہر معاشرے اور ہر طبقے میں ملتے ہیں۔ جنھیں ہم کبھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعض اوقات نظر انداز کرنے کے باوجود بھی وہ ذہن سے محو نہیں ہو پاتے کیونکہ قدرت نے کہیں نہ کہیں ان میں کوئی انفرادیت ضرور رکھی ہوتی ہے اور یہ انفرادیت ہر کردار میں نہیں بلکہ بہت سے ایک جیسے کرداروں میں سے صرف چند ایک میں ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔

بقول شیکسپیئر ”یہ دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر انسان اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے۔“ اب یہ قدرت کی عطا ہے کہ وہ ہم انسانوں کو اس دنیا کا نظام چلانے کے لیے کیا کیا رول (کردار) دیتی ہے۔ ہمیں اس کردار کو سمجھ کر بخوبی نبھانے کے فن سے کس حد تک آشنا کرتی ہے۔ ہمیں کتنی صلاحیتوں سے نوازتی ہے۔ ہمارے فہم و ادراک کو کتنا متحرک اور فعال بناتی ہے۔ زمانے کی تلخیوں اور سچی حقیقتوں کو سمجھنے کا کتنا شعور دیتی ہے۔ ہماری سوچ کس حد تک پریکٹیکل (عملی) بناتی ہے یا محض تخیلاتی۔ ہمارے لیے ہمارا ماحول کس حد تک سازگار ہے۔ یہ سب عوامل مل کر نہ صرف ہمارا کردار تشکیل دیتے ہیں بلکہ دنیا کی اسٹیج پر ہمارے کردار کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

یوں معاشرے کے ان تمام کرداروں کی درجہ بندی کریں تو سب سے پہلے ہمیں

Prototype کردار نظر آتے ہیں یعنی دنیا کی اسٹیج پر نمودار ہونے والے صف اوّل کے شاہکار کردار جنھیں قدرت سینکڑوں، ہزاروں سالوں بعد دنیا میں بھیجتی ہے۔ ایسے جوہر نایاب، کمیاب ہوتے ہیں اور وہ صرف دنیا والوں کے لیے ایک مثال اور نمونہ بننے کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ انھیں ہر طرف سے بھرپور داد و تحسین ہی ملتی ہے۔ ان کے مرنے کے بعد بھی دنیا انھیں بھول نہیں پاتی۔ ایسے کردار دنیا کی بقا اور انسانیت کی خدمت کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ دنیا کی پوری تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ایسے نایاب کردار ملیں گے تو ضرور مگر کم تعداد میں۔ جیسا کہ اس ناول کا بظاہراً کم اہم نظر آنے والا کردار، مؤحد (ولیم) جو اپنی زندگی کا مقصد انسانیت کی خدمت کو ٹھہراتا ہے۔ مؤحد میں اپنے اس کردار کو نبھانے کی کتنی صلاحیت ہے اس کا اندازہ اس کے محسوسات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے ظاہراً کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا مگر اس کے اندر اتنی پوٹینشل پیدا ہو چکی ہے کہ وہ تمام آزمائشوں سے بآسانی گزر سکتا ہے۔ جو لوگ اوائل شباب میں ہی اپنے محسوسات، جذبات، شعور و خیالات سے جنگ کر کے اپنے لیے صراطِ مستقیم متعین کر لیتے ہیں وہ دراصل اپنی ذات اور اس کے تقاضوں کو سمجھ کر، اپنے Complexes کو نظرانداز کر کے دنیا کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس کشمکش کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ قدرت ان کو اس کردار کو نبھانے کے فن سے آشنا کر رہی ہوتی ہے جو انھوں نے آئندہ زندگی بھرپور انداز میں ادا کر کے دنیا کے لیے ایک مثال بننا ہوتا ہے۔

دوسرے کردار قدرے کم اہمیّت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے داد و تحسین تو پاتے ہیں مگر ہمیشہ یاد نہیں رکھے جاتے۔ وہ آتے ہیں اور اپنا کردار احسن طریقے سے نبھا کر چلے جاتے ہیں۔ یاد آنے پر ان کی تعریف تو کی جاتی ہے مگر وہ پہلے کردار کی طرح مثال نہیں بن پاتے جیسا کہ اس ناول کا ایک اہم کردار 'حیدر' ہے۔ جسے سراہا تو جا سکتا ہے مگر جس نے کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھایا اور زندگی کے روایتی دھارے کو بہنے سے نہیں روکا۔ ایسے Stereotype کردار زندگی کو صرف چلاتے ہیں کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیتے۔

تیسرے کردار ایکسٹراز (Extras) ہیں جو دنیا کی اسٹیج کو صرف Fill کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ دنیا کو ان کے آنے اور نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بقول

ایک مغربی مفکر ''ایسے لوگ حشرات الارض'' ہوتے ہیں جو جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ جن کی زندگی میں Contributions کچھ بھی نہیں ہوتیں۔ اس ناول کے زیادہ تر کردار Extras ہیں۔

چوتھے کردار Idiosynatic ہیں جو نہ تو اپنے کردار کو سمجھ پاتے ہیں نہ ہی اپنی صلاحیتوں کو اور نہ ہی اسٹیج یعنی اس دنیا کی ڈیمانڈز کو۔ وہ گومگو کیفیت میں ہوتے ہیں۔ جو چاہتے ہوئے بھی نہ کچھ کہہ پاتے ہیں اور سوچتے ہوئے بھی عملی قدم نہیں اٹھا پاتے۔ وہ ہمیشہ مناسب مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب بھی کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو انتہائی نامناسب موقعوں پر۔ ایسے کردار دنیا کے لیے ایک سوالیہ نشان بن جاتے ہیں اور جن کے چلے جانے کے بعد لوگ حیرت سے ان کے بارے میں سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار (شہلا) سب کے لیے ایک سوال بنا رہتا ہے کہ شہلا کون تھی؟ شہلا نے پہلے طلاق کیوں نہ لی۔ اس نے بچے کیوں چھوڑ دیے۔ اس نے پیٹر کو ولیم کا نام کیوں رکھنے دیا۔ وہ پیدائش سے لے کر مرنے تک ایک سوال بنی رہتی ہے اور میرے اس ناول کا مقصد ہی معاشرے کے ان کرداروں کو Highlight کرنا تھا جو ہمیشہ نظرانداز کیے جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں ہم حیرت سے سوال تو کرتے ہیں مگر ان کی نفسیات کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور جن کے اندر جھانک کر ان کے احساسات تک رسائی نہیں کر پاتے اور جو مختلف نفسیاتی عارضوں اور جسمانی بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔

ان ہی کرداروں میں ایک اہم کردار ''شمائل'' کا ہے جنھیں ہم Odd یا ابنارمل کردار کہتے ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ آرمی پبلک کالج سیالکوٹ میں بطور انگلش ٹیچر جاب کی۔ اس دوران بہت سے نوجوان لڑکے، لڑکیوں کے مسائل سامنے آئے جو ذہن میں مواد کی صورت میں جمع ہوتے رہے۔ ان میں ایک کردار کی مماثلت ''شمائل'' سے تھی۔ جو نجانے دنیا کی بھیڑ میں کہاں گم ہو گیا مگر میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکا۔ اور جس کے ی اد آنے پر دل سے ''آہ'' نکلتی ہے۔ میں قلم کے ذریعے معاشرے کے ان چلتے پھرتے کرداروں کو میں کس طرح Portray کر پائی ہوں۔ اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

اس ناول کے ضمن میں کچھ مخصوص لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو اس

ناول کی تخلیق اور اشاعت کا باعث بنے۔

سب سے پہلے اپنی دوست عمیرہ احمد کا، جس نے ہمیشہ اپنے پرخلوص مشوروں سے نوازا اور جس کے قائل کرنے پر ہی میں نے پاکیزہ ڈائجسٹ میں لکھنا شروع کیا اور بہت سے قارئین تک رسائی ممکن ہوئی۔

اس کے بعد محترمہ انجم انصار صاحبہ (پاکیزہ کی ایڈیٹر) کا، جنھوں نے اس ناول کا انتخاب میرٹ کی بنیاد پر کیا جسے میں نے دو تین سال قبل مکمل کر کے بھیجا اور جسے گاہے بگاہے پڑھ کر انھوں نے پاکیزہ میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور ان تمام قارئین کا جنھوں نے ہر قسط کے بعد اپنی قیمتی آراء سے نوازا اور میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ جو اس ناول کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا باعث بنی۔

قارئین اپنی آراء اس ایڈریس پر ای۔میل کر سکتے ہیں۔

leo2006-sk1@yahoo.com

سب کے لیے دعاگو

قیصرہ حیات

23-11-2006

موسم خزاں کی افسردہ شام کو مضمحل، دم توڑتی دھوپ میں آسمان پر روئی جیسے اڑتے پھرتے بادلوں کے سنگ اور زمین پر تیز ہوا کے جھونکوں میں ہر طرف اڑتے پھرتے، پھڑاتے، کڑکڑاتے، سوکھے پتوں پر قدم رکھتے ہوئے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ کولتار کی سیاہ سڑک پر ہر طرف براؤن، اور سبز کئی رنگوں میں بدلتے پتوں کے ڈھیر لگے تھے۔ جیسے درخت اپنا سارا بوجھ اتارنے پر تلے ہوں اور اس فریضے سے جلد از جلد فارغ ہو کر، قدرت کی طرف سے نئی آرائش کے منتظر ہوں۔ پرانے، مضمحل، شکستہ وجودوں کو اتار پھینک دینا چاہیے...... وہ کس کام کے؟ وہ سڑک کے عین وسط میں کھڑی ہو گئی اور ایک لمحے کو سوچا۔ ارد گرد سفیدے کے لمبے لمبے اور سنبل کے درختوں ایک شکستہ عمارت کی ٹوٹی تھا۔ یہ سڑک کا سب سے خوب صورت حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ مختلف سائز اور اسٹائل کے پتے، کچھ نیچے گرے ہوئے اور کچھ اکا دکا شاخوں کے ساتھ چمٹے ہوئے، سہمے سہمے لگ رہے تھے۔ ہوا کا شدید جھونکا نہ جانے کہاں سے آیا اور پتے پھر ہوا کے سنگ پھڑ پھڑانے لگے۔ ہوا کے دوش پر سوار نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ جیسے انسان...... قسمت کے جھونکے انہیں کیسے کیسے اڑاتی پھرتی ہے۔ کبھی وہ اس کے پروں پر سوار ہوا میں محو پرواز ہو جاتے ہیں تو کبھی وہ انہیں اٹھا کر زمین پر زور سے پٹختی ہے۔ کبھی وہ قدموں تلے آ کر کڑکڑ کرتے ہیں۔ کبھی گیلی زمین کے ساتھ چمٹ کر خاک میں پنہاں ہو جاتے ہیں۔

وہ آگے بڑھی۔ خوبصورت بڑے بڑے پتوں کو ہاتھ لگا کر دیکھنے کی خواہش کی تو نہ

جانے کہاں سے اس می کوئیک کی کانٹوں بھری شاخ نے سر اٹھایا۔ اس پر ہر طرف کانٹے تھے۔ کہیں اکا دکا چھوٹے چھوٹے پتے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرخ چھوٹے، چھوٹے مسکراتے ہوئے تین پھول کانٹوں بھری اس شاخ پر اگے سرخ پھول اسے قدرے اچھے لگے۔ اس نے پھول توڑنے کی کوشش کی، کانٹوں بھری شاخ اس کے دامن سے الجھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں کئی کانٹے چبھ گئے۔ اس نے پھر پھول توڑنے چاہے مگر اب کی بار کانٹوں نے اس کے دوپٹے کو بھی اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ الجھتی گئی۔ کانٹے چبھتے ہی گئے۔ اس نے کانٹوں سے دامن چھڑانا چاہا تو ایک شاخ سے دوسری اور تیسری کئی کانٹوں بھری شاخیں نمودار ہونے لگیں اور اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کانٹے چبھتے گئے اور وہ لہولہان ہوتی گئی۔ قدموں تلے سرسراتے، پھڑ پھڑاتے، پتے دم توڑتے رہے۔ اس کی ساری تگ و دو اکارت گئی۔

وہ کانٹوں کی چبھن روح کے اندر تک محسوس کرتی رہی۔ فرار حاصل کرنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر بھاگتی رہی مگر کانٹوں میں الجھا ہوا دوپٹا اس کے گلے کا پھندا بن رہا تھا۔ اس کی ایک لمحے کی خواہش اور آرزو نے اس کے وجود کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ محض ایک لمحے کی خواہش، بنا سوچے سمجھے لا حاصل کی تمنا، کچھ حاصل کرنے کی جستجو وہ تو کرچی کرچی ہوگئی تھی۔ بالکل شکستہ اور زخمی، جال میں پھڑ پھڑاتے پنچھی کے مانند......

وہ فیصلہ نہ کرسکی کہ اس کی خواہش، تمنا اور اس کے حصول کی جستجو بے ثمر تھی یا بے سود۔ وہ الجھتی رہی، بھاگتی رہی اور کانٹوں کی چبھن شدید ہوتی گئی۔ اچانک شاخ سے پھول ٹوٹ کر گرے اور پتی پتی بکھر گئے۔ حاصل کی تمنا دم توڑ چکی تھی۔ ہر جذبہ ماند پڑنے لگا۔ کچھ بھی باقی نہ رہا۔ نہ شاخ، نہ پھول، نہ کانٹے اور نہ ہی وہ خود...... وہ لہولہان دل اور شکستہ قدموں کے ساتھ ایک سمت کو مڑ گئی اور سیاہ لمبی سڑک...... پر چلتی ہوئی پتھروں سے ٹکراتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

......۞......

”تم ایک انسان ہو۔ مکمل شخصیت، مکمل وجود!
تم بے حقیقت ہو۔ ادھوری شخصیت...... نامکمل وجود!
تم خوب صورت احساس ہو، منفرد شخصیت...... حسن و جمال کا پیکر!
تم ایک عورت ہو۔ ایک معزز شخصیت...... خالق کی معتبر مخلوق......
اور...... سنو...... تم مسلمان بھی تو ہو۔ کہیں سے آواز آئی۔

''نہیں، میرا کوئی وجود نہیں۔ کوئی شخصیت نہیں اور کوئی مذہب بھی نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اسے آج اور اسی وقت فیصلہ کرنا تھا۔ ایک اہم فیصلہ۔ جس پر اس سمیت، کئی زندگیوں کا دارومدار تھا۔ ایسا فیصلہ جس نے کتنے سالوں پر حاوی ہونا تھا۔ کتنے وجودوں پر اثر انداز ہونا تھا۔ پراگندہ اور منتشر سوچوں نے اس کے ذہن کی یکسوئی کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ وہ جھنجلا گئی۔

گھر کے باہر لمبی سیاہ سنسان سڑک پر اطراف میں اونچے اونچے درختوں کے درمیان چلتی ہوئی، سیاہ اوورکوٹ میں پژمردہ چہرے، پراگندہ سوچوں اور مسخ شدہ شخصیت کے ساتھ وہ مرجھایا ہوا خزاں رسیدہ پتا لگ رہی تھی۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے جیسے اس کی سوچیں اتھل پتھل ہو رہی تھیں۔

''میں کیا ہوں؟'' اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں اور اپنے آپ سے سوال کیا۔

''تم ایک انسان ہو، منفرد وجود، محبت کے قابل......صرف تمہاری زندگی کا تم پر حق ہے۔ تم اس دنیا کی اٹل حقیقت ہو۔ اس لیے صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچو۔ دنیا میں تمہارے وجود سے بڑھ کر تمہارے لیے کچھ اہم نہیں ہونا چاہیے۔'' پیٹر کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے اور اسے کچھ کرنے پر اکسانے لگے۔

''تم ایک نامکمل وجود ہو، ایک ادھوری شخصیت۔ جس کا کوئی ماضی نہیں اور جس کا کوئی ماضی نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی شناخت نہیں اور جس کی کوئی شناخت نہیں ہوتی وہ دنیا کی سب سے زیادہ بے وقعت اور حقیر شے ہوتی ہے۔ جسے صرف اور صرف نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔'' ملک منصور کے الفاظ اسے اندر ہی اندر کچوکے لگانے لگے۔ اسے شدید ذلت کا احساس ہونے لگا۔

''تم قدرت کا حسین شاہکار ہو، چاند کی چاندنی اور ہوا کے خوشگوار مترنم جھونکے کا حسین، دلگداز احساس، چاہے جانے کے قابل ایک اہم وجود۔'' اسے حیدر کی پذیرائی یاد آنے لگی۔ اس کے اندر ایک کھڑکی کھلی اور تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے کا لطیف احساس اسے اندر ہی اندر معطر کرنے لگا۔ لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں نمی بھی تیرنے لگی۔

''تم ایک عورت ہو، ایک بیٹی! خالق کی پیدا کردہ معزز مخلوق۔ مکمل حقوق کے ساتھ عزت کے قابل۔'' سید صاحب کے الفاظ ہمیشہ رستے زخموں پر مرہم کا کام دیتے تھے۔

''لیکن مجھے تو منصور اور پیٹر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ حیدر اور سید

صاحب تو میرا ماضی ہیں اور ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ ان سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ٹھنڈی ہوا کے یخ جھونکے اس کے جسم سے ٹکرائے اس نے کانپ کر جھرجھری سی لی۔

''اور تم...... ایک مسلمان بھی تو ہو۔'' کسی نے اندر سے پھر ٹھوکا دیا۔

کسی نے کہا'' ...... یہ تو...... یہ تو سید صاحب کا مذہب ہے۔ میرا تو نہیں جب میرے وجود کی شناخت ہی نہیں تو مذہب کیسا۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ نہ ہندو، نہ مسلمان، نہ کرسچن۔''

''انسان کو صرف اور صرف اپنے وجود، اپنی ذات کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کی آرزو اس کی باقی سب سوچوں پر حاوی ہونی چاہیے۔'' پیٹر کے الفاظ اسے ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ اس نے نادانستہ آنکھیں بند کیں تو آنسوؤں سے بھری آنکھیں برسنے لگیں۔

''انسان کا نصیب کہیں نہیں بدلتا۔ مشرق ہو یا مغرب، گھر ہو یا باہر، انسان تنہا ہو یا ہجوم میں۔'' اسے اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے جو اس نے ایک دفعہ حیدر سے کہے تھے۔

''ہاں، ہم سب بہت بے بس انسان ہیں۔ اپنی اپنی تقدیر کے ہاتھوں۔'' حیدر کی شکستہ آواز کہیں سے سرگوشیوں کی صورت میں ابھری۔

''مگر سچی محبت اور لگن قدرت کے فیصلوں کو بدل بھی دیتی ہے۔ دل سے نکلی ہوئی، کلیجے کو شق کرتی دعا۔ کیا وہ بھی نہیں؟'' اس نے آخری بار حیدر کو کنوینس کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں...... قدرت اپنے فیصلوں میں ہمیشہ اٹل ہوتی ہے۔'' حیدر نے تردید کی اور حقیت بتائی۔

''لیکن مجھے یقین ہے۔ وہ ضرور اپنے فیصلوں کو بدلے گا۔'' وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔

"Nature has to be done" حیدر کی سرگوشی مدھم ہوتی گئی۔

وہ چلتی ہوئی نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ اونچے اور لمبے لمبے درخت جھولتے ہوئے، سرسراتے ہوئے ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے۔ آسمان ابر آلود تھا۔ لندن کی صبحیں اور شامیں یکسانیت کا شکار ہو گئیں تھیں اور وہ خود بھی ویسی ہی ہو گئی تھی۔ موسم، ماحول، لوگ کچھ بھی اسے متاثر نہیں کر رہا تھا۔

"You're a woman enjoy your rights you're an individual"

پیٹر کے الفاظ اسے جھنجوڑ رہے تھے۔ کوئی قدم اٹھانے پر مجبور کر رہے تھے۔

''دنیا کی سب سے بڑی حقیقت تم ہو۔ یہ رشتے ناتے سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ تم اہم ہو۔ تمہاری خوشیاں اہم ہیں۔ صرف اور صرف اپنا سوچو۔ اپنی ذات کی خوشیاں مقدم رکھو باقی سب بھول جاؤ۔ تمہارے لیے کوئی اہم نہیں۔ صرف...... تم اپنے لیے اہم ہو۔'' پیٹر کے لہجے کا اعتماد اسے اندر ہی اندر سکون بخش رہا تھا۔

''یہی سچ ہے، ہاں یہی سچ ہے۔ سب سے پہلے میں ایک انسان ہوں بعد میں کچھ اور۔'' اس نے مثبت انداز میں سوچا اور فیصلہ کر لیا۔ اس نے ڈور بیل بجائی تو اس کی چھ سالہ بیٹی شفق نے دروازہ کھولا۔ وہ بغیر کچھ کہے اندر داخل ہو گئی۔ خاموشی سے اوور کوٹ اتارا اور ہیٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔ شفق حیرت سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے پاپا کہاں ہیں؟'' اس نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''اوپر......'' شفق نے جواب دیا۔

''اکیلے یا پھر کوئی اور بھی ساتھ ہے۔'' جواباً شفق خاموش رہی اور وہ اوپر چلی گئی۔

کمرے کا ماحول بہت رومانٹک تھا۔ آتش دان میں آگ دہک رہی تھی۔ بلیو ویلوٹ کے خوب صورت دبیز پردے، سگار اور کافی کی بھینی بھینی مہک آتش دان کے قریب دونوں فلور کشنز پر بیٹھے تھے۔ شزا گٹار بجا رہی تھی اور منصور اس کے سامنے بیٹھا محبّت بھری پرستائش نگاہوں سے اسے دیکھنے میں محو تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' شزا جھینپ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''گٹار کے تاروں سے نکلنے والے سروں کے ساتھ جھلملاتی، چمکتی اور مدہوش کرتی ان خوب صورت نیلی آنکھوں کو۔'' منصور مدہوشی کے عالم میں بولا۔

''دنیا میں اور بھی تو بہت کچھ ہے ان کے سوا۔'' وہ اک ادا سے مسکرا کر بولی۔

''ہاں...... ہے تو سہی...... مگر اہم تو صرف وہ ہوتا ہے جو نظر کے سامنے ہو، جو موجود ہو اور پھر جس تک رسائی بھی ممکن ہو۔'' وہ بھی مسکرا کر بولا۔

''اور جس تک رسائی ممکن نہ ہو تو؟'' اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے پوچھا۔

''تو میں...... ملک منصور اسے چھین لینے کا عادی ہوں۔ جلدی یا بدیر۔ اس تک رسائی کو ممکن بنانا ملک منصور کو اچھی طرح آتا ہے۔'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔

''بہت پوزیسیو ہو۔''

''ہاں جب تم جیسا آتشیں حسن بہکانے پر تلا ہو۔'' ملک منصور نے اس کے نازک مرمریں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں یوں بند کیا جیسے سیپ میں موتی۔

''اچھا یہ بتاؤ، واپس کب جا رہے ہو؟'' شزا نے جلدی سے بات کا موضوع بدلا۔ مبادا وہ کہیں مزید نہ بہک جائے۔ وہ اس کی دل پھینک طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔

''کل رات کو۔''

''سب......''

''ہاں...... ظاہر ہے۔'' منصور پر اعتماد لہجے میں بولا۔

''مگر میں نہیں......'' شہلا ایک دم اندر آ گئی اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولی۔

منصور کو اس کی غیر متوقع آمد سے جھٹکا لگا۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی اتنی جرات کہ شزا کی موجودگی میں وہ اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔

''تم...... اور تمہاری یہ جرات!'' منصور اس کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے غرایا۔

''شٹ اپ!'' اس نے اس کے ہاتھ کو روکتے ہوئے کہا۔

منصور کے لیے یہ شاک سے کم نہیں تھا ''میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں...... یو باسٹرڈ!''

''ہولڈ یور ٹنگ......'' وہ غصے سے آنکھیں نکالتی ہوئی بولی۔

شزا پھٹی پھٹی نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگی ''پلیز ریلیکس، میں جا رہی ہوں۔'' شزا حیرانی سے دونوں کی طرف دیکھتی ہوئی باہر جانے لگی اور اسی میں عافیت سمجھی۔

''تم کہاں جا رہی ہو۔ یہ تماشا اچھی طرح دیکھ کر جانا۔'' شہلا نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکنا چاہا۔

''کیا مطلب؟'' منصور چونکا۔

''مجھے ڈائیورس چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت!'' شہلا نے دوٹوک کہا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟'' منصور غیر یقینی لہجے میں بولا۔

''ہاں، بالکل ٹھیک ہے اور شاید ابھی ٹھیک ہوا ہے۔ اب میں مزید ذلت کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ تم نے مجھے جتنا بے عزت کرنا تھا خوب کر لیا۔ اب تمہارے اور میرے راستے جدا جدا ہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ منصور کے لیے یہ خبر شاک سے کم نہ تھی۔ وہ شہلا جس نے کبھی اس کے سامنے زبان نہ کھولی تھی آج کیسے اس سے جھگڑ رہی تھی۔

''تم کہاں سے آ رہی ہو؟'' منصور نے اس کے تیور دیکھ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''تم سے مطلب......'' شہلا قدرے بے پروائی سے بولی۔

''تم اپنی حد کراس کر رہی ہو۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ اپنا لہجہ دھیما کرتے ہوئے بولا۔

''میں بہت سوچ سمجھ کر بول رہی ہوں اور جو میں آج کر رہی ہوں وہ مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔'' وہ اعتماد سے بولی۔

''مجھے سب معلوم ہے یہ آگ اسی باسٹرڈ پیٹر کی لگائی ہوئی ہے۔ جس سے تم چھپ چھپ کر ملتی ہو۔ ویسے بڑی پارسا بنتی ہو...... اور اب...... تم ہو ہی باسٹرڈ......!'' وہ دانت کچکچا کر بولا۔

''کیا تمھیں احساس ہے کہ بچے......؟'' منصور نے آخری حربہ استعمال کیا۔

''بچے تمہارے ہیں اور بچوں کا جھوٹا سہارا لے کر انھیں میرے پاؤں کی زنجیر نہ بناؤ۔ جب عورت بچوں کے لیے تڑپے تو تم لوگوں کو احساس نہیں ہوتا اور جب وہ خود چھوڑ دے تو تم لوگ اسے خود غرض اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے ہو۔ مجھے نہ اب تم سے تعلق رکھنا ہے اور نہ تمہاری اولاد سے۔ تم نے نو برس جس طرح میرے وجود کو، میری ذات کو دبائے رکھا، مجھے اذیتیں دیں اور میری شخصیت کو کرچی کرچی کیا ہے۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ میں چلتی پھرتی زندہ لاش بن گئی ہوں۔ میں تمہارے لیے کبھی بھی اہم نہ تھی اور نہ کبھی ہو سکتی ہوں۔ تم نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے۔ یقیناً تمہاری اولاد بھی ایسا ہی کرے گی۔ آخر وہ بھی تو تمہارے بچے ہیں۔ تمہارا ہی خون ہیں۔ تمہارے ہاتھوں تو ذلت اٹھا چکی ہوں۔ اب تمہاری اولاد کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہونا چاہتی۔ منصور اس شادی شدہ زندگی کا صرف ایک لمحہ بتاؤ جب تم نے میری اس طرح پذیرائی کی ہو جس طرح آج تم شزا کی کر رہے تھے۔ آخر میں بھی تو عورت ہوں۔ مجھے بھی پذیرائی چاہیے۔ مجھے بھی تحفظ اور عزت چاہیے اور نہیں تو طمانیت کا کچھ احساس ہی چاہیے۔ تم نے مجھے کیا دیا۔ سوائے مار کٹائی اور ذلت کے...... اب میں دھتکارتی ہوں تمھیں اور تمہاری اولاد کو......!'' وہ چلاتے ہوئے بولی۔

''اور سید صاحب کو کیا جواب دوں کہ سید زادی......'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''میں سید زادی نہیں...... بقول تمہارے نالی کا کیڑا ہوں جو اتفاق سے رینگتا ہوا ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ فرق یہی ہے انھوں نے مجھے قدموں تلے روندا نہیں، اٹھا کر

سینے سے لگا لیا۔ تم ہی بتاؤ کیا اس سے میرا ماضی بدل سکتا ہے۔ میں جو پہلے دن تھی۔ اب بھی وہی ہوں۔ نہ وہ میری شناخت کو بدل سکے اور نہ تم ......''

''شاید اب تمہارا نیا شوہر پیٹر بدل دے۔'' منصور اس کی بات کاٹ کر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ہاں شاید...... کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔'' وہ بھی قدرے ڈھٹائی سے بولی۔

''تم اس قدر......'' منصور طیش میں بولا۔ اس نے اس پر ہاتھ اٹھانا چاہا اور پھر نیچے کر لیا۔ شاید شزا کی وجہ سے۔

''ذلیل ہو سکتی ہو، یہی کہنا چاہ رہے ہو نا تم؟ واقعی میں بہت ذلیل ہو چکی ہوں۔ کل تک مجھے طلاق کے کاغذات مل جانے چاہئیں۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

منصور ہونقوں کی طرح اسے باہر جاتا دیکھتا رہا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شہلا کبھی اس کے سامنے یوں پٹر پٹر بولے گی۔ وہ تو صرف روتی اور خاموشی سے ذلیل ہوتی شہلا کو جانتا تھا۔ اب اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔

وہ نیچے اتری تو شفق حیرت سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج اسے ماں پہلے سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ پہلے تو مما، پاپا کا سن کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی اور آج خود اوپر چلی گئی تھی۔ شفق مضطرب سی کھڑی تھی۔

''فلک اور آفاق کہاں ہیں؟'' اس نے شفق سے پوچھا۔

''آفاق کمپیوٹر گیم کھیل رہا ہے اور فلک سو رہی ہے۔''

''آفاق کو بلاؤ۔''

''کیوں مما......؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے تم لوگوں کو ایک بات سمجھانی ہے۔ جاؤ اس کو بلا کر لاؤ۔''

''جی مما......'' وہ آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی اور آفاق کو بلا لائی۔

''شفق تم بڑی ہو اور بھائی چھوٹا ہے۔ آپس میں پیار سے رہنا۔ بھائی کا اور فلک کا بہت خیال رکھنا۔'' وہ انہیں سمجھاتے ہوئے بولی۔

''کیوں مما...... آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ لوگ پاکستان جا رہے ہیں اور میں یہیں رہوں گی۔ میں آپ کے ساتھ

نہیں جارہی۔'' وہ بمشکل آنسو روکتے ہوئے بولی۔

''کیوں...... مما...... کیوں مما...... پھر ہم بھی نہیں جا رہے۔'' آفاق ضد کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں بیٹا ضد نہیں کرتے۔ آپ میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

''کیوں...... مما......؟'' شفق روتے ہوئے بولی۔

''اس لیے کہ تمہاری مما شادی کر رہی ہے۔'' ایک دم منصور پیچھے سے بولا۔

''شٹ اپ منصور، میں تو شادی کرنے جا رہی ہوں اور تم خود؟''

''جسٹ شٹ یور ماؤتھ۔'' وہ بھی غصے سے کہہ کہ باہر نکل گیا۔

''مما آپ دلہن بنیں گی؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا تو وہ چونک گئی۔ اس نے تو خود بھی ایسا نہ سوچا تھا۔ وہ مضطرب ہو کر واش روم میں چلی گئی۔ اس کی آنکھیں ایک دم سرخ ہونے لگیں۔ اس نے واش بیسن کے اوپر لگے بڑے سے آئینے میں دیکھا۔ وہ کتنی بدل چکی تھی۔ جو کچھ وہ کرنے جا رہی تھی کیا واقعی درست تھا؟ اس سے کسی کو نقصان تو نہیں ہو گا؟ میری شفق اور فلک اور میرا آفاق۔ کتنے چھوٹے ہیں سب...... وہ میرے بھی وجود کے حصے ہیں اور اپنے وجود کو یوں ٹکڑے ٹکڑے کرنا کیا کوئی آسان کام ہے۔ وہ خود سے سوال کر رہی تھی مگر بچے تو صرف باپ کے ہوتے ہیں۔ آج نہیں تو کل وہ اس کی ڈگر پر چلیں گے۔ میں ہر روز ان کے باپ کے ہاتھوں ذلیل ہوتی رہی ہوں۔ کل کو ان کے ہاتھوں ہوں گی اور پھر کل میرے پاس وقت نہیں ہو گا۔ آج بچے ہیں۔ کل بڑے ہو جائیں گے اور وہ کل نہ جانے کیسا ہو۔ اس کل کے لیے میں آج کی خوشیوں کو کیوں داؤ پر لگاؤں۔ قدرت آج مجھے آپشن دے رہی ہے اور زندگی میں صرف ایک موقع تو ملتا ہے جب انسان چاہے تو اپنے لیے کچھ کر لے۔ پہلے بھی لوگوں نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ کبھی روایتوں اور رسم و رواج کا بہانہ بنا کر تو کبھی میری ذات کی شناخت کو نشانہ بنا کر۔ آخر زندگی کے اتنے برس گزار کر بھی میری حیثیت گھر کی خادمہ جیسی نہیں تو پھر میں کیوں اپنے آج کو ان کے لیے برباد کروں۔ مجھے اپنا سوچنا چاہیے۔ اپنی خوشیوں کے بارے میں خود فیصلہ کرنا چاہیے۔ وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ اس کا سارا وجود سلگ رہا تھا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ شفق آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور اس کے اوپر گر گئی۔

''مما پلیز ہمیں چھوڑ کر مت جائیں۔ آئی لو یو مما......'' شفق بہت پوزیسیو ہو رہی تھی۔

''آئی نو مائی ڈیئر، آئی لو یوٹو۔ ڈونٹ کرائی مائی چائلڈ۔ میں جلد آؤں گی۔''

''مما فلک تو بہت چھوٹی ہے۔ ٹھیک طرح سے چلتی بھی نہیں اور تنگ بھی بہت کرتی ہے۔ کسی کے پاس بھی نہیں سوتی۔ میں اسے کیسے سلاؤں گی۔'' شفق قدرے پریشان ہو کر بولی۔

''تم فکر کیوں کرتی ہو، تمہارے پاپا ہیں نا وہ دیکھ بھال کریں گے۔ وہ خود سلا لیں گے اور پھر تمہاری دادو بھی تو ادھر ہے نا۔'' اس نے تسلی دی ''ادھر آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔'' اس نے اسے اپنے پاس بیڈ پر لٹا لیا۔

''مما...... آپ برائیڈ بنیں گی۔ اس لیے ہمارے ساتھ نہیں جا رہیں۔'' شفق کے اس اچانک سوال نے اسے جھنجلا دیا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ میں تمہارے پاپا کے ہاتھوں تنگ آ گئی ہوں سنا تم نے!'' وہ قدرے تلخی سے بولی۔ اسی اثنا میں آفاق آ کر ماں کے ساتھ لیٹ گیا۔

''مما پلیز...... مجھے تو اپنے پاس رہنے دیں۔'' وہ روتے ہوئے ''مما...... آپ پاپا کو جانے دیں۔ وہ آپ کو مارتے ہیں ہم تو تنگ نہیں کرتے نا۔ ہمیں تو ساتھ رہنے دیں۔'' دونوں اس کے ساتھ چمٹ کر بولے۔

''آئی ول شوٹ پاپا۔'' آفاق غصے سے بولا۔

''نو مائی ڈیئر، آپ کی دادو وہاں ہیں۔ وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اسی لیے تو بھیج رہی ہوں۔''

''مگر دادو اتنا اونچا سنتی ہیں، ان سے بات کون کرے گا۔'' شفق ایک دم بولی۔

''ہاں...... لیکن وہ تم سب سے پیار بھی تو بہت کرتی ہیں نا۔'' اس نے پھر دلاسا دیا ''اب تم لوگ جاؤ اور مجھے تنگ نہ کرو۔'' وہ ذرا غصے سے بولی۔

''او کے...... گڈ نائٹ مما......'' دونوں خاموشی سے بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

دونوں کے اندر آتش فشاں ابلنے کو تیار تھا مگر راستہ کوئی نہیں مل رہا تھا۔ آفاق غصے میں ادھر ادھر پھرنے لگا پھر رونا شروع کر دیا۔ شفق اسے تسلی دینے لگی تو وہ اس کے گلے لگ کر رونے لگا۔

''آئی ہیٹ مما......'' وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

''آئی ٹو......'' شفق نے بھی اس کی تائید کی۔

پیکنگ مکمل ہو چکی تھی۔ جانے کے لیے سب تیار کھڑے تھے۔ دو سالہ فلک پرام میں سو رہی تھی اور شفق نے پرام کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ آفاق اس کے پاس کھڑا تھا۔ بچوں کے چہروں پر سوگوار سی اداسی چھائی تھی۔ آنکھوں میں ان گنت سوال اور شکوے تھے مگر لب ساکت تھے۔ وہ ان کی طرف بڑھی مگر کوئی بھی اس کے گلے نہ لگا۔ شفق نے آفاق کی طرف دیکھا اور دونوں پرام دھکیلتے ہوئے باہر نکل آئے۔

''یہ طلاق کے کاغذات ہیں۔ باقی کاغذات تمہارے پاس ہی ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ گھر بھی تمھیں چھوڑنا پڑے گا۔'' منصور نے کاغذات تھماتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش بھی تھی اور حیران بھی کہ منصور نہ آج دہاڑا تھا نہ اس نے کوئی شور مچایا تھا۔ شاید وہ خود بھی اندر سے یہی کچھ چاہتا تھا اور خوش بھی تھا۔ شزا کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ وہ اب اس کے ساتھ جا رہی تھی اور وہاں جا کر دونوں یقیناً شادی کر لیں گے۔ باہر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو وہ باہر کی طرف بھاگی مگر وہ لوگ جا چکے تھے۔ بچوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر لب خاموش تھے۔ فلک شفق کی گود میں بے خبر سو رہی تھی۔

....

''ہیلو پیٹر میں آ گئی ہوں۔'' وہ مضمحل قدموں کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''اوہ گڈ...... اندر آؤ۔ ویلکم...... ویلکم ٹو یور سویٹ ہوم!'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

وہ خاموشی سے کوئی تاثر دیے بغیر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''شیئل ڈارلنگ، ڈونٹ یو وری۔ میں تمہارے لیے کافی لاتا ہوں۔'' وہ ہمیشہ اسے شہلا کے بجائے شیئل ہی کہتا۔

''تھینک یو۔'' اس نے کافی لیتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے کافی کے سپ لیتی رہی اور بچوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

''شیئل میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہی ہو؟'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا......؟'' شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

''تم ایسٹرن ویمن سوچتا بہت ہے۔ میری مدر اینگلو انڈین ویمن تھا۔ ہر وقت خاموش سوچوں میں گم، کھویا کھویا سا......''

''اب وہ کہاں ہیں؟'' اس نے نادانستہ پوچھا۔

''معلوم نہیں، دو سال پہلے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلا گیا۔ اب پتا نہیں کہاں ہے؟'' شہلا پھر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کیا اس نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ وہ پیٹر کو نظر انداز کر کے پھر سوچنے لگی۔

''ہاں، منصور نے تو مجھے ایک نہ ایک دن چھوڑنا ہی تھا اور اب تو اسے بھنک بھی پڑ چلی تھی کہ شیزا، شادی سے پہلے اسے طلاق دینے کو کہہ رہی تھی۔ کیا یہ اچھا نہیں کہ اس نے خود ہی یہ فیصلہ کر لیا۔ ابھی تو اس کے پاس آپشن تھا۔ قدرت نے پیٹر کو آپشن بنا کر ہی تو بھیجا تھا۔ اگر پیٹر نہ ہوتا تو وہ کہاں جاتی۔ واپس سید صاحب اور حیدر کے پاس......نہیں کبھی نہیں۔ اب وہاں میرا کوئی نہیں۔ پیٹر بولڈ ہے۔ اسٹرونگ ہے۔ اس نے میری ذات کو سہارا دیا ہے۔ جہاں منصور ہر وقت مجھے ذلیل کرتا رہا ہے۔ پیٹر نے مجھے عزت دی ہے اور ایک انسان کو دنیا میں کیا چاہیے۔ یہی کہ وہ عزت سے زندہ رہے۔ جہاں جائے عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ تنہائی میں اور محفل میں بھی اس کا شوہر اس کی عزت کرے اور......منصور نے نہ تو شوہر ہونے کا حق ادا کیا۔ نہ ایک انسان ہونے کا......اور نہ ہی مسلمان ہونے کا۔ ایسے بدقماش مسلمان سے تو ایک غیر مسلم اچھا انسان بہتر ہے جو دوسروں کو انسان سمجھے اور ان کو بھرپور عزت دے۔'' اس نے اپنے فیصلے کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن سید صاحب کیا کہیں گے؟'' ایک لمحے کو سوچ ابھری۔

''میں کون سی ان کی سگی اولاد ہوں اور ویسے بھی مجھ سے زیادہ انہیں اپنے شجرے، خون اور حسب نسب کی فکر ہے۔ انھوں نے بھی تو مجھے انسان نہیں سمجھا پھر مجھے کیوں فکر کرنی چاہیے۔''

''اور بچے......'' اس کا دل کٹنے لگا۔ ہر طرف شور برپا ہونے لگا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے کچھ کہنا چاہا لیکن سارے الفاظ کہیں گم ہو گئے۔ وہ جھنجلا سی گئی۔

''میں صرف اور صرف انسان ہوں۔ مجھے بھی زندہ رہنے کا مکمل حق ہے۔ مجھے بھی عزت چاہیے، ایک تحفظ چاہیے۔ مجھے اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے۔'' اس نے اپنے آپ کو مطمئن کیا۔ پیٹر اس کے چہرے پر ابھرتے تاثرات حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

شیئل پلیز ریلیکس، تم ریسٹ کرو۔ شام کو چرچ چلیں گے۔''

''چرچ......کس لیے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ویڈنگ کے لیے اور کس لیے۔''

''ویڈنگ......'' وہ بڑبڑائی۔ اس کے رگ و پے میں انجانا سا خوف سرایت کر گیا۔ اس نے جھرجھری سی لی مگر خاموش رہی۔

''شیئل ڈارلنگ، تم کیا سوچتا رہتا ہے۔ تمھیں اپنا آپ بدلنا پڑے گا۔ کیا تمہارا ہسبینڈ اس لڑکی شوزا کے ساتھ خوش نہیں۔ تو پھر تم کیوں اداس ہوتا ہے۔ تمھیں بھی خوش رہنے کا اتنا ہی رائٹ ہے جتنا اسے ہے۔'' شہلا کی سوچ پھر بدل گئی۔ اس نے زخمی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

''اوکے...... گیٹ ریڈی...... میں تمہارا برائیڈل ڈریس اور رنگ لے کر آؤں گا۔ اتنی دیر تم ریسٹ کرو۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

وہ وہیں صوفے پر نیم دراز ہوگئی۔ بچے اسے بار بار یاد آ رہے تھے۔ سید صاحب سفید ریش داڑھی اور اونچے شملے والے باعزت، پاک باز شخص، عزت و ناموس اور خون کی امانت و حفاظت کے لیے جان دینے والے...... اور...... بی بی جی...... سر سے پاؤں تک باپردہ، تقدس و پاکیزگی کا چلتا پھرتا نمونہ اور وہ خود کیا تھی؟ لب سڑک ننگ دھڑنگ، کثیف ملگجے کپڑے میں لپٹا نحیف و حقیر وجود۔ کیا اس نے ان دو عظیم ہستیوں کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی تھی؟ بی بی جی کی آغوش کی گرمی اور ان کی محبت پر شاید اس کے اندر کا چھپا کمینہ پن غالب آ گیا تھا۔ شاید اس کے جینز میں ہی فتور تھا۔ جیسے اس کو جنم دینے والوں میں...... شاید وہ کسی کے گناہوں کا ثمر تھی یا پھر کسی مجبور و بے کس، روایتوں سے جکڑی ماں کا جگر گوشہ یا پھر کسی مفلس باپ کی ناتمام حسرتوں کا شاہکار...... وہ کیا تھی؟ وہ تو ساری زندگی اسی شناخت میں سرگرداں رہی تھی۔ کس سے پوچھتی۔ سید صاحب سے، بی بی جی سے یا پھر حیدر سے۔ جو سب اس کے وجود کو تو مانتے تھے مگر اس کی شناخت کے انکاری تھے۔ کون تھی وہ؟ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ اس لیے ماننے سے بھی انکاری تھے۔ وہ اس گھر کی کیا تھی۔ بیٹی، ملازمہ، رشتے دار یا باندی۔ کوئی بھی تو تعین نہ کر سکا۔

حیدر اس کے خوب صورت فیچرز دیکھ کر اسے **Egyption Beauty** کہتا تھا۔ ملک منصور کسی انگریز کی اولاد کہتا تھا۔ شاید وہ انگریز، ہندو تھا۔ کرسچن یا پھر یہودی اور...... پیٹر اسے اینگلو انڈین کہتا تھا۔ وہ خود کو کیا سمجھتی تھی۔ اس کے پاس تو شناخت کا کوئی خانہ ہی پر نہ تھا۔ وہ کبھی کبھی بے خیالی میں اردگرد چلتے پھرتے انسانوں کو گھور گھور کر دیکھتی۔ شاید کسی سے

اس کی شکل ملتی ہو۔ شاید کوئی اسے یہ کہے کہ وہ ان کی کھوئی ہوئی اولاد تھی۔ نہیں پھینکی ہوئی، دھتکاری ہوئی۔ جیسے رینگنے والا بے بس کیڑا...... کہتے تھے جب وہ ملی تھی تو اس کے سارے جسم پر چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں اور تب سے اب تک وہ ان کے ڈنگ اپنی روح میں بھی محسوس کرتی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا۔ جو ہوا تھا ٹھیک ہوا تھا یا پھر سب کچھ غلط، الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ وہ کیسے اپنے آپ کو سمجھائے۔

......۞......

شام ہو رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ پیٹر سامنے تھا۔ اس کے ہاتھوں میں گفٹس تھے وہ اسے دیکھ کر مسکرایا ''اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ پھر چرچ چلتے ہیں۔''

اس نے بے دلی سے برائیڈل ڈریس پہنا تو اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ سید صاحب کی اتنے سالوں کی ریاضت اور بی بی جی کی آغوش کی تربیت سب اکارت گئی تھی۔ وہ کتنی بے خانماں اور حقیر نکلی تھی۔ خزاں کے سرد جھونکوں سے اپنے نحیف وجود کو نہ بچا سکی اور زرد پھڑ پھڑاتے پتّے کی مانند اس کو ادھر ادھر اڑائے دے رہی تھی۔ وجود کی صداقت کے لیے کردار کی شرط ضروری ہوتی ہے اور وہ تو بہت بودے کردار والی نکلی۔ اس کے اندر مسلسل ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

''اٹھو نا اب کس کا انتظار ہے؟'' پیٹر نے اس کے گرد محبّت سے بازو حمائل کرتے ہوئے کہا تو وہ چونک سی گئی۔

''یہ لمس...... یہ لہجہ...... یہ قربت کتنی نا آشنا سی ہے۔ اس میں وفا کی سچّائی محبت کی مٹھاس اور خلوص کی چاشنی کتنی کم ہے۔'' اس نے دکھ سے سوچا۔

''بہت اسمارٹ لگ رہی ہو۔ ویری پریٹی...... تم تو بالکل بھی ایسٹرن نہیں لگتیں تمہارے فیچرز...... تم گریک میتھالوجی کی گوڈسس (Goddes) لگتی ہو۔ ویری اسٹرینج، او کے لیوات اینڈ بی ہیپی۔'' وہ اس کا بازو تھام کر چلا۔

جیسے ہی اس نے چرچ کے اندر قدم رکھا اس کا سارا وجود تہ و بالا ہونے لگا۔ عمر کا لمبا سفر جو وہ طے کر کے آئی تھی۔ خدا سے آشنائی کے سفر میں تو اس نے کسی کو بھی نہیں سراہا تھا۔ احد احد کہتے وہ ایک دم تثلیث کے سامنے کھڑی تھی۔

......۞......

سید صاحب کے گھر کی مقدس اور روح پرور فضا میں سانس لیتے لیتے وہ اچانک

چرچ کی سنجیدہ اور سوگوار فضا میں دم لینے کو رکی تو سارا وجود تہ و بالا ہو گیا۔ میں کون سی کرسچن ہو رہی ہوں۔ بالآخر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا اور اس نے بے خبری میں نہ جانے کہاں کہاں دستخط کیے۔ جو وہ کہتا رہا۔ کسی روبوٹ کے مانند وہ کرتی رہی۔ کاغذی کارروائی مکمل ہوئی تو وہ مدر میری اور کرائسٹ کے مجسموں کے سامنے کھڑا منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا اور وہ خاموشی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اسے تو کسی دعا کی کوئی حاجت ہی نہ تھی۔

دعا کس کے لیے کرے۔ اپنے بے قراں وجود کے لیے۔ اپنے معصوم بچوں کے لیے یا پھر...... پیٹر کے لیے جو اس کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا گو کہ وہ مسز پیٹر بن گئی تھی۔ وہ کسی ایک کا بھی تعین نہ کر سکی۔ پیٹر اسے محبت سے گھر لایا۔ دونوں تنہا تھے۔ پیٹر اس سے میٹھی میٹھی مسحور کن باتیں کر رہا تھا۔ محبت کی باتیں...... ملن کی باتیں...... دلوں کی باتیں...... چاہتوں کی باتیں...... وہ سن رہی تھی اور وہ اس کے وجود کا احاطہ کر رہا تھا مگر اس کو پیٹر سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے سامنے تو حیدر تھا۔ وہی اس کی محبت، چاہت، عشق اور جنوں تھا۔ وہی تھا جس کے نہ ملنے کے ردعمل نے اسے اتنا شدید جذباتی کر دیا تھا۔

حیدر اپنی بھرپور شخصیت وجاہت اور رعب و دبدبے کے ساتھ مکمل طور پر سید زادہ۔ سید شہاب الدین کا اکلوتا بھتیجا سید ضرار الدین حیدر۔ ان کی جائداد اور گدی کا اکلوتا جانشین۔ خون کی امانتوں کا پاسدار۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، فارن کوالیفائیڈ سرجن...... مگر روایات کا پابند۔ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا مگر اس کی محبت، مصلحت میں بدل گئی جب سید صاحب نے اس کو یہ راز بتا دیا اور وہ سب کچھ دروازے کی اوٹ میں کھڑی سن رہی تھی۔ حیدر ان سے بحث کر رہا تھا۔ وہ اسے سمجھا رہے تھے اور وہ سمجھ نہیں رہا تھا اور بالآخر تنگ آ کر انھوں نے وہ سب کچھ بتا دیا جس کو سن کر اس کا وجود ریت کے ذروں سے بھی زیادہ حقیر ہو گیا۔

''حیدر خون کی امانتوں سے انحراف ممکن نہیں۔ سیدوں کو اپنے وجود سے زیادہ اپنے خون کا مان رکھنا ہوتا ہے۔ ناموس کی حفاظت، نام کی حفاظت، جان سے زیادہ کرنا سیدوں کا شیوا ہے۔ سید سر تو کٹا سکتا ہے مگر مصلحتوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ میں نے مرحوم بھائی کی نشانی کو اپنے سینے سے لگا کر پالا ہے۔ تمہاری ہر بات مانی مگر وہ مت کہو جو میں مان نہیں سکتا۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ قطعی ممکن نہیں۔ شہلا کون ہے؟ کیا ہے؟ خدا کا ہی راز ہے۔ اس کی شناخت، پہچان سب کچھ پردہ اسرار میں ہے۔ وہ تو ایک صبح ہماری گاڑی کے آگے یوں آ گئی جیسے کوئی کتا یا بلی...... ہم انسان تھے اور وہ بھی انسان تھی۔ انسانیت کے ناتے اسے سینے

سے لگا لیا۔ اگر ہم اسے نہ اٹھاتے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ آج کہاں ہوتی۔ جو سر راہ قدموں سے لپٹے اور جسے ہم اپنے وجود اور خون کی آبیاری سے جوان کریں۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں سنو حیدر! یہ سب ناممکنات میں سے ہے اور جان لو کہ خون بہانا تو سیدوں کا شیوہ رہا ہے۔ چاہے وہ اپنے عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔" سید صاحب اپنی عبا کا کونہ غصّے سے جھٹک کر گویا اسے دھمکی دے کر کمرے سے چلنے لگے پھر ایک دم رکے۔

"اور ویسے بھی ایسا کرنے سے تم ایک سید زادی کا حق مارو گے۔ ہماری بیٹیوں کا یوں حق مارا جائے ہمیں گوارا نہیں اور یہ نا قابل معافی جرم ہے۔" وہ بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔

"سید صاحب...... میں نے اسی دن کے لیے آپ سے کہا تھا کہ اس بچی کو گھر میں نہ رکھیں۔ نہ جانے کون ہے۔ کس کے وجود کا حصّہ ہے مگر آپ نہ مانے۔ یاد ہے آپ نے اس وقت کیا کہا تھا کہ ہم اپنی زندگی دے کر دوسروں کو زندگی دینا چاہتے ہیں۔ کسی کو یوں موت کے آگے نہیں پھینک سکتے اور اب آپ کیوں پچھتا رہے ہیں۔" بی بی جی بھی با رعب انداز میں بولی۔

"زہرہ خاتون ہم اپنی کسی بات سے منکر نہیں۔ کیا وہ بچی اس گھر میں ہماری بچیوں کی طرح آسائشوں سے بھرپور زندگی میں نہیں پلی۔ ہم نے اس کی تربیت میں کسی چیز کی کمی نہیں کی۔ خدا گواہ ہے ہم نے اپنی سیدہ فاطمہ اور سیدہ تبسم کی طرح ہمیشہ اسے عزیز از جان رکھا ہے لیکن شادی بیاہ تو نسلوں کے دوام کا مسئلہ ہے اور نسلوں کے خون کی پاکیزگی کی ضمانت تو جینز کے پاک ہونے پر ہے اور ایک دفعہ جینز میں یوں فشار پیدا ہو جائے تو آئندہ نسلیں ذہنی انتشار اور عناد کی نذر ہو جاتی ہیں۔ انشاء اللہ ہم اسے اپنی بیٹیوں کی طرح ہی بیاہیں گے۔ اسے اپنی جائداد سے حصّہ بھی دیں گے۔ تم دیکھنا کسی قسم کی کمی نہیں ہونے دیں گے۔" سید صاحب نے جواب دیا۔

"سید صاحب میرا خیال ہے کہ بہت بات بڑھنے سے بہتر ہے کہ اسے بلا کر آپ ساری بات سمجھا دیں۔ وہ سمجھ دار ہے سمجھ جائے گی۔" بی بی جی نے مشورہ دیا تو سید صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

⁂

پیٹر بہت خوش تھا اور اس کے لیے ناشتا بنا رہا تھا۔ اس نے ٹیبل پر بہت اہتمام سے اس کے لیے کافی اور سینڈوچز رکھے تھے "آج تم ریسٹ کرنا ..... پھر اس کے بعد زندگی کی

روٹین سیٹ کریں گے۔'' وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''تم گھر کب آؤ گے؟''

''لیٹ نائٹ...... کیوں...... خیریت تو ہے؟'' اس کی مسکراہٹ میں نہ جانے کتنے مفہوم پوشیدہ تھے۔ وہ چونک گئی اور پھر کہیں کھو سی گئی۔

''کیا واقعی مجھے اس شخص سے محبت ہے۔ دیارِ غیر میں ایک بالکل اجنبی شخص...... کیا میں نے اس کی محبت کے لیے سب کچھ داؤ پر لگایا ہے۔''

''شیئل تم کیوں پوچھ رہی ہو، کیا کوئی کام ہے؟''

''اوہ...... ہاں...... ہاں...... وہ میرے ڈاکومنٹس...... ان کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا اور میں یہاں، آئی مین......''

''ناٹ ایٹ آل۔ میں نے ایمبیسی میں بات کر لی ہے اور اب تم میری وائف ہو۔ اب تمھیں ڈاکومنٹس کی کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ ڈونٹ تھنک اباؤٹ دین۔ ایوری تھنگ از سیٹلڈ۔'' وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا تو وہ خاموش ہو گئی۔ پیٹر کے چہرے پر ابھی بھی مسکراہٹ تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں شرارت سی بھری تھی۔ گو کہ وہ درمیانی عمر کا خوب صورت نقوش والا انسان تھا۔ جس کے گرے بال اسے قدرے سوبر بناتے تھے لیکن وہ اکثر حرکتوں اور باتوں میں بالکل بچوں جیسا رویہ اپناتا تھا۔ ہر بات کو لائٹلی لیتا تھا۔

لندن میں آئے دو ماہ ہو چکے تھے اور پیٹر سے ملاقات صرف ایک ماہ پہلے ہوئی تھی اور اب وہ شخص اس کے لیے لازمی جز بنتا جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس سے اپنے دکھ شیئر کرنا شروع ہو گئی تھی۔ منصور تو زیادہ وقت شزا کے ساتھ باہر ہی گزارتا۔ اس پر تو بس شزا کا بھوت سوار ہوا تھا۔ وہ اپنا بزنس، سیاست اور گھر سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ صرف شزا اس کے من میں بس رہی تھی وہ ہر ممکن اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا ''شکر ہے منصور نے مجھے طلاق نہیں دی۔ میں نے خود لی ہے۔ ورنہ منصور کے اس طمانچے کو میں ساری زندگی کیسے سہہ پاتی۔ شکر ہے پیٹر میری زندگی میں آ گیا اور میں اس ذلت سے بچ گئی۔'' وہ سوچنے لگی۔

''شیئل تم نے بتایا نہیں کہ تم کیوں مجھے گھر آنے کے بارے میں کہہ رہی تھیں؟'' وہ اپنے بیگ میں کچھ کتابیں اور کارڈز رکھتے ہوئے بولا۔

''بس، یونہی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''بھئی آج کل کرسمس اور نیو ایئر کی وجہ سے بزی ہوں۔ کارڈز کی سیل بہت ہو

رہی ہے۔تم تو جانتی ہو بہت مصروف ہوتا ہوں لیکن جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ اوکے ٹیک کیئر ڈارلنگ...... آئی لو یو سو مچ۔'' وہ محبت سے اسے گلے لگاتا ہوا بولا ''دروازہ اچھی طرح لاک کرلو۔'' وہ بائے کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

باہر شدید سردی تھی۔ گہری دھند میں چند قدم کے فاصلے پر پڑی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے کمرے کے آگے بنی چھوٹی سی بالکونی میں کھڑی ہوگئی۔ اس کا اپارٹمنٹ زمین سے کافی اونچا تھا۔ نیچے چلنے والے لوگ سب رینگتے ہوئے کیڑے لگ رہے تھے۔ اس نے گہری سانس لی۔ ٹھنڈا یخ جھونکا اسے اپنے پھیپھڑوں میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دبیز تہیں تھیں۔

وہ ایسی ہی سرد شام تھی۔ شاید دسمبر کی ایک شام..... سب اپنے اپنے کمروں میں ہیٹرز کے سامنے دبکے بیٹھے تھے۔ جب سید صاحب نے اسے بلایا۔

''آؤ شہلا بیٹی۔'' وہ ہمیشہ بیٹیوں کو اٹھ کر ملتے تھے کیونکہ یہی سنت رسول ﷺ ہے۔

''اسلام علیکم بابا!'' اس نے ادب سے سر ان کے آگے جھکایا۔

وعلیکم اسلام۔ کیسی ہے میری بچی۔'' انھوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''ٹھیک ہوں، آپ نے مجھے بلایا؟''

''ہاں، ادھر بیٹھو میرے پاس اور جو میں کہوں توجہ سے سننا اور پھر اس پر غور کرنا۔ تمہاری دونوں بہنیں سیدہ فاطمہ اور سیدہ تبسم اپنے اپنے گھروں کی ہوچکیں اب تم ہو...... مگر بیٹی ایک مسئلہ ہے۔'' سید صاحب کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی اور وہ اس کی وجہ جانتی تھی۔

''جی فرمائیے، میں سن رہی ہوں۔''

''سید زادوں اور سید زادیوں کے رشتے آپس میں ہی طے ہوتے ہیں۔ یہی ہماری روایات رہی ہیں۔ تم بھی میری بچیوں کی طرح ہو۔ کیا میں نے تم میں اور ان میں کوئی فرق روا رکھا؟''

''نہیں بابا...... ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔''

''شکر ہے میرا مولا...... لیکن میری بچی اگر حیدر سید زادہ نہ ہوتا تو مجھے تمہارے اور اس کے رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ میں جانتا ہوں تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ ایک جگہ پلے بڑھے ہو مگر دونوں کا ملاپ ممکن نہیں۔ میں بھی تعلیم یافتہ ہوں اور مانتا ہوں کہ محبت بہت بڑا جذبہ ہے۔ مگر اسی محبت کے لیے بہت سی قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں۔ انسان

اس میں عقل وخرد کھو بیٹھتا ہے مگر اس سے بڑھ کر آزمائش بھی کوئی نہیں..... لیکن اب.....'' ان کو الفاظ نہ مل رہے تھے۔

''بابا تو پھر میں کون ہوں؟'' اسی سوال سے تو وہ ڈرتے تھے۔ چند لمحے خاموش رہے۔

''بتایئے نا بابا..... میں کون ہوں۔ کس کی بیٹی ہوں؟''

''میں نہیں جانتا۔ سید صاحب نے منہ دوسری طرف کر کے کہا۔

''تو پھر آپ نے مجھے کہاں سے اٹھایا؟''

''پل کے پاس کچی جگہ سے۔'' انھوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''تو آپ نے مجھے وہاں ہی کیوں نہ پھینک دیا۔''

''ہمارے خون میں انسانیت کی یوں بے حرمتی شامل نہیں۔''

''نام اور پہچان کے بغیر ادھورا وجود..... جسے نہ اپنے آغاز کا علم ہے اور نہ شاید اختتام کا۔ وہ کیسے جیے..... بابا..... اس دنیا میں ہم جیسے لوگوں کا جینا کتنا مشکل ہے۔ یہ معاشرہ ہمیں کن نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کاش آپ مجھے وہیں مرنے دیتے تو زندگی کا یہ دکھ اور عذاب تو سہنا نہ پڑتا۔ بابا آپ نے جو سائبان مجھے دیا تھا۔ یوں لگتا ہے آج خود ہی چھین رہے ہیں۔'' وہ سسکنے لگی۔

''میں خود تمہاری اچھی جگہ شادی کراؤں گا اور کسی بھی شے کی کمی نہیں ہونے دوں گا۔ بس بیٹی یہی ایک مسئلہ تھا۔ مجھے مجبور سمجھ کر درگزر کرنا۔''

وہ کمرے سے روتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے گلے میں پھانس تھی۔ جیسے کوئی چیز گلے میں اٹک گئی ہو اور اس کا نگلنا مشکل ہو گیا تھا۔ تیز دھار آلہ اندر ہی اندر اسے کاٹ رہا تھا۔ کبھی کبھی ان دیکھی اشیا اور غیر یقینی صورت حال انسان کو کتنا بے بس بنا دیتی ہیں۔ موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر گرے اور پھر گرتے ہی گئے۔ وہ کتنی ہی دیر حسرت و یاس کی تصویر بنی اپنے ''کل'' پر آنسو بہاتی رہی۔

وہ کھانا بنا کر پیٹر کی منتظر تھی۔ جیسے کبھی کوئی نئی چیز پکا کر حیدر کی منتظر ہوا کرتی تھی۔ وہ کھاتا جاتا اور مسکرا مسکرا کر نقص نکالتا جاتا اور وہ اسے کوستی رہتی۔ اس نے تو کبھی زندگی کا تصور بھی حیدر کے بغیر نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ بچپن گزرا۔ اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک ہر شام وہ اسے سارے دن کی روداد سنایا کرتی۔ جب کبھی وہ کہیں گیا ہوتا اور لیٹ ہو جاتا تو وہ شدت سے اس کی منتظر رہتی اور جب تک اسے سب کچھ سنا نہ لیتی اسے چین

نہ آتا۔ جب وہ امریکا پڑھنے جا رہا تھا تو وہ افسردہ سی کھڑی تھی۔

''یہ جدائی ہماری محبّت کو اور مضبوط کرے گی۔'' وہ جاتے ہوئے آہستہ سے بولا مگر اس کے آنے کے بعد تو ہر طرف دراڑیں ہی پڑ گئیں۔

''حیدر تم کہاں ہو۔ دیکھو یہ سب کیا ہو گیا ہے؟'' ایک دم اس کے منہ سے حیدر نکلا اور وہ اونچی آواز میں سسکنے لگی۔ وہ جو اس کے دکھ میں دکھی اور خوشیوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ کہاں چلا گیا تھا۔ جب اس نے میتھس میں یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا تو حیدر کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ بار بار اسے مبارک باد دیتا تو وہ جھینپ سی جاتی اور آج حیدر تم مجھ پر افسوس کرو گے یا دکھی ہو گے۔ کاش ایک لمحے کو تم نظر آ جاؤ تو میں اپنے سارے دکھ تمھیں بتا دوں۔ میرا وجود کرچی کرچی ہو چکا ہے۔

اس نے بڑے اہتمام سے کھانا ٹیبل پر چن دیا تھا۔ پیٹر رات کو بہت دیر سے آیا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا اور اس کی تعریفیں بھی کر رہا تھا۔ ایسی تعریفیں جو زندگی میں ملک منصور نے کبھی نہیں کی تھیں۔ بحیثیت بیوی وہ ایسی تعریفیں اس سے سننا چاہتی تھی مگر وہ تو اس کی ذات کو ہی اہمیّت نہ دیتا تھا۔ تعریفیں تو دور کی بات تھی۔

''میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ پیٹر تم یوں اچانک میری زندگی میں آ جاؤ گے۔ قسمت بھی کبھی کبھی کیسے کیسے لوگوں سے ملا دیتی ہے جن کے بارے میں انسان کبھی سوچتا بھی نہیں۔'' وہ اسے دیکھ کر بار بار سوچتی۔

آج سے ٹھیک ایک مہینے قبل پیٹر اس دیارِ غیر میں اس کے لیے بالکل اجنبی تھا اور اب دونوں کیسے مضبوط رشتے میں بندھ گئے تھے۔ اس کے لیے اس نے اپنا نام نہاد گھر، شوہر، بچے، ملک، شہر اپنی ادھوری پہچان سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کیا صرف پیٹر کے لیے...... نہیں صرف اس عزت کے لیے...... اس ریگارڈ کے لیے جو بحیثیت انسان پیٹر نے اس کو دیا۔ ایک انسان ہونے کے ناتے اس کا احترام کیا تھا اور اس نے اپنا سب کچھ اس کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ پیٹر کی بہت بڑی بک شاپ تھی ایک دن وہ بچوں اور ملک منصور کے ساتھ اس کی شاپ پر گئی۔ بچے اپنی اپنی پسند کی کتابیں خرید رہے تھے۔ وہ بھی یونہی کتابیں دیکھنے لگی۔ میتھس سے ریلیٹڈ ایک کتاب اسے پسند آ گئی۔

اس نے منصور سے دبے الفاظ میں کتاب خریدنے کو کہا تو جیسے وہ بھڑک اٹھا اسے

قطعی توقع نہ تھی۔ اتنا امیر کبیر شخص اور محض ایک کتاب خریدنے پر اس کی یوں بے عزتی کرے گا۔ اس کا چہرہ شرمندگی سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ پہلے یہ بے عزتی کمرے اور گھر میں ہوئی تھی اور اب سرعام، دیارِ غیر میں گویا اس نے سارے زمانے کو اس راز میں شریک کر لیا تھا۔ اس کو یوں لگ رہا تھا جیسے سر بازار اس نے اس کے وجود پر چابک مارے تھے۔ بچے سہم کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس بے عزتی کی وجہ سے وہ ساری رات سو نہ سکی۔

شادی کے بعد ایک ایک پل اس نے منصور کے ساتھ اذیت میں گزارا تھا۔ اس شخص نے اسے بے حد ذلیل کیا تھا۔ ہر لمحے، ہر آن، ہر موقع پر......اس کی روح شکستہ ہو چکی تھی۔ ہر وقت حیدر کے طعنے......حیدر کے نام پر ذلیل کرنا مگر وہ خاموش رہتی۔ اس کے پاس کوئی آپشن نہ تھا۔ وہ اس کا سائباں تھا۔ مضبوط نہ سہی مگر تھا تو سہی۔ اس کا محافظ تھا۔ اس کا نام اس سے منسوب تھا مگر شکستہ وجود اور ذلت کا شدید احساس لیے۔ منصور کی اس سے وابستگی ہی ایسی تھی۔

اگلے دن سخت سردی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش نے جہاں سبزے کو نیا رنگ دیا تھا وہیں سرمئی سڑکیں بھی دھل کر خوب صورت ہو گئی تھیں۔ سب سو رہے تھے وہ باہر لان میں آ گئی۔ کل رات کی بے عزتی نے اسے ساری رات سونے نہ دیا تھا اور اب بھی اس کے اندر شدید گھٹن تھی۔ اس لیے وہ سخت سردی میں بھی تازہ دم ہوا کے جھونکے اپنے وجود میں سمونے کے لیے آ گئی۔ اچانک پیٹر سائیکل پر سوار اس کے پاس آ کر رکا۔ وہ قدرے بھیگ چکا تھا۔ اس کی سپید رنگت شدید سردی کے باعث سرخ ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔

''آپ کل ہماری شاپ پر آیا تھا۔ یہ بک آپ کے لیے گفٹ ہے۔ آپ کو یہ پسند تھا نا......'' وہ بہت اپنائیت سے بولا۔

''نو تھینکس......مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ قدرے رکھائی سے بولی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، پوری شاپ میں یہی تو آپ کو پسند آئی تھی نا اور ویسے بھی گفٹ واپس نہیں کرتے۔'' اس کے لہجے میں بہت اصرار تھا۔

''میں نے کہا نا......اب مجھے اس کی ضرورت نہیں!''

''مجھے معلوم ہے یہ آپ کو بہت پسند ہے۔ یو آر اے گڈ ویمن۔ ویری نائس، آئی رئیلی ریسپیکٹ یو۔ آپ کے ہسبینڈ نے رات کو باقی بکس کی پیمنٹ کیا تو ان میں اس کا وزیٹنگ کارڈ بھی تھا۔ اس لیے ایڈریس ڈھونڈنے میں دیر نہیں لگی۔ میں آپ کو رات کو ہی یہ

کتاب دے دیتا مگر وہ بہت غصے میں تھا۔ اس لیے اب لایا ہوں۔ ایکسیپٹ اٹ پلیز۔'' اس نے خوب صورت پیکنگ میں لپٹی کتاب اس کی طرف بڑھائی تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

یہ کتاب نہیں تھی۔ اس کے نازک احساسات کا احترام تھا اور کسی نے تو خیال رکھا تھا۔ اس کے جذبات کو کسی نے تو محسوس کیا تھا۔

''تھینک یو...... تھینک یو سو مچ......'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو بے تاب تھے۔

''نو ٹیئرز...... اٹس پارٹ آف لائف۔ آپ کو جو بک پسند ہو۔ میری شاپ سے آ کر لے جائیں۔ بی بریو...... یو آر اے نائس پرسن۔'' وہ مسکراتا ہوا چلا گیا اور وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ ایسے نازک احساسات کا ادراک اور احساس کسی کسی کو ہوتا ہے ہر کوئی اس قابل کہاں؟ ہر کوئی کب کسی کے لیے ایسا درد محسوس کر پاتا ہے۔ یا خدایا میری اتنی Negation کیوں ہوتی ہے۔ ہر قدم پر پیدائش سے لے کر اب تک میں یہی تو فیس کرتی آئی ہوں۔ انسان کی عزت اتنی مشروط کیوں ہو گئی ہے اور پھر عورت کے لیے ہی دنیا کی ہر شے مشروط کیوں ہے۔ اس کی ذات، زندگی، نام، شخصیت، شناخت، پہچان، محبت اور عزت۔ سب کچھ ہی تو مشروط ہوتا ہے اور وہ اس معاملے میں کتنی بدقسمت رہی تھی۔ وہ بہت باسلیقہ، اطاعت گزار، اچھے اخلاق والی ایک عمدہ انسان سمجھی جاتی تھی اور ان میں سے کچھ بھی اس کے کام نہ آسکا۔ وہ دھتکاری ہوئی مخلوق کے طور پر ہی جانی جاتی تھی۔ سب کچھ کتنا بے معنی، فضول اور بے وقعت ہو گیا تھا۔ جب پیٹر نے اس کو عزت دی تو وہ سب کچھ چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ شوہر بچے، گھر اور سنہری یادیں بھی۔

***

''شیئل انسان کی زندگی بہت اہم ہے اور تم ہر وقت ڈپریسڈ رہتی ہو۔ دیکھو یہ سائنس کے کرشمے، نئی نئی ایجادات۔ سب اس کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کے سورسز تو ہیں۔'' پیٹر اسے سمجھا رہا تھا۔

''ہاں، میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ کبھی کبھی یہی جدوجہد، تہذیب و ثقافت، اخلاق، مذہب فلسفے اور تاریخ سب پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان یکسر اپنی حیثیت بھول جاتا ہے اور اپنے منصب سے ہٹ کر وہ لغو، بے معنی اور کمینی حرکتیں کرتا ہے۔'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''شیئل تم کیوں ایسا فیل کرتا ہے۔ کیا تم پچھتاتا ہے؟'' پیٹر نے اس کے چہرے پر

پھیلی یاسیت دیکھ کر کہا۔

''بے معنی زندگی میں پچھتاوے کیسے؟''

''تم بہت مسٹریئس ہو رہا ہے۔''

''ہاں تم ویسٹرن لوگ بہت سی باتوں کو سمجھ کر بھی نا سمجھنے کی ایکٹنگ کرتے ہو تو اسے Mystirism کا نام دے دیتے ہو۔'' پیٹر اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''ویری انٹرسٹنگ!'' وہ کتنی ہی دیر ہنستا رہا اور کافی کے سپ لیتا رہا۔ وہ اسے ہنستا ہوا دیکھتی رہی اور حیدر اس کے حواسوں پر چھانے لگا۔

''شہلا تمہاری ذات بہت منفرد ہے۔ تم جیسی لڑکی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ نہ یہاں نہ امریکا میں۔ کاش ہم یہاں نہ ہوتے۔ باہر کے کسی ملک میں ہوتے۔ جہاں ہماری پہچان ہمیں تنگ نہ کرتی۔ ہم صرف اپنی محبت کی آبیاری کرتے۔ کاش ایسا ہو سکتا۔ زندگی کی حقیقت تو جذبوں کی سچائیوں سے وابستہ ہے مگر جوش و جنوں ہونے کے باوجود رگوں میں دوڑنے والے خون کی حرمت کی پاسداری زیادہ ضروری ہے۔ ہم انسان تو نہ ہوئے بس مٹی کے پتلے ہوئے۔ ہماری ڈوریں کس کے ہاتھوں میں ہیں۔ ہم کیا جانتے ہیں۔'' حیدر اس کی رخصتی سے ایک روز قبل اس کے پاس آ کر کہہ رہا تھا ''جو ہوا بہتر ہی ہوا۔ میری وجہ سے اس گھر کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ یہ مجھے کبھی گوارا نہ تھا۔''

''ہم تم نہ ہوں گے خاک میں پنہاں ہو کر''

''آثار مٹا دینے سے چیزیں مٹ تو نہیں جایا کرتیں۔ دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ تم خوشبو کی طرح میرے اندر زندہ رہو گی۔ کسی کا کسی کے لیے خواہش کرنا، اسے چاہنا، اس سے عشق کرنا کیا اس کے اپنے بس میں ہوتا ہے۔ کیا ہوا کے جھونکے سے اس کی لطافت اور خوشبو چھینی جا سکتی ہے۔'' حیدر کے الفاظ بازگشت کی طرح اس کے لاشعور کے پردوں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر سن رہی تھی۔

دل کی دنیا کن کن ناموں سے آباد ہوتی ہے۔ کسے خبر ہوتی ہے۔ دلوں تک کوئی نہیں پہنچ پاتا۔ پیٹر سامنے تھا اور حیدر اندر...... ظاہر اور باطن میں کتنا فرق ہے۔ حیدر تو سنہری یاد تھا۔ اس کے وجود کے ایک ایک حصے میں رچی بسی خوشبو اور پیٹر تو اس کے وجود کا احاطہ کرنے کے باوجود بھی اس مقام پر نہ پہنچ پایا تھا۔ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا تھا۔ وہ اب اس کا لائف پارٹنر تھا۔ ہنس مکھ، زندہ دل اور قدر کرنے والا انسان۔ ملک منصور سے قدرے

مختلف.....مگر ان میں سے کوئی بھی تو حیدر جیسا نہ تھا۔

''شیئل اٹھو باہر چلتے ہیں۔'' پیٹر نے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یونہی گھومتے ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے۔ آج بہت دنوں کے بعد فرصت جو ملی ہے۔''

''اچھا.....'' اس نے لانگ کوٹ پہنا اور اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

''شیئل تم بہت اچھا انسان ہو پھر تمہارے ہسبینڈ نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''مس بی ہیو، اٹس ریئلی ویری بیڈ ٹو انسلٹ ادرز۔'' وہ ہنس دی اور اس کی ہنسی میں جیسے سارے جہاں کا درد سمٹ آیا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

''پیٹر کیا انسان کا اچھا ہونا اس کی قسمت بدل سکتا ہے؟''

''شاید.....It may be۔'' وہ شانے اچکا کر بولا۔

''کبھی نہیں.....اور نہ ہی برا ہونا۔''

''آئی ڈونٹ ایگری۔''

''پرسنل ایکسپیرئنسز ویوز (Views) کو بدل دیتے ہیں۔'' شہلا نے جواب دیا۔

وہ یونہی سڑک پر گھومتے چلے جا رہے تھے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں، بچے، بوڑھے سب آ جا رہے تھے۔ پیٹر اس کو مختلف جوکس بھی سنا رہا تھا اور اسے ہنسانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

''شیئل لائف انجوائے کرو، یہ ایک دفعہ ہی ملتی ہے۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

''اور یہ کتنی ٹریجڈی ہے کہ کوئی شے ایک دفعہ ہی ملے اور وہ بھی اچھی نہ ملے۔'' اس نے دُکھ سے کہا۔

''فار گاڈ سیک، اپنی لائف یوں مت اسپائل کرو۔ ہنسو، گاؤ، گھومو، پھرو.....تم آزاد ہو۔ تم جہاں چاہو جاؤ، کھاؤ پیو۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم ٹیپکل ایسٹرن ویمن کی طرح کھانا بنا کر گھر میں میرا انتظار کرو۔''

''پیٹر کوئی آزادی بھی تو مکمل نہیں ہوتی۔ قید و بند سے آزاد تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ نہ کوئی جذبہ نہ کوئی خیال نہ کوئی انسان تو پھر آزادی کہاں ہے.....کہیں نہیں؟'' وہ اپنی ہی لے میں بولی۔

''یہ دیکھو سب لوگ آزادی سے گھوم پھر رہے ہیں نا!''

''تو اس کا مطلب ہے کہ یہ سب آزاد ہیں؟''

''آئی تھنک سو......'' پیٹر نے مسکرا کر جواب دیا۔

''بٹ آئی ڈونٹ۔''

''شہلا یو آر سو......''

''مسٹریس......'' وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولی۔

''اوہ یس، بٹ انٹیلیجنٹ ٹو۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''شاید......'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''او کے تم ادھر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے آئس کریم لاتا ہوں۔'' اس نے اسے پارک میں ایک بینچ پر بٹھایا اور خود آئس کریم لینے چلا گیا۔

پیٹر تھا مسن درمیانی عمر کا خوب رو آدمی تھا۔ اس کی سفید رنگت، نیلی آنکھیں اور گرے بال اسے دوسرے انگریزوں سے قدرے منفرد بناتے تھے۔ وہ اس کی وجہ اپنا رشتہ کسی اینگلو انڈین سے بتاتا تھا۔ ہوا میں قدرے خنکی تھی۔ اس لیے وہ سمٹ کر بیٹھی تھی۔ سامنے سے پیٹر آ رہا تھا اور اس کے ساتھ گھنگریالے بلونڈ بالوں والی ایک لڑکی آ رہی تھی۔

''شہلا اس سے ملو۔ مائی ایکس وائف سوسن بلیئرڈ۔'' پیٹر مسکرا کر اسے یوں بتا رہا تھا جیسے دونوں میں کوئی بہت اچھا رشتہ ہو۔

''ہیلو......'' لڑکی نے خوش دلی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''شی از یور سیکنڈ وائف؟'' سوسن نے مسکرا کر پوچھا۔

''نو......تھرڈ......نینسی واز سیکنڈ۔ شی لوز ود جان ناؤ۔''

''آئی سی!'' وہ مسکرا کر بولی اور شہلا اس کا مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بہت سی ممکنات کے بارے میں سوچتی رہی۔

پیٹر نے ایک آئس کریم اسے دی، ایک سوسن کو اور اپنے لیے ایک اور لینے چلا گیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی بینچ پر بیٹھ گئی۔ دونوں کافی دیر خاموش رہیں پھر خود ہی اس نے سکوت توڑا۔

''تمہاری شادی کب ہوا؟'' سوسن نے پوچھا۔

''چند روز پہلے۔''

''تم ایسٹرن ہو؟''

''ہاں پاکستانی......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''لیکن تم ایشین نہیں لگتا۔''

''شاید۔''

''تم نے پیٹر سے شادی کیوں کیا؟''

''معلوم نہیں۔'' اس نے خلا میں گھورتے ہوئے گہری سانس لی۔

''اور تمہاری میریڈ لائف کیسی ہے؟''

''کون سی؟'' اس نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''کیا اور بھی تھی؟'' سوسن نے گہری نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں...... میرے کڈز تھے اور ہسبینڈ بھی۔''

''تو کیا تم نے پیٹر کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا؟'' اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں...... شاید...... ہاں...... آئی ڈونٹ نو۔'' وہ نروس ہو رہی تھی۔

''یو آر سو مسٹریس۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ پیٹر آ چکا تھا اس کے ہاتھ میں آئس کریم تھی۔

''سوسن تم نے میری وائف کو مس گائیڈ تو نہیں کیا؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اوہ...... نو...... نو...... ڈارلنگ...... شی از ویری نائس!''

''آئی نو۔'' وہ مسکرایا۔

''اب میں چلتی ہوں۔ تھینکس فار آئس کریم۔'' وہ بائے کہتے ہوئے چلی گئی۔ وہ سوسن اور پیٹر کے بارے میں سوچتی رہی۔

''سوسن بہت ایگریسیو ہے۔ مجھے بہت Snub کرتی تھی۔ بہت جھگڑالو۔''

''کس بات پر!'' شہلا نے حیرانی سے پوچھا۔

''یونہی، بیکار باتوں پر...... اٹس ہر نیچر، آؤ چلتے ہیں۔'' وہ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف لوٹ آئے۔

......✡......

سوسن مسلسل اس کے ذہن میں تھی۔ خوب صورت، نازک سی اور عام سی بھی ہر کردار اندر ہی اندر ایک دوسرے سے کتنا ملتا جلتا بھی ہوتا ہے اور نہیں بھی۔ وہ اپنی Negation کے بعد بھی کتنی خوش تھی جیسے وہ اب تھی۔ منصور سے مشروط معاہدے کے باوجود بھی وہ کتنی غیر اہم اور کمزور رہی تھی۔ سید صاحب نے منصور کی ہر ممکن منتیں کی تھیں کہ وہ اسے

طلاق نہ دے۔ انھوں نے اپنی جائداد کا مخصوص حصّہ بھی اس کے نام کر دیا تھا اور اس کا سارا اختیار ملک منصور کو دیا تھا۔

''لیکن اس کا ماضی داغ دار ہے...... اور میں ایسی رذیل عورت کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتا۔'' ملک منصور غصّے سے غرایا۔

''اگر تم میرے عزیز از جان دوست معراج الدین کے بیٹے نہ ہوتے تو قسم خدا کی تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کروا کر کتوں کے آگے ڈال دیتا۔ تمھیں یہ بھی حیا نہیں کہ وہ کس اعلیٰ خاندان سے تعلّق رکھتی ہے اور تم اس کے بارے میں فضول یا وہ گوئی کر رہے ہو۔'' سید صاحب کا غصہ عروج پر تھا۔

''اس خاندان سے اس کا تعلّق صرف نام نہاد ہی ہے نا! خون کا رشتہ تو نہیں۔ آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میں کوئی عقل سے کورا آدمی ہوں۔ اگر وہ آپ کے خاندان کی ہوتی تو اس وقت میری جگہ حیدر اس کا شوہر ہوتا۔ آپ نے میرے ساتھ سنگین مذاق کیا ہے۔ نہ جانے وہ کون ہے اور اس کو میرے گھر کو...... مجھے تباہ کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ کیا میں کوئی کم تر اور بے حیثیت انسان ہوں۔ ہزار ایکڑ زمین اور سیاسی اثر و رسوخ کا مالک ہوں۔ شہر میں میری دو فیکٹریاں ہیں۔ آپ نے میرے ساتھ گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ سید صاحب میں بزنس میں نقصان ہونے پر کسی ملازم کو نہیں بخشتا تو کیا میں شہلا کو بخش دوں گا۔ اب وہ سسکتی رہے گی۔ اس گھر میں اس کی حیثیت جانور سے بھی بدتر ہو گی۔ آپ دیکھیے گا نہ وہ شکایت کر سکے گی۔ نہ آپ کے سامنے رو سکے گی اور نہ ہی حیدر کو بھلا پائے گی۔ یہی اس کی سزا ہے۔'' وہ الفاظ چبا چبا کر بولا۔

سید صاحب جو کسی کی تلخ بات گوارا نہ کر سکتے تھے۔ ایک دم کمزور پڑ گئے۔ انہیں شدت سے احساس ہوا کہ وہ تو بیٹی کے باپ تھے اور بیٹی کا باپ اندر ہی اندر نہ جانے کیا کچھ برداشت کر لیتا ہے اور کچھ کہہ بھی نہیں پاتا۔ انہیں اب اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ان کا سارا غصہ اور طیش ہوا ہو گیا۔ چہرے پر تفکر، غم اور سنجیدگی کی لہریں نمودار ہو گئیں۔

''منصور وہ کوئی رذیل مخلوق نہیں۔ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے۔'' انھوں نے اسے بچانے کے لیے زندگی میں پہلی دفعہ جھوٹ بولا تھا۔

''سید صاحب کیوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں تحقیقات کروالی ہیں۔ وہ آپ کو سڑک پر ملی تھی۔ حقیر...... ذرہ خاک...... رذیل ذات...... جس کی نہ

کوئی شناخت ہے نہ نام......اور حیدر سے اس کا معاشقہ بھی کوئی چھپی بات نہیں!'' ملک منصور بدتمیزی کی حدیں پار کرنے لگا۔

''دیکھو بیٹا، میری اور تمہارے باپ کی دوستی مثالی رہی ہے۔ اس دوستی کی خاطر ان سب باتوں کو بھول جاؤ۔ یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ تمھیں خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے۔ وہ بہت اچھی سلیقہ شعار بچی ہے۔ مجھے یقین ہے تمھیں ہر طرح سے سکھ دے گی۔'' سید صاحب کے لہجے میں بلا کی شکستگی تھی۔

''اسے اتنا حق ملے گا تو سکھ دے گی نا'' وہ بھی تلخی سے بولا۔

''کیا یہ ممکن نہیں کہ تم سمجھوتا کر لو۔ کسی بھی بات پر میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔'' سید صاحب نے آخری بار التجا کی۔

''ٹھیک ہے، آپ کی خاطر وہ اس گھر میں رہے گی مگر...... اس کے لیے آپ کو ایک شرط ماننا پڑے گی۔'' ملک منصور کے لہجے سے عیاری ٹپک رہی تھی۔

''ہاں...... کہو...... میں ضرور ماننے کی کوشش کروں گا۔'' وہ بے صبری سے بولے۔

''آپ شہر والی رائس مل میرے نام کر دیں۔'' وہ قدرے ڈھٹائی سے بولا۔

''اوہ......!'' وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ ہر راستہ مسدود نظر آ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، چند روز تک تمھیں کاغذات مل جائیں گے۔'' سید صاحب ہار مانتے ہوئے شکستگی سے دوچار ہوتے ہوئے بولے۔ وہ ریت کی عمارت کے مانند بالکل شکستہ ہو گئے تھے۔ ملک منصور کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ انھوں نے اسے بسانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ اسے بالکل بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے۔ وہ ایسے سودے کا سن کر جیسے سکتے میں آ گئی۔

''اتنا مشروط وجود، اتنا مشروط رشتہ۔'' اتنی مشروط زندگی۔ مرد ہر رشتہ کیوں مشروط بنا دیتا ہے۔ ہر تعلق مشروط کیوں ہے۔ وہ اس رات اتنا روئی کہ شاید آنسو ختم ہو گئے تھے مگر آنکھیں برسنا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ ملک منصور چند دنوں میں ہی رائس مل بیچ کر انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنا بزنس سیٹ کیا۔ زیادہ تر وقت وہ انگلینڈ میں ہی رہتا اور وسیع و عریض حویلی میں وہ اس کی بوڑھی بہری ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہاں چند نوکر اور جانوروں کی بہتات تھی۔ اس حویلی کے چپے چپے سے وحشت اور ویرانی ٹپکتی تھی۔ وہ سارا دن گائے، بھینس، گھوڑے، مرغیاں اور بکریاں دیکھتی رہتی۔ نہ کسی سے بات نہ کسی سے دکھ سکھ شیئر کرتی۔ وہ اس گھر میں کیا تھی؟ مالکہ، ملازمہ، باندی یا پھر زر خرید غلام۔ وہ آج تک تعین نہیں کر سکی تھی، وہ اس کے بعد

کبھی شیخوپورہ کا شانۂ سید نہ گئی۔ شادی کے بعد وہ کبھی حیدر کے سامنے نہ گئی۔ بس اس حویلی کی خاک میں خاک ہوگئی۔

ملک منصور جب بھی انگلینڈ سے آتا تو نت نئی لڑکیوں سے وابستگی کی یادیں بھی لے کر آتا۔ جتنے دن رہتا۔ ہر رات اس پر تشدد کرتا۔ کبھی طنزیہ لہجے میں تو کبھی چابک ہاتھ میں تھام کر۔ اتنی بڑی حویلی میں وہ ایک تنکا تک اٹھا کر اپنی مرضی سے ادھر سے ادھر نہیں رکھ سکتی تھی۔ زندگی کا حاصل کیا تھا؟ وہ تو ہر شے اور جذبے کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ منصور اس کا کیا تھا اور وہ اس سے کس شے کی طالب تھی یہ بحث اور طلب ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے سرد آہ بھری۔

پیٹر کافی اور سینڈوچز لے کر آ گیا تھا اور سلیقے سے ٹرے سجا کر اس کے سامنے رکھ دی ''اتنا مت سوچا کرو، یو پریٹی ویمن۔'' وہ محبت سے بولا۔

''اوہ تم!'' وہ ایک دم مسکرا دی۔ کہاں اتنی ذلت اور کہاں اتنا مان۔

''کل تم تیار رہنا۔ میں نے تمہارے لیے ایک اسکول میں بات کی ہے۔ تم ایز اے میتھس ٹیچر جوائن کرنا۔ یوں فارغ بیٹھ کر تنگ آ جاؤ گی۔'' پیٹر نے کہا۔

''ٹھیک ہے، یہ تم نے اچھا کیا۔ واقعی میرے ذہن کو زنگ لگ چکا ہے۔''

''پیٹر سینڈوچز بہت ٹیسٹی ہیں۔'' وہ تعریف کرتے ہوئے بولی۔

''اچھے ہیں نا، میں روز تمہارے لیے بنایا کروں گا۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''تھینک یو۔'' وہ بھی مسکرا دی۔

''میں اور بھی اچھی چیزیں بناتا ہوں۔ تمھیں بنا کر کھلاؤں گا۔''

''مثلاً؟'' وہ متجسس انداز میں بولی۔

''مثلاً...... کیک، ایپل پائز، پزا وغیرہ وغیرہ......''

''اس کا مطلب ہے تم اچھے کک بھی ہو۔''

''کک نہیں بیکر...... اور اب میں شاپ پر جا رہا ہوں۔ فروٹ میں نے فریج میں رکھ دیا ہے۔ ضرور کھا لینا۔ اوکے گڈ بائے اینڈ ٹیک کیئر۔'' وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا اور آنسو اس کی آنکھوں میں جھلملانے لگے۔

پیٹر واقعی اتنا نفیس انسان ہے۔ اتنا محبت کرنے والا تو پھر سوسن نے اسے کیوں چھوڑ دیا۔ شاید کوئی کسی کے لیے سیٹسفیکشن اور کسی کے لیے ڈس سیٹسفیکشن کا باعث بنتا ہے۔ کتنا تضاد

ہے سوچ میں یا پھر رویے میں۔ کہیں دن، کہیں رات۔ کسی کے لیے اندھیرا اور کسی کے لیے روشنی۔

اس نے اوپر تلے شفق، آفاق اور فلک کو جنم دیا۔ منصور کو بچوں سے بہت محبت تھی اور اس سے بہت نفرت۔ نفرت کے ملاپ سے محبت نے جنم لیا تھا۔ عجیب مضحکہ خیز بات تھی۔ وہ اس کے وجود سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا سایہ تک اسے گوارا نہ تھا اور اس کے وجود سے پھوٹنے والی کونپلوں پر وہ جان دیتا تھا۔ بے نام نے نام والوں کو تخلیق کیا تھا۔ وہ بچوں کی ہر خواہش پوری کرتا اور اس کی ہر خواہش کو رد کرتا بلکہ اس کے پاس تو اظہار کا حق ہی نہ تھا۔ ملازم بھی رعب سے اپنا حق مانگ سکتے تھے مگر وہ تو اس کے گھر میں کچھ بھی نہ مانگ سکتی تھی اور کس سے مانگتی۔ لینے والے سے پہلے اپنے وجود اور حیثیت کا تعین تو کرواتی۔ وہ بچوں کو بہت گھماتا پھراتا اور اس کو کبھی نہیں۔ پہلے شفق اور آفاق اکیلے باپ کے ساتھ جاتے۔ اب جب سے فلک پیدا ہوئی تھی تو اسے بھی کبھی کبھار شفق کے اصرار پر پچھلی سیٹ پر بٹھا لیتا۔ شفق دونوں کے وجود کا مرقع تھی۔ ملک منصور تو ویسے بھی اپنی خوب صورت اور ڈیشنگ پرسنالٹی کی وجہ سے ہر خاص و عام میں مقبول تھا اور اس کے فیچرز بھی کسی سے کم نہ تھے اور شفق تو بالکل ماں پر گئی تھی۔ شفق جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی ماں کی حیثیت کا اندازہ کر رہی تھی۔ اس نے ہی ضد کر کے شہر کے اسکول میں داخلہ لیا اور اس کی وجہ سے سب کو شہر شفٹ ہونا پڑا۔

ملک منصور نے ڈیفنس میں چار کنال پر محیط بڑا سا گھر انہیں لے کر دیا۔ ہر طرح کی آسائشیں میسر تھیں۔ اس دفعہ بچوں نے چھٹیاں انگلینڈ میں گزارنے کی ضد کی تھی اور اب کی بار اسے بھی جانا پڑا کیونکہ فلک بہت چھوٹی تھی۔ شفق اور آفاق کے بے حد اصرار پر اسے بھی لے کر جانا پڑا۔ جوں جوں ملک منصور کی امارت میں اضافہ ہو رہا تھا اس کی سیاسی حیثیت بھی بڑھ رہی تھی اور سماجی بھی۔ وہ آئے دن مختلف تقاریب میں خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا کیونکہ وہ گلیمرس اور متحرک شخصیت کا مالک تھا۔ ہر روز نت نئی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا۔ کبھی کسی این جی او کی روح رواں کے ساتھ۔ کبھی کسی پارٹی ورکر کے ساتھ اور کبھی کسی مشہور اداکارہ کے ساتھ تو کبھی ماڈلز کے ساتھ دیکھا جاتا۔ نت نئی فیشن ایبل لڑکیاں بلا روک ٹوک اس کے گھر آتی جاتیں۔ کسی کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ ان کے آنے جانے کی نوعیت پوچھ سکتا؟

منصور دو دن سے گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے شفق کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ ضروری کام سے کہیں جا رہا ہے۔ شفق نے ماں کو بتا دیا تھا اور اس نے خاموشی سے سن لیا تھا۔ ناشتا ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ وہ بچوں کو اٹھا کر لائی تو اچانک سامنے منصور بیٹھا تھا۔ خوش باش، نکھرا

نکھرا۔ وہ چونک سی گئی مگر کچھ بھی پوچھنے کی جرات نہ کرسکی۔

''ہیلو پاپا...... آپ یہاں......؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''ہیلو ڈیئر، ہاں میں رات کو آ گیا تھا۔ بس کام ختم ہو گیا تھا۔''

''پاپا آج چھٹی ہے گھومنے چلیں گے۔ آج زو چلیں گے۔'' آفاق خوشی سے بولا۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ شفق روز اخبار میں پزل اور اسکریبل دیکھنے کی عادی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اخبار لے کر بیٹھ گئی اور پھر ایک دم چونک گئی۔

''مما...... نیوز پیپر میں پاپا......!'' وہ حیرت سے بولی۔

''کہاں، مجھے دکھاؤ۔'' آفاق اس سے اخبار چھیننے لگا۔

''مگر یہ ساتھ کون ہے؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''یور نیو مما۔'' ملک منصور مسکراتے ہوئے بولا۔

''نہیں، ہماری مما تو یہ ہیں۔'' آفاق غصے سے بولا۔

''شی از اے گڈ سنگر۔'' منصور نے اس کی تعریف کرنا چاہی۔

''بٹ وی ہیٹ ہر۔'' شفق غصے سے بولی۔ اس کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

شہلا خاموشی سے سنتی رہی۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

تو منصور نے بالآخر اس سنگر سے شادی کر ہی لی جس کا آج کل اس کے ساتھ چرچا تھا۔ اسے کوئی خاص دکھ نہ ہوا۔ منصور کے ساتھ اس کا رشتہ بس نام کا رہ گیا تھا۔ وہ پہلے کون سا اس کا تھا جو اسے دکھ ہوتا۔ منصور بہت خوش تھا۔ بچوں کو باہر لے کر جانا چاہا تو کوئی بھی ساتھ نہ گیا۔ شفق کا دل ٹوٹ سا گیا تھا۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہی اور روتی رہی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں نہ جانے کیوں اس نے اس بات کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس نے سارا دن کسی سے بات نہ کی۔ آفاق بھی روٹھا روٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ دونوں ماں باپ سے متنفر ہونے لگے تھے۔

......✡......

بی بی جی کی وفات کی خبر ملی تو وہ چونک سی گئی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بی بی جی یوں اچانک اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گی۔ ان کی محبت اور پیار بھرا لمس سب کچھ کتنا منفرد تھا اور اس میں کتنی مٹھاس تھی۔ کیا ان سب کو بھلانا آسان ہے۔ اسے شدید صدمہ ہوا۔ منصور نے خود ہی گاڑی نکالی اور ملازم کے ہاتھ اس کو پیغام بھیجا۔ وہ خاموشی سے بچوں کو

لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ کبھی بھی منصور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر نہیں بیٹھی تھی۔ نہ ہی منصور نے کبھی اسے یہ حق دیا تھا۔ وہ ہمیشہ شفق کو آگے بٹھاتا تھا۔ وہ سارا راستہ روتی رہی۔ وہ شفق کی پیدائش کے بعد اب پہلی دفعہ کاشانہ سید جا رہی تھی۔ وہ تو ان راستوں کو کھوجتی رہی۔ انھیں اپنے اندر تلاش کرتی رہی جو کبھی اس کے تھے اور اب اس کے جانے کے بعد سب کچھ کتنا بدل چکا تھا۔ گاؤں میں کافی ترقی ہو چکی تھی مگر اس کی نگاہیں تو ان کچے پکے راستوں اور پگڈنڈیوں کو تلاش کرتی رہیں جن پر وہ حیدر کے سنگ چلا کرتی تھی۔

حویلی میں سب لوگ جمع تھے۔ سید صاحب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ حیدر ان کے ساتھ ساتھ پھر رہا تھا۔ حیدر نے وہی حلیہ اپنا لیا تھا جو کبھی سید صاحب کا ہوتا تھا۔ بس اس کی نظر کی عینک کا نمبر بڑھ گیا تھا۔ حیدر کی اپنے ننھیالی رشتے داروں میں شادی ہوئی تھی اور اس کی ایک بیٹی تھی شہلا۔ وہ نام سن کر چونک سی گئی۔ وہ روتی ہوئی بہنوں کے گلے لگی۔ تبسم آپا بھی کافی دیر اس کے گلے لگ کے روتی رہیں۔ کبھی وہ اس گھر اور اس کی آسائشوں میں ان کے ساتھ برابر کی حصے دار تھی اور اب وہ اس گھر میں اجنبی تھی، مہمان تھی۔ سید صاحب نے اس کے سر پر پیار دیا تو وہ جی بھر کر روئی۔ جنازے کے بعد وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''بی بی جی کو کیا ہوا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا بس بڑھاپا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بیماری ہو سکتی ہے؟'' سید صاحب خاموش ہو گئے۔

''بابا انہوں نے مجھے کبھی یاد نہ کیا؟''

''کرتی تھی۔ بہت زیادہ...... مگر میں نے خود ہی بلانا مناسب نہ سمجھا۔''

''کیوں...... میں اس قدر غیر ہو گئی ہوں۔''

''نہیں، منصور کے ڈر سے۔ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔''

''تو کیا اب وہ مجھ سے خوش ہے؟'' اس کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔

''منصور نے شادی کر لی ہے؟'' سید صاحب نے آہستہ سے پوچھا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔ میں اس کے گھر میں فالتو شے سے بھی کم حیثیت رکھتی ہوں۔''

''میں تمہارا گنہگار ہوں۔'' سید صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

''آپ اپنے دل سے ہر وہم نکال دیں۔ کیا قسمت سے بھی کوئی لڑ سکا ہے۔ یہ سب میرا نصیب ہے جو مجھے مل کر رہنا ہے۔'' اس نے سید صاحب کی تشفی کرنا چاہی۔

اچانک حیدر کمرے میں آیا تو ٹھٹک سا گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ مدبر لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے خزاں کا کوئی موسم ٹھہر سا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ ہی دکھ تھا ''کیسی ہو؟'' وہ جیسے ہمت یکجا کر کے بولا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا اور وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

تین دن شہلا وہاں رہی حیدر نے اس دوران منصور کی بہت آؤ بھگت کی۔ اس کے بچوں کو بہت پیار کیا۔ جانے سے پہلے وہ سب سے مل رہی تھی۔ وہ کچن میں تبسم آپا سے ملنے گئی تو حیدر وہاں کھڑا تھا۔

''تم اس قدر کیوں بدل گئی ہو۔ تم وہ شہلا ہی نہیں لگ رہیں۔ خوش رہا کرو۔'' حیدر نے کہا۔

''کیا یہ اتنا آسان ہے؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ناممکن تو نہیں، کوشش کیوں نہیں کرتی۔''

''میرے لیے اب سب کچھ ناممکن ہے۔'' اس نے آہ بھر کر کہا۔

''کیا زندگی یونہی گزار دو گی؟''

''شاید۔''

''تمھیں یوں دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔'' وہ قدرے افسردگی سے بولا۔

''کیوں؟''

''کیا تم نہیں جانتی؟''

''حیدر ماضی کو وہاں دفن کر دو جہاں سوائے تاریکیوں کے کچھ بھی نہ ہو۔ اب میں آئندہ یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔'' وہ کہہ کر باہر نکلی تو منصور باہر کھڑا ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ جا کر خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گھر آتے ہی منصور نے اسے غلیظ گالیوں سے نوازا تھا۔ مرد کا گندہ ترین ہتھیار، جو عزت اور لحاظ کے تمام بت پاش پاش کر دیتا ہے۔ مرد کو اونچے منصب پر بٹھا کر جب عورت اپنے بارے میں پہلی دفعہ ایسے الفاظ سنتی ہے تو اس کا بس نہیں چلتا کہ اس شخص کو اپنے قدموں تلے روند ڈالے۔ کمینگی کی بدترین شکل...... جسے مرد ادا کر کے خوش ہوتا ہے۔ عورت کی تذلیل کے احساس سے اس کی انا تسکین پاتی ہے۔ ملک منصور بھی اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ ایک سے بڑھ کر ایک غلیظ گالی اسے دے رہا تھا۔

''منصور گالیاں مت دیں!'' وہ پہلی دفعہ چلائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''تم جو اپنے عاشق سے مل کر آئی ہو۔ اس خوشی میں پھولوں کے ہار پہناؤں۔''

''میرے اور حیدر کے تعلقات بہت اچھے اور پاکیزہ تھے اور مجھے کبھی بھی اس پر شرمندگی نہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور عزت دی۔ ایسی عزت جو شاید ہی کوئی مرد کسی عورت کو دے سکے۔ میرا اور اس کا کوئی تھرڈ کلاس افیئر نہیں تھا۔'' اس نے بالآخر ہمت کر کے کہا۔

منصور کو تو جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اسے قطعی توقع نہ تھی کہ وہ یوں اس کے سامنے بولے گی۔ اس نے جو اس کو مارنا شروع کیا تو رکنے پر ہی نہ آ رہا تھا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔

''تمہاری یہ جرأت کہ مجھ سے اس طرح بات کرو۔'' وہ غصّے سے بے قابو ہو کر بولا۔

''پاپا بس کریں۔'' شفق نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی۔ اس نے آ کر باپ کو روکا تھا۔ شفق کے کہنے پر وہ رکا تھا ورنہ آج تو وہ اس کی بوٹی بوٹی کرنے پر تلا تھا۔

شفق اور آفاق دونوں ماں کا سر دبا رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ اس کا پور پور، رواں رواں جل رہا تھا۔ سب کچھ اسے یاد آ رہا تھا۔ باہر ٹیرس پر خوشگوار ہوا کا جھونکا اس کے بالوں کو چھونے لگا مگر اندر کی آگ سے تن بدن جل رہا تھا۔ پیٹر اسے ٹیرس پر کھڑا دیکھ کر نیچے سے ہاتھ ہلا رہا تھا مگر وہ تو شدید احساس ذلت میں جل رہی تھی۔ اب وہ باہر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ جب وہ اچانک چونک کر مڑی اور دروازہ کھولا۔

''شیئل تم کیا کرتا ہے......؟'' وہ اسے دیکھ کر جھنجلا کر بولا۔

''کیوں؟''

''میں تمھیں نیچے بلا رہا تھا۔''

''کب؟''

''اوہ مائی گاڈ! شیئل ڈارلنگ اپنی سوچوں سے باہر نکل آؤ۔ اپنا پاسٹ کہیں پھینک دو۔ کہیں تاریک گوشے میں۔ صرف پریذنٹ کو دیکھو۔ کسی کو یاد نہ رکھو۔ بس تم یہاں ہو اور میں تمہارے ساتھ۔'' وہ اس کے ساتھ لپٹتے ہوئے بولا۔

''زندگی کے اتنے سال کہاں گم کر دوں، وہ لمحے وہ یادیں۔ وہ باتیں اور بہت کچھ۔ بھلانا بھی چاہوں تو نہیں بھلا سکتی۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''او کے، کل سے تم اسکول جوائن کرو گی پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کون سے اسکول؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے تمہارے لیے جاب ڈھونڈی ہے بتایا تو تھا اور تم اسکول میں میتھس پڑھاؤ گی۔ کل انٹرویو ہے لیکن ابھی پب چلتے ہیں۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''اوہ گاڈ! ایک تو میں تمہارے دل سے بہت تنگ ہوں۔ تم اس کو سمجھاتا کیوں نہیں۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''کیا سمجھاؤں؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''جو میں کہتا ہوں۔''

''تم کیا کہتے ہو؟''

''لو...... رومانس اینڈ......'' وہ شرارت سے بولا۔

''یہ ایسی باتیں نہیں سمجھتا۔''

''اٹس ویری اسٹوپڈ۔'' نادانستہ پیٹر کے منہ سے نکلا تو شہلا کھلکھلا کر ہنس دی ''تھینکس گاڈ۔ تم ہنسی تو......'' اور وہ خود بھی ہنسنے لگ پڑا ''پب چلیں؟''

''نہیں۔''

''مووی دیکھنے چلیں۔''

''نہیں۔''

''تھیٹر۔''

''نہیں۔''

''تو پھر......؟''

''باتیں کرتے ہیں۔ میری زندگی میں اچھی باتوں کی کمی رہی ہے۔ تم باتیں کرو۔ میں بس سننا چاہتی ہوں۔ اچھی باتوں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی قیمتی شے نہیں، ہے نا پیٹر۔''

''اوہ نو...... تم پھر سیڈ ہو جاتی ہو۔'' پیٹر اکتاہٹ سے بولا۔

''اب نہیں ہوتی، تم باتیں کرو۔ میں سنتی ہوں۔''

''نہیں تم کرو، میں سنتا ہوں۔''

''کیا...... کون سی باتیں۔ کیسی اور کس کے متعلق!'' اس نے خود سے سوال کیا۔

دونوں خاموش ہو گئے اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیے۔

''پیٹر تم بہت Jolly ہو......''

''اور تمھیں بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''تم اتنے اچھے کیوں ہو؟''

''کتنا اچھا؟'' پیٹر اپنی تعریف سننے کے موڈ میں تھا۔

''بہت سے لوگوں سے اچھے ہو۔ ویری نائس پارٹنر اینڈ سویٹ ہسبینڈ۔''

''کیا سب سے اچھا نہیں؟'' پیٹر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں......'' حیدر کی شبیہہ ایک دم اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئی اور وہ کھو سی گئی ''نہیں......اس سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں۔'' اس کے دل نے کہا۔

''تم بھی بہت اچھی ہو۔ معلوم نہیں تمہارے ہسبینڈ نے کیوں ایسا کیا؟''

''کیا؟'' جیسے وہ خواب سے بیدار ہو گئی ہو۔

''یوں مس بی ہیو......وہ بہت برا انسان تھا۔ تم نے اتنے سال کیوں اس کے ساتھ ضائع کیے۔ اسے دوسرے دن ہی کیوں نہ چھوڑ دیا۔''

''ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ ہم زندگی کی آخری سانسوں تک رشتہ نبھاتے ہیں۔ کوئی کوئی میری طرح راستے میں چھوڑ دیتا ہے۔''

''ویری اسٹرینج......کس کے انتظار میں زندگی یوں ضائع کی جائے؟''

''شاید کسی معجزے کے......مگر ہم جیسوں کے ساتھ معجزے بھی نہیں ہوتے۔''

''You mean miracles۔'' وہ وضاحت کے موڈ میں بولا۔

''ہاں Miracles۔''

''تو کیا تمہارا اور میرا ملاپ۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ۔ کیا یہ Miracle نہیں۔''

''ہاں یہ بھی ہے......لیکن پیٹر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم کسی اور معجزے کے منتظر ہوتے ہیں۔ دعائیں کسی اور کے لیے مانگتے ہیں لیکن کچھ اور بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ زندگی اتنی مشکل کیوں ہے۔ اس میں اتنے Jerks کیوں ہیں۔ اتنے مختلف موڑ کہ ہم خود ہی حیران ہو جاتے ہیں کہ ہم جا کہاں رہے تھے اور پہنچ کہاں گئے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''پلیز شیبل ایسی مشکل باتوں سے نکل آؤ۔ تم میتھس پڑھتی رہی ہو اس لیے اتنے

اینگلز والی باتیں کرتی ہو۔ میں تمہارا پاسٹ نہیں جاننا چاہتا۔ میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم خوش ہو کہ نہیں۔ کیا تم میرے ساتھ خوش ہو؟''

''ہاں...... بہت......''

''کیا تمہارے اندر کوئی کارنر خالی تو نہیں رہ گیا۔ میں نے تو تمھیں بھرپور محبت دینے کی کوشش کی ہے۔ ایکسٹریم لو......'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ہاں......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''تھینکس ڈارلنگ، آئی ایم سیٹسفائیڈ ناؤ۔'' وہ اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے بولا اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی ''تم جسے محبت کا نام دیتے ہو وہ محبت تو نہیں۔ پیٹر وہ تو کچھ اور ہے۔ میرے اندر محبت کا کاسہ ابھی بھی خالی ہے۔ حیدر کے بعد تو کوئی اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔ وہ تو ہمیشہ خالی رہے گا۔ تمہاری محبت میں وہ سب کچھ نہیں جو مجھے چاہیے۔'' اس نے آہ بھر کر سوچا اور اس کی طرف دیکھا وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

بعض لوگ کیسے آسانی سے مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے پیٹر...... جیسے منصور اور بعض لوگ کبھی مطمئن نہیں ہوتے جیسے میں جیسے حیدر۔ وہ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی دیکھ چکی تھی اور اس گہری اداسی کا راز بھی جانتی تھی۔ کیا زندگی یونہی گزر جائے گی۔ اس نے پیٹر کے اوپر کمبل پھیلاتے ہوئے سوچا تھا۔

شزا ملک کی سپر اسٹار ماڈل تھی اور ماڈلنگ کے سلسلے میں ہی وہ لندن گئی تھی۔ جب ایک شو کے دوران ملک منصور سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ملک منصور کو گلیمرس لائف اور گلیمرس لوگ بہت پسند تھے۔ اس سے قبل وہ ایک عدد سنگر اور ایکٹریس کو طلاق دے چکا تھا اور اب شزا سے چوتھی شادی کے موڈ میں تھا۔ شہلا کی طلاق کے بعد اسے قدرے دھچکا سا لگا تھا۔ گو کہ پہلے وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ کیونکہ واپسی تک اس نے شفق اور آفاق کو بہت افسردہ اور تنہا دیکھا۔ شفق اپنی عمر سے زیادہ سمجھنا اور سوچنا شروع ہو گئی تھی اور آفاق روڈ ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں باپ کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے۔ اسی لیے اس نے شزا کے ساتھ سیریس لائف گزارنے کا سوچا تھا۔ دونوں نے ملک واپس آتے ہی شادی کر لی۔ اخباروں کے خصوصی ایڈیشنز میں ان کی تصویریں شائع ہوئیں۔ شہلا نے بھی ایک دن اخبار میں دیکھا اور آہ بھر کر رہ گئی۔ ملک منصور کے چہرے پر جو خوشی اور مسرت کی جھلک تھی وہ جب اس کے ساتھ منسوب رہی کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی تھی۔

شادی کے بعد دونوں سوئٹزر لینڈ چلے گئے۔ بچے گھر میں بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ گاؤں سے بوڑھی دادی اور ایک پرانا وفادار نوکر اکرم آ گئے تھے۔ دادی کی قوتِ سماعت بہت زیادہ متاثر ہو چکی تھی۔ چیخ چیخ کر کوئی بھی بات سمجھانا پڑتی تھی۔ بچے دادی سے اسی لیے بات ہی نہ کرتے تھے۔ البتہ اکرم گھر...... کا بہت خیال رکھتا تھا۔ بچے ایک دم شدید تنہائی کا شکار ہو گئے تھے۔ کب تک کمپیوٹر، موویز اور فرینڈز سے جی بہلاتے۔ خود ہی آپس میں باتیں کرتے پھر چپ کر جاتے یا پھر رونے لگتے۔ شفق، فلک کا بہت خیال رکھتی۔ اس کے لیے آیا رکھی ہوئی تھی۔ جو سارا دن اس کے پاس رہتی اور رات کو اسے سلا کر چلی جاتی۔ وہ شفق کے پاس ہی سوتی تھی۔

فلک سو رہی تھی اور شفق اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ کر ہوم ورک کر رہی تھی کہ وہ ایک دم روتی ہوئی اٹھ گئی۔ وہ مما...... مما پکار رہی تھی۔ شفق نے اسے گود میں لیا مگر وہ اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

''چپ کرو، کیوں شور کر رہی ہو۔ ہماری کوئی مما نہیں۔ وہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔'' شفق نے اسے غصے سے ڈانٹا، آفاق ان کی آوازیں سن کر اندر آ گیا۔

''کیا ہوا، کیوں شور کر رہی ہو؟''

''مما کے پاس جانے کی ضد کر رہی ہے۔'' شفق بے بسی سے بولی۔

''اس کو بتاؤ کہ نہ ہماری مما ہیں نہ پاپا۔''

''بھائی تو پھر کون ہے ہمارا؟'' شفق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کوئی بھی نہیں۔ دیکھو اس گھر میں کون ہے ہمارا...... نہ مما...... نہ پاپا۔ شفق کیا گھر ایسے ہوتے ہیں۔ جہاں نہ مما ہیں نہ پاپا۔ صرف دادی، نوکر اور بچے ہیں۔ شفق جب میں بڑا ہوں گا نا تو ان کو......'' غصے سے ایک دم اس کے نتھنے پھولنے لگے۔

''تو کیا کرو گے؟''

''سب کو شوٹ کر دوں گا۔'' وہ غصے سے بولتا ہوا باہر نکل گیا۔

فلک رو رہی تھی اور وہ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیلف سے اپنے سارے کھلونے نکال کر اس کے سامنے رکھے مگر وہ سب کو اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھی۔ صرف مما...... مما کی رٹ لگا رکھی تھی۔

''اچھا چلو، دادی امی کے پاس چلتے ہیں۔'' وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئی اور دادی

کی گود میں بٹھا دیا۔ وہ نہیں...... نہیں کی ضد کر رہی تھی۔ دادی کی ہڈیاں اور نحیف و نزار جسم اسے چبھنے لگا۔ دادی نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ وہ مضطرب تھی۔ محبّت بھرا کوئی لمس چاہتی تھی۔ دادی کے پیار کرنے پر سمٹ سی گئی اور تھوڑی دیر بعد سو گئی۔ شفق ان کے پاس بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھی۔ جب رات گئے ملک منصور کا فون آیا تو وہ جھوم اٹھی۔

''آفاق، جلدی سے آؤ۔ پاپا کا فون ہے۔'' وہ خوشی سے چلائی۔

آفاق اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔

''آفاق بات کرو پاپا سے......'' اس نے بات کرنے کے بعد فون اسے پکڑانا چاہا۔

''مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔''

''آفاق بدتمیزی مت کرو۔'' شفق بڑی بہن ہونے کے ناتے اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

''میں کوئی بدتمیزی نہیں کر رہا۔ مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''پاپا آفاق آپ سے ناراض ہے۔ اس لیے باہر چلا گیا ہے۔'' اس نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔

''آفاق تم اتنے غصّے میں کیوں آ جاتے ہو۔ تم کچھ بھی نہیں سمجھتے۔''

''کچھ مت سمجھاؤ۔'' وہ غصّے سے بولا۔

''تم پاپا سے کیوں ناراض ہو؟''

''بہت سی باتیں ہیں۔''

''مثلاً......؟''

وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شفق نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اس کے ساتھ لگ کر سسکنے لگا ''شفق آئی ہیٹ پاپا۔ آئی مس مما...... آئی لو مما...... بٹ آئی ہیٹ ہر......'' وہ مسلسل بول رہا تھا اور شفق بھی اس کی باتیں سن کر رو رہی تھی۔

......✡......

منصور اور شزا ایک پہاڑی پر بنے خوبصورت ریسٹورنٹ میں آبشار کے کنارے بیٹھے سوفٹ ڈرنک پی رہے تھے۔ حد نگاہ خوبصورت مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ سبھی کچھ تو تھا۔ نیلگوں آسماں، سرسبز اونچے پہاڑ، خوبصورت فضا جس میں مہک ہی مہک تھی اور اس کے دامن میں خوبصورت...... محبّت بھرے وجود اِدھر اُدھر بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شزا کچھ خاموش

سی بیٹھی تھی۔

''منصور آپ کو آپ کی بیوی چھوڑ گئی۔ آپ کو اس کا افسوس نہیں۔'' اچانک شزا نے اس سے پوچھا۔

''نہیں!'' وہ قدرے بے پروائی سے بولا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ کبھی میرے لیے اہم نہ تھی۔ وہ کبھی بھی میری ذات کا حصّہ نہ بن سکی۔ میری سوچوں پر حاوی نہ ہو سکی اور میرے وجود کو اپنے سحر اور حصار میں نہ لے سکی۔''

''مگر وہ تھی تو بہت خوبصورت۔''

''ہاں...... مگر اس خوبصورتی میں نہ ادا تھی، نہ دل فریبی وہ دل رجھانے کے فن سے نا آشنا تھی۔ وہ صرف ایک زندہ لاش تھی۔ جس میں زندگی تھی مگر نہ حرارت تھی، نہ خوشبو...... اور نہ ہی کسی قسم کی تشفی۔''

''منصور جب ایک عورت مرد کو دھتکار دے۔ اسے یوں چھوڑ جائے۔ کسی اور کے لیے...... تو کیا یہ مرد کے منہ پر طمانچہ نہیں؟'' شزا نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

منصور نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تلملا کر جگہ بدلی۔ اس نے اس بات پر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ کیونکہ اس نے کبھی اس کو اہمیّت ہی نہ دی تھی۔ شزا کی بات کسی نشتر کی طرح اس کے دل پر لگی۔ وہ جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ شزا کی بات پر اندر ہی اندر تلملاتا رہا۔

''منصور...... مجھ سے قبل آپ کی زندگی میں کتنی عورتیں آئی ہیں؟''

''شزا! تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''بتائیں نا۔'' وہ بضد تھی۔

''اتنا اچھا خوشگوار ماحول، ہر طرف حسن ہے۔ خوبصورتی ہے۔ محبّت ہے اور تم کیسی فضول باتیں لے بیٹھی ہو۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''یونہی پوچھنے میں حرج ہی کیا ہے؟''

''بہت سی...... مگر اب تو کوئی نہیں۔ اب تو صرف تم ہو۔''

''اور میرے بعد......؟'' وہ اندر کے خوف سے مجبور ہو کر بول پڑی۔

''پلیز اس ٹاپک کو بند کرو۔''

''اچھا تو شہلا کے ساتھ آپ کے کیا اختلافات تھے؟''

''شزا تمھیں کیا ہو گیا ہے، کیوں وکیلوں کی طرح جرح کر رہی ہو؟''

''یونہی پوچھ رہی ہوں۔ اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو رہنے دیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ جب مجھے ملی تو اس کا ماضی داغدار تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کا اپنے کزن سے افیئر تھا۔''

''لیکن ماضی تو آپ کا بھی اچھا نہیں تھا اور شاید حال بھی...... مگر وہ تو آپ کے وجود کو برداشت کرتی رہی۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

''شزا پلیز! اگر تم ان فضول باتوں کو نہیں چھوڑ سکتی تو میں جا رہا ہوں۔''

''اچھا اب نہیں پوچھتی۔'' شزا خاموشی سے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی اور پھر دونوں خوبصورت مناظر کی باتیں کرنے لگے۔ محبّت کی خوبصورتی کی اور آنے والی زندگی کی۔ ایسی زندگی جس میں صرف لطف ہی لطف تھا۔ خوشی ہی خوشی۔ شزا تھوڑی دیر بعد اس کی باتوں پر قہقہے لگا رہی تھی اور وہ ان قہقہوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

منصور نے اسے جی بھر کر شاپنگ کروائی اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ جس چیز پر ہاتھ رکھتی وہی خرید کر دیتا۔ وہ جو چاہتی ویسا ہی کرتا۔ اسے کسی بھی لمحے ملک منصور میں ایسی کوئی بات نظر نہ آئی جو اس کے اندر چھپے خدشات کو توانا کرتی۔

''شزا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمھارے بعد کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔'' ایک دن ملک منصور نے مسکراتے ہوئے کہا تو جیسے اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں، مجھے تم سے وہ سب کچھ مل گیا ہے۔ جس کی میرے دل کو تمنا تھی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''تھینکس فار کمپلیمنٹ۔'' وہ یوں فاتحانہ مسکرائی جیسے ساری دنیا اس نے فتح کر لی ہو اور اب پوری دنیا پر اس کا ہی راج ہو۔

شہلا کو جب سے جاب ملی تھی وہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔ صبح اسکول جاتی اور رات کو دیر تک پیٹر کی شاپ پر اس کی مدد کرتی۔ زندگی مشین بنتی جا رہی تھی مگر وہ خوش تھی۔ اپنے

آپ کو بھولنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ ماضی کو وہ کڑوی گولی کی طرح نگل چکی تھی مگر کبھی کبھی وہ بے سبب اداس ہو جاتی۔ کبھی کبھی ماضی راتوں کو خواب میں کبھی فلک، شفق اور آفاق کی صورت میں تو کبھی حیدر اور سید صاحب کی صورت میں سامنے آ جاتا تو وہ چونک جاتی اور تڑپنے لگتی۔ ماضی کو پرانی مضبوط عمارتوں کی طرح منہدم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ قدم قدم پر پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ کسی طرح فرار ممکن نہیں۔ زندگی سے ماضی سے، آغاز سے اور انجام سے۔

''ہیلو نینسی......'' ایک خوبصورت، دبلی پتلی اور نیلی آنکھوں والی لڑکی کو پیٹر دیکھ کر مسکرایا۔

''ہیلو پیٹر، بہت ہینڈسم لگ رہے ہو۔''

''اوہ یو نینسی......'' وہ شرما کر بولا۔ وہ کتابیں شیلف میں لگا رہی تھی۔ پیٹر کی آواز میں خوشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔

''میٹ یو مائی وائف شیئل۔ شہلا......'' پیٹر نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کا تعارف کروایا۔

''ہاؤ نائس، ایسٹرن ویمن!'' نینسی حیرت سے بولی۔

''اوہ یس......تم بتاؤ جان کیسا ہے؟''

''اس کو میں نے چھوڑ دیا۔ بہت ٹارچر کرتا تھا۔ اب میں ٹونی کے ساتھ رہتی ہوں۔''

''کون ٹونی؟''

''مائی باس۔''

''آئی سی......کوئی کتاب پسند ہے تو لے لو!'' پیٹر نے خوش دلی سے اسے آفر کی۔

٭٭٭

نینسی کو دیکھ کر شہلا سوچ میں پڑ گئی۔ پیٹر کیسا پیچیدہ انسان ہے۔ یا تو وہ بہت بے وقوف تھا یا بہت ہوشیار۔ ایسی محبت سے اس سے پیش آ رہا تھا، کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی ایکس وائف تھی۔ اگر ایسی محبت اور عزت وہ ان کو اپنی میریڈ لائف میں دیتا تھا تو پھر دونوں نے اسے کیوں چھوڑا یا اس نے کیوں چھوڑا؟ کیا یہ یہاں کے لوگوں کا المیہ تھا؟ یا پھر یہی زندگی تھی۔ اگر یہی زندگی تھی تو پھر بہت تلخ تھی۔ وہ نینسی کی طرف دیکھ کر سوچتی رہی۔ نینسی نے ایک کتاب پسند کی تھی اور پیٹر نے خود اسے اچھی طرح پیک کر کے دی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''شیئل کیا سوچ رہی ہو؟'' پیٹر نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر پوچھا۔

'' کچھ نہیں...... کچھ نہیں۔''

''اگر تم میرے بارے میں سوچ رہی ہو تو پوچھ لو۔''

''ہاں، میں سوچ رہی ہوں کہ تم سوسن اور نینسی سے اتنی محبت سے ملتے ہو تو پھر انھیں کیوں چھوڑا؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''بس اتنی سی بات......سوسن ڈرنک بہت کرتی تھی اور اکثر نائٹس گھر کے باہر ہی رہتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ غصّے سے ڈانٹا تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور نینسی جان کے ساتھ بہت فرینک تھی۔ میری غیر موجودگی میں جان اکثر میرے بیڈ روم میں ہوتا۔ نینسی کو میں نے سمجھنا چاہا تو کہنے لگی تمھیں چھوڑ سکتی ہوں جان کو نہیں...... اور پھر ایک دن بغیر بتائے وہ نہ جانے جان کے ساتھ کہاں چلی گئی...... آج تین سال بعد ملی ہے۔''

''تو کیا تم ان سے محبّت نہیں کرتے تھے کہ وہ اتنی آسانی سے تمھیں چھوڑ کر چلی گئیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''آئی ڈونٹ نو کہ تم محبّت کس کو کہتے ہو؟...... رومانس کو یا سیکس کو؟ یا پھر کسی اور شے کو۔ اس معاملے میں تم مشرقی عورتیں بہت کمیٹڈ ہوتی ہو۔ تم لوگوں کے ساتھ مردوں کا رویہ انتہائی ناروا ہوتا ہے مگر تم لوگ پھر بھی نہیں بولتے اور ساری زندگی یونہی گزار دیتے ہو۔ کبھی فیملی کی خاطر، کبھی بچوں اور کبھی اپنے والدین کی خاطر...... میری مدر بھی یہی بتاتی تھیں۔'' وہ خاموش ہو گیا اور اسے یوں لگا جیسے پیٹر نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہو۔ اس نے تو کسی کا لحاظ کیے بغیر، کسی سے محبّت کیے بغیر دونوں کو چھوڑ دیا۔ فیملی کو بھی، بچوں کو بھی اور سید صاحب کو بھی۔ وہ ایسٹرن ویمن کی کٹیگری سے باہر ہو گئی تھی مگر اب ویسٹرن سوسائٹی کا حصّہ بننے سے ہچکچا رہی تھی۔

''کیا بات ہے شیئل! تم کن سوچوں میں ڈوب جاتی ہو؟'' پیٹر نے اسے متفکر دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں، سوچ رہی ہوں کہ کبھی تم ان کی طرح مجھے بھی تو تنہا نہیں چھوڑ دو گے؟''

''بس...... اتنی سی بات...... ڈیئر، اگر تم آج جانا چاہتی ہو تو جا سکتی ہو، میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ میں تمھیں کیوں روکوں گا، یو آر فری......!'' اس نے صاف گوئی سے کہا تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے قطعی توقع نہ تھی کہ وہ اسے یوں جواب

دے گا۔ اتنی زبردست نفی۔ اس کی تو ذرہ بھر بھی اہمیّت نہ تھی۔ جیسے اچانک دودھ میں گرے بال کو کوئی باہر نکال پھینکے۔ ایسے ہی پیٹر اسے ٹریٹ کر رہا تھا۔ کیا ہر عورت، مرد کی زندگی میں صرف اتنی سی اہمیّت رکھتی ہے؟ اتنی سی شناسائی، جسے اتنا مضبوط رشتہ سمجھتی ہے، جس کے لیے اپنی ہستی داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتی ہے۔ مرد کے نزدیک تو کچھ بھی نہیں۔ کیا ہر عورت ایسی تردید برداشت کر سکتی ہے یا پھر وہی...... منصور...... پیٹر...... حیدر...... سید صاحب...... ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی تو وہ اہم نہ تھی۔ ہر کسی نے اسے اتنی آسانی سے نکال دیا تھا اور اب جس کے لیے اس نے اپنی اولاد چھوڑی تھی، وہ سب سے زیادہ ستمگر نکلا تھا۔ خدا ایسی دھتکار کسی کے مقدر میں نہ لکھے۔ پہلے دن ہی وہ کسی کی گود سے نکالی گئی تھی پھر کسی کے در سے...... دل سے اور اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ کبھی وجہ جانے بغیر تو کبھی وجہ بتائے بغیر۔

''شیبل! تم میری بات سن کر سوچ میں کیوں گم ہو گئیں؟ ہر شخص اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ہارٹ ہے، باڈی ہے، مائنڈ ہے۔ جو چاہے وہ کرے۔ میں سوشل بیریئرز کا قائل نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

مشرق ومغرب کا یہ عجیب تضاد تھا۔ مشرقی مرد عورت پر چلاتا ہے، گھر سے قدم مت نکالنا ورنہ تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا اور مغربی مرد کہتا ہے...... جاؤ، تم ابھی جاؤ۔ تم آزاد ہو۔ جب مرد نکالتا ہے تو مشرقی عورت کہتی ہے خدا کے لیے مجھے گھر سے مت نکالو۔ میں تمھاری داسی ہوں، جنم جنم سے تمھاری باندی۔ میں تو عہد کر کے نکلی تھی کہ تمھارے گھر سے میرا جنازہ نکلے گا۔ تم نکال دو گے تو میں کہاں جاؤں گی؟ مغربی مرد جب مغربی عورت کو روکنا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے، مجھے مت روکنا، میں جا رہی ہوں۔ میں اپنے قول وفعل میں آزاد ہوں۔ اتنا گہرا تضاد......! وہ کیا چاہتی تھی، وہ تو مغربی عورت کی طرح اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئی تھی اور اب مشرقی عورت کی طرح اندر سے شدید آرزو تھی کہ پیٹر اس کے وسوسوں کو رد کر دے اور کہے کہ میں تو تمھیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں تمھاری ڈھال بنوں گا۔ اس کی ڈیمانڈز یہ تو نہیں تھیں...... نہ مشرقی عورت والی، نہ مغربی عورت والی۔ نہ خواہشوں کے عمیق جزیرے چاہیے تھے نہ محبت کے بہتے دھارے میں سیراب ہونے کی تمنا۔ اس کی تو آرزو ہی اور تھی......

وہ تو صرف اپنے وجود اپنی ذات کی شناسائی اور شناخت کے سفر میں سرگرداں تھی۔ اس کا تعلق نہ مشرق سے تھا نہ مغرب سے۔ وہ تو انسانوں کے ہجوم میں اپنا وجود اور شناخت ڈھونڈنے آئی تھی۔ شاید اب یہاں بھی کچھ ممکن نہیں تھا۔ اس نے سرد آہ بھری اور اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول

کر اندر چلی گئی۔ باہر شدید دھند تھی۔

موسم سرما کی شدید بارشوں نے ہر طرف طوفان برپا کر رکھا تھا۔ کئی دیہات زیر آب آ گئے تھے۔ دسمبر کی ان یخ، سنسان راتوں میں بچوں کو شدید خوف محسوس ہوتا۔ منصور اور شزا کو گئے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ شاید وہ ورلڈ ٹور پر چلے گئے تھے۔ بس فون ہر روز آتا تھا کہ جلد آ رہے ہیں۔ ہر دن، ہر شام انتظار میں کٹ جاتی۔ بچے جھنجلا سے گئے تھے۔ بوڑھی دادی سرِ شام ہی سو جاتیں۔ بس اکرم ان کا حال پوچھتا اور خیال رکھتا۔ نوکر کام کر کے چلے جاتے۔ اکرم کی بیٹی رانی کھانا پکا کر چلی جاتی پھر وہ سرونٹ کوارٹر سے باہر نہ نکلتی۔ اکرم کوٹھی کے اوپر والی منزل پر ایک کمرے میں رہتا تھا۔ ایسی ہی ایک یخ بستہ رات کو فلک کو شدید بخار ہو گیا، اسے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ دادی سو رہی تھیں۔ شفق بار بار اس کے کپڑے بدلتی اور وہ بار بار قے کرتی۔ وہ تنگ آ گئی تھی۔

''آفاق! کیا مصیبت ہے...... مجھ سے نہیں یہ سنبھالی جاتی۔'' شفق غصے سے بولی۔

''اچھا، میں اکرم چاچا کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے ہیں۔'' آفاق جلدی سے انھیں بلا لایا۔

''کیا بات ہے چھوٹی بی بی! کیا ہوا فلک بی بی کو؟'' اکرم فلک کو پکڑتے ہوئے بولا۔

''چاچا، اسے بہت بخار ہے۔ کپڑے خراب کر رہی ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''اچھا، میں ڈرائیور کو بلاتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔ فلک بی بی کو میں اٹھا لیتا ہوں۔''

اکرم گاڑی میں آگے بیٹھ گیا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ بارش تھوڑی دیر کے لیے تھمی تھی مگر باہر شدید ٹھنڈ تھی۔ کہیں اکا دکا کلینک کھلے تھے۔ اکرم اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے اسے دو تین انجکشنز لگائے اور دوائیں بھی دیں۔ جیسے ہی وہ گھر لوٹے تو لائٹ چلی گئی۔ فلک نیند میں بھی بار بار ڈر رہی تھی۔ اکرم اسے بیڈ پر لٹا کر جانے لگا تو شفق نے اسے روک لیا۔

''اکرم چاچا! آپ مت جاؤ۔ باہر بہت اندھیرا ہے اور ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔'' شفق نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

''اچھا بی بی! میں ادھر ہی رک جاتا ہوں۔'' وہ نیچے کارپٹ پر لیٹ گیا۔ ایک دم

زور سے بجلی کڑکی تو شفق فلک کو اٹھا کر اکرم کے ساتھ لپٹ گئی۔ آفاق دادی کے ساتھ سو رہا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو اکرم کے ایک طرف شفق تھی اور دوسری طرف فلک۔ اور وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ شفق کی آنکھوں سے شدید احساسِ محرومی اور ایک عجیب سے خوف، دکھ سے آنسو نکلنے لگے۔ اگر آج مما، پاپا ہوتے تو کیا اکرم یہاں ہوتا؟ اور دوسرے ہی لمحے اسے ماں باپ سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ کیا مما، پاپا ایسے ہوتے ہیں۔ فلک بیمار ہے اور ہم کتنے اکیلے ہیں...... اور وہ دونوں ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اسے ان سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔ وہ آہستہ سے فلک کو اٹھا کر بیڈ پر لے آئی۔ اسے اندر ہی اندر کوئی چیز بہت بری لگ رہی تھی۔

''اکرم چاچا، اب آپ جاؤ۔'' وہ قدرے بے رخی سے بولی۔

''اوہ، میں ادھر ہی سو گیا...... اب فلک بی بی کیسی ہے؟ اسے دوائیں دیں، ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

وہ اسے بار بار دوائیں دیتی رہی مگر اس کا بخار کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ سارا دن اسی طرح گزر گیا۔ رات پھر گہری ہونے لگی تھی اور فلک کو بخار پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ وہ اور آفاق اس کے پاس بیٹھے تھے۔ دادی کی بھی طبیعت خراب تھی۔ وہ بھی دوائیں کھا کر لیٹی تھیں۔

''شفق! اکرم چاچا کو بلا لاؤں؟'' آفاق نے رائے دی۔

''نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔'' اس کو رات کا اکرم پر بہت غصہ تھا۔

''لیکن فلک اب آنکھیں بھی نہیں کھول رہی۔'' آفاق پریشان ہو کر بولا۔

''تو اکرم چاچا کیا کر لے گا؟'' اس کے اندر نہ جانے کیا چیز کھٹک رہی تھی کہ اب وہ اکرم کے نام سے ہی نفرت کرنے لگی تھی اور اس کو قطعی نہیں بلانا چاہتی تھی۔

''تو پھر کیا کریں؟'' آفاق پریشانی سے بولا۔

''میں پھر سیرپ دیتی ہوں۔'' اس نے اٹھ کر زبردستی اسے سیرپ کی آدھی شیشی پلا دی۔

''شفق! اتنا زیادہ سیرپ پلا دیا۔'' آفاق نے حیرت سے پوچھا۔

''تو اور کیا کروں...... اسی لیے زیادہ پلایا ہے کہ جلد آرام آئے گا۔'' اس کی حالت آہستہ آہستہ بگڑ رہی تھی۔ کبھی وہ آنکھیں بند کرتی، کبھی کھولتی ایک دم وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

''شکر ہے سیرپ سے اسے نیند تو آ گئی۔'' شفق نے کمبل اس کے گرد اچھی طرح لپیٹ دیا۔ آفاق بھی اونگھنے لگا۔ وہ بھی سارے دن کی تھکی تھی۔ وہ بھی فلک کے ساتھ لگ کر سو گئی۔

صبح دادی کی آنکھ کھلی تو وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے کمرے میں آئیں۔ تینوں بچے سو رہے تھے۔ دادی نے فلک کے جسم پر ہاتھ رکھا تو چونک گئیں۔ وہ سرد، اکڑا پڑا تھا۔ انھوں نے سانسیں چیک کیں تو وہ بھی نہیں آ رہی تھیں۔ انھوں نے گھبرا کر شفق اور آفاق کو جھنجوڑنا شروع کر دیا۔

''اٹھو...... دیکھو، یہ مرگئی ہے۔'' دادی زور زور سے چیخنے لگیں۔

''کون......؟'' شفق ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''ادھر دیکھو......'' دادی نے فلک کو جھنجوڑا مگر وہ تو گہری نیند سو رہی تھی۔

''میں نے تمھیں کہا تھا نا کہ اکرم چاچا کو بلا لاتا ہوں۔ تم ہی نہیں مانیں اور اب فلک مرگئی ہے۔'' آفاق زور زور سے رونے لگا۔ دادی بھی رو رہی تھیں اکرم ان کی آوازیں سن کر نیچے بھاگتا ہوا آیا۔

''اکرم چاچا! پلیز پاپا کو بلاؤ...... پلیز، جلدی کرو۔'' شفق روتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... ہاں، مجھے ان کا نمبر دو۔'' اکرم جلدی سے بولا۔

''اکرم چاچا...... مما کو بھی فون کر دو۔'' آفاق آہستہ سے بولا۔

اکرم باہر نکل گیا منصور کے جتنے کونٹیکٹ نمبرز تھے، اس نے ملانے کی کوشش کی۔ مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ شہلا کا تو کوئی نمبر ہی نہ تھا جس پر وہ رابطہ کرتا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ بچے بے تابی سے مما پاپا کو بلا رہے تھے۔ ہر آہٹ پر باہر دوڑ کر جاتے۔ اکرم شدید شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کیا کرے، کسے بلائے؟

سید صاحب فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو خاندانی روایات کے مطابق حیدر سب سے پہلے ان کو سلام کرنے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ''حیدر! بہت دن ہوئے منصور اور شہلا کی کوئی خبر نہیں آئی۔ سب خیریت تو ہے نا۔ ان لوگوں کی طرف سے میں بہت پریشان رہتا ہوں۔'' سید صاحب نے متفکرانہ انداز میں پوچھا۔ حیدر صبح سویرے کوئی ایسی بات بتا کر ان کو پریشان نہیں کرنا چاہ رہا تھا مگر اب خود سید صاحب پوچھ رہے تھے تو اسے بتانا ہی پڑا۔

''تایا ابا! منصور نے کسی ماڈل سے شادی کر لی ہے اور اب اپنی بیوی کے ساتھ ہے۔''

''بدبخت......!'' سید صاحب ایک دم غصّے سے بولے۔ ان کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا ''اور شہلا کہاں ہے؟''

''وہ انگلینڈ میں ہے۔''

''کیا بچے بھی اس کے پاس ہیں؟''

''نہیں...... وہ اکیلی......''

''وہ اکیلی کس کے پاس ہے؟''

''اس نے منصور سے طلاق لے لی ہے اور اب......؟'' حیدر خاموش ہو گیا۔

''اب کیا......؟'' وہ چونکے۔

''اس نے کسی انگریز سے شادی کر لی ہے۔''

''کیا......؟'' سید صاحب جلال میں آ گئے۔ جہاں کھڑے تھے، وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا جسم غصّے سے کانپ رہا تھا اور وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے۔ حیدر اندازہ کر رہا تھا کہ وہ کس قدر اذیت میں تھے۔

''بدبخت...... نامراد...... بدذات......'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے۔

''تایا ابا! آپ بیٹھ جائیں...... آپ کا بی پی ہائی ہو رہا ہے۔''

''حیدر! گاڑی نکالو، آج رات میں نے خواب میں اسکے بچوں کو بہت اذیت میں دیکھا ہے۔ نہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ میں ان کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا خیر کرے۔'' وہ پریشانی کے عالم میں کمرے کا چکر لگا رہے تھے۔

حیدر گاڑی نکالنے گیراج کی طرف جا رہا تھا کہ فون بج اٹھا۔

''کون...... کب...... کیسے...... اوہ! ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ سارا راستہ وہ خاموش رہا۔ سید صاحب اس کے ساتھ بیٹھے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔

''حیدر! کیا بات ہے...... تم کچھ پریشان لگ رہے ہو...... ورنہ گاڑی چلاتے ہوئے تم ضرور کوئی نہ کوئی بات کرتے ہو، آج خاموش کیوں ہو؟''

''تایا ابا! آپ نے رات کو جو خواب دیکھا تھا، وہ پورا ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' وہ ایک دم چونکے۔

''اکرم کا فون آیا تھا۔ منصور کی چھوٹی بیٹی فلک رات کو فوت ہو گئی ہے۔''

''کیا...... اُف میرے خدایا......! یہ لوگ کتنے ظالم ہیں!'' انھوں نے سر سیٹ کے

ساتھ لگا دیا۔ حیدر کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔

''حیدر! تم ہمیں گنہگار نہ سمجھنا۔ ہم مجبور تھے...... ہم جانتے ہیں تم بھی اپنی زندگی سے خوش نہیں ہو۔ تمہاری بیوی تمہیں کچھ اہمیت نہیں دیتی۔ اس کی دولت نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ نہ تم خوش ہو اور نہ ہی شہلا۔ نہ جانے اس نے کیوں اس انگریز سے شادی کر لی۔ ورنہ وہ ایسی نہ تھی۔ وہ ہمارا خون نہیں...... مگر پھر بھی ایک رشتہ تو رہا ہے...... اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اچھی بیٹی تھی، معلوم نہیں قدرت بھی کیسے کیسے آزماتی ہے۔ تم اور شہلا، مجھے قطعی اس رشتے پر اعتراض نہ تھا۔ اگر تم سادات میں سے نہ ہوتے، ہمیں اپنی جانوں سے زیادہ اپنے آبا کی ناموس کی پروا ہے۔ میرا دل اندر ہی اندر کٹتا رہتا ہے۔''

''تایا ابا! آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ میں نے اس جذبے کو اپنے اندر سے ختم کر دیا ہے۔ زندگی کے دن پورے ہی تو کرنے ہیں۔'' حیدر کے لہجے میں بلا کی شکستگی اور دکھ تھا۔

''خدا تمہیں اس کا اجر دے......'' سید صاحب نے رقت بھرے لہجے میں اپنا لرزاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔

میت لان میں تھی اور گھر کے چند ملازموں کے سوا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دادی اس کے سرہانے بیٹھی آہیں بھر رہی تھیں۔ شفق اور آفاق سہمے سہمے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ جیسے ہی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی، حیدر اور سید صاحب باہر نکلے تو بچے چیختے ہوئے ان کے ساتھ چمٹ گئے۔ وہ اس شدت سے رو رہے تھے کہ در و دیوار کانپ رہے تھے۔ سید صاحب اور حیدر ان کو گود میں اٹھا کر دلاسا دے رہے تھے۔ سید صاحب اور حیدر نے اس کی تدفین کا بندوبست کیا اور ان کا جگر گوشہ لحد میں اتار آئے جو دنیا میں اپنے اپنے وجود کے احساس اور سحر میں مبتلا تھے۔

''حیدر! ہم بچوں کو ساتھ گاؤں لے جاتے ہیں......'' سید صاحب نے رائے دی۔

''نہیں نانا ابا...... پھر دادی اماں گھر میں اکیلی ہوں گی۔ وہ کس کے پاس رہیں گی؟ اگر وہ بھی مر گئیں تو......'' شفق نے ایک دم کہا تو سید صاحب چونک گئے۔

''ٹھیک ہے...... پھر میں ہی ادھر دو تین دن تک رک جاتا ہوں...... منصور کو خود اطلاع دو کہ وہ جلدی پہنچے۔ اب میں بچوں کو یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے تایا ابا! میں شام کو چکر لگا لیا کروں گا۔''

''ٹھیک ہے...... اور بہنوں کو بھی اطلاع دینا۔ بچوں کو ان کی ہمدردی کی بھی ضرورت ہے...... اور ہو سکے تو طاہرہ کو بھی لے آنا۔''

''جی اچھا......!'' وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

''شہلا! تم کہاں ہو؟ کس کا بدلہ کس سے لیا، تم تو بہت سچّی تھی۔ پھر جھوٹ کو کیسے قبول کیا۔ تم سید خاندان کی ساری روایات بھول گئیں۔ تم نے پاکیزہ محبّت کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ تقدس اور پاکیزگی کے مقابلے میں غلاظت اور گندگی کو قبول کیا۔ تم تو کہتی تھیں، حیدر! میں نے زندگی میں صرف تم سے محبّت کی ہے۔ نہ اس سے پہلے کسی سے اور نہ اس کے بعد کسی اور سے کرسکوں گی تو پھر تم نے دیارِ غیر میں ایک اجنبی انگریز کو اپنے لیے منتخب کیوں کیا؟ کیا واقعی تم اس کی محبت میں اتنی دیوانی ہوگئی تھیں کہ اپنے بچوں کو بھی چھوڑ دیا۔ بچے تو تمھارے اپنے تھے۔ تم نے اپنے آپ کو اس حد تک گرا دیا، تم اتنی سنگ دل کیسے ہوسکتی ہو۔ تم نے حیدر کی ذات کی بھی نفی کردی اور اپنی ذات کا بھی بھرم کھو دیا۔ تم نے بیٹی کو بھی مار دیا۔ اتنے سال خاموشی سے اذیتیں سہتے سہتے تم نے بالآخر ایسا فیصلہ کیوں کیا؟ کاش......تم مجھے کبھی ملو تو ضرور تم سے پوچھوں کہ تمہاری ساری وفائیں کیوں ایک دم بدل گئیں؟ محبّت کرنے والے تو فنا ہو جاتے ہیں مگر یوں جفا تو نہیں کرتے۔ مجھے تو اب کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ میں تو آنکھیں بند کر کے تمھیں یاد کرتا تھا کہ طاہرہ نہ سہی، تم تو مجھ سے سچّی محبت کرتی ہو۔ تم نے میری روح کو اپنے حصار میں قید کر رکھا تھا۔ میں تو اب بھی تمھارے سحر میں مبتلا ہوں۔ طاہرہ کے لیے تو صرف جسم ہوں اور تمھارے لیے روح...... میرا دل و دماغ تو صرف تمہارا تھا۔ میری سوچوں پر تم حاوی تھی۔ تم نے مجھ سے بھی سب کچھ چھین لیا اور بچوں سے بھی۔ آج تمھارے بچے کیسے بلک رہے تھے......تم بہت سنگ دل ہو۔ تمھارے وجود کے حصّے تو یہاں ہیں اور تم کہاں سرگرداں ہو؟ تم ایسی نہیں ہوسکتی...... میں کیسے تمھارے کٹھور پن پر یقین کرلوں......؟''

حیدر اپنے تخیل میں اس سے باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ڈرائیونگ بھی کر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے ساتھ بیٹھی ہو اور وہ اس سے باتیں کر رہا ہو مگر وہ مکمل خاموشی سے سب کچھ سن رہی ہو۔

......✡......

''منصور! آج تو بہت انجوائے کیا ہے۔'' شزا اور منصور نیاگرا فال پر سارا دن انجوائے کر کے لوٹے تھے۔

''ہاں، واقعی......قدرتی مناظر بہت لطف دیتے ہیں۔''

''منصور! اب گھر کب چلیں گے؟''

''کیوں...... تمہارا دل بھر گیا ہے؟ اتنی خوبصورت اور حسین جگہوں پر گھومنے کے باوجود بھی تمھیں گھر کی یاد آ رہی ہے؟'' منصور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، گھر تو گھر ہی ہوتا ہے نا۔ اب تو میں اتنا گھوم چکی ہوں کہ اب کچھ آرام کرنا چاہتی ہوں اور اب میں اپنا گھر سیٹ کرنا چاہتی ہوں۔''

''اگر تم اتنی اداس ہو رہی ہو تو کل ہی چلے چلتے ہیں۔''

''کل نہیں...... چند دنوں تک۔''

''کافی دن ہو گئے ہیں۔ بچوں سے بات نہیں ہوئی۔ ٹھہرو، ذرا فون کرتا ہوں۔'' وہ نمبر ملانے لگا۔ مسلسل بیلز ہو رہی تھیں مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ بہت دیر بعد اکرم نے فون اٹھایا۔

''ہاں اکرم! خیریت تو ہے نا...... بچے کہاں ہیں؟ کیا سید صاحب ادھر...... نہیں...... کیوں...... مائی گاڈ!...... میں پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے اکرم سے بات کر کے فون بند کیا تو آنسو اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

''منصور! خیریت تو ہے ناں، آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ پلیز...... بتائیں، کیا ہوا...... بولیں؟'' شزا مسلسل پوچھ رہی تھی مگر وہ روتا جا رہا تھا۔

''فلک...... فلک مر گئی۔''

''اوہ...... گاڈ! کب...... کیسے......؟''

''میری بچی قبر میں سو رہی ہے اور میں یہاں نیاگرا فال......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گیا۔

''میں ابھی پیکنگ کرتی ہوں۔ آپ سیٹیں کنفرم کروائیں۔ ہم جلدی نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' شزا نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی، وہ نمبر ملانے لگا۔

''منصور! کیا آپ شہلا کو نہیں بتائیں گے، وہ بھی تو ماں ہے۔''

''نہیں، رہنے دو...... اس مردود کو...... یہ اسی ذلیل عورت کی کارستانی ہے۔ میری بچی اسی کی وجہ سے مر گئی۔'' اس کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔ غم اور غصہ بھی۔

......✡......

''شمائل! میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ اداس ہو، کیا بات ہے؟'' پیٹر نے اسے گم صم دیکھ کر پوچھا۔

''پیٹر! مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔ اگر ہمارا کوئی بے بی ہو جائے......'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''اوہ......نو...... نیورایور...... آئی ڈونٹ وانٹ ینگ باسٹرڈز۔''

''کیا مطلب...... جو انسان کی سروائیول کا باعث بنے تم اس سے اکتائے ہوئے ہو؟''

''مجھے کوئی سروائیول نہیں چاہیے۔ جو انسان کی پرسنل لائف کو اسپائل کر کے رکھ دیں وہ کیا سروائیول کا باعث بنیں گے؟ بچے تو ویمن کو ہیلپ کرتے ہیں کہ وہ مین کو ایکسپلائیٹ کرے۔ ایموشنلی اینڈ فنانشلی...... آئی ہیٹ کڈز۔'' وہ اس کی بات سن کر بھڑک اٹھا۔

''تو کیا ساری عمر یونہی......؟''

''کیا فرق پڑتا ہے...... ویسے بھی تو بچے چھوڑ جاتے ہیں نا۔ کون سا آخری عمر میں ساتھ دیتے ہیں۔ میرے فادر نے گرینڈ فادر کو چھوڑ دیا اور وہ اولڈ نرسنگ ہوم میں کب مرا...... کسے معلوم؟ اور میں نے اپنے فادر کو پندرہ سال کی عمر میں چھوڑ دیا تو میرا بے بی تو مجھے دس سال کی عمر میں ہی چھوڑ دے گا تو کیا فائدہ......''

''تو پھر یہ شادی...... یہ مذہبی پابندی کیوں......؟''

''شادی کا بچوں سے کیا تعلق......؟''

''پیٹر...... میں تمہاری بات سمجھنے سے قاصر ہوں...... تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہمارے ہاں شادی تو بچوں کے لیے ہی کی جاتی ہے کیونکہ انھیں ہی تو انسان کی ایوولوشن اور سروائیول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور تم اس حقیقت سے انکار کر رہے ہو۔''

''اسی لیے تم لوگ خوار ہوتے ہو۔ تم لوگوں کے گھر مرغی کے ڈربے ہوتے ہیں جو بچوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تم لوگ اپنی ساری زندگیاں ان کے لیے برباد کر دیتے ہو اور پھر اسی طرح مر جاتے ہو۔ تم تو ان کی زندگیاں گزارتے ہو تمہاری اپنی زندگیاں کہاں گئیں...... آئی ہیٹ سچ ڈیم لائف!''

''پیٹر! آئی ایم گوئینگ ٹو ہیو یور بے بی......!'' وہ آہستہ سے بولی۔

''وہاٹ نان سینس...... جسٹ کل ہم...... کل ہم...... کل ہم۔''

''نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے کیسے اسے ماروں؟ نیور ایور......'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''شیل! اگر تمھیں کڈز اتنے پسند ہیں تو پھر اپنے بچوں کو کیوں چھوڑا؟ تم ان کے

لیے اپنے ہسبینڈ کے پاس رہ سکتی تھیں۔'' پیٹر کی بات نے اس کی روح پر چابک مارا تھا۔اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہو۔

تو کیا سب مرد ایک سے ہی ہوتے ہیں۔اپنے آپ کو بچانے کے لیے دوسرے کی عزت کو کتنی آسانی سے داؤ پر لگا دیتے ہیں۔وہ ہمیشہ اس کو انڈی وجیوئل بینگ کہہ کر اسے اس کے رائٹس کے بارے میں یقین دلاتا رہتا تھا۔اب ایسے ہی ایک انڈی وجیوئل کو مارنے کے درپے تھا۔اب تو اس کی ٹون ہی بدل گئی تھی۔

''تو پھر یہ ریلیشن شپ......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اِٹس میٹر آف ایموشنل اینڈ سیکشوئیل انجوائے منٹ۔'' وہ قدرے ڈھٹائی سے بولا۔

''پیٹر! اس کے علاوہ عورت کی مرد کے لیے کوئی اہمیّت نہیں......؟''

''نہیں......اور ہونی بھی نہیں چاہیے......اس کے علاوہ عورت اور کیا ہو سکتی ہے؟''

''اور وہ جو تقدس......احترام، عقیدت، محبت...... مدر میری کے نام کرتے ہو، وہ سب کیا ہے؟'' اس کی آواز کپکپانے لگی۔

''They're just rituals'' وہ بے باکی سے بولا۔

''بس......اور کوئی رشتہ نہیں؟'' شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔''

''پیٹر! تم اتنے مختلف ہو، جو تم نظر آتے ہو؟''

''شیئل! میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔اگر تم اس وقت بھی کڈز کی باتیں کرتی تب بھی میں یہی کہتا۔میں تو اب بھی یہی کہہ رہا ہوں۔اے ویمن از لانگ اے مین۔ نتھنگ لیس، نتھنگ مور۔اس کو بھی مرد کی طرح جینے کا حق ہے۔زندہ رہے، انجوائے کرے، گھومے پھرے۔وہ آزاد ہے اور اگر وہ یہ چاہتی ہے کہ مرد اس کی پوجا کرے تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔آدمی کیوں ایسا کرے؟ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں۔اگر مرد اپنی ضرورت پوری کرتا ہے تو وہ بھی تو اپنی ہی Desires پوری کر رہی ہوتی ہے تو پھر ایسی کیا خاص بات ہے؟ آدمی اس کو کیوں سر پر بٹھائے۔شیئل! میں بے بی کو اون نہیں کر سکتا، اب میں جا رہا ہوں۔ بہتر ہے تم جلد کوئی فیصلہ کر لو......'' وہ قطعیت سے بولا۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔اسے اس کی قطعیت سے خوف سا آ گیا تھا۔پیٹر کو تو وہ بہت نازک احساسات کا مالک سمجھتی تھی۔وہ بھی ایسا ہی نکلا تھا جیسا مشرقی مرد۔جو کہتا ہے، اب

تمھارے بیٹی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ہوئی تو اس کا بدلہ تم سے لیا جائے گا یا تو تمھیں گھر سے نکال دیا جائے گا یا پھر اسے ختم کر دیا جائے گا۔ اور مغربی مرد کہہ رہا ہے اسے نہ بیٹا چاہیے اور نہ بیٹی۔ اس نے تو عورت کی حیثیت بالکل ہی صفر کر دی ہے۔ وہاں نفی روایتی لبادے میں ہوتی ہے اور یہاں نئے کلچر اور نئی ڈیمانڈز کے مطابق۔ لبادہ کھینچو تو اندر سے دونوں ایک سے ہیں، مشرقی و مغربی، شمالی و جنوبی۔ سب...... گارے کے بت ہیں۔ اندر بھی تو خام ہی ہوں گے۔

اولادِ آدم بھی کبھی بدل سکتی ہے۔ چاہے مرد ہو یا عورت۔ نہ سرشت نہ تقاضے، نہ روایات نہ اصول، نہ بندشیں، نہ رسم و رواج۔ تو وہ کس کو بدلنے نکلی تھی۔ اس نے کیسے مان لیا تھا کہ وہ اپنے وجود کی نئی شناخت حاصل کر پائے گی۔ اس نے جو کچھ کھو جا تھا وہ کچھ نیا تو نہ تھا۔ جو کچھ ماضی میں حاصل کیا تھا اس پر تو اب مہر ثبت ہو گئی تھی۔ جتنا جتنا انسان حقیقت کو کھوجنے نکلتا ہے، اتنا اتنا مایوس ہوتا جاتا ہے۔ نگیٹو فیلنگز اس کو اپنے حصار میں مضبوطی سے جکڑنے لگتی ہیں۔ کیا فرق تھا قدیم پتھر کے انسانوں میں اور آج کے انسانوں میں، جن کے اندر آج بھی اسٹون ایج کے انسانوں جیسے سخت دل ہیں یا پھر آئس ایج کے انسانوں میں۔ کیا آج کے لوگ وحشی درندے نہیں۔ فرق تو کہیں بھی نہیں۔ تو پھر یہ کیسی کھوج تھی، کیسی شناخت تھی۔ وہ کس کو تلاش کرنے نکلی تھی۔

اپنے وجود کو، اس کی نسبت کو...... اب سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ وہ تو اس دکھ کو مٹانے نکلی تھی جو اس کو اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔ اس طمانچے کو مٹانے نکلی تھی کہ وہ کس کی اولاد تھی۔ وہ تو صرف یہ ایکسپلور کرنے نکلی تھی کہ وہ ایک زندہ وجود ہے جسے کسی شناخت کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسے اپنے ماں باپ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کس کے گناہوں کا پھل تھی جو ہرا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ گناہ کا پھل کتنا کڑوا، کسیلا اور بدبودار ہوتا ہے، کاش کوئی اس سے پوچھے۔ وہ اندر سے کتنی سڑاند زدہ تھی۔ کیسی بدبودار...... کوئی اپنانے کو تیار نہ تھا۔ کاش میں مردہ ہی جنم لیتی اور مجھ میں کوئی شعور بیدار نہ ہوا ہوتا۔

''میں کیا کروں؟ میں کیسی دھتکاری ہوئی ہوں۔ پوری کائنات سے دھتکاری ہوئی۔ مشرق سے بھی اور مغرب سے بھی۔'' اسے شفق، آفاق اور فلک شدت سے یاد آنے لگے۔ نہ جانے کیوں اسے فلک یاد آ رہی تھی۔ وہ رخصت ہوتے ہوئے کتنا تڑپ رہی تھی۔ کتنا رو رہی تھی۔ شفق کتنی ناراض تھی اور آفاق کیسے منہ بسور رہا تھا۔ مگر اس نے بھی سب کو دھتکار دیا تھا۔ منصور نے تو بچوں کو اس سے بدظن کر دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کرنے جا رہی ہے۔ ان کو

کیا معلوم کہ وہ زندگی کے کس عذاب سے گزر رہی تھی۔ وہ تو کچھ اور ہی تلاش کرنے نکلی تھی۔ جس کا ملنا اب شاید ناممکن تھا۔ اس نے شدید خسارے کا سودا کیا تھا۔ جن کو آج اس نے دھتکارا تھا، کل وہ ضرور اسے قدموں تلے روندیں گے۔ اس کے پاس تو اپنا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ نہ نام نہاد گھر، نہ شوہر، نہ بچے نہ کوئی پہچان۔ نہ وہ ماں بن سکی تھی، نہ بیوی اور نہ ہی کسی کی دوست۔ تف ہے ایسی زندگی پر جس میں کسی سے کوئی رشتہ نہ بن سکے۔ کوئی تو اپنا ہونا چاہیے۔ کوئی ایک تو بھری کائنات میں ہو، کوئی تو تنہائی کے لمحوں میں سرگوشی کر سکے۔ ''پیٹر، میں تمھارے بچے کو ضرور جنم دوں گی۔ چاہے تم مجھے چھوڑ ہی دو۔'' مستقبل کے لیے کچھ تو ڈپازٹ کروانا چاہیے۔ اس نے اسے چھوڑنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔ پیٹر نے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ بہت سکون سے اسے طلاق دے دی۔ ایک دفعہ بھی نہیں روکا۔ جیسے یہ اس کے لیے نارمل روٹین تھی۔ شادیاں اور طلاقیں۔ نینسی اور سوسن اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئیں۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا اور وہ بیتابی سے کالج کے باہر گاڑی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے بار بار سہیل پر غصہ آ رہا تھا لیکن وہ ایسا بے پروا تو کبھی بھی نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ ٹائم سے پہلے کالج گیٹ پر موجود ہوتا تھا تو پھر آج کیا ہوا تھا؟ وہ ابھی سہیل کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ سہیل نے ایک دم اس کے پاس آ کر بریک لگائی۔ بریک کی تیز آواز نے وہاں موجود سب لوگوں کو چونکا دیا۔ سہیل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے باہر نکل کر گاڑی کا فرنٹ ڈور اس کے لیے کھولا۔ وہ دھڑام سے بیگ سمیت بیٹھ گئی۔

''آئی ایم سوری...... ٹریفک جام تھی اور ملک صاحب کو اچانک میٹنگ میں جانا پڑا اس لیے دیر ہوگئی۔'' سہیل نے وضاحت کی۔

وہ منہ پھیلائے بیٹھی رہی اور کار سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

''چلو اب موڈ ٹھیک کرلو۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔'' وہ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''گاڑی میں کتنی اسمیل ہے۔ اے سی کام نہیں کر رہا۔ کتنا حبس ہے؟'' وہ اکتا کر بولی۔

سہیل نے جلدی سے ائرفریشنر اسپرے کیا۔ جیسمین کی سوندھی سوندھی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ شفق کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ تازگی کا خوبصورت سا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس نے گاگلز میں سے اسے دیکھا۔ سہیل بھی مسکرا رہا تھا۔ اس

نے منہ دوسری طرف کرلیا۔

''ایکسپلائٹ کرنا خوب آتا ہے۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔

''اور جو اپنی خوشی سے ایکسپلائٹ ہوں تو......؟'' وہ بھی فوراً بولا۔ ''شفق! تمھیں معلوم ہے، آج پی سی میں پارٹی ورکرز کی میٹنگ ہے اور تمھارے پاپا پارٹی کے لیڈر منتخب ہو رہے ہیں۔'' سہیل پرجوش لہجے میں بولا۔

''ہونہہ...... جو گھر کو نہ سنبھال سکا، وہ ملک کو کیا سنبھالے گا۔'' اس کے لہجے میں شدید نفرت تھی۔

''تمھیں تو ہر دوسرے بندے سے بس شکوے، شکایتیں ہی ہیں اور کچھ نہیں۔'' سہیل نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیونکہ یہاں ہر شخص بس دوسرے کو ایکسپلائٹ ہی تو کر رہا ہے۔ ہر ایک مفاد پرست اور سیلفش ہے۔ بس اپنی ذات اور انا کی تسکین چاہتا ہے۔ ہر کسی کو بس اپنی ہی خوشیاں عزیز ہیں۔ وہ اپنی خوشیاں چاہتا ہے۔ کسی دوسرے کی کسی کو پروا نہیں۔'' وہ غصے میں بولتی گئی۔

''میرا خیال ہے آج واقعی شدید گرمی ہے اور کچھ تمھارے دماغ کو بھی چڑھ گئی ہے۔ گنے کا ٹھنڈا رس پیو گی؟'' سہیل نے جوس کارنر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

''نہیں!'' وہ منہ پھلا کر بولی۔

''خدا کے لیے یوں ناراض ہونا چھوڑ دو اور پھر کھانے پینے سے کیسی ناراضگی۔ ویسے بھی تم اکیلی جان کس کس کو ٹھیک کرو گی۔ رہنے دو جس حال میں ہے۔ اپنی جان کیوں ہلکان کرتی ہو۔ اب بتاؤ جوس پینا ہے کہ نہیں ورنہ چلیں؟'' سہیل نے آہستہ سے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

''لے آؤ......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''یہ ہوئی نا بات......'' وہ دو گلاس جوس کے لے آیا۔ ٹھنڈا یخ جوس پی کر اس کا موڈ قدرے بہتر ہو گیا۔

''کیا کالج میں آج کسی سے لڑائی ہوئی ہے۔'' سہیل نے اس کا موڈ بہتر دیکھ کر چھیڑنا چاہا۔

''ہاں......تم سے......'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

''مجھ سے تو تم ہر وقت لڑتی رہتی ہو۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔'' سہیل نے بھی

مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

گھر قریب آ رہا تھا۔ اس لیے سہیل نے خود بخود گاڑی روکی اور وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سہیل نے مرر اس پر سیٹ کیا۔ یہی ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ شفق کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر سہیل کو ملک منصور کی ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب بھی وہ اسے شفق کے ساتھ ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔

''سہیل، کیا شام کو فارغ ہو؟'' اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں؟''

''مجھے کہیں جانا ہے۔''

''نہیں...... بتایا تو ہے ملک صاحب کی میٹنگ ہے اور میں وہاں بزی ہوں۔''

''کل چلیں گے...... او کے، خدا حافظ!'' وہ کہہ کر مڑی تھی کہ شنزا جلدی سے باہر نکلی۔ وہ اس سے ٹکرانے ہی لگی تھی۔ شفق نے گھور کر اسے دیکھا اور وہ سوری کہتی ہوئی سہیل کی طرف مڑی۔

''سہیل! مجھے بہت جلدی ہے۔ مجھے میرے آفس ڈراپ کر دو۔'' وہ جلدی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''جی بیگم صاحبہ!'' وہ گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

شفق اندر داخل ہوئی تو ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ مکمل ڈسنے والی خاموشی۔ اتنی وسیع وعریض کوٹھی کے خوبصورت کمروں اور برآمدوں میں ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی اور امپورٹیڈ شے رکھی تھی مگر بہت کچھ سب کے لیے بے معنی تھا۔ سب اپنے آپ کو ایک بے جان شے سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ کب تک سوتی رہی، کب آنکھ کھلی، اسے کچھ خبر نہ تھی۔ گھر میں کون آتا تھا، کون نہیں؟ کسے خبر تھی۔ گھر تھا یا سرائے؟ ہر کوئی ایک دوسرے کی ذات سے بے خبر تھا۔ ہر کوئی اپنی اپنی مرضی کا مالک تھا۔ کوئی کسی کے دکھ سکھ اور کسی بھی معاملے میں دخل نہیں دیتا تھا۔ صرف شفق اور آفاق آپس میں ایک دوسرے کی فیلنگز کبھی کبھی شیئر کرتے تھے۔ فلک کی وفات کے بعد دونوں شنزا سے شدید نفرت کرتے تھے اور ملک منصور سے تو کوئی بھی ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا۔ شنزا نے شادی کے بعد ماڈلنگ چھوڑ کر ایک این جی او جوائن کر رکھی تھی۔ اکثر فارن ڈیلیگیشنز کے ساتھ مصروف رہتی۔ شنزا سے منصور کے دو بچے تھے اور وہ دونوں مری کونونٹ پریزنٹیشن میں پڑھتے

تھے۔ اس لیے وہ بچوں کے جھنجٹ سے مکمل آزاد تھی۔ ملک منصور نے شزا سے جو وعدے، اقرار سوئزرلینڈ میں کیے تھے وہ چند ماہ بعد ہی ہوا ہو گئے۔ ہر چند ماہ بعد نئے اسکینڈلز سننے میں آتے۔ کبھی کسی سیکرٹری کے ساتھ۔ کبھی کسی ماڈل اور ایکٹریس کے ساتھ۔ شزا بھی اب ان باتوں کی عادی ہو گئی تھی۔ وہ بھی اسے کچھ نہ کہتی۔ اس نے بھی اپنے لیے ایسی بہت سی مصروفیات ڈھونڈ لی تھیں۔ آفاق کہاں گم رہتا، کسے خبر تھی۔ وہ شزا کو سخت ناپسند کرتا تھا مگر باپ اس کے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت تھا۔ ملک منصور کروڑوں کی جائیداد کا مالک نامور سیاسی شخصیت اولاد کے معاملے میں بالکل تہی دست تھا۔

پارٹی میٹنگ میں اسے پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ آئندہ انتخابات میں اس کی جیت اور منسٹری کنفرم تھی۔ اس لیے اس کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ رات کو دیر سے آیا تو یہ خبر سنائی۔ آفاق اٹھ کر اندر چلا آیا۔ شفق نے بھی ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ صرف شزا خوش ہوئی کیونکہ اس کی ذات اور مفاد سب کچھ منصور سے وابستہ تھا۔

''تم اٹھ کر کیوں آ گئے؟'' شفق آفاق کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

''تو اور کیا کرتا...... ان کی منافقت پر خوش ہوتا۔ ہمارا باپ کتنا کمینہ شخص ہے۔ شاید پارٹی ورکرز کو معلوم نہیں۔ کیا ایسا شخص دوسروں کے بارے میں ہمدردی سے سوچ سکتا ہے؟ جسے معلوم ہی نہیں کہ انسانیت کیا ہوتی ہے۔ جس کی اولاد سسک سسک کر مر گئی اور وہ عیش کرتا رہا۔ آئی ہیٹ سچ فادر......'' وہ غصے سے کمرے کی چیزوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا بولا۔

''اچھا چھوڑو، اس بات کو...... تم یہ بتاؤ، تم سارا سارا دن کہاں گھومتے رہتے ہو۔ کل رات کو بھی لیٹ آئے اور آج سارا دن تم گھر نہیں آئے۔'' شفق نے اس کا موڈ دیکھ کر بات بدلنا چاہی۔

''شفق یہ گھر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے...... یہ کمرا، یہ در و دیوار، سب کچھ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کہیں دور چلا جاؤں اور پھر کبھی واپس نہ آؤں لیکن یہی سوچ کر پھر رک جاتا ہوں کہ اس گھر کے در و دیوار ہی تو ہماری تنہائیوں کے ساتھی رہے ہیں اور کون تھا اس وقت...... شفق، تمھیں وہ رات یاد ہے نا، وہ تڑپنا...... چیخنا...... چلانا...... میرے کانوں میں ابھی تک سب کچھ گونجتا ہے۔ فلک کا رونا...... اور ہمارا بے بسی سے اِدھر اُدھر مدد کے لیے دوڑنا۔ دل چاہتا ہے فوراً کہیں بھاگ جاؤں۔'' وہ آہ بھر کر بولا۔

''مجھے چھوڑ کر...... بالکل تنہا...... کس کے سہارے؟'' شفق نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یہی بات تو مجھے یہاں سے جانے نہیں دیتی...... ورنہ کب کا جا چکا ہوتا۔''

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے تم اپنی اسٹڈیز میں سیریس نہیں، کیا بات ہے...... کہیں تمہارا بھی تو سیاست جوائن کرنے کا ارادہ نہیں؟'' اس نے ذرا موڈ بدلنے کی کوشش کی۔

''اوہ نو...... آئی جسٹ ہیٹ پولیٹکس۔ شفق، میرا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا...... میرے اندر آہستہ آہستہ بہت تلخی اور اداسی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے یہ سوچ بہت رلاتی ہے کہ اس دنیا میں ہمارا کوئی بھی نہیں، نہ ماں نہ باپ۔'' وہ دکھ سے بولا۔

''کیوں نہیں...... نانا، ابا اور حیدر انکل تو ہمارے اپنے ہیں نا!''

''ہاں، وہ غیر ہو کر بھی کتنے اپنے سے لگتے ہیں اور اپنے بالکل غیر۔ مگر انھوں نے بھی تو ہمیں کب کا چھوڑ دیا ہے۔ وہ بھی پاپا کی وجہ سے......''

''اچھا ان باتوں کو چھوڑو اور اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔''

''شفق، میرا دل پڑھائی میں بالکل نہیں لگتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس کسی روز کسی کا میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔''

''خدا کے لیے آفاق! ایسی باتیں مت کرو۔ اگر تم نے کچھ ایسا کیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ میں بھی بہت کمزور ہو چکی ہوں۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''چھوڑو، ان باتوں کو...... اب تم جاؤ۔ میں سونا چاہتا ہوں۔'' وہ کمرے کی لائٹ آف کرتے ہوئے بولا اور اسے چار و ناچار اٹھنا پڑا۔

اگلے دن وہ دیر تک سوتا رہا۔ ناشتا بھی کمرے میں کیا اور کمپیوٹر پر سی ڈی لگا کر دیکھنے لگا۔ جب نسرین صفائی کرنے کے لیے اس کے کمرے میں آئی، وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔ نسرین مالی بابا کی بیٹی تھی اور پیچھے کوارٹر میں اکرم کی جگہ رہتی تھی۔ اکرم اب زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے گاؤں چلا گیا تھا۔ کبھی کبھار شہر آتا۔ نسرین اپنے دو چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ کوارٹر میں رہتی۔ نسرین تیز طرار سی، لش پش کرتی، ناز و نخرے سے چلتی تو ہر دیکھنے والا ایک بار ضرور مسکرا کر دیکھتا۔

''صاحب جی! آپ ذرا باہر چلے جائیں، میں صفائی تو کر لوں۔'' وہ بڑی ادا سے جھاڑن ہلاتے ہوئے بولا۔

''کر لو صفائی...... میں تمھیں کیا کہہ رہا ہوں۔''

''آپ کے یہاں ہوتے ہوئے صفائی ٹھیک طرح سے نہیں ہوتی۔''

''کیوں...... اور ویسے بھی کیا کرنا ہے اتنی صفائی کا؟'' وہ خاموشی سے آہستہ آہستہ ڈسٹنگ کرنے لگی۔

''نسرین! تم میرے ساتھ یورپ کی سیر کو چلو گی؟'' وہ ایک دم بولا۔

''کیوں جی، خیریت تو ہے نا...... اور کس لیے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''سیر کس لیے کرتے ہیں...... ظاہر ہے، دل خوش کرنے کے لیے۔''

''پر میرا دل تو یہاں ہی بڑا راضی ہے۔ اماں ہے، گڈو ہے...... نیلو ہے۔ میں ان کے ساتھ کھیلتی ہوں۔ بڑا مزہ آتا ہے۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟''

''اچھی طرح سوچ لو؟''

''سوچ لیا......'' وہ مصمم ارادے سے بولی۔

''اچھا ایک بات بتاؤ۔ اگر تمھاری شادی ہو جاتی ہے اور پھر تمھارے تین بچے ہو جاتے ہیں تو کیا تم ان کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لو گی؟''

''نہ جی...... توبہ استغفار...... اللہ معاف کرے...... مجھے کیڑے پڑیں جی، میں کیوں ایسا کروں گی۔ توبہ استغفار!'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

''اگر کوئی تمھیں بہت امیر کبیر، پیسے والا آدمی مل جائے تو؟''

''کبھی بھی نہیں، میرا دماغ خراب ہے۔''

''اور اگر تمھارا پہلا شوہر اچھا نہ ہوا تو۔''

''پھر بھی نہیں جی!''

''کیوں؟''

''اپنے تین بچوں کے لیے...... ان بے چاروں کا کیا قصور...... ان کو کس کے آسرے پر چھوڑ دوں گی...... نہ جی، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔''

''تم کرو گی...... اور ضرور کرو گی۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم بچوں کو بھی چھوڑ دو گی اور گھر کو بھی......'' وہ آہستہ آہستہ غصّے میں آ رہا تھا۔

''میں کبھی بھی ایسا نہیں کروں گی۔'' وہ بھی بضد تھی۔

''تم ضرور ایسا کرو گی، تم عورتیں ہوتی ہی مکار ہو۔'' اس نے دو تین تھپڑ اسے لگا دیے۔ اس نے جو چلانا شروع کیا، خدا کی پناہ!

''چپ رہو، آواز مت نکالنا ورنہ.....'' اس نے جیب سے ریوالور نکال کر اسے دکھایا۔ وہ ڈر کر خاموش ہوگئی اور جلدی سے باہر کی طرف بھاگی۔ اور وہ اس کی اس حرکت پر کتنی ہی دیر ہنستا رہا اور انجوائے کرتا رہا۔ اسے یوں ڈرا دھمکا کر جو لطف آیا تھا وہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا پھر اگلے ہی لمحے وہ افسردہ ہوگیا۔ ایک ان پڑھ، جاہل، گنوار سی لڑکی اپنے بچوں کو کبھی نہیں چھوڑ سکتی، شوہر کو چھوڑ سکتی ہے مگر بچوں کو نہیں اور وہ تعلیم یافتہ، کلچرڈ عورت، ساری اخلاقیات بھول گئی، اس نے ہمیں یوں چھوڑ دیا جیسے ہم انسان کے نہیں، جانور کے بچے ہوں۔

''یا خدایا! تیری اس دنیا میں محبتوں کا اتنا فقدان کیوں ہے؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''آفاق! تم نے نسرین کو کیا کہا ہے؟'' شفق قدرے غصّے میں اس کے کمرے میں آ کر بولی۔

''کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں.....'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''وہ رو کیوں رہی ہے؟''

''مجھے کیا معلوم..... بلاؤ اسے میرے سامنے!''

''نسرین! اندر آؤ۔'' شفق اسے اندر بلاتی رہی مگر وہ نہ آئی۔

''میں نے تمھیں کیا کہا ہے..... بولو؟'' وہ خود ہی اس کے سامنے گیا تو وہ سہم سی گئی۔

''کچھ نہیں.....'' وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

''آفاق! تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ میں تمھیں ٹھیک کر دوں گی۔'' شفق غصّے سے بولی۔

''تم..... اور مجھے..... ویسے بھی عورت کسی کو کیا ٹھیک کر سکتی ہے۔ وہ تو صرف تباہ و برباد کرتی ہے۔''

''وہاٹ ڈو یو مین.....'' شفق کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''کچھ نہیں، میں بحث کے موڈ میں نہیں۔'' اس نے پانچ سو کا نوٹ جیب سے نکال کر نسرین کی طرف پھینکا..... ''بند کرو یہ رونا دھونا!'' وہ دھمکی دیتا ہوا باہر نکل گیا اور شفق حیرت سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ یہ لڑکا کتنا بگڑ چکا ہے، اس نے دل میں سوچا۔

''نسرین! اب آئندہ تم اس کے کمرے میں کبھی مت جانا..... اور یہ پیسے رکھ لو۔ سوٹ سلوا لینا۔'' شفق نے اسے دلاسا دیا۔

سوٹ کے نام پر وہ اندر ہی اندر خوش ہوگئی اور نوٹ دوپٹے کے پلو میں باندھ لیا۔

''شفق! تمھارے پاپا کے تو وارے نیارے ہو گئے ہیں اور تم بھی......'' سہیل اسے کالج چھوڑنے جا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ راستے میں اسے ملک منصور کی ساری باتیں بتایا کرتا تھا۔ سہیل کو پچھلے پانچ سالوں سے ملک منصور نے پرسنل ڈرائیور رکھا تھا۔ بی اے میں تھا جب اسے باپ کی بیماری کی وجہ سے تعلیم چھوڑنا پڑی۔ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خوبصورت، اسمارٹ نوجوان تھا۔ ہمیشہ ویل ڈریسڈ رہتا۔ مہنگے پرفیومز لگاتا۔ جب کالج کے سامنے کھڑا ہوتا تو کسی رئیس زادے سے کم نہ لگتا۔ لڑکیاں اکثر اس کو دیکھ کر سرگوشیاں کرتیں اور جب معلوم ہوتا کہ وہ شفق کا ڈرائیور ہے تو سب پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگتے۔ سہیل شفق میں گہری دلچسپی لیتا تھا اور یہ دلچسپی آہستہ آہستہ محبّت کی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شفق کو بھی وہ اچھا لگتا تھا۔ اس لیے اس کی کڑوی کسیلی باتوں پر جہاں ناراض ہوتی، وہاں مسکرا بھی دیتی۔

''شفق! تم نے پوچھا نہیں کہ میں کیا بات کر رہا تھا؟''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں...... سہیل! تمھیں معلوم ہے کہ مجھے پاپا اور ان کی ایکٹی ویٹیز سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے ان کی باتیں مت سنایا کرو۔''

''آخر تم اپنے پاپا سے اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہو؟''

''تم سے مطلب......؟'' وہ قدرے درشتی سے بولی۔

''اُف توبہ...... کس چیز کا ناشتا کیا ہے، ایف 16 بنی ہوئی ہو۔''

''اچھا تم مجھ سے ان کے بارے میں کوئی بات نہ کیا کرو۔''

''تو پھر کیسی باتیں کروں؟''

''مجھے نہیں معلوم......'' وہ منہ پھلا کر بولی۔

''یقیناً تم میٹھی میٹھی، رومینٹک باتیں سننا چاہتی ہو...... اچھا ٹھہرو، میں نے ایک نئی کیسٹ خریدی ہے۔ بہت رومینٹک سونگز ہیں......'' اس نے کیسٹ آن کی۔ اتنا فاسٹ میوزک کہ خدا کی پناہ...... اس کی ہنسی نکل گئی۔

''تم ہنستی ہوئی اتنی اچھی لگتی ہو...... کیوں ہر وقت غصّے میں رہتی ہو؟'' سہیل نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''سہیل! میرے اندر صرف نفرت، غم، غصہ اور دکھ ہی دکھ ہے۔ جو ہر وقت لاوے

کی طرح ابلتا رہتا ہے۔ میں اپنے اندر جنم لینے والے منفی جذبوں سے لڑلڑ کر تھک گئی ہوں۔ اب سکون چاہتی ہوں مگر سکون کہیں نہیں...... کیا کروں، غصہ نہ کروں تو کیا کروں؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس کی آواز میں شدید دکھ سے کپکپاہٹ سی پیدا ہو گئی۔

''تم اپنا ہر دکھ مجھے کیوں نہیں دے دیتی؟'' سہیل نے محبت سے اس کے ہاتھ کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

''کچھ غم صرف انسان کے اپنے ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو کسی کے ساتھ شیئر کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی دیے جا سکتے ہیں۔ وہ تو ازل سے انسان کی رگوں میں گردش کرتے لہو کی مانند سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہر سانس جب آہ بھر کر نکلتی ہے تو وہ ایسے ہی غموں کا دھواں ہوتا ہے۔ شاید ایسے غم انسان کی پیدائش پر ہی اسے خدا کی طرف سے امانت کی صورت میں ملتے ہیں جن کو وہ زمانے کی ہوا سے بھی بچا کر اندر ہی اندر سنبھال کر رکھتا ہے...... کیسی عجیب بات ہے نا......'' دو موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر پھسل گئے۔ کالج آ چکا تھا سہیل نے بریک لگائی۔ اس نے ٹشو سے آنسو صاف کیے اور باہر نکل گئی۔

''سنو شفق! تمھارے اندر جتنا بھی دکھ، غصہ ہے، ان سب سمیت تم مجھے عزیز از جان ہو۔ آئی ریئلی لو یو۔'' سہیل کی آواز میں محبت کی سچائی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گئی۔

.........۞.........

راہ چلتی لڑکیوں کو تنگ کرنے میں اسے ہمیشہ لطف آتا۔ ہر روز کبھی کسی لڑکی کے پیچھے ہو لیتا تو کبھی کسی اور کے پیچھے۔ ان کے بالکل قریب جا کر زور سے ہارن بجاتا اور جب وہ خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگتیں تو ان کے سہمے چہرے کو دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوتی۔ وہ تیزی سے ان کے پاس سے گزر جاتا۔ انھیں یوں تنگ کر کے اسے بہت مزہ آتا۔ پھر کھلکھلا کر ہنستا رہتا۔ آج وہ مسلسل ایک فقیرنی کے پیچھے پڑا تھا۔ اس کے قریب جا کر زور سے ہارن بجاتا۔ وہ گندے سندے کپڑوں میں ملبوس کالے رنگ کا پھٹا پرانا، بھاری سا تھیلا اٹھائے ہوئے تھی۔ جس میں اس نے نہ جانے کیا گند مند اور ٹین کے ڈبے اکٹھے کر رکھے تھے۔ کبھی ایک کندھے سے اتارتی تو دوسرے پر رکھتی۔ اسے اس لڑکے کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ کبھی سڑک کے ایک کنارے کی طرف چلتی تو کبھی ایک دم دوسری جانب ہو جاتی۔ مگر وہ باز نہیں آ رہا تھا۔ تنگ آ کر وہ سڑک پر تن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ غصے میں بپھری شیرنی کی طرح اس کی طرف آئی۔ آفاق کی آنکھوں میں شرارت تھی اور لبوں پر شریری مسکراہٹ۔

''اوئے باؤ! ذرا باہر تو نکل!'' اس نے جی کڑا کر کے کہا۔ آفاق اس کی بات سن کر ایک دم چونکا اور باہر نکل آیا۔

''کیا تکلیف ہے تجھے۔ کیوں میرے پیچھے آ رہا ہے؟'' وہ غصّے سے بولی۔

''میں نے تجھے کیا کہا ہے، میں تو اپنے راستے پر جا رہا ہوں۔''

''بنومت...... یہ کچی بستی کا راستہ تیرے باپ کے محل کو نہیں جاتا۔ تو کس کو پاگل بنا رہا ہے۔ اگر تیرا دماغ ٹھیک نہیں تو ٹھیک کر دوں؟'' وہ غصّے سے بولی۔

''زیادہ بک بک مت کر......'' وہ بھی غصّے سے بولا۔

''ورنہ......'' اس نے جی کڑا کر کے پوچھا اس نے تڑاخ سے تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ حیرت سے اپنا گال سہلانے لگی پھر جواباً اس نے بھی ویسا ہی زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ آفاق کو قطعی امید نہ تھی۔ وہ تو لڑکیوں کو تنگ کر کے خوش ہونے کا عادی تھا اور اب جو اینٹ کا جواب پتھر سے ملا تو تلملا اٹھا۔

''اب آنا میرے پیچھے...... تیری ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال نہ دیں تو منگتی نام نہیں میرا۔ سنا تو نے......!'' وہ دانت کچکچا کر بولی۔

''دیکھ لوں گا......'' اس نے گاڑی واپس موڑی۔ وہ ابھی تک اپنا گال سہلا رہا تھا۔ وہ تو اپنی ذات کے گھمنڈ میں مبتلا تھا۔ اس عام سی فقیرنی نے اس کو کیسے تڑاخ سے تھپڑ مارا تھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ جیسے آتش فشاں پھٹ چکا ہو اور لاوا بہنے کو بس راستہ تلاش کر رہا ہو۔ اس کا بدن جل رہا تھا۔ وہ ساری رات نہیں سو سکا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔ اذیت پسند شخص جب خود اذیت میں ہوتا ہے تو کتنا تلملاتا ہے۔ وہ اب محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ساری زندگی ایسے تھپڑ لگانا چاہتا تھا کہ اس کی روح تک چھلنی ہو جائے اور ساری زندگی ایسے تھپڑوں کی جلن محسوس کرتی رہے پھر وہ بہت کچھ سوچتا رہا۔ مگر سو نہ سکا۔

......۞......

سہیل اسے لینے آیا تھا۔ شام کا ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا۔

''ا ، بولو، کہاں جانا ہے؟''

''زویا کی طرف......''

''وہ جو تمہاری بگڑی ہوئی سہیلی ہے؟ اس کی طرف مت جایا کرو۔''

''تم سے مطلب......؟''

''کیوں، مجھے کیوں نہیں...... میرا سب کچھ تو اب تم ہی ہو۔''

''اچھا...... بار بار مت جتلایا کرو۔ مجھے ایسے پوزیسیو لوگ بالکل پسند نہیں۔'' وہ اکتاہٹ سے بولی۔

''شفق، تم ایک نامور سیاست داں کی بیٹی ہو اور پریس تمھارے پیچھے ہے۔ تم جو چاہو کرو، یہ اب ممکن نہیں رہا۔'' اس نے سمجھانے کی سعی کی۔

''مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں اور سنو میرا اپنا وجود ہے۔ میری اپنی ذات اور شخصیت ہے۔ پاپا کی ذات اور ان کی حیثیت میرے لیے قطعی اہم نہیں۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''اچھا، ویسے تمھیں ادھر کیا کام ہے؟''

''ہے نا کچھ!''

''شفق! وہ اچھی لڑکی نہیں۔''

''کیوں، تم کیسے جانتے ہو؟'' اس نے تنک کر پوچھا۔

''بس، میں جانتا ہوں نا...... اسی لیے کہہ رہا ہوں۔''

''تم مردوں کا کیا ہے، جو منہ نہ لگائے اس کو کہہ دیا اچھی لڑکی نہیں۔ تمہارا لوگوں کو جانچنے کا پیمانہ اور ہے اور میرا کچھ اور......''

''شفق! تم کیوں ہر بات کو الٹا رنگ دیتی ہو؟''

''تم بھی مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو۔''

''اچھا بابا، نہیں کرتا......'' وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

''جب تم سرنڈر کرتے ہو نا تو دنیا کے سب سے اچھے اور عظیم انسان لگتے ہو۔'' وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''چلو، تم کسی طرح تو خوش ہوتی ہو، چاہے کسی کی انا کو کچل کر ہی۔'' سہیل نے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا اور اسے زویا کے عظیم الشان گھر کے سامنے ڈراپ کیا۔ وہ رات آٹھ بجے آنے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔

زویا، سہیل کو بہت ناپسند تھی۔ وہ ایک دو دفعہ شفق کے گھر آئی تھی مگر اس کی حرکتیں اور فیشن ایسا بے ہودہ ہوتا تھا کہ اسے دیکھ کر اسے کراہت سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ کسی کو آتے جاتے، چلتے پھرتے نہ دیکھا۔ عجیب سا پُراسرار محل نما گھر تھا۔ شفق زویا

میں کیونکر انٹرسٹیڈ تھی، رات آٹھ بجے تک وہ کیا کرے گی؟ وہ سوچتا ہوا واپس چلا گیا۔ زویا اسے دیکھ کر قدرے بگڑتے ہوئے بولی۔

''شفق! تم دیر سے کیوں آئی ہو۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ معلوم ہے، آج میں نے تمہارا نئے میوزیکل بینڈ سوکفٹ سے تعارف کروانا ہے۔''

''کہاں ہے؟'' شفق بے چینی سے بولی۔

''آؤ، ملواتی ہوں۔'' وہ اسے گھر کے پیچھے ایک بڑے سے ہال میں لے گئی۔ اس کا گھر پورا کلچرل کمپلیکس لگتا تھا۔ نت نئے جدید موسیقی کے آلات، رنگ برنگی جلتی بجھتی لائٹس اور لڑکوں کی ایک عجیب دغریب تعداد وہاں انسٹرومنٹس کے سامنے براجمان تھی۔ ایک حصّہ سولوسونگ کے لیے اور دوسرا گروپ ڈانس کے لیے مخصوص تھا۔ عجیب سا ماحول لگ رہا تھا۔ زویا نے سب سے اس کا تعارف کروایا۔ کچھ یونیورسٹی اور میڈیکل کالجز کے پڑھے لکھے میوزک کے رسیا لڑکے لڑکیاں تھے۔ اسے کہیں بھی کوئی بزرگ نظر نہیں آیا۔

''زویا، تمھارے گھر والے کہاں ہیں؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''کون سے گھر والے......؟'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''میرا مطلب ہے تمہاری امی اور بہن بھائی وغیرہ۔''

''یہاں کوئی نہیں، سوائے میرے اور چوکیدار کے۔''

''اتنے بڑے گھر میں تم بالکل تنہا رہتی ہو؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''شفق، تم کیا فضول باتیں لے بیٹھی ہو۔ اپنے کام سے مطلب رکھو۔ یہاں بیٹھو، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' وہ کہہ کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔ وہ زویا کے بارے میں سوچنے لگی۔ زویا سے اس کی جان پہچان تھرڈ ایئر کے فائنل ایگزامز میں ہوئی تھی۔ زویا اسے بڑی خوش مزاج، ہنسنے ہنسانے والی زندہ دل لڑکی لگی۔ پھر آہستہ آہستہ دونوں میں دوستی گہری ہونا شروع ہوگئی۔ زویا باتوں کی دھنی تھی۔ باتوں سے دوسروں کو متاثر کرنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے شفق کو اعتماد میں لے لیا۔ وہ کافی باتیں اس سے شیئر کرنے لگی تھی۔ زویا تو اس کے لیے کسی مسیحا سے کم نہ تھی۔ وہ اس پر اندھا اعتماد کرنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ جس طرف اسے لگاتی، وہ آسانی سے لگ جاتی۔ زویا کی کسی بات کو چیلنج کرنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا۔ اب دونوں فورتھ ایئر میں تھیں۔ لڑکیاں فائنل ایگزامز کے لیے زور شور سے تیاریوں میں مصروف تھیں۔ وہ نوٹس کے پیچھے بھاگ رہی تھیں مگر اس پر عجیب دُھن سوار تھی۔ جب سے

ملک منصور کی سیاسی حیثیت میں اضافہ ہوا تھا۔ اسے ان کی ذات سے وابستگی پر قلق سا رہتا۔ وہ اپنی ذاتی شخصیت اور اس کی شناخت کے چکروں میں تھی۔ وہ خود کچھ ایسا کرنا چاہتی تھی جس سے وہ خود پہچانی جائے۔ اسے کسی کی ذات کی شناسائی اور تعارف کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے نزدیک تعلیم، دولت اور اسٹیٹس سب کچھ بے معنی تھا۔ زویا نے جب اسے اپنے سوئفٹ بینڈ کے بارے میں بتایا تو وہ بھی اسے جوائن کرنے کے لیے بے چین نظر آنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد زویا آ گئی۔ وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کے پیچھے لمبا سا لڑکا تھا۔ کندھوں سے نیچے لٹکتی زلفیں، گلے میں میٹل کے لمبے لمبے لاکٹس اور چینز۔ مختلف قسم کی رنگز...... رنگین شیشوں والی عینک اس نے لگا رکھی تھی۔ عجیب سی بے ہنگم شخصیت تھی۔

''اس سے ملو، یہ عابد ہے۔ ہمارے سوئفٹ کا بینڈ ماسٹر۔ بہت ٹیلنٹڈ میوزیشن اینڈ سنگر۔''

''ہیلو......'' عابد نے سر جھکا کر کہا۔

''ہیلو......'' وہ بھی آہستہ سے بولی۔

''عابد شفق کو گانے کا بہت شوق ہے۔ مگر اس نے کبھی کچھ گایا نہیں۔ تم تو ٹیلنٹ ہنٹنگ میں ماہر ہو۔ پلیز، اس کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دو۔'' زویا کے لہجے میں التجا بھی تھی اور تمسخر بھی۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں مگر اس میں وقت تو لگے گا۔ ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی آواز کیسی ہے اور ان کو کتنی ریاضت اور پریکٹس کی ضرورت ہے۔ آپ کچھ گا کر سنائیں۔'' عابد نے اسے کہا۔

''مم...... میں...... میں...... اس وقت۔'' وہ نروس ہو کر بولی۔

''ہاں...... ہاں، گھبراؤ نہیں...... عابد بہت نائس ہے۔'' زویا نے اسے تسلی دی۔

بہت مشکل سے اس نے دل دل پاکستان گایا تو عابد نے حیرت سے زویا کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

''عابد! تم بولتے کیوں نہیں، کیا یہ کچھ بھی نہیں سیکھ سکتی؟'' زویا نے حیرت سے پوچھا۔

''بہت وقت لگے گا۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''چلو، امید تو بندھی ہے۔ شفق! تم حوصلہ مت ہارو۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو

جائے گا اور عابد! پلیز، اس کو اسپیشل اٹینشن دو۔''

''ٹھیک ہے.....کل سے کچھ کریں گے۔'' وہ بے دلی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''زویا، کیا واقعی میں گا سکوں گی.....'' اس کے جانے کے بعد شفق نے پوچھا۔

''اور نہیں تو کیا..... آج کل اتنے بے سرے لوگ گروپس بنا رہے ہیں اور ویسے بھی گروپس میں سریلی آواز کم اور میوزک کا شور ہی اتنا ہوتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کون، کیا گا رہا ہے؟ عابد جب تمھارے ساتھ گائے گا نا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ، ہم ان لوگوں کی ریہرسل دیکھتے ہیں۔'' وہ اسے لے کر پیچھے ہال میں چلی گئی، جسے وہ بال روم کہتی تھی۔

ٹھیک آٹھ بجے سہیل اسے لینے آ گیا۔ وہ قدرے ناراض لگ رہا تھا۔

''سہیل! تم کچھ خفا لگ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں.....'' وہ بے اعتنائی سے بولا۔

''پھر بھی.....ہوا کیا ہے؟''

''تم یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئی ہو؟''

''اب تو روز آنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب.....؟'' اس نے جھٹکے سے گاڑی روکی اور اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں بھئی، مجھے کچھ نوٹس تیار کرنا ہیں، اس سلسلے میں روز آنا پڑے گا۔''

''جو وقت تم یہاں آنے جانے میں ضائع کرو گی۔ گھر بیٹھ کر آرام سے تیاری کر سکتی ہو۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''تم اتنے تلخ کیوں ہو رہے ہو؟''

''مجھے یہ گھر اور اس کے مکین کچھ مشکوک لگ رہے ہیں۔''

''تم کس سے ملے ہو؟''

''زویا کے ساتھ وہ لڑکا کون تھا؟ جو تمھیں گیٹ تک چھوڑنے آیا تھا؟''

''کک.....کوئی بھی نہیں.....زویا کا کزن تھا اور اگر تم نہیں آ سکتے تو میں خود آ جایا کروں گی۔''

''نہیں، میں خود چھوڑنے آیا کروں گا۔ تم اکیلی نہیں آؤ گی۔'' وہ رعب سے بولا تو وہ خاموش ہو گئی۔

گھر آ کر وہ ساری رات نہیں سو سکی۔ کبھی عابد کے بارے میں سوچتی تو کبھی سہیل

کے بارے میں۔کبھی زویا سامنے آتی تو کبھی سوئفٹ بینڈ۔ وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی تھی۔ ساری رات سوچنے اور جاگنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

⁂

ملک منصور کا اپنی سیکرٹری مہرین گل کے ساتھ زبردست اسکینڈل ہر ایک اخبار کی مسالے دار خبر بنا ہوا تھا۔شزا نے بھی پڑھا اور خاموش ہو گئی۔ ملک منصور دو دن سے گھر نہیں آیا تھا۔اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ چاہے رات کے دو تین بج جائیں، وہ گھر ضرور آتا تھا۔شزا نے اس کے موبائل پر کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی آف تھا۔ وہ کہاں تھا وہ اسے ٹریس آؤٹ کرنا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے شدید عدم تحفظ کا احساس تنگ کر رہا تھا۔ منصور نے جو وعدے اقرار اس سے کیے تھے، سب وقتی ثابت ہوئے۔ وہ حسن کے سامنے کہاں ٹھہر سکتا تھا۔کردار کی مضبوطی اور نفس پر قابو تو اسے کبھی بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی فطرت کی رنگینیوں سے شادی کے فوراً بعد ہی آگاہ ہو گئی تھی۔ اسے کسی قسم کی نکیل ڈالنا محض خود فریبی تھی۔ وہ بہت شاطر مرد تھا، جو عورت کی کمزوریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ جان بوجھ کر ایسی عورتیں منتخب کرتا جو آسانی سے ایکسپلائٹ ہو سکتی تھیں۔شزا کا تعلق معاشرے کے جس طبقے سے تھا، وہاں صرف گلیمرس وجود زندہ رہ سکتے ہیں اور اب بچے ہونے کے بعد تو ملک منصور نے اسے قطعی ان سرگرمیوں کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ صرف این جی او تک محدود تھی۔ وہ بار بار کمرے کا چکر لگا رہی تھی۔ اسے شمائل اور سمیر شدت سے یاد آ رہے تھے۔ نہ نیند آ رہی تھی نہ چین...... وہ اپنے آپ کو سخت اذیت میں محسوس کر رہی تھی۔ رتجگوں نے اس کی آنکھوں کو سرخ کر رکھا تھا۔ زندگی کا عذاب کس کس صورت میں جھیلنا پڑتا ہے، ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اذیت سہہ رہا تھا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر شزا کی آنکھیں، شفق کی سرخ سوجی آنکھوں کا مشاہدہ کر رہی تھیں اور شفق کی جاگتی آنکھیں آفاق کے افسردہ اجڑے چہرے پر منجمد تھیں۔ سب دیکھ رہے تھے۔ اندر ہی اندر کچھ محسوس کر رہے تھے مگر کوئی کسی سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکتا تھا اور کیوں پوچھتا، کس ناتے سے پوچھتا۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ گم گشتہ استعارہ تھا۔

آفاق چائے کا کپ ٹیبل پر پھینکتے ہوئے جھٹکے سے اٹھا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس کے اندر آگ دہک رہی تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ بدلہ لینا چاہتا تھا۔ جب تک بدلہ نہیں لے گا، اس کا اندر یونہی دہکتا رہے گا۔ اس کی سوچیں منتشر رہیں گی۔ اسے کچھ

کرنا تھا۔ یہی سوچ کر وہ اسی راستے پر چل پڑا جہاں نکل گیا تھا اور چلتے چلتے اس کی جھگی تک جا پہنچا اور اب اسے اِدھر اُدھر تلاش کر رہا تھا۔

''اوئے بابو، کیا چاہیے......؟ ادھر کیا ڈھونڈ رہے ہو؟'' ایک موٹا تازہ سا کالی رنگت والا آدمی باہر نکلا اور بڑے رعب سے پوچھنے لگا۔

''وہ...... وہ...... یہاں پر......'' وہ ہکلانے لگا۔

''کون...... بولو، کیا اوں آں کر رہے ہو؟'' وہ غصے سے بولا۔

''یہاں پر وہ لڑکی......کل......''

''کون...... منگتی......؟''

''ہاں......''

''کیا کام ہے اس سے؟''

''اس نے اک کام کہا تھا۔ وہی بتانے آیا ہوں۔'' جلدی سے اس نے بہانہ گھڑا۔

''منگتی اور کام...... کیوں مذاق کرتا ہے۔ وہ اک ہتھ جوڑ کے لگائے گی تو سارا کچھ بھول جائے گا۔ وہ لڑکی نہیں پٹاخہ ہے۔ چل گیا نا تو لگ پتا جائے گا۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''کیوں ہاتھ لگائے گی، میں نے کیا، کیا ہے؟'' وہ قدرے تلخی سے بولا۔

''اگر تو نے جھوٹ بولا نا تو تجھے چھوڑے گی نئیں۔ یہ تو سوچ لے۔ بڑی جی دار ہے۔''

''اچھا تم اسے بلوا تو دو...... میں جانوں اور میرا کام......''

''دیکھنا، کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا ورنہ منگتی سمیت یہاں کے لوگ بھی تجھے نہیں چھوڑیں گے۔'' وہ پھر اسے تنبیہہ کرنے لگا۔

''اچھا، بلاؤ تو سہی۔'' وہ ہمت کر کے بولا۔ وہ منتظر تھا اور خوف زدہ بھی، جب وہ آ گئی۔

''اوئے تو...... ٹھہر جا، آج تجھے زندہ نہیں جانے دینا۔'' اس نے پاس سے ہی ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھایا اور اس کی جانب لپکی۔ اس کا باپ فقیرا اس کے پیچھے تھا۔

''اری بد بخت! مرے تو...... ٹھہر تو جا۔ اسے بات تو کرنے دے، کہتا کیا ہے؟'' فقیرے نے اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھینتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ سے بات کرنی ہے۔'' آفاق نے فقیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... بول، کسی اچھے گھر کا لگتا ہے۔ ادھر کیا کرنے آیا ہے؟''

''مجھے آپ کی بیٹی سے شادی کرنی ہے اور میں یہ شادی ہر قیمت پر کرنا چاہتا ہوں۔ چاہے آپ مجھ سے پیسہ لے لیں۔'' اس نے پینٹ کی جیب سے نوٹوں کی دو گڈیاں فقیرے کی جانب بڑھائیں۔ ''یہ دس ہزار ہیں...... منگتی میرے گھر میں بہت خوش رہے گی۔''

منگتی کے ہاتھ سے ڈنڈا ایک دم نیچے گر گیا اور وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر بے وقوف ہوگا۔

''مگر یہ سب کچھ......'' فقیرے کے منہ میں پانی آ رہا تھا، کبھی وہ نوٹوں کو دیکھ رہا تھا، کبھی آفاق کو اور کبھی منگتی کو۔

''ابا! یہ بہت برا لڑکا ہے، میں اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔'' منگتی ایک دم اس کے سامنے جا کر بولی۔

''منگتی! میں اتنا برا بھی نہیں۔'' وہ بڑی ملائمت سے بولا تو وہ خاموش ہو گئی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تو تو چپ کر مر...... ابھی میں زندہ ہو، میں ہی فیصلہ کروں گا کہ کیا کرنا ہے۔ بیٹا، تو ہمیں سوچنے کا وقت تو دے...... اور تیرے گھر والے......؟'' فقیرے نے اس سے کہا۔

''میرے گھر والے نہیں ہیں اور میں نے شادی بھی آج اور اسی وقت کرنی ہے۔''

''بیٹا! یوں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جماتے...... شادی بیاہ تو زندگی کے معاملے ہوتے ہیں۔ اتنی جلدی تو سب کچھ طے نہیں ہو سکتا۔'' فقیرے نے پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''دیکھنا بھالنا کیا ہے، میں آپ کے سامنے ہوں۔ منگتی یہ ہے، مولوی صاحب کو بلائیں اور نکاح کر دیں۔''

''ابا، میں اس سے نکاح نہیں کرنے کی۔ یہ دھوکا ہے؟'' منگتی پاؤں پٹختی اندر چلی گئی۔

''کر لے...... بے وقوفی نہ کر...... نکاح ہی کرے گا نا۔ بھگا کر تو نہیں لے جا رہا۔ یہاں رہ کر ساری زندگی کوڑا ہی جمع کرتی رہے گی۔ تو، تو بڑے نصیب والی ہے۔ موٹر والا تجھے بیاہنے آیا ہے۔ اس کے گھر میں راج کرے گی۔ ورنہ یہاں کی لڑکیوں کے نصیب بھی راکھ کی سیاہی سے لکھے ہوتے ہیں۔ کوڑے میں پلتی ہیں اور بیمار ہو کر مر جاتی ہیں۔ کبھی کسی کا اچھا نصیبا دیکھا ہے تو نے۔ کس آس پر تو میرے در پر بیٹھی رہے گی۔ میں بیمار رہتا ہوں۔ تیرے بہانے چار پیسے وہ دے رہا ہے۔ ہم بھی کوئی کٹیا سی بنا لیں گے۔ میں اپنا علاج کروا لوں گا۔'' فقیرے نے فوراً ہی ساری منصوبہ بندی اسے سمجھا دی۔

''لیکن ابا! مجھے ڈر لگے ہے...... یہ موٹروں والے بڑے فریبی، دغا باز لوگ ہوتے ہیں۔ تیری منگتی کے ساتھ بھی کچھ دغا کیا تو پھر مر جائے گی۔ دیکھ پھر منگتی تیرے در پر نہ آئے گی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''نہ میری دھی! یوں اداس نہیں ہوتے۔ دیکھنا، نیلی چھتری والا کتنا کرم کرے گا۔ تو، تو منگتی ہی نہ رہے گی۔ میری موٹر والی میم صاب بن جائے گی۔'' فقیرے نے اسے سبز باغ دکھائے۔

''اچھا، جو تیری مرضی......'' وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔

''جا تو ہمیشہ خوش رہ۔'' فقیرا خوش خوش باہر نکل آیا۔

''جا بابو! مولوی کو لے آ...... وہ راضی ہوگئی ہے۔''

ہو سکتا ہے آفاق کو واقعی اس سے محبت ہوگئی ہو۔ بے شک وہ گندی مندی رہتی تھی لیکن بستی میں رہنے والی سب لڑکیوں میں وہ خوبصورت سمجھی جاتی تھی۔ مگر وہ فقیرنی بھی تھی۔ وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مولوی صاحب کو لے آیا۔ دس ہزار حق مہر کے عوض اس سے نکاح کیا گیا۔ جو اس نے فقیرے کو دے دیے تھے۔ نہ جانے کس کے بوسیدہ سے گوٹے کناری والے کپڑے اسے پہنائے گئے۔ سرخ سرخی اور گالوں پر لالی خوب بھر بھر کر تھوپی گئی۔

''ابا، ان پیسوں سے علاج ضرور کرانا۔'' وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... ہاں، تو فکر نہ کر...... تو خوش رہ۔'' فقیرے نے اسے دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔ سارا راستہ خاموشی چھائی رہی۔

''بابو! تو خوش تو ہے نا! کیا تجھے مجھ سے محبت ہوگئی ہے؟'' منگتی نے محبت سے پوچھا۔

''میں کوئی بابو نہیں، میرا نام آفاق ہے اور تم بھی منگتی نہیں، کچھ اور ہو اور مجھے تم سے کوئی محبت نہیں، سنا تم نے؟'' وہ غصے سے جھنجلا کر بولا۔

وہ خاموش ہوگئی۔

''اچھا تو کیا نام رکھوں میں، میں تو شروع سے ہی یہی ہوں، آج کیوں اپنا نام بدلوں؟''

''میں نے کہا نا...... مجھ سے فضول بحث مت کرو اور اپنا نام کچھ اور رکھو۔''

''اچھا، تو چھمو رکھ لوں؟'' وہ خوشی خوشی بولی۔

''کیا بکواس نام ہے......'' وہ منہ چڑھا کر بولا۔

''تو بھاگی رکھ لوں؟''

''شٹ اپ...... نان سینس......''

''اچھا تو ناراض کاہے کو ہو رہے ہو؟'' وہ سارا راستہ منہ بسور کر بیٹھی رہی۔ جب وہ اسے لے کر گھر آیا تو ہر نظر میں استفہام تھا، حیرانی تھی۔ شفق حیرانی سے کبھی آفاق کی طرف دیکھتی تو کبھی منگتی کی طرف۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''آفاق! یہ کون ہے؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''کون ہو سکتی ہے...... ظاہر ہے میری بیوی ہے سحر!''

''سحر......!'' منگتی خود ہی بڑبڑائی۔

''مگر......'' شہزا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا۔

''کیوں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ جب ماڈلز اور ایکٹرسز یہاں رہ سکتی ہیں تو یہ کیوں نہیں......؟'' وہ اس کا دفاع کر رہا تھا مگر وہ ان سب کے درمیان کھڑی حقیر سا، بے وقعت سا ذرہ لگ رہی تھی۔

اسی لمحے ملک منصور اندر داخل ہوا۔

''یہ کیا ہنگامہ ہے اور یہ کون ہے؟'' وہ غصے میں دہاڑتے ہوئے بولا۔

''یہ میری بیوی ہے۔''

''کیا...... تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا...... یہ تو شکل سے ہی کوئی بھکارن لگتی ہے۔'' وہ ناک سکیڑ کر بولا۔

''بھکارن تھی...... مگر اب نہیں۔ اب یہ اس گھر کی بہو ہے اور آپ کی عزت۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو، تمہاری اس بکواس کو میں آسانی سے قبول کر لوں گا۔ برخوردار، کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند کبھی نہیں لگتا۔'' وہ پھر دہاڑا۔

''مگر آپ تو ہمیشہ لگاتے رہے ہیں۔ ماڈلز اور ایکٹرسز کا۔ وہ بھی تو کمخواب میں ٹاٹ ہی تھیں......''

''شٹ اپ، یو سن آف...... بچ!'' وہ غصے سے دہاڑا۔

''بس...... ایک ہی دفعہ میں تلملانے لگے اور مت بھولیے، میں آپ کا ہی بیٹا ہوں۔''

''دفعہ ہو جاؤ میری نظروں سے...... اور پھر میرے سامنے مت آنا اور سنو، اس کو میں یہاں دوبارہ نہ دیکھوں۔''

''یہ یہیں رہے گی، میرے ساتھ اور میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سے کون جاتا ہے۔ ہم نے بھی تو بہت برداشت کیا ہے، ہم بھی تو چاہتے تھے کہ بہت سے لوگ اس گھر میں نظر نہ آئیں مگر وہ نظر آرہے ہیں تو پھر یہ بھی یہیں رہے گی۔'' اس نے تلخی سے شزا کی طرف دیکھ کر کہا۔

منصور نے تڑاخ سے تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور پاؤں پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ گنگ سا کھڑا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے آفاق کو یوں تھپڑ مارا تھا۔ وہ وہیں پر کھڑا اپنا گال سہلاتا رہا۔ ابھی پہلے تھپڑ کی اذیت کم نہ ہونے پائی تھی، اوپر سے مزید ایک اور اس کو سہنا پڑا تھا۔ شزا بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''آفاق، یہ تم نے کیا، کیا...... ابھی تو تم نے سیکنڈ ایئر کے ایگزامز دینے ہیں اور تم نے شادی بھی کر لی اور وہ بھی اس سے؟'' شفق اسے جھنجوڑ کر پوچھنے لگی۔

''میرے لیے زندگی میں کچھ بھی اہم نہیں۔ نہ تعلیم، نہ اسٹیٹس، نہ کچھ اور...... میرے لیے تو زندگی ہی اہم نہیں......'' وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔

''تم کیوں ایسا کہہ رہے ہو؟''

''شفق! یہ تم پوچھ رہی ہو...... میں کیوں زندہ ہوں...... کس کے لیے...... ہمارے ہونے کا تو کوئی جواز ہی نہیں، ہم زندہ ہیں اس لیے کہ ہم ہیں۔ کاش ہم نہ ہوتے، اس ہونے نہ ہونے کے چکر میں انسان کتنا دکھ سہتا ہے، کتنا کرب...... میں بہت ٹوٹ چکا ہوں۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''تو کیا تم اس سے محبت کرتے تھے اس لیے......؟''

''محبت اور اس سے......؟'' وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔

''تو پھر یہ سب کیا ہے؟''

''ایسا بندھن جو میرے ماں باپ میں تھا۔ میں وہی ایکسپیرینس کرنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ایسا بندھن کب تک چلتا ہے...... اٹس جسٹ این ایڈونچر......''

''یہ کیا حماقت ہے۔ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو۔'' شفق ناراض ہو کر بولی۔

''یہ زندگی ہی سب سے بڑی حماقت ہے...... تم اور کس حماقت کی بات کرتی ہو؟''

''اچھا ادھر بیٹھو...... اس غریب کو تم کس بات کی سزا دینے جا رہے ہو؟''

''سزا تو یہ اب ساری زندگی سہے گی...... میرے ساتھ۔''

''دیکھو پلیز! کوئی زیادتی نہ کرنا۔'' شفق خوف زدہ ہو کر بولی۔

''ادھر بیٹھو، میں کچھ لاتی ہوں۔'' وہ پیپسی کے دو گلاس ان کے لیے لائی۔ وہ شڑپ شڑپ کر کے ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گئی۔ شفق مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی ان کے ماحول میں فٹ ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر اس کی نوک پلک سنواری جائے، تب بھی نہیں۔ اس کے وجود میں بسی سڑاند اور بوسیدگی، رگ رگ میں سمائی مفلسی اور چہرے پر پھیلی حسرت و یاسیت، وہ تو اس گھر کے کونے کھدرے میں بھی سمانے کے لائق نہ تھی۔ تو پھر یہ سب کیسے چلے گا؟ وہ حیرت سے سوچتی رہی۔

''آؤ، میں تمھیں تمہارا کمرا دکھا دوں......'' شفق کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بالآخر ایک دم اسے لے کر آفاق کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بھی اس کے حکم پر روبوٹ کی طرح اٹھ کر چل دی۔ آفاق کا کمرا جدید آرائش و زیبائش سے آراستہ تھا۔ اتنا خوبصورت کمرا تو اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کہاں اس کی گھاس پھونس سے بنی جھونپڑی، ذرا سی تیز ہوا چلتی تو جھولنے لگتی تھی۔ بارش ہوتی تو پرنالے کی طرح بہنے لگتی۔ فرش تر بتر ہو جاتا، کہیں بیٹھنے کی صاف جگہ نہیں ملتی اور اب ہر طرح سے مکمل خوبصورت آرام دہ کمرا اس کا ہوگا۔ نرم گداز بستر، خوبصورت کمبل چھت سے لٹکتا جھومر، رنگ برنگی تصویریں، کتنا خوبصورت تھا سب کچھ۔ وہ جھجکتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔ شفق باہر نکل گئی۔ وہ حیرت سے...... ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر ٹیبل لیمپ کو دیکھنے لگی جس میں سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔

''اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔'' آفاق ایک دم پیچھے سے آ کر بولا۔ ''اور سنو، اپنی اوقات بھی کبھی مت بھولنا۔ چلو ادھر کونے میں سو جاؤ۔ یہ لو چادر......'' اس نے دور سے چادر اسے پھینک کر دی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس کے تو سارے خواب ایک دم چکنا چور ہو گئے۔

''کیوں، میں نے کیا گناہ کیا ہے؟'' وہ روتے ہوئے قریب آ کر بولی۔

''تمھارے وجود میں بدبو ہے...... تم تو گندگی کا ڈھیر ہو...... تم میرے وجود میں نہیں سما سکتی۔''

''تو پھر کیوں بیاہ کے لائے ہو؟ کیا تکلیف تھی تمھیں؟''

''تھی بہت تکلیف...... بہت جلد تمھیں بھی اس تکلیف کا پتا چل جائے گا۔''

''میں واپس جا رہی ہوں۔'' وہ گلا پھاڑتے ہوئے بولی۔

''واپسی کا سوچنا بھی مت اور خبردار......! اونچی آواز میں مجھ سے بات کی......''

''میں تو چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاؤں گی......''

''کیا بتاؤ گی؟'' اس نے وحشیوں کی طرح اسے مارنا پیٹنا شروع کیا۔ وہ اس کے ہلکے پھلکے وجود کو ہوا میں اٹھا کر یوں زمین پر مار رہا تھا جیسے وہ کوئی ربڑ کی گیند ہو اور جیسے ہی وہ آواز نکالتی تو اس کے گلے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔

''خبردار! جو تمہاری آواز نکلی، اسی کمرے میں زندہ گاڑ دوں گا۔'' اس نے جیب سے ریوالور نکال کر اس کو دکھاتے ہوئے کہا۔

اس کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ جسے وہ اپنے سرخ گوٹے والے دوپٹے سے بار بار صاف کر رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی مگر رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا وجود بری طرح دکھ رہا تھا۔ اتنی اذیت، اتنا کرب دے کر بھی اس کے اندر کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے وہ اپنا غصہ کسی پر نہیں نکال سکتا تھا۔ اب تو جیتا جاگتا وجود اس کے ہاتھ لگا تھا۔ جس پر وہ جو چاہے گا کرے گا۔ وہ تھک کر صوفے پر بیٹھ گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کی نظروں سے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ جتنی شدت سے آنسو بہا رہی تھی، اسے اتنا ہی لطف آ رہا تھا۔ عورت روتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہے۔ شاید اسی لیے قدرت نے اسے فراوانی سے آنسوؤں کا ذخیرہ دیا ہے۔ جاؤ بہاتی رہو۔ کبھی کم نہ ہوں گے۔ وہ اسے پاؤں سے ٹھوکر مارتا ہوا اپنے بستر میں گھس گیا۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھی کراہتی رہی۔ وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا اور وہ گرم گرم آنسوؤں سے اپنی مرہم پٹی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ بھکارن تھی تو کتنی خوش تھی۔ پرسکون نیند کے مزے لوٹتی تھی اور اب اس قیمتی گھر کے قیمتی کمرے میں اس کی حیثیت ٹوٹے فرنیچر جیسی بھی نہ تھی۔ اتنی ذلت...... اتنی رسوائی تو اس نے بھکارن ہو کر بھی زندگی میں نہیں سہی تھی۔ کیسا قید خانہ تھا۔ صرف دس ہزار کے عوض اس کے باپ نے اس کی حیاتی کا سودا کر دیا تھا۔ کتنے رنگین اور سرسبز باغ دکھائے تھے جو صرف ایک ہی رات میں راکھ کا ڈھیر ثابت ہوئے تھے۔

صبح جب وہ دیر سے بیدار ہوا تو وہ اسی جگہ پر گٹھری سی بنی بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر چوٹوں کے نشانات ابھی باقی تھے۔ آفاق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم...... تم ابھی تک یہاں ہو...... کیا ہوا...... اور یہ خون...... یہ سب کہاں سے آیا کیا تمھیں بہت درد ہو رہا ہے؟ اٹھو صوفے پر بیٹھو......'' اس نے الماری سے مرہم نکال کر اس

کے لگا یا۔ پین کلرز دیں اور چائے منگوا کر اسے چائے دی۔ اب تم سو جاؤ۔'' اس نے اسے زمین پر بچھے میٹرس پر لٹا دیا۔ وہ حیرت سے مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسا عجیب انسان تھا۔ رات کو وہ کسی وحشی سے کم نہیں لگ رہا تھا اور اب جو اس نے شفیق انسان کا روپ دھارا تو سارے زخم پھر سے رسنے لگے۔ محبّت کا بہلاوا ملنے سے اندر کی تمام تکالیف پھر سے متحرک ہونے لگیں۔ انسان کیا ہوتا ہے، اتنا برا بھی اور اتنا اچھا بھی۔

رات کو وہ وحشی درندے سے بھی بدتر لگ رہا تھا اور اب کسی فرشتے سے کم دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کے اندر خوف بھی کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا اور خوشی بھی ملگجی روشنی کے مانند تھوڑا سا سرور دے رہی تھی۔ وہ اسے کمبل اوڑھا کر خود باہر نکل گیا اور وہ گہری نیند سو گئی۔

.......✡.......

''آؤ...... میرے ساتھ ہم آواز ہو کر گاؤ۔'' عابد نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں...... کیسے......؟'' وہ بے اعتمادی سے بولی۔

''میں تمھارے ساتھ ہوں نا......'' عابد نے اس کے خوبصورت چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''مگر میں......'' وہ جھینپ کر بولی۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہونے لگا۔

''گاؤ...... سا رے...... گا...... ما...... پا...... دھا...... نی...... سا...... سات سُر، کائنات کے سات رنگ، سات زمینیں...... سات آسمان۔ کیا میرے اندر کے سات سُر تمھارے اندر کے سات سُروں کو متحرک نہیں کر سکتے۔ سب کچھ ممکن ہے۔ ہر گلے میں ساز ہے اور ہر آواز میں سوز۔ بے ہنگم شور میں بھی ردھم ہوتا ہے اور بے ترتیب لے میں بھی سُر۔ مجھے امید ہے کہ تم بہت جلد گانا سیکھ لوگی۔'' اس نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلیاں پیانو پر رکھیں۔ اس کا وجود کانپنے لگا۔ وہ مکمل طور پر اس کے اختیار میں تھی۔ اس کے اندر برقی روسی دوڑنے لگی۔ منجمد ساکن وجود میں حرکت سی پیدا ہونے لگی۔

''تم بہت جلد سیکھ لوگی...... تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ بس کوشش کرو۔ دیکھنا، بہت جلد میں اُپنے سُر تمھارے اندر جگا دوں گا اور ہم ایک آواز بن کر دنیا میں ہلچل مچا دیں گے۔'' عابد پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

''نہیں، میں منفرد آواز بننا چاہتی ہوں۔'' وہ ایک دم ہاتھ چھڑا کر بولی۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میرا اپنا وجود ہے۔ میں اپنے ٹیلنٹ کو خود ایکسپلور کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی شناخت دنیا میں خود پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ میرا ٹیلنٹ میری ذات کی شناخت بنے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ زمانہ مجھے کس حد تک قبول کرتا ہے؟'' وہ پُر جوش لہجے میں بولی۔

''پھر کیا ہوگا؟'' اس نے حیرت سے مسکرا کر پوچھا۔

''معلوم نہیں...... مگر کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔''

''تم کیوں ان چکروں میں پڑتی ہو۔ جیسا ہے ویسا ہی چلنے دو۔ اس ایکسپلوریشن کا فائدہ......؟''

''فائدہ یا نقصان میں نہیں جانتی۔ میں بس اپنے اندر کی تسکین چاہتی ہوں۔ میرے اندر ایک طوفان برپا رہتا ہے۔ میں کچھ ایسا کرنا چاہتی ہوں کہ جو سب سے منفرد ہو۔ جس میں میرے باپ کی شخصیت کا عکس نہ ہو۔ میری کامیابیاں صرف میری ہوں۔ میرے اندر بہت اداسیاں اور بے چینیاں ہیں۔ میں اپنے اندر چھپی محرومیوں کو ختم کرنا چاہتی ہوں ورنہ زندگی یونہی بربادی میں گزر جائے گی۔''

''تمہاری سوچوں میں توازن کیوں نہیں؟'' عابد نے حیرت سے پوچھا۔

''کبھی بے ربط سوچوں...... بے ترتیب زاویوں...... آڑی ترچھی لکیروں اور سوچوں کے بھنور سے توازن اور ہم آہنگ سوچوں اور مثبت نظریات نے بھی جنم لیا ہے؟'' وہ بے تکان بولتی گئی۔

''تم کس کی تلاش میں ہو؟''

''معلوم نہیں...... مجھے تو آج تک یہی معلوم نہیں ہو سکا کہ میں کیا ہوں اور مجھے کس شے کی ضرورت اور تلاش ہے۔ میں بس ہوں، جیسے رینگتا ہوا کیڑا یہ نہیں جانتا، وہ کس لیے رینگ رہا ہے اور اسے کس کی تلاش ہے اور اسی تلاش میں وہ کسی دن پاؤں تلے آ کر مر جاتا ہے۔ میں نے زندگی تو یونہی گزار دی مگر اب ایسی بے بسی سے مرنا نہیں چاہتی۔''

''مگر یہ سب تمہارے ساتھ ہی کیوں ہے؟ زویا تو ایسی نہیں؟''

''آپ کو معلوم ہے جب جینز ڈسٹرب ہوں تو ایب نارملٹی جنم لیتی ہے اور پھر اس سے انتشار جنم لیتا ہے۔ سوچ کا اور فکر کا۔ یہ سب کچھ جینز ایرر کی وجہ سے ہے۔ یہ اضطراب اور انتشار کو جنم دیتا ہے اور انتشار پاگل پن اور دیوانگی کو۔ میں اور میرا بھائی اس منافقوں کی سوسائٹی کے شاید ایب نارمل کردار ہیں۔ شیزو فرینک کریکٹرز...... یا پھر بہت نارمل اور

پوزیٹو۔'' وہ ایک دم بولنا شروع ہوئی تو بولتی گئی۔

''تمہارا ذہن بہت متحرک ہے، کیا پڑھتی ہو؟''

''نفسیات اور فلسفہ......''

''شاید اسی لیے......مگر اتنا کچھ مت سوچا کرو۔''

''تو پھر کیا سوچوں......؟''

''کچھ اچھا بھی تو سوچ سکتی ہو، خوبصورت......''

''خوبصورت سوچ، خوبصورت ماحول سے پیدا ہوتی ہے اور میری آنکھوں نے تو کوئی خوبصورتی دیکھی ہی نہیں۔ کانوں نے خوبصورت باتیں ہی نہیں سنیں اور جسم نے خوبصورت احساسات اور لمس کو کبھی مس ہی نہیں کیا تو میں اچھی سوچ کہاں سے لاؤں۔'' وہ قدرے بے بسی سے بولی۔

''اچھا......تم آج میرے گانے کو صرف سنو۔ اپس اینڈ ڈاؤنس یعنی آواز کا اتار چڑھاؤ۔ کہاں میوزک سلو آتا ہے اور کہاں فاسٹ۔ کہاں ردھم ہوتا ہے اور کہاں آواز......اور سب کچھ بھول کر سنو۔''

''کیوں......کچھ پانے کے لیے اپنے آپ کو بھلانا ضروری ہے کیا؟''

''ہاں......یہی قانونِ فطرت ہے۔ کسی بھی شے کو پانے کے لیے سچّی لگن ضروری ہے اور سچّی لگن کے لیے اپنے آپ کو بھی بھلانا ضروری ہے۔''

''لیکن میں ان چیزوں کی پروا نہیں کرتی۔ آپ مجھے سُروں کے بغیر ہی سکھائیں۔''

''اچھا بابا!'' اس نے گٹار پکڑ کر گانا شروع کیا۔ وہ اتنے پُرجوش انداز میں گا رہا تھا کہ وہ واقعی اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ ساز، سُر اور آواز میں مکمل ہم آہنگی بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ وہ بہت اچھا گا رہا تھا۔ قدرت نے اسے آواز بھی خوبصورت دی تھی یا پھر اس کا پیشہ ہی یہی تھا۔ اس کے باپ اور دادا بھی شادی بیاہ کے موقع پر بینڈ باجے بجاتے اور گاتے تھے...... وہ ذات کا میراثی تھا۔ انسانوں کے ہجوم میں رینگتا ہوا کیڑا۔ حقیر ذرہ مگر اب وہ میوزک ماسٹر تھا۔ گروپ انچارج، لے اور سُر کو جاننے والا۔ موسیقی کا رسیا۔

''میں آپ جیسا کبھی نہیں گا سکتی۔'' وہ اس کے گانا ختم کرنے پر بولی۔

''کیوں؟''

''میرے جینز میں طمانیت ہی نہیں۔ موسیقیت تو اندر سے جنم لیتی ہے، جب اندر

سکون ہو، تناسب ہو، ہم آہنگی ہو۔ مجھے معلوم ہے میں کبھی بھی اچھا نہیں گا سکوں گی۔'' وہ دو ٹوک لہجے میں بولی اور بیگ اٹھا کر چل دی۔

''یار! تمہاری سہیلی تو مجھے پاگل لگتی ہے۔'' عابد نے اس کے جانے کے بعد زویا سے کہا۔

''ہاں، ہے تو سہی مگر تھوڑی سی۔''

''تھوڑی سی نہیں، بہت زیادہ......''

''ارے بھئی نیگلیکٹڈ چائلڈ ہے......تو ظاہر ہے، ایسی ہی ہوگی نا!''

''کیا مطلب؟''

''فضول بات ہے چھوڑو اسے۔ اب تو اکثریت ہی ایسی ہے۔'' زویا منہ بنا کر بولی۔

''ویسے یہ نمونہ تمھیں ملا کہاں سے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''کالج میں ہی جان پہچان ہوئی اور جب مجھے اس کے فادر کا معلوم ہوا کہ وہ زبردست پولیٹیکل پرسنالٹی ہیں۔ پھر تو میں نے خود ہی دوستی بنالی۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ ایسے لوگوں سے تو میں دوستیاں بنانے میں ماہر ہوں۔'' زویا نے آنکھ دبا کر کہا۔

''آئی سی......اسی لیے......میں سوچ رہا تھا کہ اس دوستی کے پیچھے کیا راز ہو سکتا ہے؟''

''اچھا، یہ بتاؤ کہ تمہارا اپنا البم کب آ رہا ہے؟'' زویا نے اس سے پوچھا۔

''بہت جلد......''

''سپر ہٹ ہوگا......'' زویا خوشامدی لہجے میں بولی۔

''تمھیں کیسے معلوم ہوا؟''

''میں جانتی ہوں کہ تم نے بہت محنت کی ہے۔''

''لیکن صرف محنت کسی کو شہرت کی بلندیوں تک نہیں پہنچا سکتی۔''

''تو پھر کیا چاہیے؟''

''کونٹیکٹس......اینڈ ٹرمز......''

''کیا مطلب......؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''بڑے لوگوں کی اسپانسر شپ اور ان کے سپورٹنگ ہینڈز'' وہ مایوسی سے بولا۔

''تو شفق سے بات کیوں نہیں کرتے۔ آخر اس کی دوستی کس کام آئے گی۔ اپنے فادر کو کہے نا کہ وہ تمھیں اسپانسر کریں؟''

''بہت مشکل ہے۔ وہ بہت عجیب وغریب قسم کی لڑکی ہے۔ مجھے اس کی باتوں سے، باپ کے لیے نفرت کی بو آتی ہے۔ وہ اپنی فیملی کو بھی ناپسند کرتی ہے اور شاید اپنے باپ کو بھی۔ میرا نہیں خیال کہ وہ میرے لیے اپنے باپ سے بات کرے گی۔ اس کی انفرادیت معلوم ہے کیا ہے، وہ ان چیزوں کو اہمیت دیتی ہے جنھیں نظر انداز کرنا چاہیے...... جنھیں نظر انداز کرنا چاہیے، انھیں وبالِ جان بنا لیتی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کر سکے گی۔'' عابد قدرے مایوسی سے بولا۔

''بات کر لینے میں کیا حرج ہے؟'' زویا نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے...... کل آئے گی تو بات کروں گا۔ مگر مجھے امید نہیں۔''

''میرے پاپا اور تمھیں سپورٹ کریں گے...... مائی فٹ...... جو ہمیں کسی معاملے میں سپورٹ نہ کر سکے وہ تمھیں کیا کریں گے اور ویسے بھی، وہ صرف اسی بندے کو سپورٹ کرتے ہیں جہاں انھیں کوئی فائدہ مقصود ہو۔ تم تو ان کے لیے قطعی اہم نہیں۔ تم جس خوش فہمی میں مبتلا ہو، سب نکال دو۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

''اچھا اگر تمہارا البم بنایا جائے؟''

''میرا البم...... ہاؤ فنی...... گانا ڈھنگ کا آتا نہیں، البم خاک بناؤ گے۔'' وہ بہت بے باک اور منہ پھٹ ہوتی جا رہی تھی۔

''اچھا تو ایک کنسرٹ میں ساتھ دو گی......'' وہ اسے ورغلا رہا تھا۔

''مگر یہ سب کیسے ممکن ہے...... مجھے تو کسی بھی بات کا کوئی تجربہ نہیں۔''

''اس دفعہ تو تم صرف ساتھ دو گی، پھر آہستہ آہستہ تم میں اعتماد آنے لگے گا تو پھر کوئی مشکل نہیں ہو گی۔''

''ٹھیک ہے، سوچ کر بتاؤں گی۔'' شفق کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''موقع اچھا ہے...... اس کو یوں سوچنے میں ضائع مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے، ایک دو دن میں بتا دوں گی۔''

''ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔'' وہ پُرشوق لہجے میں بولا۔ سہیل اسے لینے آیا مگر قدرے خفا لگ رہا تھا۔

''تم ناراض کیوں ہو...... کیا بات ہے؟'' شفق نے اس کے تیور دیکھ کر پوچھا۔

''تم مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو...... کیا تمھیں خود معلوم نہیں کہ تم کتنی بدل گئی ہو۔ تم

پہلے والی شفق نہیں لگتیں...... تمھارے لہجے میں کتنی بے باکی آتی جا رہی ہے اور باتوں میں عجیب سی بناوٹ...... تم وہاں کیا کرتی رہتی ہو۔''

''کچھ بھی نہیں، تم تو خواہ مخواہ میرے بارے میں مشکوک رہتے ہو۔''

''میں نہیں، ملک صاحب پوچھ رہے تھے۔''

''کیا پوچھ رہے تھے؟'' اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''تم کہاں جاتی ہو...... اور کس لیے......''

''اچھا...... تو انھیں فرصت مل گئی......؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''ہاں، وہ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔''

''بڑی بات ہے، آج کل ان کی رینج میں اور کوئی نہیں......؟''

''کیا فضول باتیں کرتی ہو۔'' وہ خشمگیں لہجے میں بولا۔

''بات تم نے خود ہی شروع کی ہے۔''

''یہ بتاؤ، تم کب تک یہاں آتی رہو گی؟''

''معلوم نہیں لیکن میں اب خود ہی آیا کروں گی...... میں تمھیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' وہ اب طیش میں آ چکا تھا۔

''زویا کہہ رہی تھی اس کا ڈرائیور......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''نام مت لو...... اس خبیث کا میرے سامنے......''

''آخر تم کیوں زویا سے اتنے الرجک ہو؟''

''بس تم کہیں نہیں جایا کرو گی...... جہاں بھی جانا ہوگا، میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔''

اس کے جواب سے اسے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ وہ اس کو کیسے سمجھاتی کہ عابد سے اس کی کمٹمنٹ ہے مگر عابد کا نام لے کر وہ اسے مزید غصہ نہیں دلانا چاہتی تھی۔

''تمھارے ایگزامز کب ہیں؟''

''ابھی ایک دو ماہ ہیں۔''

''شکر ہے یہاں سے تو جان چھوٹے گی۔'' وہ اس کا جواب سن کر ایک دم چونکی اور ذہن میں مختلف جواز ڈھونڈنے لگی۔ سہیل اس کی تنہائیوں کا قابل اعتماد ساتھی رہا تھا۔ وہ اکثر اپنا غصہ اس پر نکالتی اور وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کر جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کتنی تنہا اور اداس تھی۔ وہ اس سے عمر میں دس سال بڑا تھا۔ سمجھدار تھا۔ اس لیے اس کو اچھی طرح سمجھتا

تھا۔ اس کی حماقتوں اور بدتمیزیوں کو نظرانداز کرتا تھا۔ اسے محبّت سے اور ڈانٹ سے سمجھاتا تھا۔ وہ اس سے بے شمار شکوے شکایتیں کرتی۔ اپنی ہر ہر بات اس کو سناتی۔ اپنی سہیلیوں کی کالج کی، ٹیچرز کی، کوئی بھی بات اس سے نہ چھپاتی۔ مگر جب سے وہ زویا کے گھر جانا شروع ہوئی تھی، وہ اسے کوئی بات نہیں بتاتی تھی۔ نہ زویا کی نہ اپنی مصروفیت کی اور سہیل اس بات کو بہت محسوس کر رہا تھا۔ وہاں ایسا کیا تھا جو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی اور اچانک وہاں خود جا کر وہ اسے غصہ نہیں دلانا چاہتا تھا۔ وہ کیسے اتنی جلدی بدل گئی تھی۔ اس کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے بالکل نیا وجود جنم لے رہا تھا۔

......۞......

سحر نہا دھو کر تیار ہو جاؤ، آج تمھارے لیے نئے کپڑے بھی خریدنے ہیں اور تمھیں پارلر بھی لے کر جانا ہے۔'' آفاق نے ایک دم مسکرا کر اس سے کہا تو وہ چونک سی گئی۔

''سچّی...... تم کتنے اچھے ہو۔'' وہ قدرے خوشی سے چلائی۔

پچھلی رات اس نے زندگی میں پہلی بار جتنی جسمانی اذیت سہی تھی، اب اس کی آواز اور خوشی میں اس کرب کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ کیا ہر عورت ایسی ہی سخت جاں اور ڈھیٹ ہوتی ہے۔ اتنی تلخیاں سہہ کر بھی ایک اچھی بات کی خاطر سب کچھ بھول جاتی ہے۔ اندر ہی اندر کتنے پروگرامز بناتی ہے، بلند و بانگ دعوے کرتی ہے کہ اب اس شخص کو کبھی زندگی میں منہ نہ لگائے گی جس نے اس کی انا کو کچلا ہے۔ اس کے وجود کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے درپے ہے مگر جب مرد صرف ایک دفعہ مسکرا کر دیکھتا ہے تو سارے گلے شکوے، دعوے ہوا ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک مسکراہٹ کی خاطر۔ ایک دلاسے کے بدلے، پھر وہی پہلے جیسی وفا، پہلے جیسی عنایتیں......اور محبتیں۔ یہ عورت بھی کیا مخلوق ہے؟ وہ مجرم بنا گاڑی چلاتے ہوئے خود ہی سوچ رہا تھا اور وہ اس کی ستم ظریفی پر مسکرا رہی تھی۔ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ اس نے ایک دفعہ بھی شکوہ نہیں کیا تھا۔ ایک دفعہ بھی اسے یاد نہیں دلایا تھا۔ مبادا وہ پھر کہیں ناراض نہ ہو جائے اور اگر وہ ناراض ہو گیا تو وہ زندہ درگور ہو جائے گی۔ یہ دنیا اور اس کی زمین اس کے لیے کتنی کم پڑ جائے گی، شاید اس کا کہیں بھی ٹھکانا نہ رہے۔

مرد اور عورت کی کتھا بھی کتنی عجیب و غریب ہے، نہ سلجھنے والی گتھی اور نہ سمجھ آنے والی۔ کیا ہر عورت ایسی ہی ہوتی ہے، سب کچھ بھولنے والی، ایک فقیرنی، کم ذات عورت میں

اتنا حوصلہ ہے تو اس تعلیم یافتہ میں اتنا بھی حوصلہ نہ تھا کہ خاموشی سے کچھ اور برداشت کر لیتی۔ اس نے خود ماں کو باپ سے مار کھاتے دیکھا تھا۔ اس کے ذہن میں سب کچھ نقش تھا اور وہ ایسی ہی مار منگتی کو مار کر اپنے بچپن کے شدید ہیجانی جذبات کا کتھارسس کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بھی کبھی منگتی کی طرح لب نہ کھولے تھے تو پھر اچانک وہ کیوں بدل گئی؟ اس نے کیوں اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''اوئے بابو! تو کوئی بات نئیں کرے ہے......کوئی اچھی اچھی بات کرناں......'' وہ قدرے لاڈ سے بولی۔

''کیا بولوں...... بولنے کے لیے کچھ ہو تو بولوں...... اور سنو، تم یہ اپنی زبان ذرا بدلو......'' وہ غصّے سے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

''میں کیوں بدلوں اپنی زبان...... جو بچپن سے سیکھا ہے وہ کیسے بدل دوں۔ میری بولی میرے علاقے کی ہے، میں کاہے کو بدلوں......؟''

''اب تمھیں اگر میرے گھر میں رہنا ہے تو اپنی زبان اور بولی کو بدلو...... ورنہ......'' اس نے غصّے سے گھور کر اسے دیکھا۔

''اچھا ٹھیک ہے، کوشش کرو ہوں۔'' وہ ایک دم اس کی دھمکی سے ڈر گئی۔ اس نے خود ہی اپنی پسند کے اچھے اچھے کپڑے اسے خرید کر دیے۔ پارلر لے کر گیا۔ اس کی کٹنگ کروائی، فیشل کروایا۔ سب کچھ ہو گیا۔ وہ تھوڑی سی بدلی، زیادہ نہیں۔ وہ پریشان ہو گیا۔ جب وہ بات کرتی، ماضی کی جھلک نمایاں ہو جاتی۔ وہ ماضی میں جس طرح لے میں سب سے اونچی بھرپور آواز لگاتی تھی، تو سوئے ہوئے بھی جاگ پڑتے تھے۔ یہ کم بخت منگتی صبح صبح آ کر بہت تنگ کرتی ہے، بہت شور مچاتی ہے۔ لوگ اسے گھرکتے۔

''ارے کون سا روز روز آتی ہوں۔ منگتی کو دو گے تو اللہ بہت دے گا۔'' وہ ہونٹوں کو پھیلا کر اور منہ کو کھول کھول کر بات کرتی تو اس کا دہانہ قدرے پھیل جاتا اور یہ دہانہ اب اتنا پھیل چکا تھا کہ بات کرتے یا ہنستے ہوئے کھٹ سے پورے بتیس دانتوں کی قطار کو بھرپور طریقے سے ظاہر کرتا۔

''ماضی کو کھرچ کھرچ کر صاف کرنا ہوگا۔'' آفاق نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

''باؤ، کیسی لگوں ہوں؟'' اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا پورا وجود مختلف قسم کے قیمتی باڈی اسپرے، ہیئر اسپرے وغیرہ سے معطر ہو رہا تھا۔ وہ کچھ رسپانس چاہتی

تھی۔ محبت بھرا لمس...... بھرپور...... پہلے وہ اپنے حقیر وجود کو اس کے قابل نہیں سمجھتی تھی اور آج تو وہ اپنے آپ کو قدرے اہم سمجھ رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ کچھ خود اعتمادی اور خوش فہمی بھی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی...... اور اس کی مسکراہٹ اسے زہر لگ رہی تھی۔

''اپنا آپ مت بھولو......'' اس نے اسے جھڑکا۔

''ہاں تو کیا ہوا میں...... واقعی میں تو بھول ہی گئی......'' وہ ایک دم خاموش ہوگئی اور سوچنے لگی۔ کبھی کسی کا ماضی بھی بدلا ہے۔ میں منگتی ہوں، منگتی فقیرنی۔ پہلے در در پر مانگتی پھرتی تھی، اب ایک ہی در کی پالتو کتیا ہوگئی ہوں۔ یہ کبھی مجھے سحر کہتا ہے تو کبھی منگتی کا ماضی یاد دلاتا ہے۔ دو متضاد نام، دو مختلف وجود۔ ایک بدن دو وجود۔ دو شخصیتیں، دو رخ۔ ہر رخ تکلیفوں سے بھرپور، منگتی فقیرنی مر گئی جس دن اس کی شادی ہوئی اور اب وہ سحر ہے۔ امیروں کی بہو اور امیرزادے کی دلہن۔ وہی کرنا پڑے گا جیسا وہ کہتا ہے۔ پہلا زوال ختم، جو فقیرا کہتا تھا، وہ کرتی رہی تھی، اب جو آفاق کہے گا، وہ کرنا پڑے گا۔ اب نہ جانے کیا کیا کچھ سہنا پڑے گا۔ اس نے دکھ سے سوچا۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو ہر ایک نے اس کی طرف چونک کر حیرت سے دیکھا۔ وہ پنک کاٹن کے اسٹائلش سوٹ اور باب اسٹائل ہیئر کٹ میں قدرے مختلف لگ رہی تھی۔

''سحر! تم اچھی لگ رہی ہو۔'' شفق نے قدرے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

شہزا نے بھی حیران کن نگاہوں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ اس نے کبھی بھی ان کے معاملات میں نہ دخل اندازی کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی رائے دینے کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دونوں بہن بھائی اسے کتنا ناپسند کرتے تھے۔ اس کی ہر بات کا الٹا مطلب لیتے تھے اور اس پر کتنا طنز کرتے تھے۔ شادی کے بعد اس نے ایک دو دفعہ فاصلے مٹانے کی کوشش کی مگر اسے برے رسپانس کا سامنا کرنا پڑا اس لیے وہ خاموش رہتی تھی۔

آفاق آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹا تھا۔ نہ جانے کیوں، آج اسے اس سے بہت محبت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کو اپنی ذات اور حیثیت بھولتے ہوئے وہ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور وارفتگی میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ ایک دم چونک کر اٹھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

''تم...... تمہاری یہ جرأت...... میرے بستر پر تم کیوں بیٹھیں...... اور تم کیوں اپنا

آپ بھول جاتی ہو۔ یہ کپڑے، یہ میک اپ، یہ خوشبوئیں کبھی بھی تمہارا سڑاندزدہ وجود نہیں بدل سکتیں......'' اس نے اس انداز میں جوتا اٹھا کر اسے مارنا شروع کیا جیسے بچپن میں اس نے ایک دفعہ باپ کو اس کی ماں کو مارتے دیکھا تھا۔ اسے تھوڑا تھوڑا یاد تھا، جب نانا ابا کوئی کاغذات لائے تھے اور اس کی ماں پہلی دفعہ کچھ بولی تھی۔ یونہی اس کے باپ کے بستر پر بیٹھ کر اس نے کچھ کہا تھا اور اسی طرح اس کے باپ نے اس کو دھنک کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا۔ کبھی اس کے گلے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوتا، کبھی اس کے بال کھینچتا اور وہ بغیر آواز نکالے روتی رہی۔ ساری رات روتی رہی اور صبح ہونے پر وہ پھر نارمل تھا۔

''آئی ایم سوری! نہ جانے کیوں تم جب بھی میرے سامنے آتی ہو، میں بدحواس ہو جاتا ہوں۔ سب کچھ بھول جاتا ہوں اور مجھے بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ میں بہت برا ہوں، آئی ایم ریئلی سوری! دیکھو، مجھے معاف کر دو۔ اوہ، تمہارا تو بہت خون بہہ گیا ہے۔ سر پر اتنی گہری چوٹ آئی ہے۔'' اس نے اس کی بینڈیج کی زخموں پر مرہم لگایا اور پہلی دفعہ اسے بستر پر لٹایا۔ وہ حیرت سے دیکھتی رہی، وہ اس کے قریب آیا۔

''تم مجھ سے محبت کرنا چاہتی ہو مگر میں...... میں تو محبّت ہی نہیں کر سکتا۔ مجھے محبت کرنا آتی ہی نہیں۔ کیا تم جانتی ہو محبّت کیسے کرتے ہیں؟ میں نے تو آج تک کسی کو محبّت کرتے بھی نہیں دیکھا۔ تم کیوں یہ سب کرنا چاہتی ہو، جو میں نہیں کر سکتا؟''

''کیا میاں بیوی محبت نہیں کرتے؟'' اس نے پہلی دفعہ لب کھولے۔

''کون سے میاں بیوی...... میں نے تو کسی میاں بیوی کو محبّت کرتے نہیں دیکھا۔ بس مارتے اور پیٹتے ہی دیکھا ہے۔'' وہ افسردگی سے بولا۔

''کس کو......کون کس کو مارتا ہے؟'' وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

''بس کچھ نہیں......مجھ سے سوال مت کیا کرو۔''

''میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتی۔ نہ یہ تمہارا خوبصورت کمرا، نہ تمہاری چیزیں، نہ دولت نہ گاڑی۔ ہم تو جھونپڑی میں پلنے والے لوگ ہیں۔ تھوڑے پر خوش ہونے والے۔ صرف مجھے ایک چیز دے دو۔'' اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

''کیا......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''صرف اپنے قریب آنے کی اجازت دے دو۔ جب تم مجھے دھتکارتے ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں انسان نہیں جانور ہوں۔ کوئی ذلیل کتیا ہوں، خارش والی۔ جس سے لوگ

دور دور بھاگتے ہیں۔ تم مجھے جتنا مرضی مار لیا کرو، جو مرضی کرو مگر یوں نہ کیا کرو۔'' وہ رونا شروع ہو گئی۔

''کیسے...... یہ سب......؟'' اس نے حیرت سے دیکھ کر کہا۔

''اس طرح......'' وہ اس کے سینے سے لگ گئی اور رونے لگی۔ محبت اور وارفتگی کا نیا انداز اس کے اندر ہیجانی کیفیت پیدا کرنے لگا۔ اس کے اندر جذباتیت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ پہلی دفعہ کسی کو اتنے قریب پا کر وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔

ہر رات پہلی سے زیادہ اذیت ناک ہوتی۔ وہ وحشی درندہ بن کر اسے خوب، مارتا، پیٹتا، جتنی اذیت دے سکتا، وہ اسے دیتا۔ شام کے ملگجے اندھیرے پھیلتے ہی اسے یہ خیال تنگ کرنے لگتا۔ ابھی بس ابھی...... چند لمحوں بعد وہ اس کے جسم کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دے گا۔ اس کا بدن اب اذیت سہنے کا عادی ہو رہا تھا۔ عورت بھی کتنی سخت جان اور ڈھیٹ ہوتی ہے۔ صرف روشن اور چمک دار صبح کی خاطر سب کچھ سہتی ہے۔ جب وہ نارمل ہوتا، اس کی مرہم پٹی کرتا، اسے دوائیں دیتا تو وہ خوش ہو جاتی اور سارا دن پُرسکون سوئی رہتی اور وہ باہر گھومتا رہتا۔ یہ کیسی زندگی تھی، جس کا نہ کوئی مقصد تھا، نہ کسی حاصل کی تمنا۔ وہ کیا کر رہے تھے۔ زندگی گزار رہے تھے یا پھر گزارہ کر رہے تھے مگر وہ مجبور تو نہ تھے۔ ایک دوسرے کو چھوڑ سکتے تھے۔ آفاق اس کو چھوڑ سکتا تھا مگر وہ نہیں۔ اب تو کسی قیمت پر بھی نہیں۔ وہ اس سے شدید محبت کرنے لگی تھی، ایسی محبت جس میں نفرت زیادہ تھی اور محبت کم۔ جس میں لمس کم اور اذیت زیادہ تھی۔ ایسی محبت جس نے اس کے وجود کو...... اور اس کی روح کو زخمی کر چھوڑا تھا مگر وہ صرف اس کے محبت بھرے لمس کو یاد رکھتی باقی سب کچھ بھول جاتی، اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ ہر مرد، ہر عورت کے ساتھ ایسا ہی کرتا آیا ہے یا پھر صرف وہی؟ مگر اس نے اپنے باپ فقیرے کو بھی اس کی ماں کو مارتے دیکھا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کی طرح ڈھیٹ تھی۔ تو مرد چاہے جھونپڑی کا ہو یا محل کا۔ وہ کبھی بھی نہیں بدلتا اور عورت بھی نہیں بدلتی۔ چاہے کٹیا میں سوئے چاہے آراستہ بیڈ پر۔ اس کا وجود ایک جیسا حقیر ہی رہتا ہے۔ نہ کبھی محبت بدلتی ہے اور نہ نفرت۔ وہ زیادہ تر وقت خاموش رہتی، کسی سے بھی کوئی بات نہ کرتی۔ آفاق سے بھی بہت کم......

''سحر! تم ٹھیک ہو نا؟'' شفق نے اسے بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا اور وہ اسے بہت مختلف لگ رہی تھی، بہت سنجیدہ اور خاموش سی۔

''ہاں......'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''کیا بات ہے؟ تم کچھ بولتی نہیں۔'' شفق نے اسے کریدنا چاہا۔

''کیا کہوں...... کہنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں......''

''تم اداس لگ رہی ہو؟''

''نہیں، ٹھیک ہوں۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''سحر، تم مجھ سے ہر بات کر سکتی ہو'' شفق نے اسے اعتماد بخشا۔

''کیا بات؟ کہنے کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔''

''آفاق تمھارے ساتھ ٹھیک ہے...... میرا مطلب ہے......؟''

''ہاں، بہت اچھا ہے۔'' وہ قدرے اداسی سے بولی۔

''تم بہت بدل گئی ہو!''

''عورت ذات تو بدلتی ہی رہتی ہے، ہر گھڑی...... ہر وقت...... میں پہلے بچی تھی تو اور تھی، بڑی ہوئی تو اور ہو گئی، اب شادی ہو گئی تو اور ہو گئی۔ میں نئے جنم لیتی ہوں تو پہلے والی مرتی جاتی ہوں۔ مرنے تک بدلتی ہی رہوں گی۔ معلوم نہیں عورت ذات کیوں اتنا بدلتی ہے۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا تو شفق اس کی بات سن کر چونک گئی۔

''سحر! تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ تم نے...... میرا مطلب ہے کس سے یہ باتیں سیکھی ہیں؟''

''سیکھنی کہاں سے ہیں، یہ تو آپ ہی آپ اندر سے آتی ہیں اور جو اندر سے آتی ہیں۔ ان کو سکھانے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ پتا نہیں کہاں سے آتی رہتی ہیں!'' وہ بولتی گئی۔

''ہاں...... تم صحیح کہہ رہی ہو۔ عورت لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ نئی سوچ کے ساتھ نیا وجود جنم لیتا ہے۔ پہلا وجود ماضی بن جاتا ہے اور ماضی تو دفن ہی ہونے کے لیے ہوتا ہے...... اس کا بدلنا تو یقینی ہے۔''

شفق نے کہا تو وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

......۞......

اس کی قربت نے اس کے اندر کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ وہ اک نئے لمس سے آشنا ہوا تھا۔ وہ لڑکیوں کو دور دور سے چھیڑنے اور ٹیز کرنے کا عادی تھا مگر یوں کسی کو قریب سے محسوس کرنے کا اتفاق اسے نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر خود ہی جھنجلا جاتا۔ کیا یہ محبت ہے یا پھر سیکس...... جو بھی ہے، کیا اتنی قربت کے بعد کسی کو چھوڑنا ممکن ہے......؟ اتنا سب کچھ ہونے کے

باوجود...... وہ اس کے سامنے کارپٹ پر بیٹھی تھی اور وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں...... شاید آنے والے دنوں کے بارے میں...... جب تم مجھے چھوڑ دو گی...... یا پھر میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔''

''خدا نہ کرے!'' وہ تڑپ کر اس کی طرف بڑھی۔

''کیوں...... ایسا کیوں نہیں ہوگا؟''

''آفاق......! میں تمھیں مر کر ہی چھوڑوں گی۔ میں تمھارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔''

''جھوٹ مت بولو۔ تم سب عورتیں جھوٹ بولتی ہو۔ تم سب چھوڑ جاتی ہو۔ جھوٹی محبتیں کرتی ہو اور پھر......''

''یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو اور کس کی کرتے ہو......؟''

''میری آنکھوں نے بڑی انہونی باتیں اور کربناک منظر دیکھے ہیں۔''

''مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''نہیں۔''

''کیوں......؟''

''تم سمجھ نہیں سکو گی۔''

''میرے پاس دماغ ہے جواب پہلے سے زیادہ سوچتا ہے اور سمجھتا بھی ہے۔''

''مگر وہ کچھ نہیں سمجھ سکے گا جو میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔''

''آنکھیں تو ہر وقت کچھ نہ کچھ دیکھتی ہی رہتی ہیں اور ہر منظر پہلے سے مختلف ہی ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوتا......؟''

وہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ واقعی بدل چکی تھی۔ پہلے سے کتنی مختلف...... اس کی آواز، لب و لہجہ، قوت انسان کو بدلنے کے درپے ہوتی ہے۔ یہ سڑکوں پر مانگنے والی بھکارن...... غلیظ، بدگو، ہذیان بکنے والی منگتی...... گندگی اور تیل سے اٹی۔ جس کے سائے سے ہی لوگ دور بھاگتے تھے۔ اسے دور سے ہی دھتکارتے تھے۔ اسے گندی گالیوں سے نوازتے تھے وہ کبھی مسکرا کر گزر جاتی تو کبھی اس سے بھی بڑھ کر گالیاں دیتی۔ اب کتنی بدل چکی تھی۔ اس وسیع و عریض گھر میں آنے سے اس کا پہلا وجود مٹ چکا تھا۔ اب وہ اس

کے وجود کا حصّہ بن چکی تھی۔ اس نے اس کو کیسے خود بخود آپ ہی آپ منتخب کر لیا تھا۔ بے سوچے سمجھے گندگی کو اپنے وجود پر مل لیا تھا، تعفن سے بھرپور۔ سڑاند سے اٹا ہوا۔ تف ہے تم پر...... ملک آفاق منصور، تف ہے۔ زندگی کے اس سفر میں تمھیں گندگی کا یہی ڈھیر پسند آیا۔ تم واقعی اس کے ہی قابل تھے...... یا پھر...... تم اس کے سحر میں آ گئے اور خود ہی اسے سحر کا نام بھی دے دیا۔ بہت بے وقوف نکلے، اس کے گلے میں پھانس سی اٹکنے لگی اور وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

......✿......

''شفق! اگر تم ماڈلنگ شروع کر دو تو بہت کامیاب رہو گی۔'' زویا نے مشورہ دیا۔

''میں...... اور ماڈلنگ! کیوں مذاق کرتی ہو۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''یقین مانو، تم اچھی ماڈل بن سکتی ہو۔ تمہارا فیس کٹ...... تمھارے فیچرز...... تمہارا فیگر سب اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔''

''زویا! تم کیوں اس کو ایسا کام کرنے کو کہہ رہی ہو۔ معلوم بھی ہے اس کے گھر والے......'' عابد نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''عابد! یہ تم کیا ہر بات میں میرے گھر والوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہو۔ یہ میری لائف ہے اور اس میں انٹرفیئر کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔''

''اوکے...... اوکے، ڈارلنگ! ریلیکس......'' زویا نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''زویا! میں ماڈلنگ ضرور کروں گی۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں عابد کی طرف دیکھتے ہوئے زویا سے مخاطب ہوئی اور پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

''گڈ! تم نے اس کی کمزوری پکڑ کر واقعی اچھا کام کیا ہے۔'' زویا نے عابد کو داد دی اور دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ دونوں شاطر ذہن رکھتے تھے اور معصوم ذہنوں کو کس طرح مسخ کیا جا سکتا ہے، یہ فن انھیں خوب آتا تھا۔ دونوں ہنستے ہوئے اس کے پیچھے باہر آ گئے۔

''آئی ایم سوری! میرا مطلب تمھیں ہرٹ کرنا تو نہیں تھا۔'' عابد منہ بنا کر بولا۔

''اوکے...... اٹس آل رائٹ!'' وہ خفگی سے بولی۔

''تم ہر بات پر کیوں فلیئر اپ ہو جاتی ہو۔ تم بہت حساس ہو۔ اتنا نچی ہونا اعصاب کے لیے بہت خطرناک ہوتا ہے۔'' وہ اب اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

''یار! یہ کیا...... تم تو مذاق بھی نہیں سہہ پاتیں؟'' زویا نے بھی لقمہ دیا۔

''مذاق...... مزاح، طنز یا شوخیاں...... ان سب کا میری زندگی میں کوئی عمل دخل

نہیں۔اس لیے مجھ سے سپاٹ لہجے میں سیدھی بات کیا کرو......''

''اوکے ڈیئر! آئندہ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جو تمھیں دکھ دے۔'' عابد نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا تو وہ مسکرا دی۔

''آؤ، اب بینڈ مکمل ہو چکا ہے، ایک گانا تو گائیں۔'' عابد نے کہا۔

''کون سا......؟'' زویا نے پوچھا۔

''وہی......''

زندگی کی راہ میں
جو مل جائے تجھ سا حسین

شفق کا موڈ کافی بہتر ہو چکا تھا۔ عابد گٹار لیے اس کے اردگرد منڈلا رہا تھا اور وہ قدرے محظوظ ہو رہی تھی۔ محفل عروج پر تھی جب سہیل اسے لینے آ گیا۔

''یار! اپنے اس ڈرائیور سے جان چھڑاؤ......کیا پروانے کی طرح ہر وقت تمھارے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ لگتا ہے تمہارا ڈرائیور نہیں کچھ اور ہو۔ بہت پوزیسیو ہے تمھارے بارے میں۔ اگر یہ یونہی اسی طرح تمھیں واچ کرتا رہا تو تم کچھ بھی نہیں کر پاؤ گی اور سنو، کل کنسرٹ ہے۔ اس کا بندوبست کر کے آنا......'' زویا نے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سہیل بھی روٹھا روٹھا سا لگ رہا تھا۔ دونوں خاموش رہے۔ وہ ساری رات پلاننگ کرتی رہی۔

اگلے دن وہ پھر اسے چھوڑنے گیا۔ وہ اس کی تیاری دیکھ کر چونک گیا۔ ''کیا آج وہاں کوئی پارٹی ہے......؟'' سہیل نے اس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ن......نہیں تو......'' وہ اچانک چوری پکڑے جانے پر ہکلانے لگی۔

''کب آؤں......؟'' اس نے اسے ڈراپ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آٹھ بجے......'' وہ مسکرا کر بولی اور وہ گاڑی لے کر آگے چلا گیا۔

''خان......رات کو آٹھ بجے یہ ڈرائیور مجھے لینے آئے تو کہنا کہ میں ابھی ابھی گھر چلی گئی ہوں کیونکہ میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔''

چوکیدار نے اس کی بات پر اسے طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ وہ اندر کی تمام باتوں کو سمجھ گیا ہے۔

''ہاں بھئی تیار ہونا سب......!'' عابد نے اسے آتا دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں۔'' زویا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''شفق تم کون سا ڈریس پہنوگی؟'' زویا نے معنی خیز اور تنقیدی نگاہوں سے اس کے لباس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یہ ٹھیک تو ہیں۔ ابھی کل ہی تو بوتیک سے نیا خریدا ہے۔''

''اوہ نو...... '' ایسے پارٹی ڈریسز کنسرٹ کے لیے موزوں نہیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔'' وہ بلیک لیدر جینز کے ساتھ سلیولیس نیٹ کا بلاؤز لے کر آئی۔

''کیا میں...... یہ پہنوں گی!'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''یار تم نے تو ماڈلنگ بھی کرنی ہے۔ اس میں تو بہت مختلف ڈریسز پہننا پڑتے ہیں۔ اگر اس طرح جھجکتی رہیں تو کچھ بھی نہیں کرسکو گی۔'' زویا منہ بنا کر بولی۔

''میں جھجک نہیں رہی۔ لاؤ ابھی پہنتی ہوں۔'' جب وہ ڈریس پہن کر نکلی تو جھینپ سی رہی تھی۔ جیسے پہلی دفعہ گناہ یا غلطی کرنے پر کسی کا اندر سرزنش کرتا ہے اور انسان شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ وہ بھی سمٹ رہی تھی۔ اپنا نیم عریاں جسم دیکھ کر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

''گڈ...... بہت خوبصورت لگ رہی ہو...... اور سنو یہ پونی بھی کھول دو۔ میں اپنی بیوٹیشن کو بلاتی ہوں، وہ تمہارا میک اپ بھی کر دے گی۔'' اس نے موبائل پر فوراً نمبر ملایا۔ وہ بات کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''ویری اسمارٹ......'' عابد کن انکھیوں سے اسے دیکھتا ہوا اس کے پاس آ گیا اور اس کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیے۔ وہ چونک سی گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گرفت میں تھی۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' وہ گھبرا کر بولی۔

''جب تم ہی مدہوش کرنے کے درپے ہو تو کیا کروں؟'' وہ مسرور سا ہو کر بولا۔

''وہ بس آ رہی ہے۔'' زویا بولتی ہوئی اندر آئی۔ تب تک وہ اس سے علیحدہ ہو چکا تھا اور وہ غصّے اور شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

''یہ تمھیں کیا ہو رہا ہے۔ بابا فرسٹ ٹائم تم نے یہ ڈریس پہنا ہے نا۔ اس لیے نروس ہو رہی ہو۔ ادھر بیٹھو اور یہ پانی پیو۔'' اس نے گلاس میں پانی ڈال کر اس کے آگے بڑھایا۔ پانی پیتے ہوئے اس کے ہاتھ مسلسل کانپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوٹیشن آئی اس نے تو اس کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ وہ آئینے میں بار بار دیکھ رہی تھی۔ ہر زاویے سے مختلف لگ رہی تھی۔ نیا رخ...... نئی شخصیت...... نیا وجود...... جو نئے احساسات لیے ابھی ابھی جنم لے رہا تھا۔

''اگر تمھیں زیادہ گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے تو تم میرا بلیک گاؤن اوپر پہن لو۔'' زویا نے اس کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ دیکھ کر کہا۔

''یار اس طرح تو نہیں چلے گا۔ تمہارا پہلا کنسرٹ ہے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں پھر گھبراہٹ کیسی۔ تم میرے ساتھ گاؤ گی اور گانا کیا ہے۔ بس میرے ساتھ گنگنانا ہی تو ہے۔'' عابد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ نظریں جھکائے سب کچھ خاموشی سے سن رہی تھی۔ وہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مبادا کہیں پھسل نہ جائے۔

''سات بجے ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔'' عابد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو نہیں جا رہی۔ میری کمٹ منٹ کہیں اور ہے۔'' زویا اٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب...... میں تمھارے بغیر قطعی نہیں جاؤں گی۔'' وہ بے صبری سے بولی

''ڈونٹ بی سلی۔ بی کونفیڈنٹ۔ کب تک دوسروں کے سہارے چلو گی۔ خود چلنا سیکھو۔'' زویا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ خاموشی سے دونوں کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگی۔ اس لمحے اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ان دونوں کے درمیان شٹل کاک بن گئی ہو۔

''یہ ٹشو پیپر لو اور اپنا پسینہ پونچھو۔ ابھی تو کنسرٹ شروع نہیں ہوا اور تم اتنی نروس ہو رہی ہو۔ ویسے آج تو تم قیامت لگ رہی ہو۔ یوں لگ رہا ہے جیسے چاند سارا حسن سمیٹ کر زمین پر اتر آیا ہے۔ مجھے تو قطعی یقین نہیں تھا کہ تم اس قدر حسین بھی لگ سکتی ہو۔ میں تمھیں دیکھتا ہوں تو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔'' عابد بہت رومینٹک موڈ میں بول رہا تھا اور اس کا دل اس کی باتوں پر دھڑک رہا تھا۔ عابد گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ ونڈو کار سے باہر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''تم اس قدر نروس کیوں ہو رہی ہو؟''

''نن...... نہیں...... شاید یہ میری زندگی کا پہلا شو ہے۔''

''ہاں سمجھتا ہوں...... مگر میں ہوں نا پھر کیسی پریشانی۔ جب گرنے لگو گی تو میری بانہیں تمھیں فوراً سمیٹ لیں گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ مزید گھبرا گئی۔ اسے نہ جانے کیوں عابد سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ اپنی لمٹس کراس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے قبل اس نے اسے ایک میوزیشن، سنگر اور زویا کے دوست کی حیثیت سے عزت دی تھی۔ اسے اس سے کوئی محبت نہیں تھی۔ محبت تو وہ صرف سہیل سے کرتی تھی۔ ایک لمحے کو اسے یوں احساس ہونے لگا جیسے سہیل اسے صحیح بات پر ڈانٹتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کیسے لوگ تھے۔ اسے زویا پر

بھی غصہ آ رہا تھا۔ جو پہلے تو اتنے دلار سے بلاتی تھی اور اب کیسے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ پورے بینڈ کے ساتھ اسے اکیلے بھیج دیا تھا۔ اسے زویا کی کوئی چال سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے اندر شدید خوف طاری تھا۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ایک تو اسے ایسا ڈریس پہنا دیا تھا دوسرے عابد اس کے ساتھ تھا۔ گو کہ اس نے گاؤن پہن رکھا تھا مگر اپنی عریانی سے وہ اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہ بار بار گاؤن ٹھیک کر رہی تھی۔

''یہ گاؤن تم اتار کیوں نہیں دیتیں۔ اتنی اسمارٹ لگ رہی تھیں۔ خوامخواہ یہ فضول سا گاؤن پہن لیا ہے۔'' عابد اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے بولا۔

''نہیں...... میں اسی طرح ٹھیک ہوں۔'' اس نے پہلو بدل کر کہا۔

''کنسرٹ شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ مختلف نئے پرانے گروپس ریہرسل میں مصروف تھے۔ اوپن ایئر میں کافی زیادہ کراؤڈ جمع ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں لوگوں پر ہی تھیں۔ اسے بار بار یوں احساس ہو رہا تھا جیسے اس نے یہاں آ کر فاش غلطی کی ہو۔ عابد اس کو بار بار آبزرو کر رہا تھا۔ کنسرٹ سے پہلے سب نے ڈرنک کی۔ عابد نے اسے بھی گلاس تھمایا تو وہ چونک گئی۔

''نہیں...... میں یہ نہیں پیوں گی۔'' وہ درشتی سے بولی۔

''یہ بہت ضروری ہے۔ سرور اور مستی کے لیے۔ آڈینئس جوش چاہتی ہے۔ تھرل چاہتی ہے اور اس کے بغیر ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تم دیکھنا ایک دم کتنا کونفیڈنس آ جائے گا اور تم اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرو گی۔ بہت اوپر میرے سنگ...... بادلوں میں......''

''خدا کے لیے۔ پلیز آئی ڈونٹ وانٹ اٹ......'' وہ ملتجیانہ انداز میں بے بسی سے بولی۔

''یہ بہت ضروری ہے اور یوں سب کے سامنے تماشا مت بنو۔ لو شاباش۔'' اس نے زبردستی گلاس اسے تھمایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دفعہ پھر بے بسی سے آنسو تیرنے لگے۔

''یہ نمی، یہ اداسی سب ختم ہو جائے گی۔ بس ایک دفعہ پی کر تو دیکھو۔'' اس نے بغیر کچھ کہے سنے وہ گلاس پی لیا۔ اس کے بعد وہ کہاں تھی اور کیا کچھ ہوا اسے یاد نہیں تھا۔ بس شور ہنگامہ مستی اور جوش ہی جوش تھا۔ وہ کب اور کیسے گھر پہنچی اسے کچھ یاد نہ تھا۔

......✿......

باہر عجیب و غریب قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سحر کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی گیٹ کو

عجیب انداز سے دھکا دے رہا تھا اور پھر جیسے کسی کے گرنے اور گاڑی کی چرچراہٹ کی آواز آئی۔ اس نے آفاق کی طرف دیکھا وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ شزا مری بچوں سے ملنے گئی ہوئی تھی اور منصور نہ جانے کہاں تھا۔ اسے شفق کی فکر تھی وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ دبے قدموں سے باہر نکلی اور شفق کو گیٹ کے سامنے دیکھ کر چونک گئی۔ چوکیدار آج ہی چھٹی لے کر گیا تھا۔ وہ شفق کو اندر لے کر آئی تو چونک گئی۔ وہ نشے میں دھت تھی۔ گاؤن اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا بلاؤز جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کی حالت کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ سحر کو اس کی حالت دیکھ کر شدید دکھ ہو رہا تھا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ اس سے بالکل بے خبر تھی۔ وہ اسے اس کے کمرے میں لے کر آئی اس کے کپڑے بدلے اور اسے اس کے بستر میں لٹا دیا اور خود اپنے کمرے میں آ گئی۔ شفق کی حالت بار بار اس کے سامنے آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اسے اس گھر میں صرف شفق ہی تو اچھی لگتی تھی اور وہ کس حالت کو جا پہنچی تھی۔ اس گھر کی حالت تو اس کی جھونپڑی سے بھی بدتر تھی۔ اسے یاد تھا جب تک اس کی ماں تھی وہ بہت بڑی ڈھال تھی اس کے لیے شاید یہ بچے تو بغیر کسی سہارے اور ڈھال کے پروان چڑھے تھے۔

ایسے لوگوں کا کیا مستقبل ہوتا ہے۔ اس گھر کا تو شیرازہ بالکل بکھر چکا تھا اور ابھی نہ جانے کیا کچھ ہونا باقی تھا۔ وہ ساری رات نہ سو سکی۔ دکھ کی شدید لہریں اس کے وجود کو تہہ و بالا کر رہی تھیں۔ یہ کیسا گھر اور کیسے لوگ تھے۔ ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز۔ کسی کو کسی کا کوئی احساس نہ تھا۔ نہ تعلق نہ واسطہ۔ ہر کوئی اپنی ذات میں مگن ایسا تو وہاں بھی نہیں ہوتا تھا جہاں سے وہ آئی تھی اور جو معاشرے کا رذیل ترین طبقہ سمجھا جاتا تھا مگر جہاں محبت کسی کھوٹ کے بغیر تھی اور یہ معاشرے کا اعلیٰ طبقہ تھا جہاں نہ محبت کا وجود تھا اور نفرت کا وجود بھی بہت مبہم اور مشکوک تھا۔ دوپہر بارہ بجے آفاق ناشتا کر کے باہر جا چکا تھا۔ اس نے شفق کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا اور نہ ہی اس نے بتانا مناسب سمجھا۔ آفاق باہر گیا ہی تھا کہ سہیل پریشان سا کمرے میں داخل ہوا۔

’’سحر بی بی، وہ شفق......؟‘‘ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

’’ہاں، وہ اندر سو رہی ہے۔‘‘ وہ جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔

’’اچھا...... کب آئی......؟‘‘ اس کا چہرہ ایک دم کھل گیا۔

’’تمہارے جانے کے فوراً بعد۔‘‘ اس نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا، میں تو ساری رات پریشان رہا۔ سحر بی بی آپ شفق کو ان لوگوں سے ملنے مت دیا کریں۔ وہ اچھے لوگ نہیں اور وہ زویا تو پوچھیں مت کیسی نجاست ہے؟'' سہیل قدرے پریشانی سے بولا تو وہ اس کو اس کے لیے یوں پریشان دیکھ کر چونک سی گئی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ آہ بھر کر بولی اور وہ مطمئن سا لوٹ آیا۔

وہ اٹھ کر اس کے کمرے میں گئی۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ اسے آوازیں دیتی رہی مگر اسے کوئی ہوش نہ تھا۔

شام کے سات بج رہے تھے۔ جب اس کی آنکھ کھلی اس کا سر قدرے بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں سرخ۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ سحر لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو کیسی ہو؟'' شفق سوئی سوئی آواز میں بولی۔

''ادھر آؤ میرے پاس۔'' سحر نے اسے پیار سے اپنے پاس بلایا۔

''سحر مجھے چائے چاہیے۔'' وہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اچھا میں بابا کو کہتی ہوں۔'' وہ کک کو چائے کا کہہ کر اس کے پاس آ گئی۔

''شفق تم رات کو کہاں سے آئی تھیں؟'' سحر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں؟'' شفق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یونہی پوچھ رہی ہوں۔ کیونکہ اس سے پہلے تو تمھیں ایسے لباس...... نشے اور اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا۔''

''نشہ اور کیسی حالت؟'' وہ ایک دم اچھل کر بولی۔

''تمہارا سارا لباس پھٹا ہوا تھا اور تمہاری حالت ناقابل بیان تھی پھر میں نے یہ ڈریس تمھیں پہنا دیا۔''

''اوہ گاڈ...... یہ سب کیا ہو گیا؟'' وہ شرمندگی سے ہونٹ چبانے لگی۔ خوف، دکھ، شرمندگی اور ذلت کے گہرے سائے اس کے چہرے پر چھانے لگے۔ چائے اس کے سامنے رکھی تھی اور وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کو کچھ یاد نہیں تھا۔

''کیا تمھیں واقعی کچھ یاد نہیں؟'' سحر نے حیرانی سے پوچھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سحر اسے دلاسا دینا چاہتی تھی۔ اس کی دل جوئی کرنا چاہتی تھی مگر اس کے پاس ایسے الفاظ ہی نہیں تھے جو زخموں پر مرہم جیسا کام کر سکیں۔ اسے یوں دکھی دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ شفق اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ وہ کیا سے کیا

ہوگئی تھی۔اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔دل پھٹنے کو بے تاب تھا۔یوں لگ رہا تھا جیسے سب کچھ چھن گیا ہو۔شرم وحیا، تقدس، بھرم، عزت، لاج وہ تو راکھ سے بھی زیادہ کم وقعت ہوگئی تھی۔وہ کن لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔وہ جو معاشرے میں اپنا مقام ڈھونڈنے نکلی تھی۔اپنے آپ کو منوانے، اپنی حیثیت جاننے۔اپنے وجود کی تشفی کے لیے......اور اسے بدلے میں کیا ملا تھا۔

''تف ہے تم پر شفق منصور! تم نے بہت گھاٹے کا سودا کیا۔'' وہ مسلسل اپنے آپ کو ملامت کررہی تھی۔ایسا دکھ جو وہ کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔اس کی روح تک اس سے گھائل ہو رہی تھی۔ایک دم فون کی گھنٹی بجنے لگی۔اس نے فون اٹھایا تو عابد بول رہا تھا۔اس کی آواز میں بہت ایکسائٹمنٹ تھی۔

''ہیلو ڈارلنگ، تمھیں خوشخبری سنانا تھی۔ہمارا کنسرٹ بہت کامیاب رہا اور تمہارا ڈانس بھی لوگوں نے بہت پسند کیا اور تم نے جو مجھے مدہوش کیا وہ تو میں بتا ہی نہیں سکتا۔ابھی تک اس کے سحر میں ہوں۔کب آرہی ہو؟ میں بہت بے چین ہو رہا ہوں۔'' اس کی آواز میں مستی سی تھی۔

''بہت جلد......مگر آؤں گی ضرور۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔اسے خود ہی حماقت سی محسوس ہونے لگی کہ اس نے کیوں وہاں دوبارہ جانے کا سوچا تھا۔جبکہ وہ اس کو دلدل میں اتار چکا تھا۔

......۞......

وہ آفاق کی آمد کی شدت سے منتظر تھی۔شام کے سائے رات کی تاریکی کو اپنے وجود میں سمیٹنے کے لیے تیزی سے کوشاں تھے۔وہ کھڑکی سے باہر پھیلتی تاریکی کو دیکھ کر خوف زدہ ہو رہی تھی۔کہیں آج وہ پھر اسے روئی کی طرح دھنک کر نہ رکھ دے لیکن نہیں......آج نہیں۔آج میں اسے بہت بڑی خوشخبری سناؤں گی۔شاید وہ مجھ سے محبت کرنے لگے۔میرے وجود سے اس کی شناسائی بڑھنے لگے۔میرے وجود کو پھر وہ اپنے اندر سمیٹ لے۔اس کے لبوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔آفاق رات کو بہت دیر سے آیا۔اس کے چہرے پر قدرے مایوسی اور غصہ سا چھایا تھا۔وہ آ کر اپنے جوتے اتارنے لگا۔وہ اس کے تیور تو دیکھ رہی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر اس کی طرف بڑھی اور اس کے جوتے اتارنے میں مدد کرنے لگی۔

''پیچھے ہٹو مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں!'' وہ غصّے سے بولا۔

''کیوں......کیا میں تمہاری بیوی نہیں؟'' وہ محبّت سے بولی۔

''یہ تم کیا ہر وقت بیوی بیوی کی رٹ لگائے رکھتی ہو۔ مجھے کیا بتانے کی کوشش کرتی رہی ہو۔ پتا نہیں کہاں سے تم میرے پلے پڑ گئی۔ گندگی سے بھرا وجود'' وہ کراہت سے بولا۔

''تم خود میری جھونپڑی تک گئے تھے میں تمھارے محل تک نہیں آئی تھی۔ لڑکیوں کو چھیڑنے کا تمھیں خبط تھا مجھے لڑکوں کے پیچھے جانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ آوارہ تم تھے۔ میرا تو دھندا ہی وہی تھا'' وہ بھی بہت دنوں سے ضبط کیے بیٹھی تھی۔ ایک دم غصّے سے پھٹ گئی۔ اس کی باتیں سن کر وہ ایک دم طیش میں آ گیا اور اس کی ایسی پٹائی کی کہ ساری زندگی کی مار اس کے سامنے کچھ نہ تھی۔ وہ اس کے پیٹ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا وہ مسلسل درد سے کراہ رہی تھی۔ اس کو ایک دم دھکا دے کر وہ باہر نکلی اور شفق کے کمرے کی طرف بھاگی۔ شفق اس کو اس حالت میں دیکھ کر چونکی۔ اس کے پیچھے کھڑا آفاق خوں خوار درندہ لگ رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' شفق نے زور سے ایک تھپڑ آفاق کے چہرے پر مارا۔

''تم ہمارے درمیان میں نہ آؤ'' وہ غصّے سے بولا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے تم سے میں بعد میں بات کرتی ہوں اور تم کیوں اتنا کراہ رہی ہو۔ چلو گاڑی میں، میں تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتی ہوں'' وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھا کر لے گئی۔ وہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کی جان ہی نکل جائے گی۔

''سحر ہمت کرو، یہ سب کیا ہے؟'' اس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''وہ باپ بننے والا تھا'' وہ بمشکل بولی۔

''اوہ گاڈ...... وہ کیسا ظالم نکلا'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اسے اسپتال کے ایمرجنسی روم میں رکھا گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ دیا جلنے سے پہلے ہی بجھ گیا تھا۔ مزید یہ کہ وہ کبھی زندگی میں دوبارہ ماں نہ بن سکے گی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ پہلے اس نے اپنے آپ کو کبھی بھی اتنا ذلیل اور بے وقعت نہیں سمجھا تھا۔ آج تو واقعی وہ منگتی ہو گئی تھی۔ در در سے بھیک مانگنے والی خالی جھولی لیے بیٹھی تھی۔ اب کوئی خیرات کسی کام نہیں آئے گی۔ وہ تو اس کے ظلم اور جفا کو بھی محبت سے تعبیر کرتی آئی تھی۔ اس کی مار پیٹ کو بھی محبت کا ایک رخ جانتی تھی اور کبھی بھی اس سے شکوہ کرنے کا سوچ نہیں سکتی تھی۔ اب تو اس نے اس کے وجود کا ثبوت ہی چھین لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سارے خواب ہی نوچ لیے تھے۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹیں ہی چھین لی تھیں۔ اب تک وہ کتنی دفعہ مری اور کتنی دفعہ

زندہ ہوئی تھی مگر اب کی بار تو ایسی مری تھی کہ زندہ ہونا مشکل تھا۔ آفاق آیا تو بالکل خاموش تھا۔ جیسے اس کے سامنے اس کا مجرم کھڑا تھا۔ اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیرلیا۔ وہ اس سے کبھی نفرت کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ہر رات وہ اسے اذیت دیتا تھا مگر وہ کبھی بھی اس سے نفرت نہ کرسکی اور اب نفرت کا ایسا بیج خود ہی اس نے بو دیا تھا۔ نہ جانے کب اس کے اندر سے وحشتیں اور درندگی کم ہوگی۔ نہ جانے وہ کیوں اسے لایا تھا اور کون اس کا ذمے دار تھا۔ نہ وہ باپ کی سنتا تھا نہ بہن کی۔ وہ بار بار اس سے سوری کر رہا تھا۔

''آفاق اب کسی قسم کے الفاظ مجھے بہلا نہیں سکیں گے۔'' وہ روتی ہوئی بولی۔

''آئی ایم سوری، مجھے تم نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا تو مجھے کیسے معلوم ہوتا۔''

''مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دیتے۔ میں تو اسی خوشی میں تمہاری منتظر تھی مگر تم تو بہت بڑے قاتل نکلے۔ تم نے اس کی بھی جان لے لی اور مجھے بھی جیتے جی زندہ درگور کر دیا۔ میرے وجود سے امید کی کرن بھی چھین لی۔ میں اب کس کے سہارے جیوں گی۔ عورت کی زندگی تو اس کی زرخیزی میں ہوتی ہے۔ بنجر وجود کیسے زندہ لاشوں کی طرح پھرتے ہیں تم مردوں کو کیا خبر...... میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' وہ روتے ہوئے بولی اور وہ شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

وہ ہاسپٹل سے گھر آ چکی تھی۔ ہر وقت زمین پر بیٹھی کمرے کے در و دیوار کو دیکھتی رہتی۔ شفق اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتی مگر بے سود...... اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں تھمتے تھے۔

''سحر تمھارے ساتھ جب اس نے پہلی دفعہ ایسا کیا تھا تو تم اس کو چھوڑ کر چلی کیوں نہ گئیں؟'' شفق نے محبّت سے اس سے پوچھا۔

''کیسے چلی جاتی اور کہاں چلی جاتی۔ بابا تو میرے دس ہزار وصول کر چکا تھا اور اب میں وہاں جاتی تو وہ مجھے ایک پل بھی نہ رکھتا کہ کہیں آفاق اس سے پیسہ نہ چھین لے۔ میرا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں کہاں جاتی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''مجھے قطعی علم نہ تھا کہ وہ اس حد تک دل گرفتہ ہو چکا ہے اور تم نے مجھے بھی کبھی نہیں بتایا۔''

''میں کیسے بتاتی۔ میں تو یہی سمجھتی رہی کہ میاں بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے باپ کو ماں کو مارتے دیکھا تھا۔ میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اب

میرے ساتھ ہو رہا تھا تو مجھے کیسے علم ہوتا مگر جب علم ہوا تب کیا ہو گیا؟'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''اب تم نے کیا سوچا ہے؟''

''سوچتے وہ ہیں جنھوں نے کچھ کرنا ہو۔ میری تو سانسیں بھی بکی ہوئی ہیں۔ میں کیسے سوچ سکتی ہوں اور کیا سوچوں؟''

''اس طرح تو زندگی نہیں گزرے گی۔ تم ٹھیک ہو لو میں تمھیں کسی کلب لے کر چلوں گی تاکہ تمہارا دل بہل جائے۔''

''اب اس دل کا بہلنا بہت مشکل ہے۔'' وہ یاسیت سے بولی۔

''اس قدر مایوسی ٹھیک نہیں۔ اپنے آپ میں ہمت پیدا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگی جبکہ وہ خود بھی ذرہ ذرہ بکھر چکی تھی۔ سہیل باہر آ چکا تھا اور اب مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔

''سحر تم آرام کرو۔ میں تھوڑی دیر تک آ جاؤں گی۔ میں سہیل کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔'' شفق بیگ احتیاط سے اٹھاتے ہوئے بولی وہ خالی خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

''تم آج پھر اس کی طرف جا رہی ہو۔'' سہیل نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بس آج آخری بار۔ اس کے بعد پھر کبھی نہیں۔'' وہ مطمئن لہجے میں بولی ''سہیل تم ادھر ہی کھڑے رہنا۔ بس چند منٹوں کی بات ہے۔ میں آ رہی ہوں۔'' وہ بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے جلدی سے باہر نکلی۔

وہ تیزی سے گیٹ عبور کر گئی کیونکہ اس وقت گیٹ پر چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

''آؤ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔'' زویا اور عابد اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر بولے۔

''مجھے بھی تم لوگوں سے ملنے کی جلدی تھی۔ اس نے جلدی سے ریوالور بیگ سے نکال کر سیدھا عابد پر فائر کیا۔ زویا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی طرف جھپٹنا چاہا مگر اس نے اس پر بھی فائر کر دیا اور ریوالور سمیت جلدی سے باہر نکلی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''گاڑی تیز چلاؤ۔'' اس نے سہیل سے کہا۔ اس کی آواز میں شدید کپکپاہٹ تھی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ اور ہونٹ خوف سے بالکل سفید ہو رہے تھے۔

''شفق یہ تم نے کیا کیا۔ کیا تم نے زویا کو ماردیا۔'' سہیل پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

''ہاں، اس کو بھی اور عابد کو بھی۔''

''کون عابد؟'' سہیل نے حیرت سے پوچھا۔

''تھا اس کا شیطان ساتھی......''

''شفق میں تمھیں بہت منع کرتا تھا۔'' سہیل نے شکوہ کیا۔

''اب اس کا خمیازہ میں نے ہی بھگتنا ہے نا!''

''انھوں نے تمھارے ساتھ کیا کیا؟'' وہ گاڑی تیز دوڑاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ کچھ نہ بول سکی۔ سہیل نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور آہ بھری۔

''اب کہاں جانا ہے؟'' سہیل تے پوچھا۔

''تھانے لے چلو۔''

''بے وقوف مت بنو۔ ملک صاحب کے الیکشن سر پر ہیں اور تمھارا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔'' سہیل متفکرانہ لہجے میں بولا۔

''کیا تمھیں مجھ سے زیادہ میرے باپ کی ساکھ کی فکر ہے۔''

''نہیں، تمھاری عزت کے جو پرخچے جلسوں میں اڑیں گے۔ میں وہ برداشت نہیں کر سکتا۔'' سہیل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں رہا۔'' وہ بے بسی سے بولی اس نے گاڑی خود ہی کچے پکے راستوں کی طرف کر دی۔ وہ کہاں جا رہی تھی اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اسے کہاں لے کر جا رہا تھا۔ اس نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کون اس کے بارے میں فکر مند ہوگا۔ اسے اس کی بھی پروا نہ تھی۔ اس کے لیے کچھ بھی پرابلم نہیں رہی تھی۔ نہ زندگی نہ عزت اور نہ اس کے تقاضے۔ اب وہ مکمل طور پر حالات کے رحم و کرم پر تھی۔

''ریوالور مجھے دو۔'' سہیل نے ریوالور اس سے لے لیا اور گاڑی کھڑی کر کے اسے کچی زمین میں دبا دیا۔

''تم کیوں مجھے بچانے کی کوشش کر رہے ہو؟'' شفق نے اس سے پوچھا۔

''کیونکہ تمھیں میں نے اپنے آپ سے بڑھ کر چاہا ہے۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

''مسز پیٹر آپ کا لیٹر آیا ہے۔'' وارڈن نے اسے خط دیتے ہوئے کہا۔ وہ خط لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور جلدی جلدی کھول کر اسے پڑھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کس کا خط تھا اسے ہمیشہ اسی خط کا تو انتظار رہتا تھا۔ ورنہ اب اس کی زندگی میں اور کیا باقی رہ گیا تھا۔ ولیم نے مزے مزے کی باتیں لکھی تھیں۔ وہ بار بار انھیں پڑھ کر مسکرانے لگی۔ ہر دوسری لائن میں آئی مس یو مام کا جملہ تھا۔ وہ خط پڑھ کر اسے چومنے لگی۔ اس کا دل اسے ملنے کو تڑپنے لگا۔

''مجھے اس سے ملنے جانا چاہیے۔'' اسی سوچ پر سوئی جیسے اٹک سی گئی تھی۔ اس نے اگلے ہی دن کالج میں چھٹی کی درخواست دے دی۔

''مسز پیٹر، آپ ایک ہی تو میتھس کی لیکچرار ہیں۔ اگر آپ بھی چھٹی پر چلی جاتی ہیں تو اسٹوڈنٹس کا بہت ٹائم ویسٹ ہوگا۔ آپ کا نعم البدل بھی تو کوئی نہیں۔'' پرنسپل نے اس کی درخواست پڑھتے ہوئے کہا۔

''میڈم وہ تو ٹھیک ہے مگر میرا بیٹا بہت ڈسٹرب ہے۔ میں آج شام کو جاؤں گی اور پرسوں واپس آ جاؤں گی۔ لاہور سے مری کا فاصلہ بھی تو بہت ہے۔ کافی وقت لگ جاتا ہے۔'' وہ بے چینی سے بولی۔ مسز جمال نے افسردگی کے آثار اس کے چہرے پر دیکھے اور خاموشی سے چھٹی دے دی۔ وہ خوشی خوشی ہاسٹل واپس آئی۔ اس کے لیے بہت سی چیزیں پیک کیں۔ جو وہ گاہے بگاہے اس کے لیے خریدتی رہتی تھی اور سامان پیک کر کے وارڈن کے پاس چلی گئی۔

''مس افضال، میں ایک روز کے لیے مری جا رہی ہوں۔ میرا بیٹا کچھ اپ سیٹ ہے۔ پرسوں لوٹ آؤں گی۔''

''او کے، اپنا خیال رکھیے گا اور بچے کو بھی پیار کرنا۔'' مس افضال خوش دلی سے بولیں۔

''تھینک یو مس افضال۔'' وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

سارا راستہ وہ ولیم کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ ولیم اور پیٹر، ماضی کی کتاب کے صفحات سوچوں کے جھونکے سے بار بار الٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ پیٹر بہت بدل گیا تھا جب سے اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ ضرور بچے کو جنم دے گی۔ وہ اس سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہ کرتا۔ اس نے ایسا رویہ اپنایا تھا کہ وہ جلدی سے یہاں سے چلی جائے۔

''تم یہاں سے جلدی چلی جاؤ۔'' وہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اسے یہی کہتا رہتا۔

''کہاں جاؤں؟ اپنے آشیانے کو تو میں نے خود ہی آگ لگا دی ہے۔ اب تو اس

کی راکھ بھی ہوا میں منتشر ہو چکی ہو گی۔'' وہ بے بسی سے بولی۔
''میں نہیں جانتا مگر تم اب یہاں مزید نہیں رہ سکتیں۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔
''پیٹر میں تم سے کچھ بھی طلب نہیں کروں گی۔ بس اس کی سٹیزن شپ تو ادھر کی ہو۔''
''یہ کبھی بھی نہیں ہو گا تا کہ وہ یہاں آ کر مجھے دوبارہ تنگ کرے۔ تم ایسٹرن ویمن بہت دور کی پلاننگ کرتی ہو۔'' اس کی باتوں اور لہجے میں بلا کا طنز تھا۔
''نہیں، میرا تم سے وعدہ ہے۔ میں اسے کبھی تمھارے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔ وہ کبھی تم سے کچھ طلب نہیں کرے گا۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔
''ٹھیک ہے تم ڈلیوری تک ادھر رک سکتی ہو مگر بے بی کا سارا خرچہ تم خود افورڈ کرو گی۔ میں جب اس کا وجود ہی نہیں چاہتا تو اس کے لیے خرچہ کیوں کروں۔'' وہ اس قدر بے باکی سے بولا کہ وہ حیران رہ گئی۔ جانور بھی اپنے نومولود کی اتنی کیئر کرتے ہیں اور یہ کیسا عجیب شخص تھا۔ اسے شدید دھچکا لگا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس شخص کو نہ جانے کس سے اتنا خوف تھا حالات کی ماری بے بس عورت سے یا اپنے ہی نئے وجود سے جو مستقبل میں اس کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ اس سے قبل وہ تین بچوں کو جنم دے چکی تھی مگر ولیم کے لیے اس نے جتنی ذہنی و جسمانی مشقتیں اٹھائی تھیں صرف وہی جانتی تھی۔ وہ دو دو جگہ جاب کرتی۔ رات گئے تک پیٹر کے ساتھ اس کی شاپ پر کام کرتی کیونکہ وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ جو مصیبتیں اور اذیتیں اٹھا رہی تھی۔ پیٹر سے شیئر تک نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ سب اس کی منتخب کردہ تھیں۔ جیسے جیسے ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے پیٹر زیادہ تر باہر ہی رہتا اور جس دن اس نے بچے کو جنم دیا وہ اسے دیکھنے بھی نہیں آیا حالانکہ اس کی شکل وصورت پیٹر پر تھی۔
وہ جیسے ہی ولیم کو لے کر گھر آئی۔ اس نے کچھ ڈاکومنٹس پر اس کے سائن لے لیے۔
''اب تم مجھ سے اپنے اور بیٹے کے لیے بھی ڈیمانڈ نہیں کر سکو گی۔'' اس نے طلاق کے کاغذات سائن کر کے اس کے حوالے کر دیے۔ وہ حیرانی سے اس شخص کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ انگریز قوم کس قدر شاطر اور ذی ہوش ہوتی ہے کہ خطرات کو پہلے سے ہی سونگھ کر ان کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ ان کی پلاننگ ہمیشہ سے قابل تحسین رہی ہے اور اب وہ اس کی قائل ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ اپنے وجود کی شناخت کے نشے میں اس نے ایسے کاغذات سنبھالے تھے اور اب اپنے وجود کی بقا کے لیے۔ ماضی پرت پرت اس کے سامنے تھا۔ اس کا وجود راکھ کی مانند ہوا میں بکھر رہا تھا۔ عورت بھی کتنی سخت جان ہوتی ہے۔ کیسی کیسی باتیں سہتی رہتی ہے۔ کیا کچھ

اپنے اندر چھپاتی رہتی ہے پھر بھی اسے کچھ نہیں ہوتا۔ روز و شب کا معمول اور زندگی کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔

حیدر بھی یہی کہتا تھا۔ جب وہ آخری بار اسے ملا تھا۔

’’کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ماضی کہیں دفن ہو جاتا ہے۔ حال بہت سارے تقاضے کرتا ہے اور مستقبل قربانیاں مانگتا ہے۔ شہلا جو لوگ زندگیاں گزار کر اب خاک میں پنہاں ہو گئے ہیں۔ انھیں کون پوچھتا ہے اور کون یاد کرتا ہے کہ انھوں نے کیا کیا کس کس کے تیاگ دیا۔ انھوں نے کیا کیا دکھ اپنے اندر سمیٹے۔ ان کے وجود نے کیا کچھ برداشت کیا۔ وہ بس یادوں کے دفینوں سے ایک جھونکے کی طرح کبھی کبھی آتے ہیں۔ دل سے ہوک سی اٹھتی ہے اور بس...... کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس یہی زندگی کا گورکھ دھندا ہے لیکن مستقبل تو ہر اک شخص سے متقاضی رہتا ہے۔ ہاں حیدر واقعی مستقبل متقاضی رہتا ہے۔ ماضی کو ٹٹولتا ہے۔ حال کو جھنجوڑتا اور کھنگالتا ہے اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ زندگی کی اس تپتی دھوپ میں صرف حیدر ہی اِک شجر سایہ دار تھا جس کے سائے تلے وہ چند لمحوں کے لیے ستانے کو رکتی تھی اور یہ سایہ اس کے لیے کتنا قیمتی تھا۔ یہ صرف وہی جانتی تھی۔

سرائے عالمگیر سے آگے پوٹھوہار کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اونچی نیچی مٹی کی پہاڑیاں۔ کہیں کہیں گھاس پھونس اور جڑی بوٹیوں سے اٹی ہوئیں۔ اوپر دور تک پھیلا وسیع نیلگوں آسماں۔ زندگی بھی تو ایسی ہی ہے۔ نہ جانے ان ٹیلوں نے کتنے حوادثِ زمانہ سہے ہیں اور ابھی تک ان مٹ نقوش کی طرح ماضی کی داستانیں لیے کھڑے ہیں۔ حال کو سمیٹے اور مستقبل کا ساماں کیے ہوئے زندگی کی طرح......

کوچ ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رکی۔ سب مسافر نیچے اتر گئے۔ اس نے بھی چائے کا کپ لیا۔ ولیم کے لیے کچھ چاکلیٹس خریدیں اور واپس کوچ میں آ گئی۔ کوچ میں صرف دو تین مرد تھے مگر وہ اب کسی سے خوف زدہ نہیں تھی۔ مشرق و مغرب کے تلخ تجربات اس کے اندر موجود تھے تلخی کا حتمی نتیجہ ہمیشہ سختی ہوتا ہے اور اس کا وجود اب پتھر کا ہو گیا تھا۔ چٹان کی طرح سخت...... جو اب بھی ماضی کی تلخ یادوں کے الاؤ میں ریزہ ریزہ ہوتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے کھچڑی بالوں پر ہاتھ پھیرا اور سنہری فریم والی نظر کی عینک دوبارہ صاف کر کے لگائی اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع ہو گئی۔ سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ سرسبز و شاداب بل کھاتی سڑکوں کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اوپر نیچے ڈھلوانوں پر موجود گھروں میں برقی

قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ جیسے اندھیرے میں جگنو چمک رہے ہوں۔ مغرب کی اذان کہیں دور آبادی سے سنائی دی تو نادانستہ اس کے ہاتھ دوپٹے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے سر پر دوپٹا رکھنا چاہا اور پھر رک گئی۔ دوپٹا سر سے ڈھلک گیا۔ مسز پیٹر اور اذان کی تعظیم...... اس کے اندر کہیں سے طنزیہ قہقہہ ابھرا۔ کوچ میں ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ ڈرائیور نے شوخ و چنچل گانے لگائے ہوئے تھے اور بہت سے لوگ مسحور ہو رہے تھے۔

''بھائی اس مصیبت کو بند کرو۔ اذان کا وقت ہے۔ کچھ تو خیال کرو۔'' کہیں پیچھے سے آواز آئی تو ڈرائیور نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور ٹیپ بند کر دیا۔ اذان کی تعظیم سے وہ مسلمانیت کے دائرے میں تھا۔ ذرا سی چوں چرا کرتا تو ابھی ایک لمحے میں اس کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا۔ پندرہ منٹ اس نے انتظار کیا پھر آواز اونچی کر دی۔

''بند کرو اس کم بخت کو۔ بزرگ نماز پڑھ رہے ہیں۔'' پھر آواز آئی۔

''یار ایک تو یہ لوگ...... اور ان کی نمازیں!'' ڈرائیور بڑبڑانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر آواز اونچی کرنے کی کوشش کی۔

''بند کرو اسے۔ ابھی نماز پڑھی جا رہی ہے۔'' پھر آواز آئی۔

''آپ لوگوں نے ساری قضا نمازیں ابھی ہی پڑھنی ہیں۔'' ڈرائیور جھنجلا کر بولا۔

''اور تم نے گانے سن کر امتحان دینا ہے۔'' ایک بزرگ کڑک دار آواز میں بولے۔

''بابا جی میرے منہ مت لگیے ورنہ......'' وہ اکڑ کر بولا۔

''ورنہ کیا اوئے؟'' بزرگ اس عمر میں بھی خاصے صحت مند تھے۔ اسی میں غلغلہ اٹھا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ اتنے خطرناک راستوں اور بلندیوں کا سفر کرنے والے کتنی پست ذہنیت رکھتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ بہت سے لوگوں نے ڈرائیور کو سنبھالا۔ کچھ نے بزرگ کو سمجھایا۔ پورا گھنٹہ اسی میں صرف ہو گیا۔ اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اب وہ قدرے لیٹ پہنچے گی اسے یہ سوچ سوچ کر کوفت ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کی چھوٹی سی بات اس کے لیے کتنے بڑے نقصان کا باعث بنے گی۔ اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ جو وقت سوچ کر آئی تھی۔ اس تک پہنچ جاتی تو ولیم اس کے ساتھ رات گزار سکتا تھا مگر اب تو اسے خود بھی رہائش کا مسئلہ ہوگا۔ لوگوں نے سمجھا بجھا کر دونوں میں صلح کروائی اور پھر گاڑی چلنے لگی۔ اب بابا جی آہستہ آہستہ نرم لہجے میں نصیحتیں کر رہے تھے اور ڈرائیور منہ پھلائے سن رہا تھا۔ اس کا موڈ سخت آف تھا۔ گانے بند ہو چکے تھے اور گاڑی اب فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ اچانک کوئی گاڑی سامنے

آتی تو وہ ایک دم زبردست بریک لگاتا۔

''خدا کے لیے بھائی غصہ تھوک دو اور آرام سے ڈرائیور کرو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہیں۔'' ایک آدمی بولا۔

''چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تو مری میں کیا کرنے جا رہے ہو گھر بیٹھنا تھا۔'' ڈرائیور بدگوئی میں خاصا ماہر تھا۔

''بھئی بچوں کو ہی تو گھمانے کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔'' وہ آدمی منمنایا۔

''تو اب کرنے دو انھیں مزہ!''

''بھائی اس کے منہ نہ لگو۔ بڑا ہی منہ پھٹ ہے۔ بدلحاظ۔'' وہ بزرگ دوبارہ بولے۔

''بزرگو آپ پھر ٹانگ اڑا رہے ہیں۔'' وہ گاڑی بند کر کے باہر نکل گیا۔ سب لوگ سخت پریشان ہو رہے تھے۔

''بابا جی، آپ بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔'' وہ آدمی دوبارہ بولا۔

''بھائی خدا کے لیے آ جاؤ۔ بہت وقت ہو گیا۔ کب مری پہنچیں گے۔'' ایک ادھیڑ عمر عورت نے اس کے پاس جا کر کہا۔

''ٹھیک ہے اماں جی۔ آپ کی عزت کرتا ہوں ورنہ!'' اس نے گھور کر بڑے میاں کو دیکھا اور سگریٹ سلگایا۔

''بھائی آپ کے اس جھگڑے میں میرا کتنا نقصان ہو رہا ہے...... آپ کو تو معلوم نہیں۔ مجھے اپنے بیٹے سے ملنے جانا ہے اور اب اس قدر دیر ہو گئی ہے۔'' وہ تنگ آ کر بولی۔ ڈرائیور نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے گاڑی نہ روکی اور قدرے خاموشی سے تیز ڈرائیو کرنے لگا۔

رات بارہ بجے وہ مری پہنچی۔ موسم قدرے خنک ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک ہوٹل میں اس نے کمرا لیا۔ کھانا کھا کر وہ کمرے میں آ گئی اور کھڑکی سے پردہ ہٹا کر نیچے وادی میں دیکھنے لگی۔ تاریکی میں جگنوؤں کے مانند ٹمٹماتی روشنیاں مری کی خوبصورتی میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔ نیچے بل کھاتی سڑکوں پر ابھی تک لوگوں کی چہل پہل جاری تھی۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کپلز، ہنستے مسکراتے ہوئے اور قہقہے لگاتے ہوئے ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب کی نیندیں جیسے غائب ہو چکی تھیں۔ سب انجوائے کرنے کے موڈ میں تھے۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک رخ ہے کتنا

خوبصورت، کتنا حسین، کتنا دل فریب......مگر صرف چند لوگوں کے لیے۔ اس نے پردہ آگے سرکا دیا اور خاموشی سے آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ ولیم اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ ابھی اور اسی وقت اس سے ملنا چاہتی تھی مگر بے بس تھی۔ اس وقت تو وہ خود بھی گہری نیند سو رہا ہوگا۔ کتنی جلدی وہ نومولود بچے سے ہینڈسم نوجوان بن گیا تھا۔ وہ مری کونونٹ میں پڑھ رہا تھا، او لیول کا اسٹوڈنٹ تھا، ذہین و فطین، مشرق و مغرب کا حسین امتزاج، اس کے نقوش اسٹرکچر سب پیٹر پر تھا اور آنکھیں اور بال ماں پر۔ وہ پہلی ہی نظر میں خوبصورت نوجوان لگتا تھا۔ وہ بالکل فارنر لگتا تھا۔

......۞......

وہ کتنی تنہا اور بے آسرا تھی۔ جب وہ گود میں اسے اٹھائے دوبارہ اپنے ماضی کی طرف لوٹی تھی۔ دوبارہ اپنی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ جب وہ گئی تھی تو کتنے لوگ اس کے اپنے تھے اور اب لوٹی تھی تو دور دور تک بھی کوئی شناسا نظر نہ آیا۔ وہ تو بالکل ہی مختلف وجود لیے لوٹی تھی۔ یہ کیسا شناخت کا سفر تھا جس میں ایک بھی جاننے پہچاننے والا باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے ورکنگ ویمن ہاسٹل میں پناہ لی اور بہت تگ و دو کے بعد ایک پرائیویٹ کالج میں جاب شروع کر دی۔ پہلے پہلے تو اتنی عسرت و تنگ دستی میں دن گزرے کہ ولیم جو بھی خواہش کرتا وہ کبھی پوری نہ کر پاتی پھر اس نے ٹیوشنز لینی شروع کر دیں اور حالات بہتر ہو گئے مگر اب ولیم کوئی خواہش نہیں کرتا تھا۔ وہ سمجھ دار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے پرانے کھلونوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ وہ بچپن سے ہی بہت ویل میزڈ اور سمجھدار بچہ تھا۔ کبھی کوئی بدتمیزی نہ کرتا۔ سب لوگ اس سے مل کر بہت متاثر ہوتے تو وہ اسے اپنے لیے اعزاز سمجھتی۔ ورنہ اس سے قبل ملک منصور کے بچے تو کسی شے سے محروم نہیں رہے تھے۔ وہ جو خواہش کرتے وہ ضرور پوری کرتا۔ ولیم کو یوں محروم دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوتا، آٹھ سالوں سے وہ مری میں پڑھ رہا تھا اور اب اسے بہت مس کرتا۔ اسے بھی دکھ ہوتا۔ اس کا تو سارا بچپن تنہائی کی نذر ہو گیا تھا۔ اسے اپنے پہلے بچوں کے لیے اتنا دکھ محسوس نہیں ہوتا جتنا ولیم کے لیے۔ ان کے پاس ملک منصور تھا۔ ان کی ہر خواہش پوری کرنے والا۔ ولیم کے پاس تو صرف ماں تھی اور وہ بھی تنگ دست...... وہ کیسا بے بس اور محروم بچہ تھا جس کے حصے میں محبتیں بھی پوری طرح نہیں آئی تھیں۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ ولیم سے محبت کرتی۔ کبھی کبھی فلک کی یاد بھی بہت ستاتی۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب اس نے اسے چھوڑا تھا مگر شفق، آفاق اور ملک منصور کا سوچ کر مطمئن

ہو جاتی۔ رات اس کی خیالوں میں کٹی۔

''پلیز ویٹ...... ہی از کمنگ!'' ایک نن اسے وزیٹرز روم میں بٹھا کر بولی۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ جب وہ لاہور سے چلی تھی تو طبیعت میں ایسی بے کلی نہ تھی اور اب منزل پر پہنچ کر انتظار ناممکن ہو رہا تھا۔ شاید انتظار کا فلسفہ ہی یہی تھا کہ جب تک جائے منزل تک پہنچ کر انسان کی بے چینیاں آخری حدوں کو نہ چھو لیں تب تک اس کا وجود مکمل نہیں ہوتا۔ ولیم اندر داخل ہوا تو وہ چونک سی گئی۔ وہ اس سے قد میں کافی لمبا لگ رہا تھا۔ لمبا تڑنگا خوبصورت نوجوان۔

''ولیم مائی ڈارلنگ...... مائی سویٹ ہارٹ۔'' وہ اسے والہانہ انداز میں چوم رہی تھی۔ خوشی اور جدائی سے اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔

''آج تم پورا دن میرے ساتھ گزارو گے۔ میں نے پرمیشن لے لی ہے۔''

''رئیلی!'' وہ خوشی سے اچھلا۔

''ہاں ڈیئر۔'' وہ پھر اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

''مام...... میں یونیفارم چینج کر کے آتا ہوں۔''

''اوکے، آئی ایم ویٹنگ!'' اس نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ایک خوبصورت ینگ اسمارٹ عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ اسے چہرہ کچھ شناسا سا لگا۔ بار بار ذہن کے پردے پر شبیہہ سی نمودار ہوتی۔ وہ اپنے ساتھ ڈھیروں چیزیں لائی تھی اور بچوں کو دے رہی تھی۔

''یہ کون ہو سکتی ہے؟'' وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

''مما پاپا نہیں آئے۔'' چھوٹی بچی روٹھتے ہوئے بولی۔

''وہ مصروف تھے تم جانتی تو ہو۔'' ماں نے اسے سمجھایا۔ اس کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

''اوہ گاڈ...... شنزا......'' ایک دم یہ نام اس کی زبان پر آ گیا اور اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو گیا۔ وہ اس سے چھپنا چاہتی تھی۔ جیسے ہی ولیم آیا وہ اس کو لے کر جلدی سے باہر نکل گئی۔

''مما پاپا کو لے کر آنا تھا۔ آئی مس ہم......'' وہ روتے ہوئے پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔ وہ بہت ضدی ہو گئی تھی۔

''سمیر جاؤ بہن کو بلا کر لاؤ۔ میں اتنی دور سے آئی ہوں۔ اسے بولو مما سے تو ملو۔ کیا

ممایونہی چلی جائے گی۔'' اس کی خوبصورت نیلی آنکھیں آنسوؤں سے جھملانے لگیں۔''

''اوکے مما۔'' وہ چھوٹا تھا اس لیے کچھ نہ سمجھ سکا اور بہن کو منانے چلا گیا۔

''مائیں بچوں کے لیے کتنی مشکلات اٹھاتی ہیں اور باپ...... ان کے باپ کو تو ان کی پروا بھی نہیں اور بچے باپ کے لیے کس قدر تڑپ رہے ہیں۔'' اس نے اِک ادا سے ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کیں تاکہ مسکارا پھیل نہ جائے۔ شمائل منہ بسورتی ہوئی اندر آ گئی۔

''ادھر آؤ مائی چائلڈ۔ سویٹ شمائل۔'' وہ اسے لاڈ سے منانے لگی۔ اس کا موڈ ابھی تک سخت آف تھا اور وہ ماں سے بات بھی نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

''آج میں تم لوگوں کو بہت گھماؤں گی۔'' شزا کی یہ خوش خبری انھیں کوئی خوشی نہ دے سکی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا۔ وہ ان کو لے کر باہر آ گئی۔

ولیم کے ساتھ قدم سے قدم ملاتے ہوئے اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ ایسی خوشی جو ایک ماں ہی محسوس کر سکتی ہے جب اس کی ننھی سی کونپل تناور درخت بنتی ہے۔ اس کے ماہ وسال کی محنت اس کے سامنے ہوتی ہے وہ لمحے اس کے لیے کتنی بڑی نوید لاتے ہیں۔ جب وہ ان کو تناور دیکھتی ہے۔ ولیم مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ اتنے قصے کہانیاں اور وہ مسلسل سن سن کر ہنس رہی تھی۔ وہ بالکل نہیں بول رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ بس سننا چاہتی تھی۔ وہ اسے اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ اس کا بار بار پیار کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ولیم بہت اچھے اور شائستہ لہجے میں اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ بہت دھیما اور شستہ تھا۔ وہ اسے لے کر کافی دیر گھماتی رہی پھر شاپنگ کے لیے چلی گئی۔ دکانیں نت نئی چیزوں سے بھری پڑی تھیں اور لوگ دھڑا دھڑ شاپنگ کر رہے تھے...... موسم ابر آلود تھا۔

''ولیم آج تم اپنی پسند کی جو چیز چاہو خرید سکتے ہو۔ آج تمہاری مما افورڈ کر سکتی ہے۔'' اس نے مسکرا کر اسے کہا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

''اوکے مام...... چاہے وہ کتنا ہی مہنگا کیوں نہ ہو؟'' اس نے مسکرا کر سوال کیا۔

''اٹ کین بی!'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ وہ ہر شاپ پر مختلف چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ ہر شاپ پر اسٹینڈ میں مختلف قسم کے لاکٹ لٹکتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ اسٹارز کے مطابق تھے۔ کچھ پر اللہ، لوگوں کے نام، جانوروں کے فیگرز اسکلز، ایلفابیٹ اور بہت سی چیزیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی خاص شے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ چلتے چلتے وہ ایک دکان پر رکا اور ایک اسٹینڈ سے صلیب والا لاکٹ اتارا

اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چھوٹا سا مجسمہ تھا۔

''مام، آئی لو اٹ، اٹس ریئلی بیوٹی فل!'' اس نے لاکٹ چوم کر جلدی سے گلے میں پہن لیا۔

وہ ایک لمحے کو لرز سی گئی اور جلدی سے پے منٹ کر دی۔ اس کا ذہن منتشر ہو چکا تھا۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران اس کی نظریں کراس پر تھیں۔ ولیم آج بہت خوش تھا۔ اس نے بہت سی من پسند چیزیں خریدی تھیں۔ وہ ایک دم اس کی نظروں کا مرکز دیکھ کر لاکٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

''مما...... آئی لو کرائسٹ...... اور میں کب سے ایسے لاکٹ کی تلاش میں تھا۔ سمپل کراس تو مل جاتا تھا مگر میں کرائسٹ والا چاہتا تھا۔ مما مجھے کرائسٹ سے بہت شدید محبت محسوس ہوتی ہے۔ مما صرف دو لوگ ہی تو میرے دل میں رہتے ہیں۔ آپ اور کرائسٹ......''

وہ مسکرا کر بتا رہا تھا اور وہ اس کی باتوں سے اندر ہی اندر خوف محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی سمجھدار، عقل مند مرد ہو۔ وہ جتنی دیر اس کے پاس رہی۔ اس کی سوچیں پریشان ہی رہیں۔ وہ جتنی خوش آئی تھی۔ اتنی خوش واپس نہیں جا رہی تھی۔

''مما...... آپ پریشان مت ہوا کریں۔ میں ہوں نا۔ آپ کو ہر روز خط لکھا کروں گا۔ میں آپ کو بہت مس کرتا ہوں۔ میں کرسمس پر لاہور آؤں گا تو ہم دونوں بہت انجوائے کریں گے۔ آپ کے اس وزٹ سے میں بہت فریش ہو گیا ہوں۔'' وہ بار بار اسے چوم رہا تھا اور پھر بائے بائے کہتا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کا دل بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ اب جدائی کے ساتھ ساتھ ایک اور خدشہ بھی اندر ہی اندر کھٹک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کوئی کانٹا سا دل میں چبھ گیا ہو اور سارا جسم اضطراب میں مبتلا ہو گیا ہو۔ سارا سفر اسی حالت میں کٹا۔ ورنہ وہ جب بھی اس سے مل کر آتی تو سارا وقت اس کی یادوں اور باتوں سے خوش ہوتی رہتی مگر اب اسے ولیم کی کوئی بات بھی یاد نہ تھی یاد تھی تو صرف اس کی وہی ایک حرکت۔ اس نے تو ولیم کو کسی بھی مذہب کی کوئی تعلیم نہیں دی تھی۔ اس نے جب سے ملک منصور اور بچوں کو چھوڑا تھا اس کے ساتھ ساتھ ہر اس شے کو بھی چھوڑ دیا تھا جن سے وہ ماضی میں وابستہ رہی تھی۔ جب تک وہ سید صاحب کے گھر تھی۔ خدا اور اس کی خدائی پر یقین رکھتی تھی۔ ملک منصور کے گھر آئی تو خدا پر ایمان تو تھا مگر خدائی پر سے یقین اٹھ گیا تھا اور جب پیٹر سے شادی کی تو نہ خدا پر ایمان رہا نہ خدائی پر یقین۔ مذہب کے خانے پر

اس نے شناخت کا بورڈ آویزاں کر دیا اور اسی شناخت کے لیے اتنے بڑے اسٹیپس لے لیے مگر اب شناخت کا وجود بھی نہیں رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اب اسے نہ مذہب کی ضرورت ہے نہ شناخت کی۔ بس اب زندگی کی سانسیں ہی پوری کرنی ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ۔ اسے تو یہ بھی پکا یقین نہیں تھا کہ جب وہ پیدا ہوئی تو اس کا کوئی مذہب بھی تھا۔ اس نے تو وہی کچھ اپنایا جو سید صاحب کا تھا مگر پیٹر نے اسے کچھ بھی اپنانے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس لیے اس نے کچھ بھی نہیں اپنایا۔ وہ مسز پیٹر کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ ماضی میں شہلا منصور تھی اور اب مسز پیٹر مگر اس کی یہ خام سوچ کس طرح ایک آزمائش بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ولیم کو کسی بھی مذہب کی کوئی بھی تعلیم نہیں دی تھی۔ صرف اسے اخلاقیات سکھائی تھی۔ وہ نہ تو کبھی اسے چرچ لے کر گئی اور نہ ہی مسجد...... وہ صرف اور صرف اسے ایک اچھا انسان بنانا چاہتی تھی۔ ایک عظیم انسان جس میں کوئی مذہبی تعصب نہ ہو صرف اپنی ذات اور اپنی خوبیوں پر اعتماد ہو۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ نہ جانے ولیم نے کیوں، کب اور کس وقت اپنے آپ کو کرسچن مان لیا تھا۔ اس نے تو کبھی اس سے مذہب کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔ شاید اس نے اپنے نام سے ہی یہ اخذ کر لیا تھا۔ کیا جو چیز بھی انسان کو پیدائشی طور پر ملتی ہے وہ اس کے بارے میں اتنا پوزیسیو ہو جاتا ہے کہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ مان بیٹھا تھا۔ اس کا دل اب کرچی کرچی ہو رہا تھا۔ وہ کراس اور کرائسٹ کے بارے میں کس قدر پکّی ہو گیا تھا۔ ان سے شدید محبت اور عقیدت کی لہر اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ کیا یہ سب فطری تھا یا جبلی۔ اس نے کئی سال جس چیز کو اگنور کر دیا تھا وہ یوں اس طرح اچانک متقاضی ہو جائے گی۔ مستقبل ایک سوالیہ نشان بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اندر ہی اندر خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ سوچوں کے بھنور میں پھنسی تھی۔ وہ اسے کیسے اور کس طرح منع کرے۔ وہ شدید تذبذب میں تھی۔

زندگی میں آخر کیا کچھ متقاضی ہے؟

محبت......؟

شناخت......؟

بقا......؟

وجود......؟

یا پھر کچھ بھی نہیں۔

اب وہ ہستی کے عذاب میں مبتلا ہو رہی تھی۔ سخت اذیت میں تھی، ایسی اذیت جو پچھلی تمام تکلیفوں اور اذیتوں سے بڑھ کر تھی۔ نہ جانے ابھی کیا کیا کچھ اسے آزمانے کو منتظر تھا۔

ولیم اب کی بار بہت خوش تھا۔ ایک تو اسے ماں مل کر گئی تھی اور ماں کے ملنے پر اسے کرائسٹ والا کراس بھی مل گیا۔ اس کی اپنی محدود سوچ تھی۔

''ولیم تمہاری مما چلی گئیں؟'' شمائل نے اس کے پُرمسرت چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں...... اور میں انھیں بہت مس کر رہا ہوں اور تمہاری مما......''

''وہ ابھی ادھر ہی رہیں گی۔ کشمیر پوائنٹ پر ہمارا بہت خوبصورت گھر ہے۔ مما جب بھی آتی ہیں وہیں رہتی ہیں پھر ہم بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ سمیر مما کے ساتھ ہی گیا ہے۔''

''تمہاری مما ادھر ہی کیوں نہیں رہ جاتیں......''

''وہ بہت سوشل ہیں۔ لاہور میں ان کو بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں لیکن جب بھی ادھر آتی ہیں تو پھر کافی دن رہتی ہیں۔''

''تمھارے پاپا نہیں آتے......؟''

''آتے ہیں...... لیکن......'' ولیم کے سوال پر وہ افسردہ سی ہوگئی۔

''کیا مطلب......؟''

''وہ منسٹر ہیں۔ اس لیے ان کے پاس ٹائم نہیں ہوتا...... مگر وہ ہم سے بہت محبّت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی آ بھی جاتے ہیں۔ ولیم تمھارے ڈیڈی کہاں ہیں؟''

''ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔'' وہ بہت سکون سے بولا۔

''تمہاری مما بہت بہادر خاتون ہیں۔''

''یس، آف کورس!'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔

''ولیم تم نے یہ کراس گلے میں کیوں پہن رکھا ہے؟''

''اوہ...... نظر آ رہا ہے۔'' اس نے جلدی سے جھک کر دیکھا اور پھر اسے شرٹ کے اندر کر لیا۔

''آئی لو اٹ، اٹس پارٹس آف مائی سول۔'' وہ محبت سے بولا۔

''رئیلی...... سو اسٹرینج!'' شمائل نے حیرت سے کہا۔

''تم مما کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟'' ولیم نے اس سے پوچھا۔

''میں ان سے ناراض ہوں۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''کیوں......؟''

''بس ہوں...... کسی بات پر۔''

''سلی گرل مما سے ناراض نہیں ہوتے۔ مما از لائک مدر میری اینڈ یونو۔ مدر میری لوز آل...... شی از سمبل آف لو، اونلی لو نتھنگ ایلس۔''

''وہاٹ ڈو یو مین؟'' شمائل نے حیرت سے پوچھا۔

''مما سے صرف محبت کرنی چاہیے۔ غصہ نہیں ورنہ گاڈ ناراض ہو جاتا ہے۔'' شمائل کو اس کی بات اچھی لگی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ماں کا نمبر ملا رہی تھی۔ ولیم ہنستا ہوا اپنے روم میں چلا گیا۔

لاہور جانے سے پہلے شزا اس سے خصوصی طور پر ملنے آئی۔ جب سے شمائل کا موڈ ٹھیک ہوا تھا اور اس نے اسے ولیم کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ جب آیا تو اس نے اسے بہت پیار کیا وہ اس کے لیے کافی گفٹس بھی لائی جو شمائل نے خود اس کے لیے پسند کیے تھے۔

''ولیم بیٹا آپ کی مما کیا کرتی ہیں؟'' شزا نے محبت سے پوچھا۔

''وہ کالج میں میتھس پڑھاتی ہیں۔''

''اوہ آئی سی، جب آپ لاہور آؤ تو ان کے ساتھ ہمارے گھر ضرور آنا۔''

''اوکے آنٹی۔''

''اور تمھارے پاپا کی ڈیتھ کب ہوئی؟''

''میری برتھ سے پہلے۔''

''آپ اپنے پاپا کو مس تو کرتے ہو گے۔''

''نہیں آنٹی، میں جانتا ہوں کہ میں پاپا کو اس دنیا میں نہیں مل سکتا تو پھر ان کو یاد کر کے مما کو کیوں ڈسٹرب کروں۔ میں اپنی مما کو بالکل ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ وہ میرے لیے سب کچھ ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی میرے لیے قربان کی ہے۔ میرے لیے تو وہ سب کچھ ہی ہیں۔ مما بھی اور پاپا بھی۔ ہاں پاپا کو میں امیجینیشن میں مل لیتا ہوں۔ ان سے بہت ساری باتیں کر لیتا ہوں۔'' وہ اس کی باتیں سن کر محظوظ ہو رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر کتنا مستعد تھا۔ اسے اس سے باتیں کر کے اچھا لگ رہا تھا۔

''او، کے بیٹا، اب میں چلتی ہوں۔ لاہور آنا تو مجھ سے ضرور ملنا۔ بلکہ میں خود تم

سے ملنے آؤں گی اور آپ کی مما سے بھی ملنا چاہوں گی۔ جنھوں نے تمہاری سوچ کو اتنا پوزیٹیو رکھا۔ اب میں چلتی ہوں۔'' اس نے باری باری سب کو پیار کیا اور پھر باہر نکل گئی۔

جب سے وہ مری سے لوٹی تھی۔ گم صم سی تھی۔ اس کے اندر کیا کیا کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرا تھا وہ کسی کو نہ بتا سکی۔ اس کا دل فگار اور سوچیں منتشر ہو رہی تھیں۔ زندگی کس کس رنگ میں انسان کو آزماتی ہے کبھی محض ایک سوچ ساری زندگی کے لیے وبال بن جاتی ہے تو کبھی کوئی ایک احساس شدید زیاں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اتنی خاموش تو وہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی جس میں کرب ہی کرب تھا۔ نہ سکوت تھا نہ سکون بلکہ شور ہی شور اور دکھ ہی دکھ۔ وارڈن نے بھی اس بات کو نوٹ کیا۔ وارڈن کے ساتھ اس کی بہت گہری دوستی تھی۔

''مسز پیٹر، کیا بات ہے آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔ ولیم تو ٹھیک ہے نا؟'' ڈنر کے بعد مس افضال نے اس کے کمرے میں آ کر پوچھا۔

''ہاں، وہ تو ٹھیک ہے۔'' وہ پھر خاموش ہو گئی۔

''پھر آپ کیوں اپ سیٹ ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں مس افضال...... مگر نہ جانے کیوں زندگی میں کچھ ایسے موڑ اچانک آ جاتے ہیں کہ انسان کی سوچ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ عقل خود حیران رہ جاتی ہے اور انسان بھی ہونق سا دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا ہے جو میں نے سوچا نہیں تھا۔ جس کو میں نے زندگی میں نظر انداز کیا۔ شاید اب وہ میری زندگی کی سب سے بڑی آزمائش بن جائے۔'' وہ بے خیالی میں بولتی گئی۔

''میں سمجھی نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' مس افضال نے حیرت سے پوچھا۔

''میں خود بھی نہیں سمجھی۔ میں تو شاید زندگی کو ہی نہیں سمجھ سکی۔ میں تو یہی نہیں جان سکی کہ زندگی میں اہم کیا ہے۔ سب سے اہم کس کو فرسٹ کیٹگری میں رکھوں۔ مس افضال آپ نے جب گھر چھوڑا تو آپ کے لیے سب سے اہم کیا چیز تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے لیے میری ماں اور چھوٹے بہن بھائی۔ ابا کی حادثے میں جان چلی گئی تو میں سوچ میں پڑ گئی کیا کروں۔ کچھ سمجھ نہ آیا تو شہر چلی آئی۔ نہ کوئی راستہ تھا نہ کوئی منزل۔ سیدھی اس ہاسٹل میں آئی اس وقت یہاں کی انچارج مسز شمیم تھیں۔ انھوں نے میری بڑی مدد کی یہاں میں نے ایک آفس میں جاب شروع کر دی۔ ہر مہینے گھر پیسے بھیجتی رہی۔ میرا اور گھر کا رشتہ پیسے کی ڈوری میں بندھ گیا۔ میں یہاں کس کرب، اذیت اور تنہائی میں وقت گزارتی

ہوں۔ کوئی بھی اس کا اندازہ نہ کر سکا پھر سب کسی نہ کسی قابل ہو گئے۔ اماں نے ایک ایک کر کے ان کی شادیاں کر دیں۔ مجھے انھوں نے شاید ہر جذبے ہر ضرورت سے عاری سمجھا۔ میں تو بس پیسہ چھاپنے والی مشین یا پھر روبوٹ بن گئی تھی یا پھر جو نظروں سے اوجھل رہتا ہے وہ ہر طرح سے مامون و محفوظ رہتا ہے۔ مجھے کسی نے نہ پوچھا کہ میری زندگی میں کسی اور شے کی خواہش ابھی باقی ہے یا نہیں۔ سب کی شادیاں ہو گئیں۔ اماں دو سال پہلے فوت ہو گئیں۔ بھائی نے آبائی گھر بیچ دیا اور خود کینیڈا چلا گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں بڑھاپا کہاں اور کس کے سہارے گزاروں گی۔ کہنے لگا۔

''آپا میں آپ کو باقاعدگی سے خرچہ بھیجتا رہوں گا۔'' سال ہو گیا ہے نہ اس کا خط آیا اور نہ ہی خرچہ۔ اب تو اس ہاسٹل کے سوا میرا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ شاید میرا میکا اور سسرال یہی ہے۔ گھر والوں نے سمجھا شاید میں ساری زندگی کے لیے ہی چلی گئی ہوں۔ اب ان کی زندگیوں میں نہ میری اہمیت ہے نہ جگہ۔ پہلے ان کے لیے کماتی تھی اور اب شاید...... نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لیے۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ شاید وہ لمحہ جب میں نے گاؤں سے شہر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ میری زندگی میں آنے والی خوشیوں کو نگل گیا۔ کبھی کبھی کوئی ایک لمحہ انسان کو کتنا تباہ کر دیتا ہے اور وہی لمحہ ماضی کی بھیانک پرچھائیں بن کر مستقبل کی گھات میں لگا رہتا ہے، نہ پھر حال رہتا ہے اور نہ ہی مستقبل۔ اب میں کہاں جاؤں۔ کوئی بھی تو نہیں پوچھتا۔ زندگی کے تیس سال یہاں گزار دیے۔ اپنی جوانی کا خود اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیا اور جن کی خاطر سب کچھ کیا ان کو احساس بھی نہیں۔'' آنسو ان کے جھریوں زدہ چہرے پر شکستہ راستے بنانے لگے۔ ''محبتوں اور قربانیوں کا یہ انجام بہت بھیانک ہے مسز پیٹر، دکھ اندر ہی اندر کس طرح ہر وقت کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ کاش کوئی جان سکے۔ زندگی کے اس مقام پر کھڑی ہو کر سوچتی ہوں کہ زندگی کا حاصل کیا ہے؟''

''آپ دکھی نہ ہوں۔ مس افضال میرا جو دکھ ہے وہ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتی مگر اس کی چبھن اتنی شدید ہے کہ میرا وجود کرچی کرچی ہو رہا ہے۔ اس آگ سے میرا بدن جل رہا ہے۔ شاید وہی تپش محسوس کر کے آپ میرے پاس آئی ہیں۔''

''لیکن آپ کچھ تو بتائیں؟'' مس افضال نے اصرار کیا۔

''کیا کہوں؟ کہنے سے میں اپنے آپ کو مزید مجرم سمجھوں گی۔ بس ایسا دکھ ہے جو کیکٹس کی طرح میرے وجود کے گوشے گوشے کا احاطہ کر رہا ہے لیکن میں کہہ نہیں سکتی۔ آپ کا

دکھ بالکل شفاف اور سمجھ آنے والا ہے اور میرا بہت پیچیدہ نہ سمجھ آنے والا۔ اسی لیے تو میں آج تک کسی سے اپنا دکھ شیئر بھی نہیں کر سکی۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''مسز پیٹر ایک بات کہوں۔ اگر برا نہ منائیں تو......''

''ہاں...... ہاں ضرور......'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ویسے تو یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے مگر میں یہ ضرور کہوں گی کہ آپ ویسے تو بہت اچھی ہیں مگر نہ تو کبھی چرچ گئی ہیں نہ ویسے عبادت کرتی ہیں۔ زیادہ تر کرسچینز سنڈے کے سنڈے چرچ جاتے ہیں۔ آپ کو تو کبھی جاتے نہیں دیکھا۔ خدا کو یاد کریں مشکلات میں اک وہی تو آسرا نظر آتا ہے۔ ورنہ ہم خانماں لوگوں کے پاس اب کیا رکھا ہے؟'' مس افضال نے اس سادگی سے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا کہ وہ تلملانے لگی۔ شاید زندگی کا اذیت ناک مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔

''مگر میرا کسی پر یقین نہیں رہا۔'' وہ مشکل سے بولی۔

''ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ جب بہت کرائسس ہوں تو خدا پر بھی ایمان ڈولنے لگتا ہے مگر پھر اسی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ کیا کریں۔ اس کے محتاج جو ٹھہرے۔ اس نے ہمیں اتنا بے بس بنایا ہے کہ ہر لمحہ ہر وقت اس کو مدد کے لیے پکاریں۔ یہی وہ چاہتا ہے۔''

''مگر میں نے اس کو پکارنا عرصے سے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے نہ میری کوئی دعا میری قسمت بدل سکے گی اور نہ ہی کسی کی دعا میری تقدیر تو پھر اس امید اور آس کا فائدہ؟'' وہ بے بسی سے آہ بھر کر بولی۔

''آپ شدید ڈسٹرب ہیں لیکن میں آپ کے لیے ضرور دعا کروں گی۔''

''شکریہ، مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' مس افضال نے ہر ممکن طریقے سے اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور پھر واپس چلی گئیں۔

سردیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کرسمس کی تیاریاں بھی کرسمس ڈنرز اور فنکشنز بھی عروج پر تھے۔ ولیم لاہور آنا چاہ رہا تھا۔ ہر سال وہ کچھ دنوں کے لیے لاہور آتا تو اس کے پاس ہی ٹھہرتا مگر اب وہ قد کاٹھ سے ایک بھرپور نوجوان لگتا تھا۔ اس لیے اب ویمن ہاسٹل میں ٹھہرانا قدرے ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اسے شدید ٹینشن ہو رہی تھی کہ وہ اسے کہاں ٹھہرائے۔ وہ انہی سوچوں میں گم مس افضال کے پاس چلی گئی۔

''مس افضال، ولیم لاہور آنا چاہتا ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا اس کو کہاں ٹھہراؤں۔ ظاہر ہے وہ ہاسٹل میں تو نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی جگہ ہو تو پلیز بتایئے۔ صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔'' مس افضال اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئیں۔

''ٹھیک ہے میں مس حیدر کو فون کرتی ہوں۔ شی از نائس لیڈی کوئی نہ کوئی راستہ تو نکل ہی آئے گا۔ آپ پریشان مت ہوں۔''

''کون...... مس...... حیدر''...... حیدر...... بہت عرصے کے بعد یہ نام سن کر وہ ایک دم چونک سی گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

''مسٹر حیدر ویلفیئر منسٹر ہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں۔ بہت ہی کوآپریٹو...... ان کی بیٹی مس حیدر بھی بہت سوشل ہیں ویل ایجوکیٹڈ اور نائس۔ ان جیسے چند لوگ اس شہر میں اور ہوں تو یہ شہر جنت بن جائے۔ وہ این جی اوز کو بھی سپورٹ کرتی ہیں اور عورتوں کے فلاحی ادارے بھی ان کی سپرویژن میں ہیں۔''

''اچھا...... آپ ان سے بات کریں۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

ماضی کی ایک اور چنگاری اس کے دامن میں پھینکی گئی تھی۔ ماضی سے فرار ناممکن تھا۔ حال ہمیشہ ماضی کو کیوں جھنجوڑتا رہتا ہے اور مستقبل ایک سوال بن کر حال اور ماضی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے۔ حیدر تو ماضی میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے خود گم کرنے کی کوشش کی تھی گو کہ وہ اس میں کامیاب نہیں رہی تھی مگر وہ اس کے پرانے وجود کی شناخت کی ایک اہم کڑی تھا۔ اس کا جز تھا۔ اس کی روح کا حصّہ تھا۔ اس سے اس نے ایسی محبت کی تھی جو کسی سے نہیں کر سکی تھی۔ اگر اس کی زندگی میں کہیں محبت کا وجود تھا اور اس کو محبت سے شناسائی ہوئی تھی تو وہ صرف اور صرف حیدر کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جب وہ شہلا تھی اور جب وہ شہلا منصور بنی تب بھی مگر جب سے وہ مسز پیٹر بنی تھی۔ اس نے سارے حوالے خود ہی دفن کرنے کی کوشش کی تھی۔ گو کہ وہ ایک سایہ سا بن کر کبھی کبھی ابھرتا تھا مگر اب پیٹر کا تعلق سب سے زیادہ مضبوط سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ ولیم کا باپ تھا اور وہ اس کی بیوہ کی حیثیت سے زندہ تھی۔ ولیم کی صورت میں وہ ہمیشہ اس کے سامنے زندہ تھا مگر اس نے کبھی اسے اتنا اہم نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس کی شناخت ضرور بنا تھا مگر محبت نہیں...... مگر جو شناخت نہیں بن سکا وہ محبت بن کر روح کی گہرائیوں تک میں زندہ تھا۔ ہمیشہ کے لیے وہ اس کی

سانسوں میں سما گیا تھا۔ حیدر کے نام نے ہی اس کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی اور حیدر ہو۔ یہ محض اتفاق بھی تو ہوسکتا ہے اور زندگی اتفاقات کا دوسرا نام ہی تو ہے۔

''مسز پیٹر، ہاسٹل کے پیچھے انیکسی ہے۔ جب بھی فارن ڈیلیگیشنز آتے ہیں تو وہیں ٹھہرتے ہیں۔ مس حیدر مان گئی ہیں۔ چند روز کے لیے میں آپ کو وہ کھول دیتی ہوں۔'' مسز افضال نے خوشی خوشی اسے بتایا۔

''تھینک یو ویری مچ مس افضال۔ میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''ہاں، مسئلے تو حل ہوتے ہی جاتے ہیں مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اپنی جگہ جوں کے توں بھی رہتے ہیں یا شاید زندگی خود ہی بہت بڑا مسئلہ ہے یا معما۔'' وہ قدرے مایوسی سے بولی۔

''مس افضال، آپ تو دل چھوٹا نہ کریں۔ آپ تو ہمیشہ ہمارے لیے سورس آف انسپریشن رہی ہیں اور اب آپ ہی......؟'' اس نے انھیں دلاسا دینے کی کوشش کی گو کہ وہ خود بھی جانتی تھی کہ یہ الفاظ محض ڈھکوسلا ہیں۔

''کیا کریں......کبھی کبھی......'' وہ بنا کچھ کہے نم آنکھوں کو صاف کرتی باہر نکل گئی۔

ولیم آیا تو بہت خوش تھا۔ یوں لگ رہا تھا وہ پہلی دفعہ کرسمس منانے لاہور آیا ہو۔ وہ اپنے ساتھ ڈھیروں گفٹس لایا تھا جو اس کے دوستوں نے اسے دیے تھے۔ اس نے بھی اس کے لیے نئے کپڑے خرید کر رکھے تھے۔ ولیم نے کمرے میں چھوٹا سا کرسمس ٹری بنایا۔ اس پر چھوٹے چھوٹے گفٹس لٹکائے۔ رنگ برنگی لائٹس لگائیں۔ شائل نے اسے خوب صورت سا نیتا کلاز گفٹ کیا تھا۔ وہ ہر کام بہت ایکسائیٹڈ ہو کر کر رہا تھا اور وہ اس کو یوں پُرجوش دیکھ کر بار بار سوچ رہی تھی۔

یہ مذہبی جنون اس میں کہاں سے آ گیا تھا۔ نہ پیٹر مذہبی تھا اور نہ ہی وہ۔ نہ اس نے اسے ایسی کوئی تعلیم دی تھی اور نہ ہی کسی اور نے۔ تو پھر یہ سب...... اسے سوچ سوچ کر وحشت سی ہونے لگی۔

''مما، آپ کیک لے آئیں گی یا پھر میں واپسی پر لیتا آؤں۔''

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ آج رات چرچ نہیں جانا۔''

''اوہ...... میں بھول ہی گئی۔ کل......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''آپ تو بس۔ میں خود ہی ہو آتا ہوں۔'' وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ وہ اس کو بھی روکنا چاہتی تھی مگر کیا کہے اور کیسے کہے۔ عجیب مخمصے میں پڑ گئی تھی۔ یہ لڑکا اس کے لیے چیلنج بنتا چلا جا رہا تھا۔ اگر وہ کل اسے چرچ جانے کے لیے کہے گا تو وہ کیا جواب دے گی۔ وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ساری رات نہ سو سکی۔ کب اس کی آنکھ لگی اور کب وہ آیا مگر وہ صبح صبح تیار ہو کر اسے اٹھا رہا تھا۔

''مما اٹھیں نا۔ آج تو چرچ چلیں۔'' وہ نئی پینٹ شرٹ اور نیوی بلیو سویٹر میں بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ یوں لگ رہا تھا پیٹر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''بیٹا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے پھر کبھی چلی جاؤں گی۔''

''آپ تو بس۔ نہ جانے کیوں ایسا کرتی ہیں۔'' وہ منہ بناتا ہوا کہہ کر باہر نکل گیا اور وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس کے جانے کے بعد مس افضال خوبصورت بوکے اور ولیم کے لیے گفٹ لے کر آئی۔

''ہائے مسز پیٹر، یہ کیا۔ آپ نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔''

''وہ اصل میں میری طبیعت خراب ہے نا۔ اس لیے......''

''آئی سی۔ یہ ولیم کے لیے ہے۔'' انھوں نے گفٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔

''آپ نے یہ تکلف کیوں کیا؟''

''مسز پیٹر اب میری زندگی میں ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے علاوہ اور کیا باقی رہ گیا ہے۔ اب تو صرف دوستوں سے ملاقاتیں باقی رہ گئی ہیں اور ہاں آج کھانا میں آپ لوگوں کے ساتھ کھاؤں گی۔ اب میں چلتی ہوں۔ نیچے کچھ لڑکیاں آپ کو وش کرنے آئی ہیں۔ ان کو اوپر ہی بھیج دوں۔'' مس افضال باہر نکلتے ہوئے بولیں۔

''کون ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید آپ کی اسٹوڈنٹس ہیں۔''

''اچھا، ٹھیک ہے ان کو اوپر بھیج دیں۔'' اس نے قدرے حیرت سے کہا۔ کیونکہ اس سے قبل کبھی بھی کوئی بھی اسے کرسمس وش کرنے نہیں آیا تھا۔ آٹھ، دس لڑکیاں بوکے، کیک اور گفٹس لے کر ''میری کرسمس'' کہتی ہوئیں اندر داخل ہوئیں۔

''تھینک یو، آپ لوگ......ادھر بیٹھیں۔'' اس نے ان کو چیئرز دیتے ہوئے کہا۔

''میڈم یہ کیا آپ نے آج ڈریس بھی چینج نہیں کیا۔'' اس کی ایک شوخ و چنچل سی اسٹوڈنٹ افرا بولی۔

''بس یونہی، میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آپ لوگ بیٹھیں میں چائے لاتی ہوں۔''

''نہیں میڈم آپ آرام کریں۔ ہم خود ہی بنا لیتے ہیں بلکہ بنا کر آپ کو بھی پلاتے ہیں۔'' دو لڑکیاں جلدی سے اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔ انھوں نے اہتمام سے ٹیبل سجائی ناشتے کے لیے کچھ چیزیں فریج سے نکالیں۔ کیک کاٹ کر رکھا اور پھر سب چائے پینے لگیں۔ خوب رونق ہو رہی تھی۔ ان کے قہقہے پورے کمرے میں گونج رہے تھے جب ولیم اندر داخل ہوا۔

''ولیم ان سے ملو۔ یہ میری اسٹوڈنٹس ہیں۔''

''ہیلو۔'' وہ سر کو قدرے جھکا کر بولا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔

''میڈم آپ کا بیٹا تو بہت اسمارٹ ہے۔ بالکل فارنر لگتا ہے۔'' طیبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی اور ہونٹ چبانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سب لڑکیاں چلی گئیں تو وہ اس کے پاس آئی۔

''آؤ بیٹا ناشتا کرلو۔''

''مما مجھے بھوک نہیں۔ اب میں سونا چاہتا ہوں۔ ہاں شام کو مجھے جلدی اٹھا دیجیے گا۔ میں نے Supper کے لیے فادر جانسن کے پاس جانا ہے۔''

''کون فادر جانسن؟'' اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''مما آج چرچ میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پریئر کے دوران وہ مسلسل مجھے دیکھتے رہے۔ جب سب لوگ جانے لگے تو وہ خود میرے پاس آئے۔ مجھے بہت پیار کیا۔ گلے لگایا۔ مجھ سے مختلف باتیں پوچھتے رہے۔ کہنے لگے آج Supper میں ان کے ساتھ ہی کروں اور میں نے وعدہ کرلیا ہے۔ وہ چرچ کے پیچھے ہی تو رہتے ہیں۔ ان کی شخصیت بہت متاثر کن ہے۔'' اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ جیسے اس نے کوئی انوکھی قیمتی شے پالی ہو۔ وہ مسکراتا ہوا سونے کے لیے چلا گیا اور وہ پریشان سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہر طرف چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ کرسمس ٹری کے ساتھ اکا دکا

گفلس لٹک رہے تھے۔ ٹیبل پر کیک اور برتن بکھرے ہوئے تھے۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے، یہ کیسا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ انسان نے جن باتوں کے بارے میں کبھی سوچا نہیں ہوتا وہی کیوں ہوتی ہیں۔ ولیم کی باتوں سے اسے خوف آ رہا تھا۔ وہ کتنی سنجیدگی سے ساری گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ میچور لگ رہا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر اب سب کچھ ناممکن لگ رہا تھا۔ اس کے اندر جو شعلہ بھڑک رہا تھا وہ بس آتش فشاں بننے کو تیار تھا۔ اس نے جو کچھ ولیم کے لیے سوچا تھا وہ اس سے بالکل مختلف سوچ رہا تھا جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی بہت مبہم، غیر واضح اور دھندلا تھا۔ اس کے برعکس ولیم ہر منظر کو صاف اور واضح دیکھ رہا تھا۔ وہ زندگی کے ہر مفہوم کے بارے میں مشکوک تھی اور وہ تخیل کو بھی حقیقت کا عملی جامہ پہنانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ وہ ایسے موڑ پر کھڑی تھی جہاں کوئی راستہ بھی کسی منزل کی طرف نہیں جاتا تھا۔ ماضی عذاب تھا تو مستقبل کربناک۔ وہ کتنی ہی دیر گھٹنوں پر سر رکھے گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ ولیم مقررہ وقت پر گھر سے نکل کر جا چکا تھا اور وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

وہ اپنے آپ کو بہت ویک پرسنالٹی تصور کر رہی تھی جو اپنے بیٹے کو کسی بھی بات کے لیے نہیں روک سکتی تھی۔ چرچ کے پیچھے ایک کچا راستہ جس پر کہیں کہیں سرخ ٹائل لگے تھے اور جس کے دونوں اطراف گھنی باڑیں تھی۔ بل کھاتا ہوا یہ رستہ فادر کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ اردگرد سروا ملتاس جامن اور بائل برش کے درخت خصوصی طور پر نمایاں تھے۔ ابھی دھند اتنی گہری نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی وہ قدرے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ اچانک لکڑی کا ایک چھوٹا سا پھاٹک نظر آیا۔ اس نے ہلکا سا اسے دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ پختہ راہداری کے دونوں اطراف خوبصورت وسیع لان تھے۔ ان میں چھوٹے برقی قمقمے روشن تھے۔ ٹھنڈی یخ ہوا کا جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا اس نے جھرجھری سی لی اور پرانے سیمنٹ کے اکھڑے ہوئے فرش کے آگے بنے ہوئے برآمدے میں داخل ہوا۔ چھوٹا سا برآمدہ تھا اس میں ایک کھڑکی اور ایک دروازہ تھا۔ جس پر سفید اور زردی مائل پینٹ ہوا تھا۔ البتہ برآمدے کی دیواروں کو کرسمس کی خوشی میں چھوٹے رنگ برنگی قمقموں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ خاصا عجیب سا اور افسردہ سا ماحول تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر ڈھونڈنے کے بعد بیل بجائی۔ ایک بوڑھا سا آدمی باہر نکلا۔

''فادر سے ملنا ہے؟''

''کیا کام ہے؟'' وہ قدرے درشتی سے بولا۔

''انھوں نے مجھے بلایا ہے۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''ولیم......ولیم ہیگل۔''

''اچھا اندر آ جاؤ۔'' وہ اسے تاریک کشادہ کمرے میں لے گیا اور آگے بڑھ کر لائٹ آن کی۔

''بیٹھو، ابھی وہ مصروف ہیں۔ کچھ وقت لگے گا۔ باہر سردی ہے چائے پیو گے یا کافی۔''

''کافی۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اچھا، ٹھیک ہے۔ میں ہیٹر آن کر دیتا ہوں۔ اس کے پاس بیٹھ جاؤ۔'' اس نے آتش دان میں رکھے ہیٹر کو آن کیا اور باہر نکل گیا۔ کمرے کی آرائش واضح طور پر نشان دہی کر رہی تھی کہ فادر کو جیسز سے کس قدر محبت تھی۔ کمرے میں رکھی کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جو ان کی مادیت پرستی کی طرف اشارہ کرتی سوائے کونے میں رکھے ایک کمپیوٹر کے۔

کمرے میں مختلف پینٹنگز لگی تھیں۔ ایک دیوار پر بہت بڑی پینٹنگ آویزاں تھی۔ اس نے اس کے نیچے ڈیٹ پڑھی جو شاید پندرھویں صدی میں بنائی گئی تھی۔ پینٹنگ میں جیسز، مدر میری ان کے شوہر جوزف۔ ان کے گرد جانور، بھیڑیں مقامی گڈریے اور فرشتے خاص طور پر نمایاں تھے۔ فرشتے خدا کی حمد اور جیسز کی پیدائش کی خوشی منا رہے تھے۔ پینٹنگ میں ہر طرف نیلا رنگ نمایاں تھا جو خصوصی طور پر بہشتی رنگ سمجھا جاتا ہے۔ ایسی ہی پینٹنگ وہ مری اسکول میں نمائش کے دوران دیکھ چکا تھا اور اسے تب بھی یہ پینٹنگ بہت اچھی لگی تھی اور اب بھی۔ وہ آگے بڑھا تو مختلف اقسام اور اشکال کے بے شمار چھوٹے بڑے کراس بڑے قرینے سے شیلف پر سجائے گئے تھے۔ کارنر میں مدر میری کا پلاسٹر آف پیرس کا بہت بڑا مجسمہ رکھا تھا۔ وہ دو تین سالہ جیسز کو اٹھائے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ ان کے سر پر سنہری تاج انھیں کوئین آف ہیومنز ظاہر کر رہا تھا۔ دیوار پر ایک بہت بڑی پینٹنگ تھی جس نے پوری دیوار کا احاطہ کر رکھا تھا۔ جس میں جیسز کو صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ وہ ایک طرف کو مڑا۔ ایک لمبی سی مگر چھوٹی سی میز پر لمبا سا کراس رکھا تھا اور اس کے کونوں کے اندر جان، لیوک، مارک اور میتھیو کی تصویریں بنی تھیں جو نیو ٹیسٹمنٹ کی چار کتابوں کے آتھرز سمجھے جاتے ہیں۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ خاصی دیر ہو چکی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا فادر کے آنے کے ابھی تک کوئی آثار نہ تھے۔ کافی بھی نہیں آئی تھی۔ البتہ ہیٹر کی

وجہ سے کمرا قدرے گرم ہو گیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور سامنے دیوار پر جیسز کی چھوٹی سی پینٹنگ دیکھنے لگا جس میں ان کے ہاتھوں اور پاؤں پر میخوں کے نشانات تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فرطِ جذبات سے آنسو تیرنے لگے۔ کمرے میں ایسی ہی پینٹنگز جا بجا آویزاں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ملازم کافی لے کر آ گیا۔

''فادر کب فارغ ہوں گے؟'' اس نے قدرے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کافی پیو، تھوڑی دیر تک آ جائیں گے۔'' وہ کہہ کر باہر چلا گیا اور وہ کافی پینے کے بعد پھر کمرے میں انہی پینٹنگز کو دوبارہ دیکھنے لگا جیسے سب کچھ اپنے حافظے میں محفوظ کر رہا ہو۔

''ہیلو مائی سن، آئی ایم سوری۔ تمھیں ویٹ کرنا پڑا۔'' فادر نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا اور اس کا ماتھا چوما۔

ایک میٹھی سی لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ ایسا میٹھا لمس اس نے اس سے پہلے اپنی زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

''مائی سن میں نے تمہاری آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے جو آج کل کے نوجوانوں میں بہت کم ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے گاڈ نے تمھیں سلیکٹ کر لیا ہے۔''

''سلیکٹ اور مجھے...... کس لیے فادر؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''تم جیسز کرائسٹ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' فادر نے اچانک پوچھا۔

''فادر بہت...... بہت زیادہ۔'' وہ شدتِ محبت سے بولا۔

''یس مائی سن! دس از دی ریزن...... یو آر اے ٹرو کرسچن! جب کرائسٹ کسی سے محبت کرتے ہیں تو وہ محبت آنکھوں کے دیے روشن کرنے لگتی ہے اور تمہاری آنکھوں میں جو چمک ہے وہ ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔ وعدہ کرو...... مائی سن! وعدہ کرو کہ تم صرف اور صرف کرائسٹ کے بن کے رہو گے، تم سوچو گے تو صرف کرائسٹ کو...... تم کام کرو گے تو صرف کرائسٹ کے مشن کے لیے...... تم محبت کرو گے تو صرف کرائسٹ کے لیے...... تم جیو گے تو کرائسٹ کے لیے، جب تم لوگوں کی مشکلات کم کرو گے تو پھر دیکھنا، خداوند یسوع مسیح تمھیں کیا کچھ عطا کریں گے۔ یہ دنیا تمہاری مٹھی میں آ جائے گی اور تم زمین و آسمان کی قید سے آزاد ہو جاؤ گے۔ تم چلو گے تو یوں محسوس کرو گے جیسے کرائسٹ تمھارے ساتھ چل رہے ہیں۔ بات کرو گے تو وہ تمھارے ساتھ بولیں گے...... مائی ڈیئر سن، یو آر سلیکٹیڈ۔'' انھوں نے پھر اسے گلے لگایا۔

فادر کے الفاظ اور شخصیت میں جانے کیا مقناطیسی کشش تھی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ابھی بہت سارے الفاظ کے مفہوم سے وہ نابلد تھا مگر جیسے کوئی شے روح میں اتر گئی تھی، وہ عجیب سے ٹرانس میں تھا۔

''اچھا ادھر آؤ...... یہ بتاؤ، تم نے فیوچر کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟''

''مما مجھے پائلٹ بنانا چاہتی ہے۔''

''اور تم خود کیا چاہتے ہو؟''

''میں نے ابھی کچھ ڈیسائڈ نہیں کیا۔''

''تو ابھی ڈیسائڈ کرلو۔ مائی سن کہ تم نے جیسز کے مشن کو آگے بڑھانا ہے۔ پائلٹ بن کر تم آسمان پر تو اڑو گے مگر دلوں پر حکومت کرنا اور انھیں تسخیر کرنا زیادہ مشکل اور ایڈونچرس ہے۔ آؤ اب ڈنر کرتے ہیں۔'' وہ اسے محبت سے ڈائننگ روم میں لے گئے۔

ڈنر سادہ تھا مگر بہت لذیذ تھا۔ کھانے کے دوران میں وہ اس سے اس کے متعلق مختلف سوالات پوچھتے رہتے جو کچھ مما نے اسے بتایا تھا اور اس کے حافظے میں محفوظ تھا، وہ بتاتا رہا۔

''لگتا ہے تم چرچ بہت کم جاتے رہے ہو۔'' فادر کے اس سوال نے اسے چونکا دیا۔

''یس...... یس فادر...... پرہیپس......!''

''اس لیے تم کرسچنیٹی کے بارے میں بہت کم جانتے ہو۔ خیر، تم بس اسی پر سوچو کہ جیسز تم سے کچھ چاہتے ہیں۔''

''لیکن فادر! میں کیا کرسکتا ہوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم مجھ سے نیٹ پر رابطہ رکھو اور اپنا ذہن بنالو کہ تم نے چرچ جوائن کرنا ہے، اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی اہم کام نہیں۔''

''لیکن مما......!''

''میرے خیال میں اگر وہ بھی کرائسٹ سے محبت کرتی ہیں تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' کھانے کے بعد انھوں نے اسے کافی لٹریچر پڑھنے کے لیے دیا اور خود اسے گاڑی میں چھوڑنے اس کی انیکسی تک آئے۔

''او کے مائی سن، گڈ بائے...... اپنی مما کو بھی چرچ لے کر آنا۔''

''اچھا...... لیکن وہ چرچ نہیں جاتی ہیں۔''

''کیوں مائی سن! وہ ایک سچّی عیسائی عورت ہے؟''

''فادر!......شی از!'' وہ اس بات کی تردید کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''نو مائی سن!......نو ایکسکیوز......!''

''اوکے...... فادر!'' وہ جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ فادر کے الفاظ اس کے دل پر جیسے نقش ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے حافظے پر زور ڈالا۔ مما کبھی بھی تو چرچ نہیں گئی تھیں اور آج بھی نہیں۔ اس کا مطلب ہے مما کو جیسز سے محبت نہیں۔ وہ انھی سوچوں میں گم سیڑھیاں چڑھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''ولیم! مائی ڈیئر......تم کہاں رہ گئے تھے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''مما......! میں فادر کے ساتھ بزی تھا۔ میں آپ کو بتا کر تو گیا تھا۔''

''انھوں نے تمھیں کیوں بلایا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''مما، میں چرچ جوائن کرنے جا رہا ہوں۔''

''نو مائی سن! میں نے تمھارے لیے دن رات پلاننگ کی ہے، وہ سب......نہیں یہ کھیل نہیں ہو سکتا...... تمھیں صرف اور صرف پائلٹ بننا ہے اور آئندہ تم فادر سے بھی نہیں ملو گے......تمھیں صرف اور صرف ہواؤں میں اڑنا ہے۔'' وہ قدرے سختی سے بولی۔

''اوکے مما......گڈ نائٹ!'' وہ اس کو نظر انداز کرتا ہوا چلا گیا۔

وہ وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا، کیا کرے جو وہ سوچتی تھی، کہہ نہیں سکتی تھی۔ وہ زندگی میں جن جن لوگوں سے جو بھی کہنا چاہتی تھی کبھی نہ کہہ سکی تھی۔ جو سوچتی تھی، وہ ذہن میں ہی رہ جاتا۔ بہت کچھ ہونے کے باوجود وہ خاموشی سے سرنڈر کر دیتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی کو بھی کنونس نہیں کر پائے گی تو خاموش رہنا ہی بہتر ہے اور اسی خاموشی کے آگے اس نے بارہا ہتھیار ڈالے تھے ہر بار خود ہی مجرم ٹھہری۔ جب وہ یونیورسٹی میں تھی تو قدرے کونفیڈنٹ تھی مگر حیدر سے تعلق ٹوٹنے کے بعد اور اپنی ذات کی ذلت کے بعد اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی گئی ہو۔ وہ ہر بات کہتے ہوئے ڈرتی۔ ہر فیصلہ کرتے ہوئے جھجکتی اور ہر فیصلہ کرنے کے بعد پچھتاتی۔ وہ ماں ہونے کے باوجود اپنا حق استعمال کرنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر مجبور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے خیالات اس تک پہنچانا چاہتی تھی مگر کس طرح......اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ولیم اور

اس کے درمیان کمیونیکیشن گیپ تھا۔ اسے شدید پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اس کا اسلامی نام کیوں نہیں رکھا۔ اس نے ولیم کا نام پیٹر کے بتائے ہوئے نام پر کیوں رکھا۔ جو شخص اس کے وجود کا خواہاں نہیں تھا۔ جسے اس میں رتی بھر دلچسپی نہ تھی تو اس نے کیونکر اصرار کیا تھا۔ وہ اس لمحے پیٹر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے تو ولیم کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا اور اس نے نادانستہ احمقانہ طور پر نام کے سلسلے میں اس کی رائے لے لی۔

''یہ تمہارا بچہ ہے، میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ تم جو نام چاہو رکھو، تمھیں پورا اختیار ہے۔'' وہ بے رخی سے بولا۔

''مگر رائے دینے میں کیا حرج ہے۔ میرے پاس یہ تمہاری یاد اور نشانی ہوگا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر تم اسے نام دے دو۔'' نہ جانے کیوں وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، ولیم ہیگل رکھ لو۔'' وہ بے اعتنائی سے بولا۔

''کیوں......؟''

''یہ میرے گرینڈ پا کا نام تھا۔ وہ میرے باپ سے بہتر تھا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہارا بیٹا مجھ سے اور میرے باپ سے بہتر ہو۔''

یہی وہ لمحہ تھا جس نے اس کے لیے مسائل کھڑے کر دیے تھے۔ اسے اپنے احمقانہ فیصلے پر افسوس ہو رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت اپنا فیصلہ سناتی اور اپنے فیصلے پر قائم رہتی اور ولیم کے بجائے کوئی مسلم نام رکھتی تو آج وہ اس دوراہے پر نہ کھڑی ہوتی۔ اس کی اپنی غلطی اتنا بڑا عذاب بن کر سامنے آئے گی، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اب میں کیا کروں؟ وہ پچھتا رہی تھی۔ مجھے فادر سے مل کر بات کرنی چاہیے، ان کو ساری بات بتا دینی چاہیے۔ شاید وہ کچھ کر سکیں لیکن میں کس طرح اور کیسے ان کو ساری بات بتاؤں گی۔ کہاں سے شروع کروں گی اور ولیم کا ری ایکشن کیا ہوگا؟ وہ بہت ساری باتوں کو ترتیب دینے لگی اور پھر انھیں ترتیب سے جملوں میں پرونے لگی۔ ان کا سیاق وسباق فادر کے سوالوں کا جواب...... ولیم کی تسلی کیسے کرے گی؟ وہ جتنا سوچ رہی تھی، اتنا ہی جھنجلا رہی تھی...... ایک انجانا سا خوف دل میں سما گیا۔ ولیم کی جتنی بھی چھٹیاں تھیں، وہ ہر روز فادر سے ملنے جاتا۔ گھنٹوں نہ جانے وہاں کیا کیا کرتا رہتا۔ وہ کتنی دفعہ اسے روکنے کی کوشش کرتی مگر کر نہ پاتی۔ وہ اس کے مصمم ارادے اور آنکھوں میں پرعزم چمک دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی۔ ولیم اس کے بارے میں قدرے مشکوک تھا۔ اس سے کرسچینٹی کے بارے میں مختلف سوالات کرتا رہتا اور وہ اِدھر اُدھر ٹال جاتی۔

آج صبح وہ ولیم کو بتائے بغیر باہر چلی گئی تھی۔ کالج میں تو ونٹر ہالیڈیز تھیں اور وہ کبھی بھی ولیم کو بتائے بغیر باہر نہیں جاتی تھی۔ وہ سو رہا تھا۔ ڈور بیل کافی دیر سے بج رہی تھی۔ وہ منہ بسورتا ہوا اٹھا اور دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے ایک دبلی پتلی، سانولی سی لڑکی کھڑی تھی۔ وہ خاصی پریشان لگ رہی تھی۔

''مم...... میں اندر آ جاؤں؟ میڈم کہاں ہیں؟'' وہ قدرے گھبرائی ہوئی تھی۔

''وہ تو گھر پر نہیں ہیں، آپ کون ہیں؟''

''میں جوزفین ہوں۔ میم کی اسٹوڈنٹ، وہ کہاں گئی ہیں، مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں انتظار کر لوں؟''

''شیور!'' اس نے اسے راستہ دیا۔

وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئی اور وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فریش ہو کر آیا تو وہ بے چینی سے صوفے پر پہلو بدل رہی تھی۔ اس نے بغور دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔

''کیا بات ہے...... آپ پریشان لگ رہی ہیں؟''

''نن...... نہیں تو......'' اس نے جلدی سے آنکھیں اپنی ہتھیلیوں سے خشک کرتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کو کوئی مسئلہ ہے تو بتا دیں۔ مما تو نہ جانے کب آئیں گی؟''

''وہ...... میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے اور ہمارے پاس پیسہ نہیں، ان کو اسپتال لے کر جانا ہے۔ میم اکثر کالج میں میری ہیلپ کرتی رہی ہیں۔ اس وقت مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں ادھر ہی آ گئی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''اوہ گاڈ! تو آپ نے پہلے نہیں بتایا۔ اتنی دیر آپ انتظار کرتی رہی، آپ چلیں میرے ساتھ۔'' اس نے دروازہ لاک کیا چابی گیٹ کیپر کو دی اور اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے آپ کو بہت محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسے شہر سے دور گندی سی کچی بستی میں لے گئی۔ ایک کمرے اور برآمدے پر مشتمل گھر میں لے جاتے ہوئے اسے جھجک بھی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ مجبور تھی۔ ولیم کو دیکھ کر ارد گرد کے بچے اور لوگ یوں اکٹھے ہو گئے جیسے کوئی شہزادہ راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہو اور ہر کوئی شہزادے کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہو۔ جوزفین کی چھ بہنیں تھیں اور ایک دو سالہ بھائی۔ باپ ایک سال پہلے فیکٹری میں کام کرتے ہوئے ساتویں منزل سے گر کر مر گیا تھا۔ اب کمائی کا کوئی بھی آسرا نہ تھا۔ ماں لوگوں

کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ ٹھنڈ لگ جانے سے اسے شدید نمونیا ہو گیا تھا۔ ساری رات اس نے شدید اذیت میں گزاری۔ ولیم جلدی سے ٹیکسی لے آیا اور جوزفین کے ساتھ اسے اسپتال میں لے گیا۔ اسے فوراً اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا۔ کچھ ضروری بل ادا کرنے کے بعد اس نے پانچ سو روپے جوزفین کے حوالے کیے۔

''میں مما کے ساتھ دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ اس وقت میرے پاس صرف یہی پیسے ہیں، آپ رکھ لیں۔'' اس کے لہجے میں نہایت مٹھاس اور نرمی تھی۔ جوزفین کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ صرف چند آنسو گرا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

''تھینک یو...... آئی ول ریٹرن یو سون......'' وہ بمشکل بولی۔

''ڈونٹ وری......'' وہ کہہ کر باہر نکلا۔ اس کا دل عجیب سی خوشی اور سرور سے لبریز تھا۔ ایسی خوشی اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی اسے فادر کے الفاظ یاد آنے لگے۔

''جب تم لوگوں کی مشکلات کم کرو گے تو پھر دیکھنا، خداوند یسوع مسیح تمہیں کیا کیا عطا کریں گے۔ یہ دنیا تمہاری مٹھی میں آ جائے گی۔ تم چلو گے تو یوں محسوس کرو گے جیسے کرائسٹ تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔ مائی سن! یو آر سلیکٹیڈ...... یو آر سلیکٹیڈ......'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ فادر کے الفاظ اس کے ذہن میں مسلسل گونج رہے تھے۔ اسے آج جو خوشی ملی تھی وہ اس نے پہلے کبھی بھی زندگی میں محسوس نہ کی تھی۔ اسے گاڈ اور کرائسٹ سے محبت تو تھی ہی، اب کرائسٹ اس کی ذات کا سب سے اہم حصہ بن گئے تھے اور فادر...... تو جیسے کسی بیش بہا نعمت سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا عزم جوان ہو چکا تھا۔ وہ وہی کرے گا جو فادر کہیں گے اور فادر جو کچھ بھی کہیں گے وہی سچ ہو گا۔ فادر پر اندھا دھند اعتماد کرنے کو دل چاہنے لگا۔ وہ واپس آیا تو ماں کو دیکھ کر چونکا۔ اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔

''مما، کیا ہوا...... آپ صبح صبح کہاں چلی گئی تھیں؟''

''میں مس افضال کے پاس گئی تھی مگر تم کدھر چلے گئے تھے، بغیر بتائے۔ میں تمہارے لیے پریشان ہو رہی تھی۔''

جواباً اس نے جوزفین کی ساری کہانی اسے سنا دی۔

''اچھا کیا...... وہ بے چاری بہت دکھی لڑکی ہے۔ کوئی بھی تو آسرا نہیں۔ ہم شام کو اس کی ماں کو دیکھنے اسپتال چلیں گے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ہاں، میں نے جوزفین سے وعدہ کیا تھا کہ میں مما کو لے کر آؤں گا۔'' جوزفین کی ماں کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ جب وہ اسے اسپتال ملنے گئے تو وہ بیڈ پر بیٹھی بچوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ جوزفین اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

''میم! آپ...... آپ...... تھینک یو...... تھینک یو...... ویری مچ۔'' اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ وہ ان دونوں کا شکریہ کیسے ادا کرے۔

''بیٹا! آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا سب ٹھیک کرے گا۔ شکر ہے ولیم گھر پر تھا اور آپ کی مدد کر سکا۔''

''ہاں...... میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔'' احسان مندی اور شکر گزاری کے بوجھ تلے اس کی آنکھیں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

''اٹس آل رائٹ...... آپ کی مدد سے مجھے جو خوشی ملی، وہ میرے لیے سب سے بڑا گفٹ ہے۔'' ولیم کے لہجے میں اعتماد اور خلوص تھا وہ مسکرا کر بولا۔ ولیم کی جتنی چھٹیاں باقی تھیں۔ وہ روزانہ فادر کو ملنے جاتا اور اب جانے سے پہلے بھی وہ ان کو ملنے جا رہا تھا۔ ماں کو بھی اس نے اصرار کر کے ساتھ لے لیا تھا۔ فادر کی بات غلط ہو رہی تھی۔ وہ واقعی ٹرو کرسچن ویمن تھی۔ اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا۔ فادر ان سے بہت محبت سے پیش آئے۔ سب نے شام کی چائے اکٹھے پی۔ فادر نے اسے بائبل کا لیٹسٹ ورژن دیا۔

''اور مسز پیٹر! یہ آپ کے لیے ہے۔'' انھوں نے ایک خوبصورت کراس اور مدر میری کی لائف ہسٹری پر ایک کتاب اسے تحفتاً دی۔

''تھینک یو فادر...... میں آپ سے ملنے دوبارہ آؤں گی۔'' اس کی زبان کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''ضرور...... اور آپ چرچ بھی باقاعدگی سے آیا کریں۔''

''ہاں...... لیکن میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اس لیے بہت کم باہر نکلتی ہوں۔ کالج اور ہاسٹل...... بس یہی میری مصروفیت ہے۔''

''خداوند خدا! آپ پر رحم کرے...... اور آپ کو شفا بخشے۔ خداوند یسوع مسیح آپ کا حامی و ناصر ہو۔'' انھوں نے ایک دم ہاتھ اٹھا کر دعائیں شروع کیں تو ولیم نے بھی ہاتھ اٹھا لیے اور نادانستہ اسے بھی ہاتھ اٹھانے پڑے۔ اس کا ذہن عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ

اٹھائے تھے گو کہ دل ابھی بھی یکسوئی سے خالی تھا۔ پیٹر سے شادی کے بعد تو اس نے خدا سے اپنا ناتا بالکل منقطع کر لیا تھا۔ جب دعائیں نہ میرا مقدر بدل سکتی ہیں اور نہ ہی شناخت تو یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ خدا سے کیسا رابطہ رکھا جائے؟ جب وہ میرا دکھ سمجھتے ہوئے بھی اسے کم نہ کرے۔ میری آزمائشوں میں میرا ساتھ نہ دے تو پھر سب تعلق بے معنی ہیں۔ اسے بس سانسیں پوری کرنی تھیں اور وہ کر رہی تھی۔

''آپ دیکھیے گا، آپ کی روح کو سکون آ جائے گا۔'' فادر وثوق سے بولے۔

''خاک سکون آئے گا بلکہ سب کچھ اور منتشر ہو جائے گا۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ولیم مسرور تھا کہ فادر کی اور مما کی ملاقات بہت خوشگوار ماحول میں ہوئی تھی۔ اگلے دن وہ واپس مری چلا گیا اور وہ افسردہ سی پھر کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ اور ہاسٹل واپس آ گئی۔

''مسز پیٹر کیا بات ہے؟ آپ بہت دنوں سے الجھی الجھی لگ رہی ہیں۔ کرسمس والے دن بھی آپ بے حد پریشان لگ رہی تھیں۔ ایسی کیا پریشانی ہے کہ آپ شیئر بھی نہیں کر سکتیں۔'' مس افضال نے اسے راستے میں روک کر پوچھا۔

''معلوم نہیں مگر طبیعت بہت بوجھل رہتی ہے۔ نہ جانے کیسی پریشانی ہے شاید آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ آخری وقت میں ایسی ہی اداسی اور پریشانی چھائی رہتی ہے۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''اللہ نہ کرے...... یہ آپ صبح صبح کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ حوصلہ مت ہاریں، ابھی تو ولیم کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔'' مس افضال نے اسے تسلی دینا چاہی۔

''کسی کو کسی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی کسی کے لیے اہم نہیں ہوتا۔ سب زندہ رہتے ہیں کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''اچھا، آپ پریشان نہ ہوں۔ شام کو سب خواتین کی ایک میٹنگ ہے۔ آپ نے بھی کامن روم میں پہنچنا ہے۔ آپ کی شرکت بہت ضروری ہے۔ ایک اہم پروگرام ڈسکس کرنا ہے۔'' مس افضال نے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، ابھی چلتی ہوں۔ کالج سے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ بوجھل قدموں سے گیٹ سے باہر چلی گئی اور مس افضال اس کی باتوں پر دل مسوس کر رہ گئیں۔

شام کو سب خواتین مس افضال کے ہمراہ کامن روم میں موجود تھیں۔ انچارج مسز شائستہ جبیں بھی ان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

''مس حیدر، کافی سوشل لگتی ہیں۔ انھوں نے خصوصی طور پر لیٹر بھیجا ہے کہ ورکنگ ویمن کے لیے بھی کچھ تفریح ہونی چاہیے۔ ایک فن فیئر ٹائپ فنکشن اور ہاں، اس کے ساتھ کچھ ایسے اسکٹس بھی ہوں جو ان خواتین کے مسائل سے ریلیٹیڈ ہوں۔'' مسز شائستہ نے کہا۔

''لیکن مس حیدر کو اس میں اتنی دلچسپی کس لیے ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ان کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے مگر دوسری بیگمات تو نمبر بنانے کے چکروں میں رہتی ہیں۔ ان کے لیے تو یہ سب ان کے ہسبینڈز کی پوزیشن اسٹرونگ کرنے کے لیے ہوتا ہے ورنہ ان کے دل تو خلوص سے خالی ہوتے ہیں۔ بہرحال مسز پیٹر، آپ کا لب و لہجہ بہت اچھا ہے۔ آپ کمپیئرنگ کریں گی اور ایک اسکٹ بھی آپ تیار کرلیں۔ اور باقی کچھ ٹریڈیشنل پروگرامز ہوں گے۔ اس کے علاوہ اسٹالز بھی کرلیں گے۔'' مسز شائستہ نے کافی دیر ان سے پروگرام ڈسکس کیا اور مطمئن ہو کر چلی گئیں۔

''میڈم! چیف گیسٹ کون ہوگی؟'' ایک خاتون نے جاتے جاتے انھیں روک کر پوچھا۔

''ظاہر ہے، مس شہلا حیدر ہی ہوں گی۔'' ایک اور منسٹر کی مسز بھی ہیں۔ اگر ایک کو بلایا جائے اور دوسری کو نہ بلایا جائے تو پھر دونوں میں ٹھن جاتی ہے اور پھر پستے تو ہم جیسے لوگ ہیں۔ آپ لوگ چار پانچ روز میں مجھے فائنل کر کے بتا دیں پھر دعوت نامے بھی بھیجنے ہیں۔ ہاسٹل کی مینجمنٹ کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ جو ویلفیئر ٹرسٹ چلاتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے بہت بڑی گیدرنگ ہوگی۔''

شہلا حیدر! نام جانا پہچانا سا بھی لگ رہا تھا اور نہیں بھی۔ وہاں بیٹھی خواتین کیا کیا پروگرامز بناتی رہیں، اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اس کا ذہن تو ایک نقطے پر اٹک گیا تھا۔ اسے جیسے کوئی پھانس سی چبھ گئی تھی۔ وہ بے چینی سے معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی۔

''آج کل مسز پیٹر کچھ ڈسٹرب ہیں۔'' مس افضال نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

''ہاں......شاید......'' کوئی بھی کمنٹ نہ کرسکا کیونکہ وہاں رہنے والی ہر خاتون ہی ڈسٹرب تھی اور ہر ایک کو اپنا غم دوسری سے زیادہ لگتا تھا اور ویسے بھی مسز پیٹر نے کبھی بھی اپنی کوئی بات کسی سے شیئر نہیں کی تھی۔ سب یہی جانتے تھے کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اب بیٹے کو پال رہی ہیں۔ اس سے مزید کسی نے بھی جاننے کی خواہش نہ کی اور نہ اس نے بتانے کی۔

کس طرح اس نے فنکشن کے لیے اسکٹ تیار کیا، کس طرح وہ بے دلی سے اس

سارے کام میں ایکٹو رہی، یہ صرف وہی جانتی تھی۔ کئی بار دل چاہا کہ مس افضال سے ایکسکیوز کر لے کہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتی مگر وہ ان سے کچھ بھی نہ کہہ پاتی۔ خاموشی سے بنا کچھ کہے لوٹ آتی۔ مس افضال اور ہاسٹل کی دوسری خواتین بہت ایکسائیٹڈ تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت عرصے کے بعد ان کی یکسانیت سے بھرپور زندگیوں میں خوشی کا کوئی لمحہ آیا ہو۔ کچھ چینج شاید پلیزنٹ چینج۔ سب لوگ کچھ مختلف سوچ رہی تھیں۔ کپڑوں کے بارے میں، گیٹ اپ کے بارے میں......اور بہت کچھ۔

''مسز پیٹر! شام کو دعوت نامے لکھنے ہیں۔ آپ دو تین لڑکیوں کو لے کر آ جایئے۔ لسٹ میں نے بنا لی ہے، یہ کام بھی ہو جائے تا کہ کل ہی دعوت نامے بھیج دیے جائیں۔'' مس افضال نے کہا۔

''جی بہتر......ہم لوگ شام کو آ جائیں گے۔''

شام کو وہ مہ رخ اور نبیلہ کے ساتھ مس افضال کے کمرے میں چلی گئی۔ مہ رخ اور نبیلہ دونوں ہی بہت ایکٹو اور سوشل لڑکیاں تھیں۔ جنھیں ہاسٹل آئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔ اس لیے ہاسٹل کی یکسانیت اور اداسی کا اثر ابھی ان پر نہیں ہوا تھا۔

''مسز پیٹر! آپ نے کیسا ڈریس بنوایا ہے؟'' مہ رخ نے پُرجوش انداز میں پوچھا۔

''بھئی نکال لوں گی کوئی پرانی ساڑھی۔'' وہ بے دلی سے بولی۔

''اور تم نے'' اب کی بار نبیلہ نے اس سے پوچھا۔

''میرے باس آج خرید کر دیں گے۔'' مہ رخ اِک ادا سے بولی۔

''کیا مطلب......تمھارے باس......؟'' نبیلہ کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

''اتنا کام کرتی ہوں۔ کیا ہے ایک سوٹ خرید کر دے دیں گے تو کوئی احسان تو نہیں کریں گے۔'' مہ رخ نے قہقہہ لگا کر کہا تو دونوں ہنس دیں۔

''کاش......میرے بھی کوئی باس ہوتے۔ میں تو ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ وہاں کی پھٹیچر سی پرنسپل بات سیدھے منہ سے کرتی نہیں سوٹ خرید کر دینا تو ناممکن اور دور کی بات ہے۔'' مسز پیٹر ان کی باتیں سن کر مسکرا دیں۔

''مسز پیٹر یہ لسٹ لے لیں، ذرا احتیاط سے سب کے نام لکھوایئے گا اور وی آئی پیز اور چیف گیسٹ کے نام آپ خود لکھئے گا۔ بہت احتیاط سے......میرا مطلب آپ سمجھ رہی ہیں نا......'' مس افضال نے ناموں کی لسٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''آپ بے فکر رہیے...... میں خود ہی یہ کام کرتی ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں اسٹور میں جا کر ذرا کراکری چیک کرلوں۔'' مس افضال اٹھتے ہوئے بولیں۔

''ٹھیک ہے......'' وہ لسٹ لے کر پڑھنے لگی۔ ایک نام پر تو اس کا دل جیسے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مسز شزا منصور۔ تو کیا یہ وہی شزا ہے جو انگلینڈ میں...... اس دن اور اب چیف گیسٹ...... ماڈل...... اور اب چیف گیسٹ...... اس کا جسم کپکپانے لگا۔ اسے اس بات کا افسوس نہ تھا کہ وہ کیا بن چکی تھی، ملال تھا تو اس بات پر کہ وہ کس طرح اس کے سامنے اپنے وجود اپنی شناخت کے لیے منصور اور اس کے بچوں کو دھتکار کر نکلی تھی اور آج وہ کہاں کھڑی تھی ورکنگ ویمن ہاسٹل میں۔ اکیڈمی کم کالج میں ایک ادنیٰ لیکچرار یا پھر عام سی ٹیچر...... کیا یہی وہ مقام تھا جس کو حاصل کرنے کے وہ درپے تھی۔ اس وقت اس میں کتنی انا تھی۔ کتنا اعتماد اور خودداری تھی اور سب کچھ اتنا لمحاتی اور عارضی ثابت ہوا کیونکہ یہ سب اس کی ذات کی خصوصیات نہیں تھیں۔ وہ تو شروع سے ہی بزدل اور ڈرپوک تھی۔ نہ جانے اس وقت اس میں اتنی ہمت اور قوت کہاں سے آ گئی تھی؟ اور اب شزا اسے دیکھ کر کیا سوچے گی؟ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ کاش وہ نہ آئے۔ اسے کوئی ضروری کام پڑ جائے اور وہ نہ آ سکے۔ دل ہی دل میں نہ جانے اس نے کتنی بار دعا کی۔ فنکشن تک وہ بے دلی اور بے اطمینانی محسوس کرتی رہی اور جس دن فنکشن تھا، وہ سخت بے چینی سے اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ مس افضال اور مسز شائستہ جبیں صبح سے بھاگ دوڑ میں مصروف تھیں۔ خواتین کے مختلف اسٹالز پر خوب رونق تھی۔ باقاعدہ تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔ مس حیدر کو دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ وہ وہی تھی جو وہ سمجھ رہی تھی۔ وہ حیدر کی ہی بیٹی تھی کیونکہ وہ کافی حد تک باپ پر تھی۔ وہی نین نقش اور دائیں آنکھ کے پاس سیاہ تل۔ بے انتہا کانفیڈنٹ اور گریس فل۔ اس کی شاندار پرسنالٹی کے سامنے ہر ایک ہیچ نظر آ رہا تھا۔ وہ بیس بائیس برس کی دھان پان سی لڑکی تھی۔ اسے دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی مگر وہ آگے جا کر اسے مل نہ سکی۔ البتہ شزا فنکشن میں بہت دیر سے آئی تھی۔ اس کی نگاہوں کا مرکز وہی تھی، وہ مہمان خواتین کے ساتھ اس قدر باتوں میں مصروف تھی کہ شزا نے اس کی طرف بہت کم دھیان دیا۔ ویسے بھی گردشِ ایام نے اس کو قدرے بدل کر رکھ دیا تھا۔ شزا کے بجائے منصور بھی ہوتا تو اسے بھی پہچاننے میں چند ثانیے لگتے۔ اس نے مس افضال کی کہانی پر مبنی ایک اسکرپٹ تیار کیا تھا جو خصوصی طور پر ان کی مرضی اور اجازت لے کر کیا گیا تھا۔ اس کی

ایکٹنگ اتنی جاندار تھی کہ سب بہت متاثر ہوئے۔ ہاسٹل میں رہنے والی کئی خواتین تو باقاعدہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ مس حیدر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو خاموشی سے آہ بھر کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی افسردگی خصوصی طور پر نمایاں تھی۔ فنکشن کے اختتام پر سب نے اس کی ایکٹنگ اور کمپیئرنگ کو بہت سراہا۔

''ورکنگ ویمن کے کتنے مسائل ہوتے ہیں، ہم لوگ تو کبھی جان ہی نہیں پائے۔''

مس حیدر نے مسز شائستہ جبیں سے کہا جو اس کا تعارف اس سے کروا رہی تھیں۔ اس کی نظریں تو بس مس حیدر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ کسی طور بھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنا خوبصورت گلابی چہرہ ہے اور اس چہرے سے وابستہ اس کی یادیں بھی کتنی خوبصورت تھیں۔

''مس حیدر ان لوگوں کے لیے ضرور کچھ کرنا چاہیے۔'' مسز شہزا منصور کے لہجے میں عجیب سا طنز تھا جسے مس حیدر اور دوسری خواتین بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

''میرا خیال ہے این جی اوز بھی کافی فنڈز کھا چکی ہیں، اب ان کو بھی عوام کی فلاح و بہبود کے لیے متحرک ہونا چاہیے۔'' مس حیدر نے بھی جلدی سے جواب دیا تو شہزا منہ بنا کر رہ گئی۔ وی آئی پی خواتین خوب ایک دوسرے کو لپیٹ لپیٹ کر سنا رہی تھیں۔ ایسے مواقع تو کبھی کبھار ہی ان کو ملتے تھے جب وہ اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتی تھیں۔ اس فنکشن نے تو ان کو اچھا موقع فراہم کر دیا تھا۔

''مسز پیٹر، مجھے آپ کا چہرہ اور نام کچھ شناسا سا لگ رہا ہے۔ میں کب سے ذہن پر دباؤ ڈال رہی ہوں مگر یاد نہیں آ رہا۔ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے...... اصل میں میری یادداشت بہت خراب ہو چکی ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ بچوں، گھرداری اور آفس کی مصروفیات کی وجہ سے ہر وقت ڈسٹرب رہتی ہوں۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بول رہی تھی۔

''چلیں چھوڑیں، کبھی کبھی بہت سے چہرے ناقابل یقین حد تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یقیناً آپ نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔ وہ جلد از جلد اس سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی اس لیے معذرت کرتے ہوئے جلدی سے وہ مس حیدر کی طرف مڑی جو مس افضال سے باتوں میں مصروف تھی۔ مبادا وہ کہیں اسے پہچان نہ لے۔ وہ دل ہی دل میں اس سے چھٹکارا پانے کی پلاننگ کرنے لگی۔

''میں پاپا سے کہوں گی کہ وہ ہاسٹل کا وزٹ ضرور کریں۔ ظاہر ہے، وہ ویلفیئر منسٹر ہیں تو جب تک خواتین کی بہبود کے لیے کام نہیں ہوگا، معاشرے کی فلاح کیسے ممکن ہوگی۔'' وہ

شستہ انگریزی میں تیز تیز بول رہی تھی۔ اس کے بولنے کا انداز......اور لہجے میں ٹھہراؤ بہت حد تک سید صاحب اور حیدر سے ملتا تھا۔

''ہاں......ضرور لیکن آنے سے پہلے ہمیں فون ضرور کر دیں۔'' مسز شائستہ جبیں فوراً بولیں۔

''آپ بے فکر رہیے۔ وہ کسی پروٹوکول کے قائل نہیں۔ اچانک وزٹ پر یقین رکھتے ہیں۔ اس طرح حالات کا بہتر طور پر پتا چل جاتا ہے۔''

''ہاں، ان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے......ان جیسے لوگ بہت کم ہیں۔'' مسز شائستہ نے تعریفی لہجے میں کہا۔

''ہاں، جب سے منسٹر بنے ہیں وہ تو جیسے گھر کو بھول ہی گئے ہیں۔ ہر وقت کچھ کرنے کا جذبہ ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔'' مس حیدر بھی باپ سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔

''ہم ان کی آمد کے منتظر رہیں گے۔'' مس افضال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور آپ کی تو میں بہت تعریف کروں گی۔ آپ کی ایکٹنگ واقعی کمال کی تھی اور موضوع بھی بہت مناسب تھا۔ کیا نام ہے آپ کا؟'' اس نے اپنے مرمریں نازک ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

''مسز پیٹر...... یہ بہت ٹیلنٹیڈ خاتون ہیں۔'' مس افضال جلدی سے بولی تھیں۔

''وہ تو نظر آ رہا ہے۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ کچھ دیر اور رک جاؤں مگر ایک اور فنکشن بھی اٹینڈ کرنا ہے۔ جب سے پاپا منسٹر ہوئے ہیں۔ خواتین کے فنکشنز مجھے ہی اٹینڈ کرنے پڑتے ہیں۔''

''کیوں......مسز حیدر کہاں ہیں؟'' مسز شائستہ نے ایک دم پوچھا۔

''دراصل میری پیدائش کے دو سال بعد ان کی ڈیتھ ہو گئی۔ اس لیے مجھے ہی پاپا کو سپورٹ کرنا پڑتا ہے۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

اسے طاہرہ کی وفات کا سن کر قدرے صدمہ ہوا۔ وہ مس حیدر سے بہت کچھ سننا چاہتی تھی۔ بہت سے لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتی تھی مگر سب کچھ ذہن سے جیسے محو ہو گیا تھا۔ مہمان خواتین جا چکی تھیں۔ وہ بھی واپس آ گئی۔ انتہائی تھکاوٹ کے باوجود بھی اس کا ذہن بہت متحرک تھا۔ شہلا حیدر، ذہن تو جیسے گھوم پھر کر اس نام پر اٹک سا گیا تھا......تو حیدر اسے بھول نہیں پایا تھا۔ طاہرہ تو اس کا نام سننا گوارا نہیں کرتی تھی اور حیدر تو شاید اسی نام کے

سہارے جیتا تھا اسی لیے تو اس نے اپنی بیٹی کو یہ نام دیا تھا۔ اسے حیدر کی یہ ادا اچھی بھی لگ رہی تھی اور دکھ بھی ہو رہا تھا۔ کوئی کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا اور وہ دلدل میں پھنستی ہی چلی گئی تھی۔ اسے مس حیدر پر بہت پیار آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے ملنے جائے، اسے گلے سے لگائے اور اس سے ڈھیروں باتیں کرے مگر وہ تو ان سب کے لیے شاید مر چکی تھی۔

شزا بار بار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اس نے جب سے منصور کو چھوڑا تھا، اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ بچوں کو بھی بھلا دے۔ بہت بھلانے کے باوجود وہ اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ نہ جانے آج کیوں اس کا دل شدت سے بچوں کے لیے بھی تڑپنے لگا۔ جب تک ولیم اس کے پاس رہا۔ اس نے ان کو قدرے بھلائے ہی رکھا مگر اب اس کا دل جیسے اس کو سرزنش کر رہا تھا کہ اس نے ولیم کو ہی کیوں اپنی اولاد سمجھا، انھیں کیوں نہیں۔ شفق، آفاق...... اور فلک۔ فلک کتنا روتی رہتی تھی اور جاتے ہوئے شفق اور آفاق کتنے ناراض تھے۔ اس نے تو پلٹ کر کبھی ان کی خبر بھی نہ لی اور ان کو منانے کی کوشش بھی نہ کی۔ نہ ہی ان سے کوئی رابطہ رکھا۔ آخر وہ اس کے بچے بھی تو تھے۔ اس نے پرانا البم الماری میں سے نکالا اور ان کی تصویروں کو پیار کرنے لگی۔ آنسو فرطِ جذبات سے اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ اسے بچوں سے اتنی شدید محبّت محسوس ہو رہی تھی جو اس سے پہلے شاید کبھی اس نے محسوس نہ کی تھی۔ ایک دم نہ جانے سید صاحب کہاں سے ذہن کے پردے پر نمودار ہوئے۔ وہ تو سب کو بھلانے کی کوشش میں تھی مگر سب اپنی اپنی جگہ پر جوں کے توں موجود تھے۔

''کیا ماضی سے کبھی بھی فرار ممکن نہیں...... حال ہمیشہ ماضی کی طرف کیوں دھکیلتا ہے......؟ اور مستقبل، ماضی اور حال سے تصدیق کیوں چاہتا ہے؟ اس نے اپنے ماضی سے نجات پانے کے لیے اپنے آپ کو کہاں کہاں گم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر ماضی پھر اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا تھا۔ اس کا مطلب ہے اپنے وجود سے فرار کی ساری کوششیں بیکار ہیں...... اتنے برسوں میں اسے کسی نے کوئی طعنہ نہ دیا مگر اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی قوت رفتہ رفتہ اسے ماضی کی طرف لے جا کر اس کو کھوجنے کی جدوجہد میں تھی۔

''یا خدایا...... یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا...... مجھے ہستی کے عذاب میں کیونکر مبتلا کیا...... کیوں کیا؟ میرے پاس نہ کوئی راستہ ہے اور نہ ہی کوئی منزل۔ ہم جیسے بے خانماں اور بکھرے وجود کہاں جائیں۔ ہمارے لیے بھی تو اپنی اس زمین پر کوئی جائے پناہ رکھتا۔'' وہ سسکنے لگی۔ ایک دم ولیم اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ ولیم جن راستوں پر چل نکلا تھا وہ اس

کی منزل تو نہیں...... اس کا مطلب ہے ولیم بھی ڈوب رہا ہے۔ کیا وہ بھی اپنی ماں کی طرح یونہی ساری زندگی منتشر رہے گا؟ نہیں، میں ولیم کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے اس کے لیے تو کچھ کرنا چاہیے؟ مجھے فادر سے جلد از جلد ملنا چاہیے۔ اس نے پکا ارادہ کرلیا کہ وہ اگلے دن ضرور فادر سے ملے گی۔

اس نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا۔ بہت سے جملے ترتیب دیے۔ اپنے آپ کو ٹیمپر لوز نہ کرنے کی ہدایت کی۔ میں آج ہر قیمت پر ولیم کو واپس لے کر رہوں گی۔ اس نے مصمم ارادہ کیا اور واپسی پر فادر سے ملنے چلی گئی۔

''مجھے فادر سے ملنا ہے۔'' اس نے بوڑھے ملازم کو کہا۔

''کیوں......؟'' وہ بہت سوالات کرنے کا عادی تھا۔

''ان سے کہیے...... ولیم کی مما ملنے آئی ہیں۔'' وہ قدرے روکھے انداز میں بولی۔

''آپ بیٹھیں، میں بلاتا ہوں۔'' وہ بے چینی سے ایک پرانے کاؤچ پر بیٹھی پہلو بدلتی رہی۔

''خیریت ہے مسز پیٹر، آپ یوں اچانک......؟ ولیم تو ٹھیک ہے نا؟'' فادر اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوئے تھے۔

''ہاں، سب ٹھیک ہے...... لیکن میں آج آپ سے بہت اہم بات کرنے آئی ہوں۔'' اس نے لہجہ مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''جی فرمائیے، میں سن رہا ہوں۔'' فادر بھی متجسس لہجے میں بولے۔

''فادر...... ولیم کو اپنے راستے سے مت ہٹائیں۔ اسے تعلیم مکمل کرنے دیں۔ میں اسے پائلٹ بنانا چاہتی ہوں۔ میں نے زندگی میں صرف یہی ایک خواب دیکھا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس خواب کی حقیقت دیکھ لینے دیں۔ میں اس کے لیے کس قدر جدوجہد کر رہی ہوں۔ آپ شاید اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور میں نے جس طرح مشکل حالات میں اسے زمین کی بھول بھلیوں میں الجھا رہے ہیں۔'' وہ قدرے روہانسی ہو کر بولی۔

''مسز پیٹر! یہ میرا نہیں گاڈ کا فیصلہ ہے۔ آپ کے بیٹے کی سول تمام لوگوں سے مختلف ہے۔ آپ فضاؤں کو تسخیر کرنے کی بات کر رہی ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ دلوں کو تسخیر کرے گا۔ خداوند نے اسے عام انسانوں سے ممتاز کیا ہے۔ اسے جو مشن سونپا جا رہا ہے وہ ہر ایک کو تو نہیں سونپا جا سکتا۔ گاڈ اپنے کچھ اسپیشل لوگ دنیا میں بھیجتا ہے جنھیں اہم کام

کرنے ہوتے ہیں اور ولیم بھی گاڈ کا اسپیشل بندہ ہے۔ آپ نے جن حالات کا ذکر کیا ہے تو گاڈ کے اسپیشل بندے انہی حالات میں سے گزرتے ہیں، کیا آپ کرائسٹ کی لائف اور مدر میری کی مشکلات بھول گئی ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے، ولیم وہ کام کرے گا جو لاکھوں پائلٹس بھی نہیں کر سکتے۔ اور ولیم سے گاڈ سچّی محبت کرتے ہیں۔ وہ کرائسٹ کے مشن کو پھیلائے گا۔'' فادر کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ مزید کچھ نہ بول سکی۔ وہ جو بہت کچھ کہنے آئی تھی، بالکل مزاحمت نہ کر سکی۔ وہ ولیم کو ہر قیمت پر واپس لینے آئی تھی اور پہلی ہی گفتگو میں ہتھیار ڈال دیے۔ وہ فادر کو کنونس نہ کر سکی۔ وہ فادر کو یہ بھی نہ بتا سکی کہ آپ کس سے مشن کو آگے بڑھانے کی بات کر رہے ہیں۔ جس کا کوئی مذہب ہی نہیں۔ عیسائیت کی رو سے تو وہ عیسائی بھی نہیں، آپ صرف نام سے دھوکے میں آ گئے۔ وہ سوچوں میں گم لفظوں کو پھر ترتیب دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ فادر نے اسے پھر چونکا دیا۔

''مسز پیٹر! آپ کہاں سے تعلّق رکھتی ہیں؟'' فادر کے اس سوال پر وہ گڑبڑا سی گئی۔ اسے اس غیر متوقع سوال کی قطعی امید نہ تھی۔

''میں پاکستان سے......'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''وہ تو میں جانتا ہوں......مگر کس شہر سے......؟''

''لاہور سے۔''

''میرا مطلب ہے......آپ کے پیرنٹس......؟''

''سب مر گئے......'' وہ بے اعتنائی سے بولی۔

''آپ میرا مطلب نہیں سمجھ رہیں...... کس چرچ سے ان کا تعلّق تھا اور آپ کیتھولک ہیں یا پروٹسٹنٹ؟'' فادر کے ادھورے جملے میں بہت سے معنی پوشیدہ تھے۔

''میں اب چلتی ہوں، میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' وہ فادر کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔

''او کے......مسز پیٹر......آپ ریلیکس رہیں......اور فکر نہ کریں۔ قدرت نے ولیم کو خود منتخب کیا ہے اس کے لیے راستہ بھی خود ہی بنائے گی۔'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی بس اسٹاپ تک پہنچی۔ فادر نے ایک ہی وار میں اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ اچانک اس کے منہ پر وہی طمانچہ مارا تھا جس کی جلن وہ اپنے اندر کئی سالوں سے محسوس کرتی آ رہی تھی۔

ماضی سے فرار ممکن نہیں...... حال ہمیشہ ماضی کی طرف دھکیلتا ہے اور مستقبل دونوں

سے سوال کرتا ہے۔

انسان اس دنیا میں ایسی مخلوق ہے جس کا ماضی قدم قدم پر اسے منہ کے بل گراتا ہے کسی اور مخلوق کا ماضی اسے اتنی تکلیف نہیں دیتا جتنا انسان کو...... تف ہے اس زندگی پر۔ اس نے اپنے وجود کی شناخت اور مقام کے لیے بڑے سے بڑے قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کیا تھا اور حاصل......؟ وہ تو حاصل اور لاحاصل کے چکر میں بری طرح پھنس گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں سے چلی تھی۔ وقت کے ساتھ نظریات تو بدلتے ہیں مگر حقیقتیں کبھی نہیں بدلتیں۔ زمانہ چاہے کتنے رنگ بدلے مگر انسان کا وجود۔ اس کا پیکر اور کائنات میں اس کا مقام کبھی بھی نہیں بدلتا۔ وہ وہی رہے گا جو ازل سے متعین کر دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ خلاؤں کو تسخیر کر لے یا آسمان کی وسعتوں کو چھو لے۔ کبھی بھی کچھ نہیں بدلتا۔ نہ زندگی کے دکھ نہ سکھ۔ نہ احساسات نہ جذبات، نہ کبھی آنسو خون بن سکتے ہیں، نہ خون کبھی آنسو۔ نہ ہنسی پھول کھلا سکتی ہے اور نہ دکھ دلوں کو خوش کر سکتے ہیں۔ ازلی حقیقتیں سب اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں۔ اس نے جو سوچا تھا، ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا ہر قدم الٹا ہی پڑا تھا۔ خسارہ تب بھی تھا اور اب بھی مگر تب اس کا وجود ایک معما تھا اور اب ایک سوال...... تب اس کی حیثیت مشکوک نہ تھی اور اب حیثیت بھی مشکوک تھی اور وجود بھی۔ اب کس کو ایکسپلور کرنا تھا، کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ واپسی کے سب راستے مسدود ہو چکے تھے۔

ولیم کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکی تھی، اس کا اسے شدید قلق تھا۔ اب وہ دوسرے بچوں کے بارے میں جاننے کے لیے فکر مند تھی اور ان تک پہنچنے کا واحد ذریعہ شزا تھی۔ شزا کو دیکھنے کے بعد اس میں بچوں سے ملنے کی تڑپ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ وہ شزا سے ملنا چاہ رہی تھی۔ جلد از جلد...... اس نے ہاسٹل سے ہی اس کا فون نمبر لے کر رابطہ کیا مگر وہ مسلسل انگیج جا رہا تھا۔ جیسے جیسے فون بزی ملتا، اس کا دل اتنی ہی بے تابی اور بے چینی سے دھڑکتا نہ جانے کیوں وہ ہر صورت میں اس سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ کافی دیر بعد بیل گئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ شزا کی سیکرٹری نے فون اٹھایا تھا۔

''مسز شزا سے بات کرنی ہے۔''

''میڈم تو نہیں ہیں، ضروری کام کے سلسلے میں باہر گئی ہیں۔'' دوسری جانب سے آواز آئی۔

''مجھے بہت ضروری کام تھا۔ کس وقت ان سے بات ہو سکتی ہے؟'' وہ بے تابی

سے بولی۔

''آپ ان کے موبائل پر رابطہ کرلیں۔'' اس نے جلدی سے موبائل نمبر لکھوا کر فون بند کر دیا۔ موبائل نمبر لے کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کیا واقعی اسے ضروری کام تھا؟ وہ کیسے اس سے بات کرے گی؟ کہیں شنزا اس بات کو مائنڈ ہی نہ کرلے۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھی جب رشیدہ اسے بلانے آئی۔

''میڈم صاحبہ! جلدی سے آفس پہنچیں جی...... بڑی میڈم صاحبہ بلا رہی ہیں۔ جلدی کریں جی...... دیر نہ کریں۔'' رشیدہ بوکھلائی ہوئی تھی۔

''کیوں...... خیریت تو ہے نا۔'' وہ رشیدہ کی بدحواسی دیکھ کر بولی۔

''بس جی، کوئی بڑے مہمان آئے ہیں۔''

''کون بھئی...... کون آ گیا؟'' وہ بھی ذرا حیرت سے بولی۔

''پتا نئیں جی! پر کوئی بڑے بڑے لوگ ہیں اور پولیس بھی ساتھ ہے۔''

''اچھا......'' وہ سوچوں میں گم وہاں پہنچی تو مسز شائستہ جبیں کے آفس کے باہر جمگھٹا سا لگا ہوا تھا۔ اس سے قبل تو کوئی بڑا آدمی یوں اچانک نہیں آیا تھا، کون ہوسکتا ہے؟'' وہ حیران ہوتی ہوئی اندر چلی گئی، وہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔

''آیئے مسز پیٹر! حیدر صاحب آئے ہیں۔'' مسز شائستہ جبیں کے لہجے میں فخر و انبساط تھا۔

اس نے ایک نظر اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کا جسم بری طرح لرزنے لگا۔ اس کے سامنے سید ضرارالدین حیدر ڈھلتی عمر، سرخ و سفید رنگت، کھچڑی بالوں اور سفید کاٹن کے اکڑے سوٹ میں اجلی اجلی نکھری شخصیت کے ساتھ براجمان تھا۔ حیدر نے بھی اسے پہچان لیا تھا اور ایک دم نظریں جھکا لی تھیں۔

''ادھر بیٹھیے مسز پیٹر......'' مس افضال نے اسے اپنے ساتھ بٹھایا۔ وہ بار بار مسز پیٹر کے نام پر چونک رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ کر ان کی باتیں سننے لگی۔ ایک دفعہ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو حیدر کی آنکھوں میں سرخی سی نمودار ہونے لگی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ آنکھیں کب سرخ ہوتی تھیں۔ اس کی آواز میں ارتعاش بھی پیدا ہو رہا تھا۔ جو چند ثانیے قبل بہت پُر اعتماد لہجے میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ ان کے مسائل سن رہا تھا۔ اب اندر ہی اندر جذبات سے مغلوب ہو کر رندھے ہوئے گلے کے ساتھ ان کے مسائل بے دلی سے پوچھ

رہا تھا۔ اس نے اس کے وجود کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا وجود تو جیسے پسینے میں نہا گیا تھا۔

''مسز پیٹر، آپ بھی تو کچھ بتائیں نا......'' مسز شائستہ نے اچانک اس سے کہا تو وہ چونک سی گئی۔

حیدر ایک دم اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا لرزیدہ وجود کتنا بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے سفید بال، نظر کی عینک اور پژمردہ چہرہ...... کسی طور بھی اس شہلا سے مماثلت نہیں رکھتا تھا وہ جس شہلا کو جانتا تھا۔ وہ تو حسن و جمال کا پیکر تھی اور اب ایسا حلیہ اس نے تو کبھی تصور میں بھی شہلا کو ایسا نہ دیکھا تھا۔

''میں کیا بتاؤں...... حیدر صاحب، بہت ہمدرد انسان ہیں۔ آپ انھیں بتایئے نا کہ آپ نے جو لمبا عرصہ یہاں گزارا ہے؟ آپ کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ حکومت ان مسائل کو کیسے حل کر سکتی ہے۔'' مس افضال نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔

''آپ کب سے یہاں ہیں؟'' حیدر کے اچانک سوال پر وہ مزید بوکھلا گئی۔

''غالباً سولہ سترہ سال سے......'' وہ نظریں چرا کر بولی۔

''کسی کے بارے میں بھی رائے دینے کے لیے یہ عرصہ کافی ہوتا ہے۔'' حیدر کے لہجے میں رعب اور اعتماد عود کر آ رہا تھا۔

''ضروری نہیں، بعض اوقات انسان ساری زندگی گزارنے کے باوجود کسی کے بارے میں اپنی رائے نہیں دے پاتا۔ یہ تو اپنے اپنے تجربے کی بات ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''مسز پیٹر کچھ تو کہیے؟'' مسز شائستہ نے پھر اصرار کیا۔

''میڈم...... کیا آج تک کوئی کسی کے مسائل حل کر سکا ہے؟ کسی کی مشکلات ختم ہو سکی ہیں۔ یہ سب بے معنی اور فضول ہے۔ میرے خیال میں کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ جو لوگ خود مجبور و بے بس ہوں، مصلحتوں اور مجبوریوں کی ڈوروں سے بندھے ہوں وہ دوسروں کے لیے کیا کر سکتے ہیں، یہ محض دعوے ہیں۔ الفاظ کا گورکھ دھندا۔ سب سے زیادہ نقصان تو ہم جیسے مجبور اور لاچار لوگوں کا ہوتا ہے۔ جو ان باتوں کے داؤ میں آ کر سنہرے خواب بننا شروع کر دیتے ہیں مگر جب حقیقت کھلتی ہے تو ہم اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ بے وقعت اور کمزور پاتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسی میٹنگز کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ قدرے

تلخی سے بولی۔

''لگتا ہے آپ کو زندگی کا بہت تلخ تجربہ ہوا ہے۔'' حیدر کی بات نے اسے شدید دھچکا لگایا۔

''زندگی بذاتِ خود بہت تلخ ہے۔ تجربے بھی تو ویسے ہی ہوں گے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اوہ میڈم! آج تو میرے پاس وقت کچھ کم ہے لیکن جب اگلی دفعہ آؤں گا تو تفصیلاً بات ہوگی۔ آپ ہر قسم کے مسائل کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ کرسکتی ہیں۔'' وہ اٹھا تو سب لوگ اس کے ساتھ اٹھ گئے۔ جاتے ہوئے بھی اس کی نظروں کا محور وہی تھی۔ سب لوگ اسے باہر تک چھوڑنے آئے مگر وہ نہ آئی۔

''مسز پیٹر! آپ کو اتنا تلخ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہمارے مہمان تھے اور ویسے بھی انسان کو ایک دوسرے کا لحاظ رکھ کر بات کرنی چاہیے۔'' مسز شائستہ کے لہجے میں قدرے خفگی تھی۔

''میڈم! میں اس لیے اصرار کر رہی تھی کہ مجھے بولنے پر مجبور مت کریں کیونکہ سچ تو ہر حالت میں کڑوا ہی لگتا ہے۔ ویسے آپ بے فکر رہیے، میں ہر طرح کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی اور باہر نکل گئی۔

اس کے بعد کتنی چہ میگوئیاں ہوئیں، کتنے لوگوں نے اسے موردِ الزام ٹھہرایا۔ اسے قطعی پروا نہیں تھی۔ اسے یاد تھا تو بس حیدر۔ جو اس کے حواسوں پر چھایا رہا۔ وہ بدل بھی چکا تھا اور نہیں بھی۔ اس کی ذات، اس کی شخصیت، اس کا رتبہ۔ اس کی حیثیت سب کچھ پہلے سے منفرد تھی۔ سب کچھ بدل چکا تھا، شاید اس کا اندر نہیں۔ اس لیے وہ اسے دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا۔

کیا ماضی سے واقعی فرار ممکن نہیں......؟ کیا حال ہمیشہ ماضی کی طرف دھکیلتا ہے؟ اور مستقبل دونوں سے حقیقت کا متقاضی رہتا ہے، سوالیہ نشان بن کر؟

وہ رفتہ رفتہ چاروں طرف سے آزمائشوں کے نرغے میں آ رہی تھی۔ جن تمام چیزوں کو وہ قصۂ پارینہ سمجھ کر بھلا چکی تھی، اب اور مستحکم پوزیشن میں ٹھوس حقیقت بن کر اس سے سوال کر رہی تھیں۔ حیدر ہمیشہ اس کے حافظے میں شجر سایہ دار کی طرح موجود رہا تھا۔ جس کے سائے میں ستانے کے لیے وہ چند لمحوں کے لیے رکتی تھی۔ جب کبھی بہت گھبرا جاتی تو آنکھیں بند کر کے اسے یاد کرتی اور وہ اسے تسلیاں دیتا۔ دلاسے دیتا۔ وہ ہمیشہ اس کے وجود

کے اندر اس کی سانسوں میں موجود رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تب بھی تھا جب وہ پیٹر...... کے ساتھ ہوتی تھی اور تب بھی جب ملک منصور کی قربت میسر ہوتی۔ مجبوریاں اور مصلحتیں انسان کی ذات کو دور تو لے جاسکتی ہیں مگر یادوں پر کسی کا بس نہیں اور وہی ایک یاد تھی جو اسے معطر رکھتی تھی۔

کالج میں ایگزامز ہو رہے تھے اس لیے وہ پیپرز پھیلائے ان کی چیکنگ کر رہی تھی جب رشیدہ کارڈلیس فون پکڑے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''میڈم جی، آپ کا فون آیا ہے۔'' رشیدہ نے اسے فون دیتے ہوئے کہا۔

''میرا فون......'' وہ قدرے حیران ہو کر بولی کیونکہ اسے کبھی بھی سہ پہر کے وقت فون نہیں آیا تھا۔ ولیم جب بھی فون کرتا تو رات کو دیر سے کرتا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے فون پکڑا اور ہیلو کہا تو چونک گئی۔

''میں حیدر بول رہا ہوں...... مجھے جانتی ہو کہ سب کچھ بھلا دیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

''میں کسی کو نہیں جانتی......سوری......'' اس نے کہہ کر فون بند کر دیا پھر بیلز ہونے لگیں۔

''کب تک ماضی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرو گی...... میں تمہارا کل تھا اور اب آج بن کر تم سے سوال کر رہا ہوں......'' وہ قدرے تلخ لہجے میں بولا۔

''سوال کرنے کا حق میں نے کسی کو نہیں دیا......'' اس نے بھی تلخی سے جواب دیا۔

''کب تک حقائق سے نظریں چراؤ گی...... مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ بولو کہاں ملو گی......؟'' حیدر دوٹوک لہجے میں بولا۔

''کہیں نہیں...... مجھے نہ آپ سے کچھ کہنا ہے اور نہ ملنا ہے۔''

''کوئی بحث نہیں...... میں تمہارا انتظار کروں گا...... اور اگر تم نہ آئیں تو تمہارے ہاسٹل آ کر تمہارے کمرے میں تم سے بات کروں گا۔'' حیدر نے منجھے ہوئے سیاست داں کی طرح اسے ایکسپلائیٹ کرنے کی کوشش کی تھی اور فائیو اسٹار ہوٹل کا ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا۔

حیدر کتنا پوزیسو ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ بھی کسی قدر بدل گیا ہے۔ وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔ پوری دنیا میں صرف وہی شخص تو تھا جس سے بات کرتے ہوئے اسے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ زندگی میں اسے جتنے بھی مردوں سے پالا پڑا تھا، وہ ان سب سے مختلف تھا۔ ایسا مرد جس پر اندھا اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ایسا مرد جس کی ذات سے دوسروں کو

صرف سکون مل سکتا ہے...... ایسا مرد جس کی صرف پذیرائی کی جاسکتی ہے اور ایسے شخص سے بھرپور محبّت بھی کی جاسکتی ہے۔ صرف ایک وہی شخص تھا جس کی وابستگی اور تعلق اسے ہمیشہ مسحور رکھتا تھا ورنہ ملک منصور اور پیٹر ہمیشہ کانٹوں کی طرح اسے چبھتے رہتے تھے۔ شنزا اور ولیم بیک گراؤنڈ میں چلے گئے، اب صرف حیدر اس کے سامنے تھا اور حیدر سے ملنے کے لیے وہ تانا بانا بن رہی تھی۔ الفاظ ترتیب دے رہی تھی۔ کیسے اور کس طرح اسے جوابات دینے ہیں، ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ وہ قدرے نروس بھی ہو رہی تھی۔

وہ کالج سے سیدھی ہوٹل پہنچی اور ریسپشنسٹ سے کمرے کا پوچھ کر اس کمرے کی طرف بڑھی، اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے، وہ جو ہمت اور حوصلہ یکجا کر کے آئی تھی، اسے لگ رہا تھا، سب کچھ بھربھری ریت کی طرح ڈھے جائے گا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ ناک کیا۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھل گیا۔ حیدر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے خاموشی سے اسے راستہ دیا۔ وہ بیگ اور کتابوں کا ڈھیر اٹھائے اندر داخل ہو گئی۔

''بیٹھو......'' حیدر نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور بیل بجائی۔ ویٹر کو کولڈ ڈرنک اور کھانا لانے کو کہا۔

''جلدی سے پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو...... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''مجھے پہلے دیکھنے تو دو کہ شہلا کدھر ہے اور مسز پیٹر کہاں ہے اور میں کس سے بات کروں......؟'' حیدر کے لہجے میں چبھن تھی اور آنکھوں میں غصہ۔ اس نے نظریں اٹھا کر حیدر کو دیکھا۔ وہ اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

''میں صرف مسز پیٹر ہوں۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''کیا تم عیسائی ہو چکی ہو؟'' حیدر نے قدرے غصّے سے پوچھا۔

''کیوں؟''

''اگر تو تم عیسائی ہو چکی ہو تو پھر مجھے تم سے نہ کچھ کہنا ہے اور نہ کچھ پوچھنا ہے، تم جاسکتی ہو۔'' وہ دیوار کی طرف منہ کر کے بولا۔ وہ اس کے سوال پر بھونچکا رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے، وہ بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلتی رہی اور سوچتی رہی۔ وہ جو کچھ سوچ کر آئی تھی۔ حیدر تو ان میں سے کوئی بات نہیں پوچھ رہا تھا۔ وہ بھی خاموش رہا اور وہ بھی خاموشی سے پہلو بدلتی رہی۔ ویٹر کھانا لے کر آگیا تھا اور اس نے ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا۔

''سر! کچھ اور......'' ویٹر نے باادب لہجے میں پوچھا۔

''نہیں......تم جاؤ۔'' وہ بارعب انداز میں بولا۔

''کھانا کھاؤ......'' اس نے منہ اس کی طرف کر کے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں۔''

''یہ ہماری مہمان نوازی کا حصّہ ہے۔''

''مجھے بھوک نہیں۔''

''مجھے بار بار ''نہ'' سننے کی عادت نہیں رہی۔'' وہ غصّے میں اس کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھیں اب بھی سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں نمی بھی تھی۔ وہ ڈر سی گئی۔ وہ کرسی کھینچ کر بالکل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ہر زاویے سے اسے آبزرو کرتا رہا۔

''کب تک اپنے آپ سے جھوٹ بولتی رہو گی؟'' حیدر نے سکوت توڑا۔

''میں نے نہ کسی سے جھوٹ بولا اور نہ ہی اپنے آپ سے......''

''اگر سچ کہنے کی ہمت ہے تو بتاؤ کیا تم عیسائی ہو چکی ہو؟''

''ن......نہیں......'' وہ اچانک بول پڑی۔

حیدر نے یہ سنتے ہی زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ اس کی قطعی توقع نہیں کر رہی تھی۔ وہ حیرت سے گال سہلانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''تم نے مسلم ہو کر ایک غیر مسلم سے شادی کی......تم اس قدر بے ضمیر ہو سکتی ہو، تم مر جاتیں مگر یہ نہ کرتیں۔ یہ تھپڑ سید صاحب کی طرف سے ہے اگر وہ زندہ ہوتے تو وہ یہ تھپڑ خود مارتے۔ میں نے جو کیا ان کی وجہ سے کیا۔ اگر تم کہتیں کہ تم عیسائی ہو چکی ہو تو انھیں اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا یہ جان کر۔'' حیدر کی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔ ''تم نے ان کی محبت و شفقت کا تو مذاق اڑایا ہی ہے، میری محبت کی بھی توہین کی ہے۔ میں نے پوری دنیا میں صرف ایک تمھیں ہی تو چاہا تھا۔ میری پہلی اور آخری محبت تم ہی تھیں۔ میرا گھر تمہاری وجہ سے منتشر رہا۔ طاہرہ کبھی بھی مجھے معاف نہ کر سکی......اور تم نے یہ سب...... یہ سب کر کے مجھے کس مقام پر کھڑا کیا ہے، کیا تم جانتی ہو......؟'' اس کے لہجے میں اب شکستگی اور مایوسی تھی۔ ''میں نے اپنی بیٹی کو تمہارا نام دیا...... تمھیں زندہ رکھا اپنی یادوں میں، اپنی سوچوں میں...... میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ پہلی شادی میری مجبوری تھی اور دوسری میں نے تمھارے لیے نہیں کی۔ کیونکہ طاہرہ میرے نام پر بیٹھی تھی مگر تم...... میں تم سے بے وفائی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کیسی

زندگی گزار رہا ہوں، کاش تم اندازہ کر سکو...... تم...... تم نے تو اپنا ضمیر ہی بیچ...... دیا، میرے ساتھ بھی بے وفائی کی۔" وہ غصّے میں بول رہا تھا اور وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ وہ جواباً ایسی ہی باتیں اس سے کہنا چاہتی تھی مگر...... مگر اس میں حوصلہ تھا نہ ہمت۔

"بولو...... جواب دو، تم نے یہ سب کیوں کیا؟"

"کیا......؟" وہ ہچکی لیتے ہوئے بولی۔

"مجھ سے بے وفائی کیوں کی؟"

"میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی......"

"تو پھر یہ سب......؟"

"کیا شادی ہو جانے سے روح کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے؟ جسموں کو قید کرنے سے روح تو قید نہیں کی جاسکتی اور آپ...... آپ تو میری روح کا حصّہ ہیں......" وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ حیدر ایک دم نرم پڑ گیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا...... اور پانی کا گلاس اٹھا کر ایک ہی بار میں ختم کیا۔

"تو پھر تم نے یہ سب کیوں کیا......؟" اس کے لہجے میں اب قدرے نرمی تھی۔

"کیا کرتی...... کب تک ذلت برداشت کرتی۔ اذیت تو میں سہہ ہی رہی تھی مگر جب منصور دوسروں کے سامنے ذلیل کرنے پر اتر آیا تو میں سہہ نہ پائی...... حیدر! میں نے اس کے طعنے سہے...... تھپڑ کھائے...... بے عزتیاں سہیں...... کبھی وہ جائز اور ناجائز کے چابک مار کر میرے بخیے ادھیڑتا...... تو کبھی آپ سے تعلق کو بنیاد بنا کر الزامات کی بوچھاڑ سے میرا وجود چھلنی کر دیتا...... آخر میں بھی انسان تھی۔ اس کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ میرے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ ہر وقت میری آزمائش میں رہتا۔ اس نے تو مجھے سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ آخر کب تک کوئی اتنی تذلیل برداشت کرے۔ سید صاحب، ان کا گھرانا...... اور میرا وہاں پلنا بھی میرے وجود پر لگی گندگی اور حقارت کو نہ دھو سکا۔ آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میں نے یہ سب کیوں کیا...... صرف ایک کتاب خریدنے پر منصور نے مجھے دیارِ غیر میں اجنبی لوگوں کے سامنے اتنا ذلیل کیا کہ میں برداشت نہ کر سکی۔ پیٹر اس بک شاپ کا مالک تھا۔ اس نے میری دلجوئی کی اور ان کمزور لمحوں میں میری حوصلہ افزائی کی۔ انسان ہونے کے ناتے اس نے میری ہمت بندھائی۔ میری یہ غلطی تھی کہ میں نے بغیر جانچے اس کے لفظوں پر یقین کیا۔ اس کے لہجے کی

نرمی کو اپنے رستے زخموں کا مرہم سمجھا۔ اس کی پذیرائی نے مجھے اعتماد بخشا اور...... میں نے منصور کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر میں اس وقت پیٹر کی حقیقت بھی نہیں جانتی تھی۔ حیدر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میں جو قدم بھی اٹھاتی ہوں۔ وہ الٹا پڑتا ہے۔ قدرت کیوں میرا ساتھ نہیں دیتی۔ کیا میں خدا کی اس دنیا میں اتنی ذلیل اور ادنیٰ مخلوق ہوں، کبھی تو کوئی مہرہ میرا بھی ساتھ دے۔ بعض لوگوں کے نصیب کیوں کالی راتوں کی کالی روشنائی سے لکھے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کبھی بھی کوئی جگنو نہیں، کہیں بھی کوئی روشنی نہیں، کاش سید صاحب مجھے وہیں گاڑی تلے کچل دیتے یا پھر نظر انداز کر کے چلے جاتے۔ کاش وہاں کے آوارہ کتے ہی میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے تو آج میں یہ زندگی کا عذاب نہ سہتی۔ میں ایسی بدنصیب ہوں جسے نہ شناخت ملی، نہ محبت اور نہ ہی سکون۔ کاش ہم جیسے لوگ پیدا ہی نہ ہوں۔'' اس کے لہجے میں بلا کی شکستگی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

وہ کتنی ہی دیر ہچکیاں لیتی رہی۔ اس نے اچانک کسی کا لمس اپنے کندھے پر محسوس کیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ حیدر سرخ انگارہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے اپنے آنسو روک رہا تھا۔ وہ بے اختیار اس کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا، نہ تسلی دے سکا نہ دلجوئی کر سکا۔ وہ بھی اسی غیر متوقع صورتِ حال سے تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ زندگی میں اس نے اپنا غم آج تک کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا۔ اپنے دل کی بات کبھی کسی سے نہ کہی تھی۔ اپنا غم صرف اپنے تک ہی رکھا تھا اور اب جو بکھرنے پر آئی تو کرچی کرچی ہو گئی۔ ایک دم وہ پیچھے ہٹی جیسے اسے کرنٹ لگا ہو یا پھر وہ اپنے حواسوں میں واپس آ گئی ہو۔ اس نے حیدر کی طرف دیکھے بغیر اپنا بیگ اور کتابیں اٹھائیں اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

حیدر نے اسے روکنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ شاید اس کا جانا ہی بہتر تھا۔ کولڈ ڈرنکس اور کھانا وہیں کا وہیں پڑا تھا۔ وہ خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا دل بھی شدتِ جذبات سے پھٹنے کو تھا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے جو لوگ کبھی مل نہیں سکتے، وہ زندگی کا حصّہ کیوں بن جاتے ہیں نہ بھلائے جانے کے قابل...... حیدر نے دکھ سے سوچا۔ وہ واپس آ کر بہت شرمندہ بھی تھی اور افسردہ بھی۔ وہ گلٹی فیل کر رہی تھی۔ اسے اپنے جذبات پر قابو کیوں نہیں رہا تھا۔ وہ کیوں ایک ہی لمحے میں بہک گئی اس کا سارا بھرم خاک میں مل گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ یہ سب کیونکر ہو گیا۔ وہ تو اسے کنونس کرنے گئی تھی۔ اپنی باتیں بتا کر اسے قائل کر لے گی

مگر وہ تو کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کچھ بھی نہ بتا سکی، بہت کچھ ادھورا ہی رہا۔ ہر دفعہ میرے ساتھ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ تھوڑی دیر بعد رشیدہ اس کے پاس کارڈلیس لے کر آئی۔

''میڈم جی! آپ کا فون ہے......'' وہ فون پکڑا کر چلی گئی۔

''شہلا، میں حیدر بول رہا ہوں۔ کل تمھارے کالج میں میرا آدمی، تمھیں موبائل دے جائے گا۔ اسے رکھ لینا...... اور ہاں، تم لوگوں اور حقیقتوں کے بارے میں غلط اندازے کیوں لگاتی رہی ہو۔ منصور کو چھوڑنے کے بعد اگر تم واپس لوٹ آتیں حیدر تمھیں سید صاحب کی بیٹی کی حیثیت سے سر آنکھوں پر نہ بٹھاتا تو پھر تم کوئی انتہائی قدم اٹھاتیں، تم نے یا تو حیدر کو نہیں سمجھا یا پھر اپنے آپ کو...... تم سن رہی ہو نا......'' اس نے چند لمحے توقف کیا۔

''ہاں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اور اب......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پوچھا۔

''اب میری زندگی میں کسی بھی شے کی کوئی اہمیت نہیں۔''

''ہم چاہے جتنے بھی دعوے کریں...... جن کی اہمیت ہوتی ہے، وہ اپنا پورا حق لے لیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں تم نے زندگی میں بہت مشکلات کا سامنا کیا ہے۔''

''ہاں، کچھ لوگ صرف پیدا ہی اس لیے ہوتے ہیں اور شاید ابھی بہت کچھ باقی ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''بہت سی آزمائشیں ابھی میری منتظر ہیں۔ خدا جانتا بھی ہے کہ میں ثابت قدم نہیں ہوں۔ میں تو بہت کمزور اور شکستہ وجود ہوں پھر بھی...... نہ جانے کیوں وہ مجھے بار بار آزما رہا ہے۔''

''اب کس آزمائش کی بات کر رہی ہو...... کیا تم......؟''

''ولیم کی صورت میں......''

''کون ولیم......؟''

''میرا بیٹا ہے، مری میں پڑھتا ہے......''

''اوہ آئی سی...... اسے کیا ہوا ہے؟'' حیدر نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

''شاید بہت کچھ ہونے والا ہے۔''

''کیا تم سب جانتی ہو؟''

''نہیں...... مگر میں دیکھ رہی ہوں مگر میں کچھ نہیں کر سکتی۔''

''سب کچھ دیکھنے کے باوجود......''

''ہاں...... میں نے کہا نا۔ میں بہت کمزور اور بے بس وجود ہوں......بس خاموش تماشائی......'' وہ ہونٹ چبا کر بولی۔

''اور میں کچھ...... خیر چھوڑو۔'' اس نے فون رکھ دیا۔ اس کا ادھورا جملہ اس کے لیے عذاب بن گیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے فون بند کر کے رشیدہ کے حوالے کر دیا۔ وہ بہت مضطرب تھی۔ ایک طرف ولیم تھا۔ دوسری طرف حیدر تھا اور پھر ان کے درمیان شزا اور اس کے اپنے بچے تھے۔ وہ عجیب سے دوراہے پر کھڑی تھی۔ ہر طرف الجھنیں تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رفتہ رفتہ گرداب میں پھنستی جا رہی ہو۔

اگلے دن حیدر کا ملازم اسے نیا موبائل سیٹ دے گیا۔ اس کے جاتے ہی حیدر نے اسے فون کیا۔ ''آپ نے یہ سب کیوں کیا؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''میں اب تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔''

''یہ سب کچھ بے معنی ہے۔''

''بعض اوقات بے معنی چیزیں بھی زندگی میں اہمیت رکھتی ہیں۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔''

''حیدر...... خدا کے لیے مجھے مزید آزمائش میں مت ڈالیں۔''

''میں تمہیں ہر آزمائش سے نکالنا چاہتا ہوں۔ تمہارا حیدر کبھی بھی کمزور نہیں تھا۔ اس وقت میں روایات کے ہاتھوں مجبور تھا، اب نہیں۔ شہلا تم اپنا ہر دکھ مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ شہلا، تم مجھ پر اعتبار تو کرو۔'' ابھی وہ بات کر رہا تھا کہ ایک دم فون بند ہو گیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ فون کٹ گیا تھا یا پھر حیدر نے خود ہی فون بند کر دیا تھا۔ اس نے فون ملایا تو نو ریپلائی کی ٹیپ سن کر وہ پریشان ہو گئی۔ ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہو گی جو حیدر نے یوں اچانک فون بند کر دیا تھا ورنہ وہ تو بہت پُر اعتماد اور کونفیڈنٹ شخص ہے۔ اس طرح فون بند کرنا، اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔

حیدر اپنے بیڈ روم میں تھا، جب وہ شہلا سے بات کر رہا تھا کہ اچانک شہلا حیدر کسی کام کے سلسلے میں اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے کسی کو فون کرتا دیکھ کر وہ اس کے فارغ ہونے کی منتظر رہی۔ جب اس نے حیدر کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو چونک گئی۔ حیرانی کے ساتھ ساتھ اسے شاک بھی لگا۔ اس کا باپ اس عمر میں کس قدر بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا اور وہ بھی اس کی کسی ہم نام سے۔ اس کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا اور وہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

شہلا نے غصّے سے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گئی اور حیدر اب نادم سا کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا توجیحات پیش کرے۔ زندگی کا اتنا لمبا عرصہ بے سکونی سے گزارنے کے بعد چند لمحوں کے لیے اسے شہلا کی جو قربت نصیب ہوئی تھی اس نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ مزاحمت نہیں کر پا رہا تھا یا شاید کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی شکستہ روح جیسے برستی پھوار میں چند لمحوں کے لیے تر بتر اور معطر ہو گئی تھی۔ کاش وہ وقت ٹھہر جاتا......اور وہ دونوں یونہی......؟

وہ ساری رات نہیں سو پایا...... وہ ہمیشہ یہی سمجھتا آیا تھا کہ اس نے اپنے اندر سے محبت جیسے جذبے کا وجود ہی ختم کر دیا تھا۔ طاہرہ کبھی اس کی ذات کا اور روح کا حصّہ نہیں بن سکی تھی اور طاہرہ کے بعد وہ تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔

شہلا کو اپنے باپ پر کبھی کبھی ترس بھی آتا تھا جو ہر وقت کام اور صرف کام میں لگا رہتا تھا اور کبھی کبھی فخر بھی محسوس ہوتا مگر اب باپ کا بدلتا روپ دیکھ کر اسے شدید صدمہ ہوا۔ اس نے کبھی بھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ اس کا باپ بھی ان تمام سیاست دانوں کی طرح یوں دیوانگی دکھائے گا...... وہ بھی کسی عورت کے لیے یوں بے چین ہو رہا تھا جو اس کی ہی ہم نام تھی۔ اسے شدید نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے شدت سے رو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم بہت نیچے گر گئی ہو۔ بے وقعت ہو گئی ہو۔ وہ جو سر اٹھا کر چلتی تھی، اپنے باپ کا نام فخر سے لیتی تھی، اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ کے نام کو اٹوٹ انگ سمجھتی تھی، اب یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے دونوں میں گہری دراڑ پڑ گئی ہو۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کو خاص الخاص سمجھتی آئی تھی۔ وہ بھی بہت عام مرد نکلا۔ اس کا اعتماد ٹوٹ رہا تھا اور جب اعتماد ٹوٹ رہا ہوتا ہے تو دل کس طرح ٹکڑے ٹکڑے اور کرچی کرچی ہوتا ہے، وہ اندازہ کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے یا پھر وہ خود ہی خودکشی کر لے۔ اب وہ باپ کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ بار بار غصّے میں مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔ وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھی تڑپ رہی تھی جیسے کسی بہت عزیز از جان کی مرگ پر کوئی تڑپتا ہے، بلکتا ہے، روتا ہے مگر کچھ کر نہیں پاتا۔ ایسی ہی بے بسی وہ محسوس کر رہی تھی۔

آخر میرا باپ بھی تو انسان ہی ہے نا۔ وہ اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کرتی...... نہیں، نہیں...... میرا باپ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اور فلرٹ...... اُف خدایا! میں کیا کروں، کاش میں یہ دن دیکھنے کے لیے نہ ہوتی۔ جس شخص کی پارسائی کی زمانہ گواہی دے، جس کی شخصیت

میں، میں نے کبھی کوئی جھول نہ دیکھا ہو۔ کبھی بھی بڑی بڑی رکاوٹیں اور آزمائشیں اسے راہِ راست سے نہ ہٹا سکی ہوں، کیا وہ فلرٹ کرے گا؟ یہ نہیں ہو سکتا لیکن وہ باپ سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت میچور اور ریشنل سمجھی جاتی تھی اور اب اس قدر ارریشنل ہو رہی تھی۔ اتنی امیچور۔ اسے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی وہ وہی شہلا تھی۔ وہ تو بااعتماد انداز میں باپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی آئی تھی اور اب کیسے چل پائے گی؟ جبکہ باپ کے قدم ڈگمگا گئے ہوں۔ آپ کوئی بھی برا کام کر لیتے، مجھے دکھ نہ ہوتا مگر کسی عورت کے چکر میں تو نہ پھنستے۔ اسے غصہ آ رہا تھا...... اس عورت پر...... وہ کون عورت ہو سکتی ہے؟ یہ سوچ کر اسے سخت غصہ آ رہا تھا، کبھی دل چاہتا کہ اسے جا کر شوٹ کر آئے، کبھی دل چاہتا باپ کو ہی شوٹ کر دے اور کبھی اپنے آپ کو۔ اس بدنامی کے ساتھ وہ کس طرح جی پائے گی۔

اس نے کچھ سوچ کر اپنا سامان پیک کیا۔ وہ کہیں جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی، وہ خود نہیں جانتی تھی، وہ رات کو ہی گھر سے نکل گئی۔ حیدر بدحواسی میں اِدھر اُدھر اسے تلاش کر رہا تھا۔ وہ شدید ذہنی اذیت سے دوچار تھا۔ وہ اسے ڈھونڈنا چاہتا تھا، بغیر کسی کو بتائے اور اس کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا۔ وہ اس قدر مشتعل ہو سکتی تھی، اس نے سوچا بھی نہیں تھا اور وہ خود بھی جذبات کے ہاتھوں اس طرح بہک سکتا تھا، اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا۔ شہلا کا اتنا وسیع سوشل سرکل تھا کہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کہاں ڈھونڈے...... وہ قدرے پاگل ہو رہا تھا۔

مسز پیٹر (شہلا) کا دل کہہ رہا تھا کہ حیدر کسی مصیبت میں ہے۔ وہ اس کے موبائل پر بار بار فون کر رہی تھی مگر وہ بند تھا۔ حیدر یوں بات ادھوری چھوڑنے کا عادی تو نہیں تھا اور وہ بھی اس وقت۔ اسے اس کے لہجے اور لفظوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اہم فیصلہ اسے سنانے والا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ اسے کچھ سناتا، ایک بار پھر کوئی شے یا غیر مرئی قوت اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ وہ کہاں جائے، اس کی تلاش میں؟ وہ ہاسٹل سے باہر سڑک پر آ گئی اور ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہر آنے والی گاڑی کو گھور گھور کر دیکھتی، کئی ایک نے تو اس کے قریب آ کر زبردست بریک لگائے تو وہ چونک گئی۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ وہ واپس ہاسٹل آ گئی اور اپنے کمرے میں آ کر شدت سے رونے لگی۔ ہاتھوں کو باندھے وہ تعظیم سے قبلہ رخ بیٹھ گئی۔

''میں پچیس سالوں سے نہ تمھارے آگے جھکی ہوں، نہ تجھ سے مدد مانگی ہے اور نہ

تیری عبادت کی ہے...... مگر آج بھی میں اپنے لیے نہیں، صرف اور صرف حیدر کی خیریت کے لیے جھکتی ہوں۔ اس کے لیے تیری مدد چاہتی ہوں...... اور اس کے لیے تیرے آگے سرِ تسلیم خم کرتی ہوں۔ میں سرکش نہیں، باغی نہیں...... مگر جب تو نے مجھے چھوڑ دیا تو میں بھی تجھے بھول گئی...... تو نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے، اس نے میرا تیری ہستی پر اعتماد ختم کر دیا ہے لیکن آج...... آج تو نے مجھے اس جگہ لا کھڑا کیا ہے کہ میں پھر تیرے آگے جھک رہی ہوں۔ جو تجھے بھلاتے ہیں، تو انھیں ایسے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے کہ وہ خود بخود تیری طرف لوٹ آتے ہیں۔ تو انسان کی اکڑ اور غرور کیسے کیسے خاک میں ملاتا ہے، آج مجھے اس کا احساس ہو رہا ہے اور سب کچھ بھولتے ہوئے میں آج صرف حیدر کے لیے تیرے آگے جھکی ہوں۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں تجھ سے کچھ بھی نہیں مانگا۔ بس حیدر کو اپنی امان میں رکھ۔ اگر حیدر کو کچھ ہو گیا تو پھر وہ دن میری زندگی کا بھی آخری دن ہوگا۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے۔'' وہ قدرے جذباتی ہو کر بڑبڑا رہی تھی۔ وہ حیدر کے لیے کس قدر پچی تھی، اسے آج اندازہ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی نامعلوم جذبے اور نامعلوم منزلیں انسان کو کس قدر کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ وہ اس لمحے اپنے آپ کو بالکل کھوکھلا اور خالی وجود محسوس کر رہی تھی۔ ایسا خالی وجود جس میں صرف حیدر کے نام پر ایک دل دھڑکتا تھا۔ وہ ساری رات نہ سو سکی۔ ساری رات وہ اس کے موبائل پر فون کرتی رہی مگر کوئی بھی فون ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ حیدر کا موبائل کس طرح آف ہو سکتا ہے اور وہ بھی ساری رات...... یقیناً وہ بہت بیمار ہے۔ وہ خود ہی اندازے لگا رہی تھی۔

اگلے دن کالج میں بھی فری پیریڈز میں وہ بار بار فون کر رہی تھی۔ وہ کالج سے واپس آ رہی تھی جب اس کے فون پر بیل ہوئی۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا، حیدر بول رہا تھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں؟'' وہ قدرے بے صبری سے بولی۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں اور تم......؟'' وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

''آپ میری چھوڑیں اور اپنی بتائیں......؟''

''ہاں......بس......''

''حیدر! کیا بات ہے...... پلیز، مجھے سچ سچ بتائیں؟''

''کچھ نہیں۔''

''کچھ تو ہے۔'' وہ کریدتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو...... آپ کو......شہلا کی قسم......''

''مجھے کسی بھی شہلا کی کوئی قسم نہ دو جبکہ وہ دونوں ہی میرے پاس نہیں۔''

''کک......کیا......؟'' ابھی وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ حیدر نے فون بند کر دیا۔

......۞......

سہیل گرفتاری دے چکا تھا اور یہ خبر اخباروں میں بھی چھپ چکی تھی۔ ملک منصور کی راتوں کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ الیکشن سر پر تھے......اب وہ چیف منسٹر کے عہدے تک پہنچنے کی تگ و دو کر رہا تھا کہ اس غلغلے نے اس کے سارے پلان کا بیڑا غرق کر دیا۔

''وہ بدبخت ہے کہاں......؟'' ملک منصور نے سرگوشی کے انداز میں سہیل سے پوچھا۔

''میرے گاؤں میں۔ میری ماں کے پاس۔ آپ بے فکر رہیں، وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ ہے۔'' سہیل نے اسے تسلی دی۔

''میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔'' وہ طیش میں بولا۔

''اس وقت ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھائیے۔ زویا اور عابد کے پیچھے کوئی ایسا نہیں جو مقدمہ بہت اوپر تک لے جائے۔ صرف ان کے لواحقین کو خریدنا پڑے گا......'' سہیل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اور وہ کم بخت عابد کا دوست۔ جس نے شفق کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ شکر ہے اس وقت چوکیدار گیٹ پر نہیں تھا۔ اس کو میں ہر ممکن طریقے سے خریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی تک تو وہ رکا ہوا ہے۔ اگر اس نے زبان کھول دی تو......؟ اس وقت میں شدید اسٹریس میں ہوں۔ میں ملک منصور، جو بڑی سے بڑی آفتوں سے نہیں گھبرایا، اس نامراد لڑکی کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس کھو رہا ہوں۔'' وہ قدرے بے بسی سے بولا۔

''ملک صاحب! آپ فکر نہیں کریں۔ جب میں اقرارِ جرم کر رہا ہوں تو پھر......پھر کسے اعتراض ہے......اور ویسے بھی یہاں پر ایمان تک بکنے کو تیار ہوتا ہے۔ ایک شخص کی گواہی کیا معنی رکھتی ہے؟ اگر نہیں مانتا تو......'' سہیل کے ادھورے جملے نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔

''اس کو میرے بندوں نے اغوا تو کر لیا ہے۔ اسی لیے تو وہ تھانے تک نہیں پہنچ پایا۔''

''ملک صاحب! اس نے شفق کو کسی کو مارتے ہوئے نہیں دیکھا ہے نا۔'' شفق جب گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تب وہ پیچھے سے آ رہا تھا۔ اس کا بیان اتنا ٹھوس نہیں۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا اور ظاہر ہے گاڑی میں چلا رہا تھا۔ اب میں نے گرفتاری دے دی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''لیکن...... پولیس بار بار یہی پوچھ رہی ہے کہ شفق کہاں ہے کیونکہ عابد کے

دوستوں اور چوکیدار نے یہی بیانات دیے ہیں کہ شفق کا وہاں بہت آنا جانا تھا۔ ظاہر ہے شفق کی غیر موجودگی خود بخود اسے مشکوک بنا رہی ہے۔"

"تو آپ اوپر بات کیوں نہیں کرتے؟"

"کر تو رہا ہوں۔ آج کل میں منسٹر شپ سے استعفیٰ دے چکا ہوں۔ میری وہ حیثیت نہیں ہے جو منسٹر ہوتے ہوئے تھی۔ اب الیکشن کے دن ہیں اور مخالف پارٹیاں ہر ممکن طریقے سے مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کریں گی۔ ہر ہتھکنڈا اپنائیں گی۔ شفق کی بھنک بھی ان کے کانوں تک پڑ گئی تو پھر...... پھر سب کچھ میری اتنے سالوں کی محنت اور سب کچھ برباد ہو جائے گا۔" ملک منصور کچھ کھو جانے کے شدید خوف سے تلملا رہا تھا۔

"آپ شفق کو گھر لے آئیں۔" سہیل نے رائے دی۔

"نن......نہیں۔"

"کیوں؟"

"وہ بہت خود سر اور ضدی ہے۔ اگر اس نے ابھی کوئی الٹا سیدھا بیان دے دیا تو میں نہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہوں گا اور نہ ہی دوبارہ الیکشن میں کھڑا ہوسکوں گا۔ میرا فیوچر تباہ و برباد ہو جائے گا۔ میرا تو دل چاہتا ہے اس کو بھی شوٹ کر دوں۔" ملک منصور غصّے سے بول رہا تھا۔

"کیا......؟" سہیل حیرت سے اس کی طرف بے یقینی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اسے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص اس قدر سنگدل اور بے رحم ہوسکتا ہے۔ وہ اس کے سارے کرتوتوں سے واقف تھا۔ لمحوں میں وفاداریاں بدلنا اور موقع کی مناسبت سے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا تو اس کی فطرت کا خاصہ تھا۔ مگر اولاد کے بارے میں اس کا یہ رویہ پہلی دفعہ سامنے آیا تھا۔ اس شخص کو صرف اپنا کیریئر عزیز ہے۔ نہ اولاد اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص، اس کا مطلب ہے کہ وہ سہیل کو ایک مہرے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس نے کسی قدر مخلص ہو کر بے لوث اس کی خدمت کی تھی۔ بنا اس کے کہے شفق کی خاطر دُہرے قتل کا الزام اپنے سر لیا تھا اور اس شخص نے ایک دفعہ بھی نہ اس کا شکریہ ادا کیا نہ اس کی رہائی کے سلسلے میں کوئی امید دلائی۔ وہ تو بس اپنی ساکھ اور الیکشن کی بات کرتا رہا۔ سہیل اس کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

سہیل کی ماں اور اس کی دونوں بہنیں اس کی ہر طرح سے خدمت کر رہی تھیں۔

اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتیں مگر وہ گم صم سی پریشان ہر وقت کمرے میں بیٹھی رہتی۔ وہ شدید ڈپریشن میں تھی۔ عابد نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا، اسے اس کا شدید دکھ تھا اور اب اس نے جو کچھ زویا اور عابد کے ساتھ کیا تھا، وہ اس کا بھی عذاب سہہ رہی تھی۔ سونے کی کوشش کرتی تو عابد کی گندی باتیں اس کے دل و دماغ میں آگ لگا دیتیں اور کنسرٹ والی رات...... اس رات کیا کچھ ہوا تھا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی، یاد نہ آتا مگر شاید کچھ بہت ہی بھیانک ہوا تھا۔ اس کا جسم اس کا گواہ تھا۔ اس کے بازوؤں پر سگریٹ کے جلنے کے نشانات اور بہت کچھ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ان لمحوں کو کوستی رہی جب اس نے زویا کو دوست بنایا، اس پر اندھا اعتماد کیا، سہیل اسے کتنا سمجھاتا تھا۔ کتنا ڈانٹتا تھا مگر وہ کب سنتی تھی۔ سہیل نے اس کے لیے نہ جانے کیا کچھ کیا تھا۔ وہ اس کے خلوص کو نہ جان سکی۔ سہیل نہ جانے کن حالوں میں ہوگا۔ اس کے گھر والے بھی لاعلم تھے یا شاید اسے بتانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ کس سے پوچھے۔ چند ساعتوں کے لیے اس نے سونے کی کوشش کی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی پھر بھی اس نے آنکھیں بند کر کے ایک کوشش کی کہ شاید بھولے بھٹکے نیند کی وادیوں میں سے کوئی پری اِک لمحے کے لیے اس کی طرف آ جائے۔ آج اسے شہلا بار بار یاد آ رہی تھی۔ اگر مما پاپا ٹھیک ہوتے تو شاید وہ ان حالات کا شکار نہ ہوتی مگر وہ دونوں تو...... اپنی اپنی ذات کو چاہنے والے تھے۔ اولاد کو تو کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ فلک کس طرح بے بسی کی حالت میں مرگئی اور میں بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گی۔ دونوں میں سے کسی کو بھی افسوس نہ ہوگا۔ ہم کتنے بے وقعت وجود ہیں۔ جنھیں نہ محبت مل سکی نہ تحفظ۔ جیسے خزاں میں اڑتے آوارہ پتے۔ اِدھر اُدھر، بے ضرر، بے حقیقت، مردہ اور بے جان۔ آنسو آنکھوں سے بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہوتے رہے اور اس طرح اس کی آنکھ لگ گئی، ابھی اس نے نیند کی وادی میں قدم رکھا ہی تھا کہ کسی کی سسکیوں نے اور رونے کی آواز نے اسے اٹھا دیا۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور باہر جھانکا۔ سہیل کی ماں اور بہنیں رو رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس بھاگتی ہوئی گئی۔

''کیا ہوا...... آ...... آپ لوگ کیوں رو رہی ہیں؟''

''میرا بیٹا ایسا نہیں ہے......'' اس کی ماں روتے ہوئے بولی۔

''کیا...... کیا ہوا......؟''

''وہ کسی کو نہیں مار سکتا۔''

''مگر اس نے کس کو مارا ہے؟'' اس نے بے صبری سے پوچھا۔

''یہ دیکھو اخبار......'' سہیل کی بہن عذرا نے اخبار اس کے سامنے رکھا۔ وہ زمیندار کی حویلی میں کام کرتی تھی شاید وہیں سے لائی تھی۔ اس نے جیسے ہی اخبار سیدھا کر کے پڑھنے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ سہیل اس کی وجہ سے یہ سب برداشت کر رہا ہے۔

''وہ بے گناہ ہے...... وہ بے گناہ ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''آپ کیسے جانتی ہیں؟'' عذرا نے جلدی سے پوچھا۔

''میں جانتی ہوں...... میں ہی تو سب کچھ جانتی ہوں...... وہ ایسا نہیں...... وہ بے گناہ ہے۔ مجھے کسی طرح تھانے پہنچا دو...... میں گواہی دوں گی۔''

''نہیں، سہیل بھائی آپ کی سخت حفاظت کا کہہ کر گئے ہیں اور یہ کہ آپ باہر نہ نکلیں۔''

''یہ تب تھا جب وہ خود لاک اپ میں نہیں تھا۔ اب میرا باہر جانا مجبوری ہے۔ مجھے کسی طرح شہر پہنچا دیں۔'' تینوں ماں بیٹیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گئیں۔

☆

ملک منصور مضطرب سا کمرے کا چکر لگا رہا تھا۔ گھر میں ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ شنزا اپنے کاموں میں مگن رہتی تھی۔ آفاق نے آج کل فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا اور وہ اب رات گئے تک واپس آتا۔ سحر کہاں ہوتی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا موبائل بار بار بج رہا تھا وہ نمبر دیکھ کر فون رکھ دیتا۔ تھوڑی دیر بعد پھر فون بجا۔ اب کی بار اس نے نمبر دیکھا تو فوراً ہیلو کہا۔ دوسری طرف اس کا پی اے تھا۔

''ہاں کہو...... کیا بات ہے؟''

''سر، مس شفق تھانے پہنچ گئی ہیں اور انھوں نے اقبال جرم کرنے کی کوشش کی ہے۔''

وہ غصے میں گالیاں بکنے لگا اور موبائل اٹھا کر زور سے فرش پر پھینکا۔ چند ثانیے جیسے وہ دم بخود رہا اور پھر کچھ سوچ کر باہر نکل گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ایسی ناہنجار اولاد سے تو میں بے اولاد ہی رہتا تو بہتر تھا۔ اب چیف منسٹر بننے کی ساری تگ و دو اکارت جائے گی۔ یہ الیکشن نہیں جوا تھا اور اس میں اس نے ساری جمع پونجی لگا دینے کا سوچا تھا اور کافی کچھ لگا بھی دیا تھا۔ فیکٹری بھی رہن رکھی تھی۔ پارٹی والے سنہرے خواب دکھانے میں کسی طرح

بھی پیچھے نہیں تھے۔ ملک منصور کے چیف منسٹر بننے کی دیر ہے پھر سب کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ جلسے کامیاب جا رہے تھے۔ الیکشن کمپین میں زبردست کامیابی کے دعوے کیے جا رہے تھے۔ اب جبکہ فصل پک کر تیار ہو چکی تھی، بس کٹنے کی ہی دیر تھی کہ شفق کا یہ قدم تیز رفتار آندھی کے مانند ثابت ہوا...... میں تمھیں تباہ کر کے رکھ دوں گا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ گاڑی تھانے میں داخل ہوئی۔

''ملک صاحب! میں آپ کو بہت دیر سے فون کر رہا تھا مگر آپ کا فون ہی نہیں مل رہا تھا۔'' انسپکٹر اسے دیکھ کر تابعداری سے بولا۔

''ہاں...... ہاں، مجھے معلوم ہے۔ شفق کہاں ہے؟'' وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لیے بے اعتنائی سے بولا۔

''وہ کمرے میں ہے۔''

''میں اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں جی......ضرور......''

''اوئے نذیر...... بی بی کو ملک صاحب سے ملوا اوئے۔'' انسپکٹر نے ایک سپاہی کو آرڈر دیا۔

''ابھی ہم نے ان کو لیڈی پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ بس آپ کے حکم کے منتظر تھے۔ ابھی ان کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ وہ خود ہی تھانے میں پیش ہو گئی ہیں اور ابھی پرچہ بھی نہیں کٹا۔ اس لیے ابھی معاملہ اپنے ہاتھ میں ہے۔'' انسپکٹر کی رال ٹپکنے کو تیار تھی۔ ملک منصور نے جیب سے ہزار ہزار کے نہ جانے کتنے نوٹ نکالے سب انسپکٹر کے سامنے رکھے اور سپاہی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

شفق ایک چادر میں لپٹی بیٹھی تھی۔ باپ کو دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا۔ ملک منصور خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تم بھی اپنی ماں کی طرح گندا خون ہی نکلی۔ تم نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر میں تمہارا ہر پلان فیل کر دوں گا۔ تم زندہ رہو گی تب نا......'' اس نے ریوالور نکال کر دو تین فائر کیے۔ وہ وہیں فرش پر تڑپنے لگی۔ وہ قدرے اطمینان سے باہر آیا۔

''باقی معاملہ خود سنبھال لینا۔'' اس نے انسپکٹر کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب......؟'' جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

''اس واقعے کی خبر نہ پریس میں جائے اور نہ کسی اور کو یہاں کچھ نہیں ہوا ہے۔'' وہ الفاظ پر زور دے کر جیسے وارننگ دے رہا تھا۔

''مگر......؟''

''بس کچھ نہیں......'' وہ غرایا۔

انسپکٹر شدید شش و پنج میں تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

اتنا اہم واقعہ......اور سب کچھ چھپانا کیسے ممکن ہوگا؟ اس کی نوکری بھی جا سکتی تھی اور ملک منصور کی سیاسی حیثیت سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا۔

سہیل غصّے میں ماں کے ساتھ جھگڑ رہا تھا اور وہ اس کی منتیں کر رہی تھی۔ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا...... جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ اسے باہر نہیں جانے دینا اور آپ اسے تھانے تک لے آئیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ اس کی جان کو کتنا خطرہ ہے۔'' سہیل غصّے سے بولا۔

''مجھے کیا معلوم...... مجھے اس نے کچھ بھی تو نہیں بتایا۔ کہنے لگی وہ تھانے میں تم سے ملنا چاہتی ہے......اب بتاؤ میں کیا کرتی......تھانے آتے ہی وہ سیدھی پولیس کے پاس چلی گئی، میرا کیا قصور ہے؟''

''اماں...... اماں، میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔ ''اور اب وہ کہاں ہے؟''

''تھانے میں......''

''اور آپ کو جیل میں کس نے آنے دیا؟''

''اسی نے پلیسے سے بات کر کے مجھے ادھر بھجوایا ہے۔'' اسی لمحے ملک منصور جیل میں اس کے پاس آ گیا۔

''سہیل، میں نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' سہیل کے قدموں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔

''وہ تھانے میں پیش ہو گئی تھی اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ابھی پرچہ نہیں کٹا تھا اور کسی کو بھی خبر نہیں ہوئی تھی۔ میرے پی اے نے مجھے فون پر اطلاع دی...... اور میں نے اسے ختم کر دیا۔''

''ملک صاحب...... ملک صاحب! یہ آپ نے کیا، کیا...... اتنا بڑا قدم......؟'' وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

''میں نے کہا نا...... اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا اور اب تم اپنی بات پر قائم رہنا۔''

''کون سی بات......؟''

''زویا اور عابد والی...... کہ یہ قتل تم نے کیے ہیں۔''

سہیل اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ ملک منصور جا چکا تھا اور سہیل کی ماں حیرت سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''اماں...... میں نے کہا تھا نا کہ اس کو یہاں مت لانا...... اب دیکھو، اس کے سگے باپ نے ہی اس کو مار ڈالا ہے...... اماں، یہ آپ نے کیا، کیا......؟'' وہ تاسف سے بولا۔

''کیا کوئی باپ بھی اپنی اولاد کو مار سکتا ہے؟'' اس کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ دنیا ہے اماں...... اور یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ اب خود ہی دیکھو، کیا ہو گیا ہے؟'' وہ قدرے دکھ سے بولا۔

''بی بی...... ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔'' ایک پولیس والے نے اس کی ماں کو باہر نکلنے کو کہا اور وہ اس ادھوری ملاقات سے مزید پریشان ہو کر باہر نکل آئی۔

......✿......

جب سے وہ کلب جانا شروع ہوئی تھی، زندگی کا ایک نیا روپ اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ عورتوں کی چالبازیوں اور چلتروں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔ ظاہری طور پر خوبصورت، اسمارٹ، ویل ڈریسڈ اپر کلاس کی چارمنگ خواتین اندر ہی اندر کس کس طرح ایک دوسرے کو فریب دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ شزا اس کے سامنے تھی۔ مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ اس سے ناواقف تھی اور شفق ایسی نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی زندگی میں مگن رہتی۔ شفق کئی دنوں سے گھر سے غائب تھی اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے آفاق سے پوچھنے کی کوشش کی تو اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

''آفاق، وہ تمہاری بہن ہے تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہے۔'' سحر نے قدرے غصے سے اس سے پوچھا۔

''وہ اکثر ٹرپس پر یونہی بتائے بغیر چلی جاتی ہے۔ کچھ دنوں تک واپس آ جائے گی

اور جائے گی بھی کہاں؟'' وہ بے پروائی سے بولا۔

اسے اندر ہی اندر فکر تھی کیونکہ وہ شفق کو جس حالت میں دیکھ چکی تھی، اسے خوف تھا کہ وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لے مگر آفاق اور دوسرے گھر والے کچھ بھی نہیں جانتے تھے اس لیے مطمئن تھے۔ جب سے اس کے ساتھ یہ حادثہ ہوا تھا۔ آفاق اب آہستہ لہجے میں اس سے بات کرتا جیسے اس کا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی تھی۔ شفق نے سب کچھ بھلانے کے لیے اسے کلب جوائن کرنے کو کہا تھا اور اس نے کافی دنوں سے کلب جوائن کر لیا تھا۔ پہلے پہلے تو خواتین نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ فرفر انگریزی بولنے والوں میں وہ اردو بھی پنجابی لہجے میں ڈر ڈر کر بولتی۔ کبھی وہ اس کی پرسنالٹی کا مذاق اڑاتیں تو کبھی اس کے لب و لہجے کا۔ وہ ان کے درمیان مذاق بن گئی تھی۔ اسے اندر ہی اندر شرمندگی بھی ہوتی تھی۔ اس نے فوری طور پر ٹیوٹر ارینج کی۔ وہ گھر آ کر اسے مینرز بھی سکھاتی۔ پڑھاتی بھی اور سوسائٹی میں موو کرنے کے طریقے بھی بتاتی۔ ذہین تو وہ تھی ہی...... ہر چیز کو اس نے چند دنوں میں ہی پک کر لیا۔ بس انگریزی میں کسر باقی تھی...... اور اس کے لیے وہ بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت انگریزی فلمیں دیکھنے میں گزارتی۔ ساتھ ساتھ ٹیوٹر اسے سمجھاتی رہتی۔ اس نے عام بول چال کے جملے سکھا دیے تھے۔ اس کا ایکسنٹ بھی آہستہ آہستہ بہتر کرنے کی کوشش کی۔ اس کے کپڑوں کے اسٹائل میں بھی فرق آ چکا تھا...... اور ان چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کے اعتماد میں بھی کافی اضافہ ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ ان خواتین کی خامیوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ وہ ان کے درمیان بیٹھ کر ایک دوسرے کی تعریفیں اور پھر خامیاں سنتی رہتی۔ کس کو کہاں لیٹ ڈاؤن کرنا ہے اب یہ فن بھی اس کو آ گیا تھا۔ باتوں باتوں میں طنز اور گھٹیا جملے پھینکنے میں وہ ایسی ماہر ہو گئی تھی کہ خواتین حیران رہ جاتیں۔ جیسے جیسے وہ کونفیڈنٹ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی نظریں اور حرکتیں بھی بے باک ہو رہی تھیں۔ جب وہ منگتی تھی تو کالی سی چادر کبھی سر سے ہٹنے نہ دیتی تھی۔ اپنی طرف ہر اٹھنے والی بے باک نظر کو ایسا نشتر چبھوتی کہ دیکھنے والا بلبلا اٹھتا۔ وہ تو ساری آبادی میں پٹاخہ مشہور تھی اور اب اپنی نظروں کو خود ہی اس نے بے باک کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جن خواتین میں اٹھ بیٹھ رہی تھی۔ وہ بیگمات کا مخصوص سرکل تھا۔ جن کے لیے ہر بات فن اور ایڈونچر سے کم نہ ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثریت تو خاوندوں کو چھوڑ چکی تھیں اور کچھ ظاہراً شوہروں والیاں تو تھیں مگر اندر سے دل رجھانے اور ٹائم پاس کرنے کے بہت سے شغل پال رکھے تھے۔ وہ جیسے جیسے ان کے قریب

ہوئی تو ویسی ہی عادتیں اپنانے لگی۔ دو مخالف گروپوں کے درمیان وہ شٹل کاک بن گئی۔ اسے ایک دم اپنا آپ بہت اہم اور معتبر محسوس ہونے لگا۔

وہ ایک گروپ کی باتیں دوسرے کو بتاتی اور پھر جو کچھ ہوتا اسے خوب انجوائے کرتی۔ اس کے لیے زندگی تو اب کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ محض ایک فن...... ایک شغل...... اس کے علاوہ اس کے لیے زندگی میں کچھ بھی باقی نہ تھا۔ وہ آفاق کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اب اس کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔ جس ماحول سے وہ نکلی تھی اب وہاں جانا تو کیا سوچنا بھی ایک مضحکہ خیز خیال لگتا تھا۔ وہ اسے روپیہ پیسہ بھی کھلا دیتا۔ وہ جو چاہتی کرتی۔ ان کا رشتہ محض نام کا رہ گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد آفاق میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ وہ اس پر ہاتھ بھی کم اٹھاتا تھا اور خود بھی اس نے فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا۔ زندگی کی طرف اس نے سنجیدگی سے قدم بڑھایا تھا۔ اس بات کو ملک منصور نے بھی بہت خوش آئند سمجھا تھا اور سحر کے لیے بھی یہ کسی اچنبھے سے کم نہ تھا۔ وہ بات بھی دھیمے لہجے میں کرتا اور اس کی بہت سی نامعقول باتوں پر بھی خاموش رہتا۔

اس کا موڈ سخت آف تھا۔ نہ کچھ کھانے کو جی چاہ رہا تھا نہ پینے کو۔ باہر ملگجا سا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ کمرے میں لائٹ آف کیے کرسی پر بیٹھی سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہی تھی۔ آج سگریٹ بھی خاصی بدمزہ لگ رہی تھی اس نے سگریٹ بری طرح توڑ مروڑ کے ایش ٹرے میں پھینکی اور سگریٹ کیس سے نئی سگریٹ نکالی پرس میں سے ایک چھوٹی سی ڈبی نکال کر اس کے تمباکو میں چرس بھرنے لگی اور پھر گہرے گہرے کش لینے لگی۔ ہار کا قلق پھر بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔ گو کہ ذہن اونچی اڑانیں بھرنے لگا اور اس میں نئی نئی اسکیمیں آنے لگیں۔ مسز سلیم انتہائی چھچھوری اور کمینی عورت ہے۔ آج اس نے ضرور پتا بدلا ہوگا ورنہ میں کیسے ہار سکتی تھی۔ میرا تعلیم یافتہ نہ ہونا ان لوگوں کو اکثر فائدہ دے جاتا ہے۔ ورنہ میں آج ہار ہی نہیں سکتی تھی۔ مسز سلیم، مسز اکرام اور مسز زبیر بڑی گھاگ اور زہریلی عورتیں ہیں۔ شاطر، چال باز انھوں نے میرے خلاف مل کر پلاننگ کی ہوگی۔ یہ ہمیشہ مجھے پھنسانے کے چکروں میں رہتی ہیں۔ اسے ان پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ آج وہ پچاس ہزار جوئے میں ہار کر آئی تھی۔ وہ ہر طرح سے لیس ہو کر آج میدان میں اتری تھی۔ اس نے خصوصی طور پر مسز عبید سے سارے ٹرکس سیکھے تھے۔ پتے سارے اس کے پاس تھے۔ یقیناً پتے بدلے گئے ہوں گے وہ بار بار سارا منظر ذہن میں لا رہی تھی اور جیسے ایک دم کچھ ذہن میں آ گیا۔ جب اس کا سگریٹ کیس نیچے

گرا تھا اور وہ اٹھانے کے لیے جھکی تھی۔ تب سر اٹھاتے ہوئے اس کی نظر مسز زبیر پر پڑی تھی اس کی آنکھوں میں خاص چمک تھی اور لبوں پر مسکراہٹ اور اس نے مسز اکرام کو آنکھ بھی ماری تھی۔ اچھا تو یہ گیم تھی۔ میں بھی ان کو نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے ریڈ کلر کی بلاک ہیل کی اونچی ایڑی والی جوتی اتار کر دور پھینکی۔ اس کا خون غصّے سے کھول رہا تھا۔ انھوں نے مجھے ہمیشہ شکست دینے کی کوشش کی ہے۔ ہر ہر بات میں۔ اب میری باری ہے ان سے اپنی ہار کا بدلہ لینے کی اور اب یقیناً وہ پی، سی میں ڈنر کے لیے گئی ہوں گی۔ وہ ان کی عادتوں اور روٹین سے اچھی طرح واقف تھی۔

وہ اک نئے عزم کے ساتھ اٹھی۔ سگریٹ ایش ٹرے میں مسلی اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ شولڈر کٹ بالوں کو برش کیا۔ لپ اسٹک کا دُہرا کوٹ کیا۔ ماؤتھ واش سے منہ صاف کرنے کے بعد ماؤتھ اسپرے کیا۔ جسم پر پرفیوم کا بھرپور چھڑکاؤ کرنے کے بعد وہ گاڑی لے کر پی سی کی طرف روانہ ہوگئی۔ پی، سی میں کوئی خاص فنکشن تھا۔ اس لیے مرد و خواتین جوق در جوق جدید فیشن ایبل ملبوسات اور ملی جلی خوشبوؤں سے معطر ہنستے مسکراتے داخل ہو رہے تھے۔ اس نے ہال میں نظر دوڑائی کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آیا۔ موسم گرما کی آمد آمد تھی اس لیے مقامی کمپنیاں اپنی پروڈکٹس کی ایڈورٹائزنگ کے لیے ہر سال کی طرح اس دفعہ بھی بہت وسیع اور جدید خطوط پر یہ شوز منعقد کروا رہی تھیں۔ تقریباً تمام بڑے ہوٹلوں میں یہی سرگرمیاں جاری تھیں۔ فیشن اور ماڈلنگ کے نام پر ایک مخصوص انجوائے منٹ مخصوص طبقے کو فراہم کی جا رہی تھی۔

ہال قدرے بھرا ہوا تھا۔ رنگ برنگی روشنیاں نیم عریاں ماڈلز کے جسموں اور چہروں پر پڑتیں تو عجیب سا تاثر پیدا ہوتا۔ لوگ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ تینوں اسے ایک کونے میں بیٹھی نظر آ گئیں۔ تینوں قہقہے لگا رہی تھیں اور اچانک اس سے اگلی ٹیبل پر اس کی نظر پڑی وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ اس میں ایک قدم بھی اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ آفاق ایک خوبصورت سی ماڈ اسکا ڈ لڑکی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا اور دونوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ ان قہقہوں کا شور اور گونج اپنے دل و دماغ میں سن رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر رکی اور پھر خالی خالی قدموں سے واپس لوٹ آئی۔

✿

ولیم کو فادر کی طرف سے ایک میل موصول ہوئی تھی اور اب وہ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ

اسے کیا کرنا چاہیے۔ فادر نے ہر ممکن طریقے سے دو سالوں میں اس کی برین واشنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب اس کے اے، لیولز کے ایگزامز بھی ہونے والے تھے اور ان سے فارغ ہونے کے بعد فادر نے اس کے بارے میں کوئی اہم فیصلہ کرنا تھا۔ فادر نے خود ہی اس کا ایڈمشن لاہور میں کروا دیا تھا۔ شہلا ان تمام باتوں سے بے بہرہ تھی۔ ولیم نے کئی دنوں سے ماں سے بالکل رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ حیدر کی وجہ سے سخت پریشان تھی۔ نہ وہ اسے مل رہا تھا نہ کوئی اس سے بات ہو رہی تھی۔ وہ حقیقت معلوم کرنا چاہتی تھی مگر سب کچھ اس کی رینج سے باہر تھا۔ رشیدہ نے اسے اطلاع دی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یقیناً حیدر ہی ہوگا مگر اس وقت۔ اس نے گھڑی دیکھی رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ پریشان سی منتشر سوچوں کے ساتھ جب وزیٹرز روم میں داخل ہوئی تو چونک گئی۔ ولیم سامنے بیٹھا تھا۔

''ولیم تم...... اور یوں اچانک بغیر بتائے۔ خیریت تو ہے۔'' اس نے بے دلی سے اسے گلے لگایا اور سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔

''ہاں...... وہ...... مما......'' اسے جیسے پوری بات بتانے کے لیے ماحول سازگار نہیں لگ رہا تھا۔ ''مما...... آپ بیٹھیں، میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

''کیا، خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں، وہ فادر نے کہا ہے کہ میرا اب لاہور میں رہنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے اب میں لاہور شفٹ ہو رہا ہوں۔ انھوں نے میرا ایڈمشن بھی یہیں بہت اچھے کالج میں کروا دیا ہے اور میرے رہنے کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔'' ولیم آہستہ آہستہ اسے بتا رہا تھا۔ شاید اسے اس کے ردِعمل سے خوف آ رہا تھا۔

''ولیم...... میں فادر سے سخت تنگ ہوں۔ انھوں نے تم میں اور مجھ میں دراڑ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور تم نے ماں کو اہمیّت دینا تو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ فادر جو بات بھی کرتے ہیں تم فوراً مان لیتے ہو۔ کیا تمھاری ماں مر چکی ہے اور تم بے آسرا ہو گئے ہو جو تمھیں ہر بات میں ان کے مشورے کی ضرورت ہے۔ ولیم تم اب کسی بھی بات میں مجھ سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اب جبکہ سب کچھ ہو چکا ہے تم صرف مجھے بتانے کے لیے آئے ہو۔ ٹھیک ہے تم جو چاہو کرو۔ میں کون ہوتی ہوں تمھیں کسی بھی بات میں مشورہ دینے والی۔ تمھارے لیے اب سب کچھ فادر ہی ہیں۔'' وہ غصّے سے بولتی ہوئی باہر نکلنے لگی تو ولیم اس کے

سامنے آ کھڑا ہوا۔
''مما...... یوں نہیں۔ میں جانتا تھا آپ ناراض ہوں گی اور آپ کو ہونا بھی چاہیے۔ مما میں نہ آپ کو ناراض دیکھ سکتا ہوں نہ فادر کو۔ آپ میری ماں ہیں اور میں جانتا ہوں کہ آپ نے کن تکلیفوں سے مجھے پالا ہے۔ مما آئی رئیلی لو یو'' اس نے ماں کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا ''مگر مما، فادر میرے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آئی آلسو لو ہم۔ میں کیا کروں۔ میں آپ دونوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مما۔ میرے لیے سچویشن کو مشکل نہ بنائیں اس طرح میں کنفلیکٹ کا شکار ہو کر ڈسٹرب ہو جاؤں گا۔ کیا آپ چاہیں گی کہ میں ڈسٹرب ہو جاؤں۔'' وہ استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
''نہیں، میں کبھی بھی نہیں چاہوں گی۔ میں کبھی بھی تم کو ڈسٹرب نہیں دیکھ سکتی۔''
اس کی آنکھوں میں بھی نمی سی تیرنے لگی۔ وہ ولیم کی بات سن کر شدید جذبات سے مغلوب ہو چکی تھی اور سخت غصے کے باوجود اسے نہ روک سکی۔ اس کے اندر لاوا ابل رہا تھا۔ کبھی دل چاہتا اسی لمحے ساری حقیقت اسے بتا دے اور کبھی مسئلے کو مزید الجھنے سے بچا لے...... مگر پھر وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ جا چکا تھا اور اسے اپنے آپ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ ہر بار ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ کب تک مصلحتوں کا شکار ہوتی رہے گی۔ کب تک...... یوں حالات کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی رہے گی مگر میں کیا کروں۔ کیا کہوں اور کس طرح۔ اسے ہمیشہ نتائج سے خوف آتا تھا۔ اس نے حالات کو یونہی چلنے دیا۔

ولیم ہاسٹل شفٹ ہو چکا تھا۔ جب سے فادر سے اس کا ملنا جلنا ہوا تھا اس کی سوچ بہت بدل چکی تھی۔ وہ عام لڑکا نہیں رہا تھا۔ فادر کی میلز نے اس کی بہت برین واشنگ کر دی تھی۔ وہ بہت سنجیدگی سے زندگی اور اس کی حقیقتوں کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ وہ ہر بات کے ہر پہلو کو پہلے ذہن میں رکھتا پھر کوئی قدم اٹھاتا۔ اس کے نرم و نازک ذہن کو فادر نے مذہب کے سخت شکنجے میں جکڑ دیا تھا۔ وہ گناہ اور ثواب کے فلسفے میں الجھا رہتا۔ ہر بات کو کہنے سے پہلے سوچتا کہیں گناہ کے زمرے میں تو نہیں آتی اور ہر کام کو کرنے سے پہلے الجھن کا شکار رہتا کہ اس کا ثواب بھی ہوگا کہ نہیں۔ اس کے ہم عمر زندگی کو کیسے کیسے انجوائے کر رہے تھے۔ ہنسی مذاق کرتے لڑکے لڑکیوں کے گروپ انجوائے منٹ کے مختلف پلانز بناتے رہتے۔ ٹرپس ارینج کرتے۔ ایگزیبشنز پر جاتے۔ فیشن شوز دیکھنے کے لیے پروگرامز بنتے۔ تھیٹر جاتے۔ شاپنگ کے لیے جاتے اور وہ یا تو اپنی اسٹڈیز کرتا یا پھر بائبل پڑھتا یا پھر نیٹ پر فادر سے

چیٹ کرتا۔ وہ جب بھی الجھتا فادر اسے ایک نئی سوچ دے کر اس کے ذہن کا دھارا بدل دیتے۔ فادر بہت ماہر اور فطین شخص تھے۔ جن کی زندگی کا مشن ہی نئے ٹیلنٹ کو چرچ کے مفادات کے لیے استعمال کرنا تھا۔ فادر سے ملنے سے پہلے وہ ہر ایکٹیوٹی میں آؤٹ اسٹینڈنگ سمجھا جاتا تھا۔ کسی بھی پروگرام میں اس کی شرکت ادارے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی اور اب وہ ان سب چیزوں سے الگ تھلگ رہتا۔ اس کے کلاس فیلوز اور روم میٹس نے بھی اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا بلکہ اب وہ اس کی کمپنی کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ لڑکیاں اسے ''گاڈ فادر'' کہہ کر چھیڑتیں اور اس کا خوب مذاق اڑاتیں۔ وہ کالج کا سب سے ہینڈسم لڑکا تھا۔ لڑکیاں اس کے پیچھے دیوانہ وار فدا ہوتیں۔ جب تک وہ مری میں تھا ہر لڑکی اس سے دوستی کی خواہاں تھی اور جب لاہور آیا تب بھی وہ سب اس کی تاک میں رہتیں مگر جیسے ہی اس کی پرسنالٹی کا یہ پہلو سامنے آتا تو سب بدک کر پیچھے ہٹ جاتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنا فیوچر بھی انھیں تاریک لگنے لگتا۔ بات بڑھنے سے پہلے اس کو ختم کر دینا بہتر ہوتا ہے۔ ہر بڑھتا قدم رک جاتا۔ ماں کے ساتھ بھی اس کے تعلقات سرد مہری کا شکار تھے۔ دوستوں کے حلقے میں بھی کمی آ گئی تھی۔ اب اس کی ذات کو صرف اور صرف فادر نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ پورا کا پورا فادر کے کنٹرول میں تھا اور فادر اسے اپنے اشاروں پر چلا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود ہی الجھ جاتا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ سب ٹھیک تھا یا پھر......؟ اس کے آگے اس کا ذہن کچھ نہ سوچ پاتا۔ ہر طرف الجھنیں ہی الجھنیں تھیں اور وہ کسی کیکٹس کی طرح اس کے سارے وجود کو جکڑے ہوئے تھیں۔ اس کا وجود تضادات کا شکار ہو رہا تھا۔ سکون کے بجائے انتشار جنم لے رہا تھا۔ جب سے اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ ماں اس کو اور فادر کے تعلقات کو ناپسند کرتی ہے۔ وہ مزید ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ ماں کے خواب چکنا چور ہو رہے تھے اور اس کی اپنی سوچ ڈسٹرب......

شہلا نائٹ کوچ سے پشاور پھپھو تبسم کے پاس گئی تھی۔ وہ اسے یوں اچانک صبح سویرے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

''شہلا خیریت تو ہے نا بیٹی۔ تم اس طرح اچانک...... بغیر کسی فون اور اطلاع کے گھر میں سب ٹھیک ہے نا۔'' تبسم اسے یوں پریشان اور پژمردہ دیکھ کر مضطرب سی ہو گئیں۔

''ہاں، سب ٹھیک ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''شہلا سچ سچ بتاؤ۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے

ہوئے بولیں۔

''ارے بھئی بیٹی کو ناشتا وغیرہ تو دو پھر پوچھ لینا۔'' ان کے شوہر سید مغیث الدین نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''السلام علیکم انکل۔''

''وعلیکم السلام بیٹی۔ کیسی ہو۔ حیدر بھائی کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''بیگم اس کو فریش تو ہونے دو۔ جاؤ بیٹی آپ فریش ہو جاؤ پھر ناشتا اکٹھے کرتے ہیں۔''

''جی انکل۔'' وہ بیگ لے کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

''بیگم، آپ نے آتے ہی اسے پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔ آپ کو اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی اور پریشانی سے خود ہی اندازہ کر لینا چاہیے۔ وہ بہت ڈسٹرب ہے۔'' مغیث صاحب نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... اسی لیے تو میں پریشان ہوگئی ہوں۔ وہ نہ تو کبھی یوں اچانک آئی ہے اور وہ بھی کوچ سے اور نہ ہی اس طرح کبھی افسردہ دکھائی دی ہے۔''

''آپ ناشتا لگوائیں۔ بعد میں اس سے پوچھ لینا لیکن پہلے میں حیدر کو تو فون کر کے بتا دوں کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ وہ بھی پریشان ہو رہا ہوگا......'' انھوں نے جلدی سے فون ملایا۔

''حیدر بھائی، کیسے ہیں آپ...... ٹھیک تو ہیں نا؟'' وہ خوش کن لہجے میں بولے۔

''کون مغیث بھائی! ہاں ٹھیک ہوں۔'' وہ قدرے یاسیت سے بولا۔

''آپ کو اطلاع دینی تھی کہ شہلا بیٹی خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ اپنی ہی لے میں بولے۔

''شہلا...... ادھر...... ہے۔'' حیدر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں بھئی۔ کیوں یقین نہیں آ رہا۔ بات کرواؤں۔ ابھی ابھی وہ پہنچی ہے اس لیے واش روم میں ہے۔''

''اچھا اس کو کچھ نہ بتایئے گا میں خود ادھر آ تا ہوں۔''

''خیریت تو ہے نا؟'' مغیث صاحب کو شک سا ہوگیا۔

''بس آپ فون کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایئے گا۔ وہ کچھ ناراض ہے۔'' حیدر نے فون بند کر دیا۔

''خدایا تیرا شکر ہے کہ وہ ادھر چلی گئی۔ ورنہ میں تو پاگل ہی ہو جاتا۔''

شہلا زندگی میں پہلی دفعہ اس سے روٹھی تھی اور اس کا یوں روٹھنا اس کے لیے سخت جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی دنیا ختم ہو رہی ہو۔ محبتوں کا یہ ریشمی اور نازک جال انسان کو کیسے کیسے جکڑے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ نازک جذبے بھی انسان کو کس قدر بے حوصلہ اور مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ نہ جی سکتا ہے نہ مر سکتا ہے۔

''محبتیں...... مصلحتیں، مجبوریاں اور بے بسی۔'' انسان الجھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہر کوئی الجھ رہا تھا اور جو جتنا جتنا الجھ رہا تھا اتنا اتنا تڑپ رہا تھا۔ جتنا جتنا تڑپ رہا تھا۔ اتنا ہی زیادہ بے بس ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً پشاور کے لیے سیٹ بک کروائی تھی۔

اس نے ناشتا بہت بے دلی سے کیا۔ اب مغیث الدین معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اس کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ تبسم اپنی جگہ پریشان بیٹھی تھیں۔

''بیٹی آپ ناشتا کیوں نہیں کر رہیں...... اور حیدر بھائی کیوں نہیں آئے؟''

''وہ...... انکل ان کی میٹنگز...... وہ بہت مصروف ہیں۔'' وہ بے ربط لہجے میں بولی

''پھپو...... میں بہت تھک گئی ہوں۔ آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' شاید اس نے مغیث الدین کی نظروں میں چھپے استفہام اور مشکوک لہجے کو پہچان لیا تھا۔ اس لیے ان کے سوالوں سے بچنے کے لیے وہ آرام کا بہانہ بنا رہی تھی۔

''آؤ...... میرے ساتھ......'' پھپو اسے گیسٹ روم میں لے گئیں۔

''پھپو گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے۔ کہاں ہیں سب لوگ؟''

''رینا نے اسلام آباد میں ہاؤس جاب شروع کی ہے۔ ضیغم کالج ٹرپ کے ساتھ بھوربن گیا ہے اور اطہر کی پوسٹنگ آج کل کوئٹہ میں ہے۔''

''شہلا مجھے سچ سچ بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔ اس قدر پریشانی تو میں نے تمھارے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی ہے۔''

''پھپو...... میں بہت پریشان ہوں۔ پاپا...... پاپا نہیں رہے۔ آئی مین...... ہی ازان لو...... اور یہ میرے لیے بہت شاکنگ ہے۔''

''کیا فضول بکواس ہے۔ حیدر اور ایسی باتیں۔'' پھپو ہنستے ہوئے ایک دم سیریس

ہوگئیں۔

''یہی تو میرے لیے دکھ کی بات ہے۔ وہ میرے سامنے شروع سے ایک شفاف موتی کی طرح رہے ہیں۔ ان کی زندگی کھلی کتاب کے مانند ہے مگر اب وہ اس قدر بدل گئے ہیں۔''

''تم یہ سب کیسے جان پائیں؟''

''میں نے خود ان کو فون پر باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ ان کا لہجہ...... مائی گاڈ...... پھپو...... وہ کہہ رہے تھے۔ شہلا تم اپنا ہر دکھ مجھ سے شیئر کرسکتی ہو۔''

''کیا کہا...... کیا...... شہلا زندہ ہے......؟'' پھپو کو جیسے ایک دم کرنٹ لگا۔

''کیا آپ انھیں جانتی ہیں......؟'' شہلا کے لہجے میں حیرانی کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بے شمار سوالات بھی تھے۔

''ہاں...... وہی تو ہے۔'' پھپو کے لہجے میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔

''کون...... بتائیں نا کون......؟ جس نے میرا سکون برباد کر دیا ہے۔''

''حیدر کی محبت......'' وہ آہستہ سے بولیں اور اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

''پھوپھو...... آپ نے بات ادھوری کیوں چھوڑ دی۔ آخر آپ کیوں بتانا نہیں چاہ رہیں؟'' وہ ان کے پیچھے کچن میں آ گئی۔

''تم کیا کرو گی سن کر؟ جن باتوں کو دہرانے سے سوائے تاسف کے اور کچھ نہ حاصل ہو تو ان کا فائدہ؟''

''مگر پھوپھو...... اس عورت کو کوئی حق نہیں کہ ہماری پرسکون زندگی کو یوں تباہ کرے...... پاپا کو اس سے پہلے میں نے اتنا مضطرب کبھی نہیں دیکھا۔ ان کا بدلا ہوا لب و لہجہ...... مجھے تو وہ اپنے آپ ہی میں نہیں لگے۔''

''آخر تم اس بحث سے کیا نتیجہ نکالنا چاہتی ہو؟'' وہ قدرے درشتی سے بولیں۔

''پھوپھو! آپ ناراض ہو رہی ہیں، آپ کو اندازہ نہیں کہ میں کتنی ہرٹ ہوئی ہوں۔ جس شخص کو ہم اپنی ذات سے بڑھ کر چاہیں۔ اس کا امیج ایک دم ختم ہو جائے تو کیا ہوتا ہے...... تو کیا ہوتا ہے، شاید آپ کو نہیں معلوم......''

''شہلا...... تم صرف اپنا ہی سوچ رہی ہو۔ اگر دو لوگ ایک دوسرے کو بہت چاہیں اور مصلحتیں، روایتیں انھیں نہ ملنے دیں۔ ایک کانٹوں بھری زندگی گزارے اور ایک بیابانوں جیسی ویراں...... تو اس کو تم کیا کہو گی......؟'' تبسم نے آہ بھر کر اسے دیکھا۔

''تو یوں کہیں نا قسمت نے انھیں نہیں ملایا...... مگر پاپا کا اس سے کیا تعلق؟''

''تم جانتی ہو...... تمہارا یہ نام بھی کسی کی عطا ہے...... شہلا کو قسمت نے اس سے چھینا تھا یا پھر وہ کھو گئی تھی۔ مگر وہ تمہاری صورت میں کبھی بھی اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ہم سب خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہے۔ کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا اور نہ کر سکا۔ شاید قسمت اسی کو کہتے ہیں...... نہ بابا نہ، حیدر...... نہ شہلا اور نہ ہی کوئی اور......''

''آپ مجھے تفصیل سے سب کچھ کیوں نہیں بتاتی ہیں......؟'' انھوں نے ساری تفصیل اسے بتا دی۔

''پھوپھو...... اس عورت نے میری ماں کو بھی پورا حق نہ لینے دیا۔ میری ماں میرے باپ کی سچی اور بھرپور محبت کو ترستی مر گئی اور اب وہ مجھ سے میرا حق چھیننا چاہتی ہے۔''

''شہلا! تمہاری ایسی سوچ...... ہم جو حیدر کے کزنز ہیں، اسے سگے بھائی سے زیادہ عزیز جانتے ہیں۔ اس کے لیے ہمارا دل اتنا دکھتا ہے اور تم کس قدر بے اعتنائی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ تمھیں اس شخص نے اتنی محبت دی ہے اور تم کیسے اس کے اور شہلا کے خلاف بول رہی ہو'' وہ ناراضی سے بولیں۔

''پھوپھو...... محبت میں شراکت داری مجھے قبول نہیں، جب وہ عورت یہاں نہیں تھی تب بھی اس کی وجہ سے میری ماں ڈسٹرب رہی اب وہ نہ جانے کہاں سے آ گئی ہے تو اب میرا اور میرے باپ کا رشتہ کمزور کر رہی ہے۔ ایسے لوگ بس دوسروں کو اذیتیں دینے کے لیے جنم لیتے ہیں۔''

''شہلا مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی...... تم تو پورے خاندان میں بہت مختلف اور پیار کرنے والی مشہور ہو۔ تمھارے منہ سے یہ باتیں سن کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔''

''پھوپھو...... مجھے زندگی میں صرف ایک ہی رشتہ ملا ہے۔ ماں میری پیدائش کے دو سال بعد مر گئی۔ نہ بہن، نہ بھائی، نہ دادا نہ نانا...... اور آپ لوگ بھی دور دور رہتے ہیں۔ میرے پاس صرف ایک ہی رشتہ ہے جسے میں اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں۔ وہ مجھ سے چھن جائے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں اس چھیننے والے سے ہی اس کا سب کچھ چھین لوں گی......'' وہ قدرے غصّے میں بولی۔

''شہلا...... آرام سے میری بات سنو۔ جس سے تم اتنی محبت کرتی ہو، اگر اس کی خوشی ایک ذات سے وابستہ ہو اور تم وہ بھی اس سے چھیننا چاہو تو کیا تم خود غرض نہیں کہلاؤ گی؟''

''پھوپھو! اب اس عمر میں وہ کیا کرنا چاہتے ہیں......شادی......! کیا انھیں یہ زیب دے گا۔ اگر وہ شادی کریں گے تو کیا میں سوسائٹی میں منہ دکھانے کے قابل رہوں گی۔ اگر ایسا ہوا تو پھر انھیں میرا جنازہ ہی اٹھانا پڑے گا......'' وہ اس قدر جذباتی ہو کر بول رہی تھی اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ کچن سے باہر کرنل مغیث الدین اس کی ساری باتیں بہت توجہ سے سن رہے تھے۔

''ہر محبت کو مشروط نہیں بناتے بیٹا......تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔ حیدر ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ تم سے زیادہ ہم اسے جانتے ہیں۔ جو شخص اپنی جوانی تیاگ دے وہ بڑھاپے کو کیونکر داغ دار کرے گا۔ تم اطمینان رکھو۔'' مغیث الدین اخبار پکڑے کچن میں آئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ وہ ایک دم نادم سی ہوگئی اور خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔

''تبسم، حیدر ابھی یہاں پہنچنے والا ہے......'' انھوں نے بیوی سے کہا۔

''وہ کیسے......اور آپ کو کس نے بتایا؟'' وہ حیرت سے بولیں۔

''میں نہیں جانتا تھا کہ شہلا ناراض ہو کر اسے بغیر بتائے یہاں چلی آئی ہے، میں نے تو شہلا کے پہنچنے کی اسے اطلاع دینا چاہی تو اس نے ہی بتایا کہ وہ خود اسے لینے آ رہا ہے۔ شہلا بہت جذباتی لڑکی ہے۔'' وہ قدرے افسردہ لہجے میں بولے۔

''شدید محبت، انسان کو جذباتی بنا دیتی ہے مگر دیکھیے، ہر رشتہ اپنا حق کیسے دھونس اور رعب سے مانگتا ہے اور جو بے چارے نہیں مانگ سکتے، وہ ساری زندگی اذیتیں ہی سہتے ہیں۔ اس وقت بھی سید خاندان کے بہت سے لڑکوں نے غیروں میں شادیاں کر لی تھیں مگر حیدر نے خاموشی سے بابا کی بات مانی۔ اگر وہ ذرا بھی مشتعل ہوتا یا چوں چرا کرتا تو بابا کیا کر سکتے تھے اور وہ یہ بات خود بھی جانتا تھا......مگر بابا کی پرورش اور ان کی محبت کو جھٹلا کر وہ احسان فراموش بھی نہیں کہلانا چاہتا تھا، بس یہی قسمت ہے......'' وہ افسردہ ہو رہی تھیں۔

''وہ اپنا غصہ نکال کر آرام سے سو رہی تھی۔ تبسم کے میاں کرنل مغیث الدین سی ایم ایچ میں سائیکاٹرسٹ تھے اور آج کل ان کی پوسٹنگ پشاور میں تھی۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ گھر پر تھے۔ بیٹ مین سبزی بنانے میں مصروف تھا اور وہ خود سوئیپر سے صفائی وغیرہ کروا رہی تھیں۔ جب حیدر پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر وہ خوش بھی ہوئیں اور پریشان بھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ساری رات نہیں سویا تھا۔ پریشان حال چہرہ، سوجی سوجی سرخ آنکھیں، تبسم کا تو دل ہی لرز گیا۔

''حیدر بھائی...... یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے......''

''بس آپا...... میں شہلا کی وجہ سے بہت پریشان رہا ہوں۔ یہ بغیر بتائے ہی آ گئی۔کیا اس نے آپ سے کوئی بات کی؟''

''ہاں...... سب باتیں ہو چکی ہیں۔ وہ تمھارے بارے میں بہت زیادہ پوزیسیو ہے...... اور ہاں، شہلا تمھیں کہاں سے ملی، اتنے سالوں کے بعد...... سنا تھا اس نے منصور سے طلاق لے کر کسی انگریز سے شادی کر لی تھی اور اب یہاں......؟'' آپا نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''بس، مصائب کی چکی میں پس رہی ہے۔ وہ پہلے جیسی شہلا نہیں رہی ہے۔ نہ وہ وجود رہا ہے اور نہ ہی نام......'' وہ افسردگی سے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' آپا نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں......شہلا کہاں ہے؟''

''سو رہی ہے......'' آپا نے بتایا۔

''حیدر بھائی...... آپ ایگریسیو نہ ہونا، آرام سے بات کرنا۔ وہ اس وقت بہت جذباتی ہو رہی ہے۔'' مغیث اللدین نے انھیں سمجھایا۔

''آپا، ہر دفعہ نہ جانے میں ہی کیوں آزمایا جاتا ہوں......'' حیدر کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''ہاں...... بعض لوگوں کو قدرت بار بار آزماتی ہے۔ نہ جانے کس بھٹی کے لیے انھیں تیار کر رہی ہوتی ہے۔ شاید زیادہ آزمائشیں انھی کے لیے ہوتی ہیں جنھیں وہ زیادہ پیار کرتا ہے۔'' آپا نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''آپا، میں جتنا اپنے ماضی سے دور بھاگنا چاہتا ہوں، وہ بھاگ بھاگ کر میرے قدموں سے لپٹتا ہے...... نہ جانے شہلا کہاں سے آ ٹپکی...... میں اس کی تکلیفیں اور مصیبتیں دیکھ کر پریشان ہو گیا......بس یہی مجھ سے غلطی ہو گئی۔'' وہ پریشانی سے ہونٹ چبانے لگا۔

''اچھا......تم فکر نہیں کرو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تھکے ہوئے ہو، آرام کرو۔ مغیث آپ انھیں اطہر کے کمرے میں لے جائیں، میں ذرا کھانا وغیرہ بنا لوں۔''

''آیئے، حیدر بھائی!'' وہ خاموشی سے کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے چلنے لگا۔

دونوں رات گئے تک سوتے رہے۔ نہ دوپہر کا کھانا کھایا اور نہ شام کو چائے پی۔

تبسم آپا نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا اور ان کو اٹھا کر اب ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ حیدر فریش ہو کر ان کے پاس بیٹھا تھا۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلی، باپ کو دیکھتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں اور آہستہ سے سلام کر کے ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھ گئی۔

''باقی سب باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے اطمینان سے کھانا کھائیں۔'' مغیث الدین نے ان کے چہروں پر پھیلی ناگواری دیکھ کر کہا۔ سب خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

''کریم خان، برتن اٹھا لو......اور چائے لاؤنج میں ہی لے آؤ۔'' تبسم آپا نے بیٹ مین کو آواز دی اور سب لوگ لاؤنج کی طرف چلے گئے۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے سے جیسے نظریں چرا رہے تھے۔

''شہلا، تم حیدر بھائی کو بغیر بتائے کیوں آئیں؟'' تبسم پھوپھو نے کافی دیر انتظار کے بعد کہا۔

''میں ان سے ناراض تھی۔''

''اگر ناراض تھیں تو مجھ سے کہا ہوتا...... یوں گھر چھوڑ کر آنے کی کیا تک تھی اور میں کس طرح مارا مارا لاہور کی سڑکوں پر ساری رات تمھیں ڈھونڈتا رہا ہوں۔ تمھیں کچھ اندازہ ہے؟'' وہ قدرے درشتی سے بولا۔

''میں بہت ڈسٹرب تھی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کس بات سے ڈسٹرب تھیں......کم از کم مجھ سے کوئی بات تو کی ہوتی......''

''مجھے لگا جیسے آپ دوسری شادی کر رہے ہیں اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکی اس لیے ادھر چلی آئی۔''

''تمھاری ماں کو بھی ساری زندگی یہی وسوسے اور خدشات رہے۔ آپا، ان لوگوں کو نہ جانے میں کیوں اتنا بے اعتبار لگتا ہوں۔ سنو، اگر میں نے یہی کچھ کرنا ہوتا تو نہ مجھے تمھاری ماں کی اجازت کی ضرورت تھی اور نہ تمھاری۔ میں نے تو جانتے بوجھتے سب کچھ اپنے ہاتھوں سے ختم کیا تھا اور پھر بھی تم لوگ میرے بارے میں مشکوک رہے۔ طاہرہ مرتے دم تک اپنا ذہن صاف نہ کر سکی اور اب تم میرے لیے مسائل کھڑے کرنا چاہتی ہو......''

''پاپا...... میں آپ کے لیے کوئی مسائل کھڑے نہیں کرنا چاہتی لیکن میں یہ بھی نہیں برداشت کر سکتی کہ وہ عورت، جس نے پہلے میری ماں کا جینا حرام کیے رکھا تھا، اب میرا بھی کرے...... ماضی میں وہ آپ کے لیے جو کوئی بھی تھی، اب اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہونا

چاہیے۔ آپ کی ایک سیاسی حیثیت ہے اور میری بھی معاشرے میں پہچان ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ معاشرہ آپ کی وجہ سے مجھ پر انگلیاں اٹھائے۔" وہ قدرے غصے میں بولی۔

"آپا...... آپ اس کی باتیں سن رہی ہیں...... باپ آج اس کی نظروں میں مشکوک ہوگیا ہے۔ ایک لمحے میں تم نے میرا امیج تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ میں نے تم سے اپنی محبتوں کا کوئی صلہ تو نہیں مانگا...... تم مجھے کس کا بدلہ دے رہی ہو؟" وہ بھی غصے میں پھنکارا۔

"پھوپھو...... آپ بھی دیکھیے، محبت بھری نظریں اور پیار کہنے والی زبان آج کسی صلے اور بدلے کی باتیں کر رہی ہے۔ یہ کس کی وجہ سے ہے، یہ اس عورت کی وجہ سے ہے جس نے میری ماں کی زندگی میں بھی زہر گھولا تھا۔ مجھے سب علم ہے آپ دونوں نے کیسی زندگی گزاری ہے اور اب وہ مجھ سے میرا باپ بھی چھیننا چاہتی ہے۔ ہمارے رشتے میں دراڑ تو اس نے ڈال ہی دی ہے...... اب نہ جانے اس نے اور کیا کچھ کروانا ہے۔" وہ غصے سے بولتی چلی گئی۔

"شہلا بیٹی! باپ سے اس لہجے میں بات نہیں کرتے......" مغیث انکل نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اور انکل، آپ بھی انھیں بتائیں کہ ایسی باتیں کر کے وہ میرا بھرم...... میرا اعتماد، میرا سب کچھ چھین رہے ہیں۔ اس وقت میں ریزہ ریزہ ہو رہی ہوں...... کاش، یہ اندازہ کر سکیں۔" وہ رونے لگی۔

"حیدر بھائی، آپ بھی لہجے کو نرم رکھیں۔ غصے سے مسائل حل تو نہیں ہوتے......" مغیث الدین نے انھیں بھی سمجھایا۔

"آپا، آپ اس سے پوچھیں، یہ میرے بارے میں کیونکر مشکوک ہے؟" حیدر نے تبسم آپا کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو آپ نے اس سے فون پر کیا کہا تھا؟"

"اُف خدایا...... تو کیا میں اسے شادی کے لیے کہہ رہا تھا...... تم کس قدر ناسمجھ ہو...... آپا، آپ اندازہ نہیں کرسکتیں کہ وہ کس قدر غم زدہ زندگی گزار رہی ہے۔ ہاسٹل میں پندرہ بیس سال سے وہ خوار ہو رہی ہے۔ بیٹا، اس کا کہیں ہے، وہ خود کہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ اتنی بڑی حویلی خالی ہے، ادھر آ جائے۔ نوکر چاکر ہیں اور پھر ماضی میں اس تعلق کے علاوہ ایک اور تعلق بھی تو تھا۔ وہ تایا ابا کی بیٹی بھی تو تھی۔ اس ناتے سے بھی اس کا

پورا حق ہے کہ وہ وہاں رہے۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں اور خود ہی فیصلہ کر لیا۔ آپا، جہاں اتنے مزارعے ہماری زمینوں سے رزق کھاتے ہیں، فیکٹریز میں ملازمین اور ان کے بچے اتنے فوائد اٹھا رہے ہیں، اگر وہ اور اس کا بیٹا ہمارے پاس رہ جائے گا تو کوئی قیامت تو نہیں آ جائے گی اور ویسے بھی یہ سید صاحب کی وصیّت تھی۔'' حیدر اب دھیمے لہجے میں بولا۔

''ہاں، اس میں کوئی قباحت نہیں۔'' آپا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں...... وہ آئیں اور رہیں لیکن پاپا، میں اپنا کچھ بھی ان سے شیئر کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ آپ کو بھی نہیں۔'' وہ غصّے میں بولتی ہوئی اندر چلی گئی۔

''پھر وہی بات...... تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' حیدر غصّے میں بولا۔

''حیدر...... اسے یہ خدشہ ہے کہ اس کے آنے کی وجہ سے تمہاری توجہ اس کی طرف ہو جائے گی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ تمہاری شیئرنگ کسی صورت میں نہیں چاہ رہی۔ نہ تمہاری محبت، نہ تمہاری توجہ...... اور نہ ہی کچھ اور...... اگر اس نے ذرا سا بھی کچھ ایسا دیکھ لیا تو اس کی شخصیت بگڑ جائے گی اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ شہلا جس حال میں ہے، اسے رہنے دو۔ جہاں اس نے زندگی کے اتنے سال گزار لیے ہیں، اب بھی گزار لینے دو۔ تمہاری ہمدردی اور توجہ شاید اسے تو کچھ سکون دے دے مگر تمہاری بیٹی کا سکون برباد ہو جائے گا۔'' مغیث بھائی نے اسے سمجھایا تو وہ خاموشی سے ان کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ آپا نے حیدر کی طرف دیکھا۔ اس لمحے انھیں وہ بے حد مجبور، بے بس اور لاچار باپ لگ رہا تھا۔ آپا بھی مصلحتاً خاموش رہیں۔

اگلے دن ان کی واپسی تھی۔ آپا اور مغیث الدین نے دونوں کو علیحدہ علیحدہ بھی سمجھایا اور ایک دوسرے کے سامنے بھی۔ دونوں خاموشی سے سنتے رہتے۔ ایک نے دوسرے سے کچھ نہ کہا۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ایک دم دونوں میں جیسے صدیوں کا فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے جھجک رہی تھی اور وہ اس کی طرف منتظر مگر حیران کن نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دو دفعہ موبائل پر بیل بجی۔ حیدر نے نمبر دیکھا اور فون آف کر کے رکھ دیا۔ اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فون کس کا ہو سکتا ہے......

شفق خون میں لت پت اسپتال لائی گئی تھی۔ اس کی حالت بہت نازک تھی ملک منصور کے فائر کے بعد وہ گر گر کر تڑپنے لگی۔ سارا عملہ وہاں اکٹھا ہو گیا۔ کوئی بھی یوں اسے

ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔تھانے دار کی جان پر بنی تھی۔ اس نے فوراً ایمبولینس منگوا کر اسپتال بھجوایا۔ تھانے میں یوں بے باکی سے قتل اور اس پر چشم پوشی اس کے لیے ہزار ہا مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر ہر ممکن طریقے سے اسے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات بھر آپریشن کے بعد گولیاں اس کے پیٹ سے نکالی گئیں۔ ساتھ ہی انھیں اس کا ابارشن بھی کرنا پڑا۔ پوری کوشش کی جا رہی تھی کہ یہ خبر اخبار میں نہ لگے۔ صحافیوں کو ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی تو ملک منصور نے جو طوفان برپا کرنا تھا، اس کا سامنا کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ وہ بستر پر لاوارثوں کی طرح پڑی تھی۔ اس کے گھر اطلاع دینا گویا ملک منصور کو مزید مشتعل کرنا تھا۔ اس کی جان کو اب بھی اس سے خطرہ تھا۔ جو شخص خود اسے بے دردی سے قتل کر کے پھینک گیا ہو، دوبارہ اس کے زندہ ہونے کا سن کر غصے سے پاگل ہونا یقینی تھا۔ مگر اس کے پاس بھی کسی کا ہونا بہت ضروری تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو نرس نے کسی کو بلانے کے لیے اس سے ایڈریس مانگا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کون ہوگا جو اس وقت اس کے پاس آئے گا۔ شزا سے اس کے تعلقات ایسے نہ تھے کہ وہ اس مشکل وقت میں اس کا ساتھ دیتی۔ ملک منصور کو تو بلانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور آفاق......نہیں......سحر...... ہوسکتا ہے سحر آ جائے۔ اس نے بہت سوچنے کے بعد سحر کو بلانے کو کہا اور اس کا موبائل نمبر لکھ کر دیا۔

آفاق رات بھر گھر نہیں آیا تھا اور وہ سخت غصے میں رات بھر نہیں سوئی تھی۔

وہ کہاں تھا اور کس کے ساتھ تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس سے بھرپور جھگڑے کے موڈ میں تھی۔ ایک طرف لیڈیز سے ہارنے کا قلق تھا تو دوسری طرف آفاق کی بے وفائی جو شاید اس کے خون میں شامل تھی۔ وہ بار بار اپنے آپ کو سمجھاتی۔ ایک دن تو ایسا ہونا تھا۔ وہ کب تک اس کے بنجر وجود کو برداشت کر سکتا تھا لیکن نہ جانے اندر ہی اندر کسی شے کے ٹوٹنے کا اسے شدید صدمہ ہوا تھا۔ شاید ایسے میاں بیوی میں جو نام نہاد رشتہ ہوتا ہے، اس کے ٹوٹنے کا دکھ تھا یا پھر اپنی ذات کی نفی تھی۔ دوسری عورت جب پہلی کی جگہ لیتی ہے تو پہلی اپنے آپ کو کس قدر کمتر اور بے وقعت سمجھتی ہے۔ شاید یہ سوچ کر اسے اس بے قدری کا دکھ تھا مگر کچھ ایسی چیز تھی جو اندر ہی اندر اسے چیر رہی تھی۔ وہ لاکھ اپنے آپ کو تسلیاں دیتی۔ اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کرتی مگر آفاق اور اس لڑکی کا قہقہے لگاتا چہرہ اس کے سامنے گھوم جاتا۔ آفاق کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسرت نے اسے ایک لمحے کے لیے

چونکا دیا تھا۔ اس نے شادی سے اب تک ایسی خوشی کبھی بھی آفاق کے چہرے پر نہ دیکھی تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ اس لڑکی کو دل سے پسند کرتا ہے۔ اس کی صحبت اس کے لیے خوشی کا باعث ہے، اسے اپنا آپ سڑاند زدہ اور بدبودار لگا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے قیمتی پرفیومز، باڈی اسپرے، اس نے اٹھا اٹھا کر زمین پر مارنے شروع کر دیے۔ وہ اپنے اندر کے غم و غصّے کا اظہار اسی طرح کرتی تھی۔ جب کسی پر بس نہ چل رہا ہو تو بے جان چیزیں انسان کے زیر عتاب آ کر اپنے وجود کی اہمیّت کو خود بھی منوا لیتی ہیں۔ اس نے آفاق کو موبائل پر کانٹیکٹ کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر وہ آف تھا۔ اس کا مطلب تھا آج وہ اس لڑکی کے ساتھ تھا۔ صبح ہو چکی تھی مگر وہ نہیں آیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دور پھینکا۔

''اسی لمحے اس پر بیل ہونے لگی۔ اس نے اٹھا کر نمبر دیکھا مگر سمجھ نہ آیا۔ اس نے ہیلو کہا۔ فون اسپتال سے تھا۔ نرس نے اسے شفق کے بارے میں بتایا اور وہ آنے کو کہہ رہی تھی۔

اگلے لمحے وہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ شفق کو کسی نے گولیاں ماری تھیں۔ شاید ان لوگوں نے، جن کے ساتھ وہ اٹھتی بیٹھتی تھی اور اس رات...... وہ جلدی سے اسپتال پہنچی۔ شفق بستر پر بالکل لاوارثوں کی طرح پڑی تھی۔

''شفق، تمھیں یہ کیا ہوا...... اور کس نے کیا؟'' وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''پاپا نے......'' شفق بمشکل بولی۔

''کیا...... مگر کیوں؟'' وہ انتہائی حیران ہو رہی تھی۔

''سحر، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پاپا اس حد تک ظالم ہو جائیں گے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

''مگر انھوں نے یہ سب کیوں کیا؟''

''کیونکہ میں نے سہیل کو بچانے کے لیے سچ بولنا چاہا۔ سحر، عابد اور زویا کو میں نے قتل کیا ہے مگر پاپا نے سہیل کو مجبور کیا ہے کہ وہ الزام اپنے سر لے لے کیونکہ میں ان کے الیکشنز کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکی ہوں۔ ان کو بس اپنا عہدہ اور شان و شوکت عزیز ہے۔ نہ ان کو اولاد سے محبت ہے اور نہ ہی کسی اور سے۔ وہ کسی سے بھی مخلص نہیں۔ بچپن میں، میں انھیں بہت عزیز تھی مگر اب ہم سب ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ہم کیسے حقیر لوگ ہیں۔ ہمیں کوئی بھی نہیں چاہتا۔ نہ ہمارے حصّے میں محبت آئی، نہ شفقت۔ نہ خلوص، نہ ہمدردی

اور نہ ہی پیار۔ یہ دو دن جو میں نے اسپتال میں گزارے ہیں، میں نے اپنے آپ سے بڑھ کر اس وارڈ میں کسی کو اتنا بے آسرا اور لاوارث نہیں سمجھا۔ کوئی ایک بھی تو میرے پاس نہیں آیا......'' وہ چھت کو دیکھ رہی تھی اور آنسو اس کے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

''معلوم نہیں...... اس گھر پر کس کی نحوست ہے یا کسی کی بددعا ہے۔ کوئی بھی تو کسی کا نہیں...... نہ اولاد ماں باپ کی، نہ شوہر بیوی کا، نہ بھائی بہن کا، سب کیسی منتشر اور آوارہ زندگیاں گزار رہے ہیں۔'' سحر دکھ سے بولی۔

''میں تمہاری مشکور ہوں کہ تم آ گئیں، اگر تم بھی نہ آتیں تو......''

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں تمھارے پاس ہی رہوں گی۔''

''سحر، میں ٹھیک ہونے کے بعد کہاں جاؤں گی...... پاپا نہ تو مجھے گھر میں گھسنے دیں گے اور نہ ہی زندہ چھوڑیں گے۔'' وہ سخت فکرمندی سے بولی۔

''تم فکر نہ کرو، کوئی نہ کوئی راستہ تو نکل ہی آئے گا۔'' اس نے اسے دلاسا دیا مگر خود اس کا دل کس قدر افسردہ تھا، یہ وہی جانتی تھی۔ وہ باتیں شفق سے کر رہی تھی مگر ذہن میں آفاق تھا اور وہ لڑکی؟ سحر سن تو شفق کو رہی تھی مگر قہقہے ان کے سن رہی تھی۔ اس کا ذہن دونوں صورتوں سے دوچار تھا۔

''محبت بہت بے معنی شے ہے...... اور بہت بے وقعت......'' بار بار یہی جملہ اس کے دل کے نہاں خانوں سے اٹھتا اور اس کے دل و دماغ میں گونجنے لگتا۔ وہ سرد سی آہ بھر کر شفق کو دیکھتی رہی جو اب میڈیسنز کھا کر سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ شفق کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ واقعی، شفق اسپتال کے بعد کہاں جائے گی۔ ملک منصور کیسا باپ تھا، اپنے مستقبل کے لیے اپنے اولاد کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کیا تھا۔ کیا اب وہ اسے کسی قسم کا تحفظ دے سکے گا، کبھی نہیں بلکہ اس سے کوئی بھی امید وابستہ کرنا حماقت ہوگی اور خود اس کا باپ، اس نے کیسے جلدی جلدی میں اس کے بدلے میں نوٹ کھرے کیے تھے۔ اولاد، رشتے، ناتے، محبت سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے بھی دوبارہ مڑ کر انھیں نہیں دیکھا تھا، جنھیں پیسوں سے محبت، اولاد سے بڑھ کر تھی۔ رشتوں کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ اور اب جیسے جیسے وہ ماڈرن سوسائٹی کی ایک سرگرم رکن بن رہی تھی، مزید تلخ حقیقتیں کھل کر سامنے آ رہی تھیں۔ ہم سب کس طرف جا رہے ہیں؟ کس کو کس کی تلاش ہے۔ سب دوڑ رہے ہیں، بھاگ

رہے ہیں۔مگر کوئی کسی کے لیے ٹھہر نہیں رہا...... گھر بکھر رہے ہیں، معاشرہ ٹوٹ رہا ہے اور انسان منتشر ہو رہا ہے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو دوسرے سے برتر ثابت کرنے کی تگ و دو میں آخری حد تک دور نکل گیا ہے۔ وہ بھی سوچ رہی تھی، کوئی ایسا ٹھکانا......مگر دور دور تک کہیں بھی کوئی منزل نظر نہیں آ رہی تھی۔ سب کچھ اب قسمت پر تھا، وہ جہاں اسے لے جائے۔

آٹھ دس دن میں وہ کافی حد تک بہتر ہو چکی تھی۔ ایس ایچ او بار بار چکر لگا رہا تھا۔ اس کے نزدیک ابھی وہ ایک قیمتی مہرہ تھی جسے وقت آنے پر ملک منصور کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔ گو کہ اس کا بیان ابھی تک قلمبند نہیں ہوا تھا اور سحر نے ہی کسی طرح اسے بتایا تھا کہ سہیل کو عمر قید کی سزا ہوئی ہے۔ ملک منصور نے چوٹی کا وکیل کر رکھا تھا اور یہ سب اسی کا کمال تھا۔ شفق کو سن کر بہت دکھ ہوا۔

''میں اس کے خلاف احتجاج کروں گی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''شفق، بے وقوفی مت کرو۔ تم بستر پر ہو۔ اسپتال میں ہو، کیا تم نہیں جانتیں کہ تمھارے باپ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ بہتر ہے کہ تم یہ بھی سوچ لو کہ وہ آئندہ تمھارے ساتھ کیا کر سکتا ہے؟ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا لیکن پہلے یہ تو سوچو کہ جانا کہاں ہے اور اس تھانے دار سے بھی جان چھڑاؤ۔''

''سحر کسی طرح اس شخص کا پتا کرواؤ۔ یہ میرے نانا کے بیٹے ہیں۔ انکل حیدر یہ بھی منسٹر تھے۔ ان کا کانٹیکٹ نمبر کہیں سے لو...... ہو سکتا ہے یہ میری کچھ مدد کر سکیں۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ صرف یہی ایک شخص ہے جو میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ ہم سے بہت محبت کرتے تھے۔ اب تو عرصہ ہوا ہے ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ معلوم نہیں اب کیسا سلوک کریں مگر تم ان سے رابطہ ضرور کرنا۔'' وہ بہت سوچنے کے بعد بولی۔

''کہیں یہ شہلا حیدر کے والد تو نہیں......؟'' سحر نے ذہن پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''کک...... کک...... کون شہلا؟'' وہ ہڑبڑا گئی۔

''مس شہلا حیدر!...... بڑی ایکٹو، گریس فل سوشل ورکر ہے...... ہر جگہ باپ کے ساتھ وہی جاتی ہے اور ہماری کلب کی میٹنگز میں اکثر آتی ہے۔ سوسائٹی میں اس کا بڑا نام ہے۔ تمھیں کبھی ملواؤں گی۔''

''شاید...... وہی ہو'' اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ اس نام پر جیسے اس کی سوچیں اتھل پتھل ہو گئی تھیں۔ بہت سی یادیں اس کے ذہن کو جھنجوڑنے لگی تھیں۔ وہ جس نام

سے الرجک تھی۔ شاید وہی اس شخص کی بیٹی کا نام تھا۔ اسے ماں اور حیدر کے تعلق کا اندازہ تو تھا کیونکہ ملک منصور اکثر غصّے میں انھیں جب ماں کے طعنے دیا کرتا تھا تو حیدر کی ذات کو بھی اس میں لپیٹ لیتا تھا۔ وہ یہ نام سن کر مضطرب ہوگئی۔ کوئی شے اندر ہی اندر تنگ کرنے لگی۔

''میں کنفرم کر کے ان سے رابطہ کروں گی بلکہ نمبر لے آؤں گی، تم خود ہی بات کر لینا......'' سحر اٹھتے ہوئے بولی۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''میں ذرا گھر جا رہی ہوں۔ آفاق کی بھی...... خیر چھوڑو، تمھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''نہیں...... کچھ نہیں چاہیے۔''

''میں ایک دو گھنٹے تک آ جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔''

شام ہو رہی تھی، جب وہ گھر پہنچی، آفاق کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ یہ وقت آفاق کے آنے کا تو نہیں تھا وہ کیسے اس وقت آ گیا تھا۔ وہ قدرے حیرانی میں اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی۔ آفاق اوندھے منہ سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے حد تھکاوٹ کے آثار تھے۔ وہ خاموشی سے باہر آ گئی اور خانساماں کو شفق کے لیے سوپ بنانے کو کہا اور خود چائے کا کپ لے کر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آفاق سے کس طرح بات کرے۔ اسی لمحے شزا اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ شزا کی ناپسندیدگی کا یہی اظہار ہوتا تھا۔ وہ تو پہلے دن سے اس کو سخت ناپسند کرتی تھی اور ہمیشہ اسے دیکھ کر ایسا منہ بناتی تھی جیسے کوئی گندی سی سڑاند زدہ چیز کو دیکھ کر منہ بناتا ہے۔ سحر کو ہمیشہ اس کا رویہ برا لگتا تھا مگر وہ کچھ کہتی نہیں تھی۔ وہ کچن میں گئی اور واپس آ کر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''تم آفاق پر ذرا کنٹرول رکھو۔ آج کل وہ بہت اوور ہو رہا ہے۔'' شزا منہ دوسری طرف کر کے روکھے انداز میں بولی۔

وہ اس کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے چائے پینے میں مصروف رہی۔

''میں تم سے کہہ رہی ہوں......'' وہ قدرے جھنجلا کر بولی۔

''اس گھر میں کیا کوئی کسی کو کنٹرول کر سکتا ہے؟'' اس کے اس جملے پر شزا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم پوچھو گی نہیں کہ وہ آج کل کیا کرتا پھر رہا ہے؟''

''یہ اس گھر کی روایت ہی نہیں کہ کوئی دوسرے سے کچھ پوچھے......''

''تم ہر بات کا الٹا جواب کیوں دیتی ہو؟'' شزا اسے غصے سے گھورتے ہوئے بولی۔

''آپ بے معنی اور فضول باتیں جو کر رہی ہیں......''

''شٹ اپ...... میں بے معنی باتیں یعنی کہ بکواس کر رہی ہوں اور تم بھکارن عقلمند بن بیٹھی ہو؟''

''کیوں بھکاریوں کے دماغ نہیں ہوتے یا پھر ان کے دل و دماغ بھی آپ جیسے شوپیس میں ڈال دیے جاتے ہیں......'' اس نے بھی برابر کی چوٹ کی۔

''تم بہت بدتمیز ہو...... نان سینس......! بات سمجھ نہیں رہی......اور الٹا بکواس کیے جا رہی ہو۔'' شزا غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

''میں سب جانتی ہوں آفاق کیا کر رہا ہے۔ کس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟ کیا آپ اپنے شوہر کو آج تک ان کاموں سے منع کر سکی ہیں، جو میں کروں؟ آفاق بھی وہی کرے گا جو ملک منصور کرتا آیا ہے...... نہ آپ کچھ کر سکیں اور نہ میں اسے روک سکوں گی۔ ہم دونوں ایک سی ہیں...... نہ آپ کا حسن اور خوبصورتی انھیں کسی کام سے روک سکا اور نہ میری محبت......اس لیے یہ گفتگو ہی فضول ہے۔'' وہ کہتی ہوئی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور شزا اپنی جگہ پر تلملانے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے برابر گنوایا تھا اور دونوں اب ایک ہی جگہ کھڑی تھیں۔ اس کا حسن کتنا ارزاں تھا، ملک منصور اس سے کمتر لڑکیوں کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ ان کے لیے اس کو نظر انداز کرتا تھا۔ واقعی اس کی بات میں سچائی تھی۔ وہ غصے میں بیٹھی ناخن چبا رہی تھی۔ اس کے اندر جیسے آتش فشاں کھول رہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختی گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل گئی۔

سحر فون پر مسز عبید سے مس شہلا حیدر کا فون نمبر لے رہی تھی، جب آفاق کی آنکھ کھل گئی۔

''تم آہستہ بکواس نہیں کر سکتیں...... دیکھ نہیں رہیں، میں سو رہا ہوں۔'' اس نے چلاتے ہوئے تکیہ اس کی طرف پھینکا۔ اس نے تکیہ پکڑ کر پاس رکھ لیا اور مس شہلا حیدر کا نمبر لکھنے لگی۔ فون بند کرنے کے بعد اسنے تکیہ زور سے اس کی طرف پھینکا۔

''یہ سونے کا وقت نہیں...... جو سونے کا وقت ہوتا ہے، تم آوارہ لڑکیوں کے ساتھ

رات بھر گھومنے پھرنے میں صرف کرتے ہو۔'' وہ غصّے سے چلائی۔

''تم سے مطلب...... جب تم کسی قابل نہیں رہیں تو پھر میں جو چاہے کروں......''

''کیا...... کیا...... کیا کہا تم نے...... میں کسی قابل نہیں رہی۔ یوں کہو تم نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا......'' وہ آفاق کا گریبان جھنجوڑتے ہوئے بولی۔

''تمہاری یہ جرأت!'' اس نے گریبان چھڑاتے ہوئے دو تین تھپڑ اسے لگائے۔

''تمھارے ان تھپڑوں کا مجھ پر اب کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ زبان سے بات کرو۔'' اس نے اسے دھکا دیتے ہوئے بیڈ پر گرایا اور خود بھی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''تم دفع ہو جاؤ کمرے سے......!'' آفاق غصّے سے بولا۔

''وہ تو میں ہو ہی جاؤں گی...... مگر وہ کون ہے جس کے ساتھ تم بہت خوش تھے۔ تمھارے قہقہے اور تمہاری خوشی ابھی تک مجھے یاد ہے۔''

''تم سے مطلب......! وہ جو کوئی بھی ہے۔''

''مجھے نہیں...... تمہاری ماں شزا کو ہے...... وہ آج مجھ سے شکایت کر رہی تھی۔''

''ان کو کیا تکلیف ہے؟''

''انہی سے پوچھو۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں...... اور نہ ہی میں کسی کو جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر ماہ رخ ان کی سیکرٹری کی بہن ہے تو میں کیا کروں؟ اس میں ان کا کیا جاتا ہے۔ روکنا ہے تو ماہ رخ کو روکیں...... انھوں نے تو اسے پاپا کی نگرانی کے لیے رکھوایا تھا۔ اب فیکٹری میں، میں چلا گیا تو ماہ رخ سمیت ان سب کو خطرہ پڑ گیا ہے۔ ٹھیک ہے، میں کل ہی ماہ رخ کو نکال دیتا ہوں۔''

''مجھے نہیں پتا...... تم لوگوں کے گندے گیمز کا...... ہر وقت ایک دوسرے کو کمتر ثابت کرتے رہتے ہو۔''

''تم اپنے کام سے کام رکھا کرو...... نہ کسی کی بات میں دخل دو اور نہ ہی کسی کو یوں تنگ کرنے کی ضرورت ہے۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''کیا تمھیں بھی......؟''

''ہاں...... مجھے بھی......''

''آفاق، تمھیں معلوم ہے نا کہ تم میرے لیے......'' وہ ایک دم محبت بھرے لہجے

میں بولی۔

''سب بکواس ہے...... یہاں کسی کو کسی سے کوئی محبت وحبت نہیں...... سب ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ...... سب کا کوئی نہ کوئی مفاد ہے۔ خود غرض ہیں سب...... مطلب پرست...... ہوس کے مارے ہوئے لالچی انسان۔'' وہ غصّے میں بے قابو ہو رہا تھا۔

''لیکن آفاق، مجھے تو تم سے بہت محبت ہے۔''

''ہونہہ...... محبت...... چھوڑو اس فضول بکواس کو اور جاؤ، میرے لیے چائے لے کر آؤ۔'' ایک دم اس کا موڈ بدل چکا تھا۔

''اچھا......'' وہ اپنا چہرہ اور بال درست کرتی ہوئی باہر آ گئی اور چائے خانساماں سے بنوا کر اس کے لیے لے کر آئی۔ وہ بستر پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

''آفاق...... ایک بات کہوں؟''

''ہاں......''

''تم نے مجھے بہت دکھ دیے ہیں مگر...... مگر ایک بات نہ کرنا'' وہ پیار سے بولی۔

''کیا......؟''

''دوسری...... شادی نہ کرنا...... بے شک تم لڑکیوں کے ساتھ گھومو پھرو مگر گھر میں کسی کو نہ لانا۔''

''تمھیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟''

''پڑتا ہے...... یہی تو فرق پڑتا ہے...... بس تم وعدہ کرو......''

''کیوں...... کیوں، میں وعدہ کروں اور اگر تم ہی دوسری شادی کر لیتی ہو......''

''وہاٹ نان سینس...... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' اس نے غصّے سے جواب دیا۔

''تم عورتیں بہت ناقابل اعتبار ہوتی ہو۔''

''تم مرد بھی کسی سے کم نہیں ہوتے۔''

''مرد تو ایک کو تباہ کرتا ہے تم تو خاندانوں اور نسلوں کو برباد کرتی ہو۔''

''اس ایک کے بھی بہت سے رشتے ہوتے ہیں اور ہر عورت کو بہکانے والے بھی تو تم مرد ہی ہوتے ہو۔''

''تم بہت بحث کرنے لگی ہو۔''

''سب کچھ میں نے یہاں آ کر سیکھا ہے...... چالاکیاں...... مکاریاں اور

عیاریاں......"

"اور جہاں سے تم آئی ہو وہاں تو تم بڑی پاک صاف تھیں نا! میں سب جانتا ہوں، ایک ایک کے چار چار چھ چھ......" وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"بکواس نہیں چلے گی آفاق! تم جانتے ہو، میں یہ سب نہیں سن سکتی۔"

"اور میں بھی نہیں سن سکتا۔" اس نے گرم گرم چائے کا کپ اس کی طرف پھینکا۔ کپ اس کے ہاتھ سے ٹکرا کر گھٹنے سے ٹکراتا ہوا پاؤں پر گرا۔ گرم چائے سے اس کا پاؤں اور گھٹنا بھی جل گیا۔

"تم بہت ظالم ہو......" وہ غصے میں بولی۔

"وہ تو ہم ہیں......" ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر اس نے بالوں کو ٹھیک کیا اور پرفیوم لگاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اب مارکٹائی کے بعد وہ آرام سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔ اس سے قبل وہ ہمیشہ اس کی مرہم پٹی کیا کرتا تھا۔ اس کو مار کر خود ہی خوف زدہ ہو جایا کرتا تھا مگر اب وہ ان تمام باتوں اور احساسات سے عاری ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ بے پروا ہوتا جا رہا تھا، اس کے اندر کی سفاکی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ بڑی سے بڑی بات کی پروا کیے بغیر وہ آرام سے باہر نکل جاتا تھا۔

***

شفق اس کی منتظر تھی۔ رات گہری ہو رہی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے لیے سوپ اور پھل وغیرہ لے کر آئی۔

"سحر! اتنی دیر......؟"

"ہاں......بس آفاق سے جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"تم لوگ اتنا جھگڑتے کیوں ہو؟"

"مجھے کیا معلوم......اس کے اندر نہ جانے کون سا درد ہے۔ کیا زہر ہے کہ بس وہ ہر وقت محاذ ہی کھولے رکھتا ہے۔ شفق! ویسے تم لوگ بہت عجیب لوگ ہو...... میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اسے میری اس کمزوری کا علم ہے، اس لیے وہ ہر وقت...... اچھا چھوڑو...... یہ سوپ پی لو۔"

"اسے چھوڑو...... یہ بتاؤ، تم نمبر لائی ہو؟"

"ہاں، یہ لو بات کرو۔" اس نے موبائل پر نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

''ہیلو...... جی حیدر صاحب سے بات کرنی ہے۔'' اس نے لرزتے ہاتھوں سے موبائل کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں شفق بول رہی ہوں...... بہت ضروری کام ہے۔'' تھینک یو...... اس نے موبائل فون بند کر دیا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟'' سحر نے حیرت سے پوچھا۔

''شہلا حیدر تھی...... بہت غصّے میں بول رہی تھی پھر کہنے لگی کہ وہ اس وقت میٹنگ میں ہیں، ایک گھنٹا ٹھہر کر ان کے موبائل پر کر لیں۔ ان کا موبائل نمبر اس نے دے دیا ہے۔ لیکن سحر، تم تو اس کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں۔''

''ہاں...... شفق، معلوم نہیں وہ کیوں ایسے بولی ہے ورنہ وہ تو بہت نائس مشہور ہے میں خود اس سے ملی ہوں۔ ہوسکتا ہے اس وقت وہ بھی بزی ہو......''

''ہاں، ہوسکتا ہے......'' وہ آہستہ سے بولی، اسے امید ٹوٹتی نظر آئی۔ اگر حیدر انکل بھی اس کی طرح بولے تو وہ پھر کہاں جائے گی۔ ہر طرف اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''سحر...... آفاق نے میرے بارے میں پوچھا؟'' شفق نے پُر امید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں...... کیا اس گھر میں کوئی دوسرے کے بارے میں پوچھتا ہے؟ سب اپنی اپنی زندگیوں میں کھوئے رہتے ہیں اور شاید اپنے آپ سے بھی محبت نہیں کرتے۔ شفق مجھے تو کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ سب بہت کھوکھلے لوگ ہیں۔ بس کبھی کبھی کھوکھلے ڈبوں کی طرح کھنکتے ہیں پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں۔ ہم سب لوگ کیسی زندگی جی رہے ہیں۔ نہ کسی کو کسی کے دکھ درد کی پروا ہے اور نہ کسی کی خوشی کی۔ اپنی اپنی زندگی ہے جیسے چاہو جیو اور مر جاؤ۔ مجھے تو یوں لگتا ہے اگر اس گھر میں کوئی مر جائے تو یہاں رونے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ بے حد افسردگی سے بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو...... گھر تو ماں باپ سے بنتے ہیں۔ جب دونوں ہی اولاد کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑیں تو ان پر نہ قدرت رحم کرتی ہے نہ دوسرے انسان مہربانی۔ یوں جیسے کسی درخت کے آوارہ پتے اِدھر اُدھر تنہا پھرتے رہتے ہیں اور پھر کہاں گم ہو جاتے ہیں، کون جانتا ہے......'' شفق اداسی سے بولی۔

''شفق، تم لوگوں کی ماں نے بچوں کو کیوں چھوڑا؟''

''معلوم نہیں۔'' وہ سحر کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے چونکنے کے ساتھ ساتھ خاموش بھی ہوگئی۔

''آفاق کسی نہ کسی طرح اپنی ماں کا ذکر کر ہی لیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اسے ماں سے بہت محبّت تھی۔ شاید یہ سارا درد، یہ زہر اس کے اندر انہی کی وجہ سے ہے۔''

''کیا اس نے تم سے کبھی کچھ کہا......؟''

''اکثر بے وفائی، بے اعتباری عورت سے منسوب کرتا ہے اور ایسی باتیں کرتا ہوا کہیں کھوسا جاتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو بے چینی اور بے بسی ہوتی ہے، وہ میں تمھیں نہیں بتا سکتی۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''ہاں...... ہماری ماں بہت اچھی تھی اور ہم سے بہت محبت بھی کرتی تھی پھر نہ جانے کیا ہوا...... اس نے ہمیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور ہم بکھر گئے۔ تب سے ہم منتشر ہی تو ہیں...... ہم پل بڑھ کر جوان تو ہو گئے مگر اندر سے ہم خالی، سوکھے ہوئے، بنجر انسان ہیں۔''

''ملک منصور جیسے شخص کو چھوڑا ہی جا سکتا ہے......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''لیکن شزا آنٹی بھی تو ہیں نا...... وہ بھی تو سب کچھ برداشت کر رہی ہیں؟'' مما بھی کر سکتی تھیں۔'' اس کے لہجے میں بلا کا تاسف تھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تو وہی جانتی ہوں گی مگر ہم عورتیں کیسے کیسے ان مردوں کے ہاتھوں ذلیل ہو رہی ہیں۔ چلو دفع کرو، اس بکواس کو۔ ہاں تم بات کرو، اس شخص سے۔'' اس نے موبائل پر نمبر ملا کر اسے تھما دیا۔

''ہیلو، حیدر صاحب سے بات کرنی ہے......'' شفق قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جی بول رہا ہوں......'' وہ بھاری رعب دار آواز میں بولے۔

''انکل، میں شفق بات کر رہی ہوں۔''

''کون شفق......!''

''ملک منصور کی بیٹی......!''

''اوہ...... تم......'' جیسے وہ بری طرح چونک سے گئے ہو۔

''انکل، مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ میں اسپتال سے بات کر رہی

ہوں۔ آپ کل اسپتال آ سکتے ہیں۔'' اس نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہے...... میں کل کسی وقت چکر لگاؤں گا۔'' وہ قدرے سوچتے ہوئے بولے۔

''تھینک یو انکل!'' اس نے اسپتال کا ایڈریس وغیرہ بتا کر خوشی خوشی فون بند کر دیا۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' سحر نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہ کل آئیں گے...... سحر، وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے۔''

''خدا کرے...... ورنہ اب ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں میں تمھیں چھپا سکوں؟'' سحر فکر مندی سے بولی۔

شفق مطمئن تھی اور پُرامید بھی۔

اگلے دن سہ پہر کو حیدر آیا، شفق اس وقت سو رہی تھی۔ اور سحر واک مین لگائے کچھ سن رہی تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ ناک کیا اور شفق کے بارے میں پوچھا۔

''آپ آ جائیں...... آپ کا انتظار کرتے کرتے وہ سوئی ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔'' اس نے حیدر کو کرسی دیتے ہوئے کہا۔ حیدر نے قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر بیڈ پر سوئی شفق کو وہ ہو بہو ماں جیسی لگ رہی تھی۔

وہ کافی حد تک شہلا سے مشابہہ تھی۔ سحر نے اسے جھنجوڑ کر اٹھایا۔

''شفق اٹھو! دیکھو کون آیا ہے؟''

''کون......؟'' اس نے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''حیدر......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''اوہ آئی ایم سوری انکل! میری آنکھ لگ گئی تھی۔''

''کیسی ہیں آپ......؟ اور یہ سب کیا ہے؟'' حیدر نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''انکل، میں نے بہت مجبوری میں زحمت دی ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں صرف آپ ہی میرے لیے امید کی کرن ہیں...... مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے......؟''

''کیسی مدد......؟'' حیدر نے چونک کر پوچھا۔

''انکل، مجھے سر چھپانے کے لیے ٹھکانا چاہیے۔ میرے پاس اس وقت کوئی ایسی چھت نہیں جس کے سائے تلے میں چند دنوں کے لیے پناہ لے سکوں۔''

''کیوں...... آپ کا گھر اور آپ کے والد تو......؟''

''انکل پلیز...... ان کے کان میں تو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔''

''کیوں؟'' حیدر نے حیرت سے پوچھا۔شفق نے ساری بات اسے بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

''ٹھیک ہے...... آپ ہماری گاؤں والی حویلی میں ٹھہر سکتی ہیں۔ میں کل ڈرائیور بھیج دوں گا اور تھانے میں بھی بات کرلوں گا، آپ بے فکر رہیں۔''

''انکل، بہت شکریہ...... اس وقت میں بالکل بے آسرا ہوں۔ آپ کا خیال آیا تو امید سی بندھی۔ سوچتی تھی نہ جانے آپ بھی......'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ مسئلے اور اس کے حل کے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔'' حیدر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور خاموشی سے نکل گیا۔

''وہاٹ آ گریس فل مین......'' سحر اک ادا سے بولی۔

''ہاں، حیدر انکل بہت نائس ہیں۔''

''ہاں، اور تمھارے گھر کے مردوں سے بہت مختلف بھی...... پہلی دفعہ کوئی بندے کا پتر لگا ہے۔'' سحر اپنے مخصوص پرانے اسٹائل میں بولی۔

''شفق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھپکائیں۔ اسے قطعی سمجھ نہ آیا کہ وہ کس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

''میں تم سے ملنے وہاں آیا کروں گی...... اور تمھارے ان انکل سے بھی۔''

''کیا مطلب......؟''

''بھئی اچھے لگے ہیں......'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''پلیز، کسی کو کچھ مت بتانا......''

''ٹھیک ہے، نہیں بتاؤں گی، مجھ پر بھروسا رکھو۔ البتہ تمھارے باپ کی سی آئی ڈی بہت ایکٹو ہے۔ ان کی ذمے داری میں نہیں لیتی۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

''شکر ہے کوئی ٹھکانا تو ملا۔'' شفق نے سکھ کا سانس لیا۔

''خوش قسمت ہو کہ کوئی آسرا تو بنا۔ میری طرف دیکھو، کہیں جانا بھی چاہوں تو نہ کوئی منزل ہے، نہ راستہ۔ میرے تو راستوں کے آثار ہی مٹ گئے ہیں۔''

''تم کل میرے کچھ کپڑے اور ضروری سامان بیگ میں ڈال کر لے آنا...... اور سنو، بہت بہت شکریہ، تم نے میری بہت مدد کی۔'' شفق نے اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر کہا۔

''شکر ہے، کسی کے کام تو آئی...... ورنہ..... خیر، چھوڑو...... میں تم سے ملنے آتی رہوں گی اور کل میں تمہارا سامان لے آؤں گی۔''

''ٹھیک ہے......'' وہ مطمئن ہو کر لیٹ گئی۔

پوری رات آفاق پھر گھر نہیں آیا...... اسے معلوم تھا، وہ کہاں ہوگا؟ اس لیے وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ جو شخص خود اپنی کارستانیوں کا اقرار کر لے تو اس سے مزید کچھ اگلوانا حماقت ہے۔ اور ایسے منہ زور گھوڑے کو روکنا مزید حماقت جب کہ وہ سرپٹ بھاگ رہا ہو۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں۔ چند دنوں کے بعد وہ خود لوٹ آئے گا۔ نہ شہزا گھر پر تھی نہ ملک منصور۔ خانساماں اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا اور چوکیدار باہر پہرہ دے رہا تھا۔ کئی دنوں سے وہ کلب بھی نہیں جا سکی تھی۔ اس نے مسز زبیر کا نمبر ملایا۔ مسز زبیر لگائی بجھائی کرنے میں شاطر کھلاڑی سمجھی جاتی تھی۔ ہر اندر کی بات کی خبر سب سے پہلے انھیں ہوتی تھی۔ گھریلو سیاست سے لے کر ملکی سیاست تک تمام جوڑ توڑ کے علاوہ سب مہروں کی چالیں ان کی نظر میں ہوتی تھیں۔ پچاس ہزار کے ڈوبنے کا دکھ تو اپنی جگہ پر تھا۔ مگر مسز زبیر سے بگاڑنا گویا سوسائٹی میں اپنے آپ کو ذلیل کرنے کے مترادف تھا۔ اس وقت اس کی فون کال کا مقصد کچھ اور تھا۔

''مسز زبیر، سنائیے، کلب ہمارے بغیر کیسا جا رہا ہے؟'' وہ اک ادا سے بولی۔

''بھئی کلب کی رونقیں تو آپ جیسے لوگوں سے ہیں۔ یار، تم نے آنا کیا بند کیا ہے، ہر طرف اداسی سی چھا گئی ہے۔ آپ جیسے روحِ رواں ہوں تو محفلوں کو چار چاند لگتے ہیں اور یہ چاند اتنے دنوں سے کلب میں جلوہ افروز نہیں ہوا اس لیے تاریکی ہی تاریکی ہے۔'' مسز زبیر اپنے مخصوص چاپلوس اسٹائل میں بولیں۔

''سچ، میں تو خود آپ کے کمنٹس اور قہقہوں کو ترس گئی ہوں۔ بس جلد ہی حاضر ہوں گی۔ بس مصروفیت ہی ایسی تھی۔ ہاں، یہ تو بتائیے شہلا حیدر آج کل کلب آ رہی ہے کہ نہیں...... مجھے اس سے کچھ کام تھا۔''

''نہیں، کافی دنوں سے نہیں آ رہی......شاید کچھ ڈسٹرب ہے؟''

''ڈسٹرب...... کس لیے......اور کیونکر؟'' وہ اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔

''کیوں......تم کیوں چونکیں؟''

''بھئی، ایسی اسٹرانگ پرسنالٹی کے بارے میں سن کر...... ویسے آپ کو کیا خبر ملی؟''

''یہی بات تو معلوم نہیں ہوسکی مگر لگتا ہے آج کل اس کی باپ سے کچھ ٹھنی ہے ورنہ پہلے تو ہر جگہ اکٹھے جاتے تھے۔ جاتے تو خیر اب بھی ہیں مگر کچھ تناؤ سا ہے۔''

''باپ کے ساتھ...... شوہر کے ساتھ ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

''بھئی اس کی باپ کے ساتھ زبردست اٹیچ منٹ ہے۔''

''کیوں، اس کے باپ میں کیا خاص بات ہے؟'' وہ اپنے اصل موضوع کی طرف آ رہی تھی۔

''اس کے باپ میں ہی تو بات ہے......'' مسز زبیر نے زبردست بے ہودہ سا قہقہہ لگایا اور اس قہقہے کے انداز میں ہی ساری بات چھپی ہوئی تھی۔

''خیریت تو ہے مسز زبیر...... مجھے تو آپ بڑی امپریس لگ رہی ہیں؟''

''ہائے ہائے، ہم تو بس ان کے متاثرین میں سے ہی رہ گئے ہیں۔ کوشش تو بہت کی مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتے...... تم نے ان کو دیکھا ہے جانو، کیا ڈیشنگ پرسنالٹی ہے...... اور اوپر سے مغرور بھی۔ کلب کی بہت خواتین نے ٹرائی ماری ہے مگر سب ناکام ہی ہوئیں۔ مس شہلا حیدر اسی بات پر تو اکڑتی ہے۔ ویسے ابھی تک باپ سے ناراضگی کی سمجھ نہیں آ رہی۔ خیر ہم بھی آرام سے کہاں بیٹھنے والے ہیں۔ بس اندر کی خبر پہنچی سمجھو...... بڑے لوگ چھوڑے ہوئے ہیں ان کے پیچھے یقین مانو، سیاست دانوں کی صف میں کھڑا وہ منفرد شخص ہر ایک کو بس تڑپاتا ہی ہے......'' مسز زبیر کی جیسے رال ٹپک رہی تھی۔

''بس بس مسز زبیر! زبیر صاحب نے سن لیا تو آپ کی شامت آ جائے گی۔''

''ارے، وہ اس قابل تو ہوں پہلے......'' مسز زبیر نے پھر قہقہہ لگایا۔

''کیا مطلب......؟''

''ارے اب اتنا بھی مت بنو...... بے وقوف...... اور چغد قسم کے شوہر بس بیوی بچوں کو پال لیں، یہی بڑا کام ہے۔ رومانس تو کہیں اور چلتا ہے۔ یار، تمھیں حیدر سے کہیں ملواؤں گی پھر دیکھنا...... اب میں چلتی ہوں۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔ میرا بیٹا بلا رہا ہے...... اوکے بائے، کلب میں ملیں گے۔''

اس نے بھی مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔ اس کا دل نہ جانے کیوں حیدر سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ اسے اپنی اس احمقانہ سوچ پر ہنسی بھی آ رہی تھی مگر وہ اس سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ سوچ خود بخود اس کی طرف چلی جاتی۔ اس کا ٹھہرا ٹھہرا لہجہ، باتوں میں سنجیدگی اور

شائستگی...... نظروں میں حیا اور شرافت۔ وہ کسی اعلیٰ خاندان سے معلوم ہوتا تھا۔

رات کے پچھلے پہر آفاق گھر لوٹا، وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی جوتے اتارے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بھی آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ اس کے تصور میں کبھی حیدر تھا، کبھی ملک منصور اور کبھی آفاق۔ وہ ان تینوں کا موازنہ کر رہی تھی۔ یہ دونوں اسے بہت حقیر اور سطحی مرد محسوس ہو رہے تھے۔ ملک منصور سے وہ شدید نفرت کرتی تھی اور آفاق سے شدید محبت مگر شاید حیدر کی وہ عزت کرنے لگی تھی۔ خود بخود اس کے لیے دل سے اچھے اور محترم جذبات نکل رہے تھے۔ واقعی، وہ شخص اس قابل ہے کہ اس کی بہت تعریف اور دل سے عزت کی جائے۔ میں ضرور اس سے کبھی ملوں گی۔ شفق خوش قسمت ہے کہ وہ ایسے شخص کے زیر سایہ رہنے جا رہی ہے۔

صبح وہ شفق کا سامان پیک کر کے کمرے میں لوٹی تو آفاق ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''کیوں...... تم ہوش میں آ گئے؟''

''اچھا بکواس نہیں کرو صبح صبح...... شفق کہاں ہے، بہت دنوں سے نظر نہیں آئی؟''

''واہ...... کیا کہنے بہن کی یاد آ ہی گئی۔ تف ہے تم جیسے بھائی پر اور تمہارے باپ پر بھی۔ تمہاری بہن اتنے دنوں سے گھر نہیں آئی اور تم ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تمہاری بلی کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہی۔ حد ہے تم لوگوں کی بے حسی کی......'' وہ بے حد زبان دراز اور منہ پھٹ ہو گئی تھی۔

''افوہ...... کیا بکواس شروع کر دی تم نے...... جاؤ دفع ہو جاؤ کمرے سے۔'' اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھا پلاسٹک کا گلدان اس کی طرف پھینکا۔ جسے اس نے فوراً کیچ کر لیا اور جواباً زور سے اس کی طرف پھینکا جو اس کے بازو پر لگا۔ وہ کراہ اٹھا۔ اس سے قبل کہ وہ بستر سے اٹھ کر اس کو تھپڑ رسید کرتا، وہ باہر جا چکی تھی۔ ''جاہل...... بھکارن......'' وہ بڑبڑاتا رہا۔

شفق اور وہ دونوں سامان پیک کیے منتظر تھیں شام کو حیدر کا ڈرائیور اسے لینے آ گیا۔ ''حیدر صاحب نے مجھے بھیجا ہے...... آپ میرے ساتھ چلیں۔'' ڈرائیور نظریں جھکائے بہت احترام سے بولا۔

''ہاں، میں بھی انتظار کر رہی تھی...... چلو......'' وہ دوپٹا گلے میں ڈالتے ہوئے بولی۔

’’بی بی، اس طرح...... میرا مطلب ہے آپ گاؤں میں بغیر چادر کے یا پردے کے نہیں جاسکتیں۔ شہلا بی بی بھی گاؤں جانے کے لیے چادر اوڑھتی ہیں۔ یہ اس علاقے کی روایت ہے۔‘‘ شفق اور سحر حیرانی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

’’ٹھیک ہے...... سحر بیگ میں سے مجھے کوئی بڑا دوپٹا نکال کر دو۔‘‘

سحر نے ایک کاٹن کے سوٹ کے ساتھ بڑا سا بلیک کلر کا دوپٹا نکال کر دیا جسے اس نے اچھی طرح اوڑھا اور سحر سے مل کر چل دی۔

’’یہ میرا موبائل تم رکھو۔‘‘ سحر نے اس کے بیگ میں اپنا موبائل رکھ دیا۔

’’تھینک یو سحر...... میں تم سے رابطہ رکھوں گی۔‘‘

’’میں تمھیں خود فون کیا کروں گی...... اپنا خیال رکھنا۔‘‘ وہ اس کے گلے ملتے ہوئے بولی۔

....

مسز پیٹر (شہلا) بے حد پریشان تھی۔ جب سے حیدر نے اسے موبائل بھیجا تھا۔ ایک کال کے بعد اس نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ بارہا اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی مگر جواب ندارد یا تو فون بند ملتا یا پھر بزی۔ وہ عجیب مخمصے میں تھی۔ حیدر نے اس دن بہت مایوسی میں اس سے بات کی تھی۔ وہ بیٹی کے بارے میں بھی پریشان تھا۔ دوسری جانب ولیم بھی لاہور آ کر بہت ڈسٹرب تھا۔ وہ بہت خاموش خاموش رہنے لگا تھا۔ لاہور آنے کے بعد وہ اکثر اس سے ملنے آتا یا وہ چلی جاتی مگر ولیم پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اس کا مخصوص لب و لہجہ، ہر بات میں بحث و مباحثہ، لمبی لمبی تمہیدیں...... ہر بات پر ایک نیا جوک، وہ قہقہے، وہ ہنسی، وہ شرارتیں سب نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ اور میچور ہو گیا تھا۔ شہلا کو یوں لگتا جیسے وہ ہر بات فارمل طریقے سے کر رہا ہو۔ ماں سے محبت اور شدت پسندی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ولیم شام کو اس سے ملنے آیا تھا۔ دونوں کافی دیر بیٹھے رہے۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ اس کی اسٹڈیز کا پوچھتی رہی اور وہ اس کے کالج کا۔ پھر نیگزامز پر باتیں ہوتی رہیں۔ مختلف موضوعات زیر بحث رہے مگر کوئی بھی ایسی بات نہ ہوئی جو دل کو ٹٹولتی جذبات کو چھوتی اور احساسات کو جھنجوڑتی۔ ان کا رشتہ سرد مہری کی نذر ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ اپنی گرفت کھو رہا تھا۔ دونوں اس بات کو محسوس کر رہے تھے اور دونوں ہی اس بات کو خوش قسمتی بھی نہیں سمجھ

رہے تھے۔ ولیم جا چکا تھا اور وہ بیٹھی سوچ رہی تھی۔

اس نے موبائل پر حیدر کا نمبر ملایا۔ وہ آج حیدر سے ولیم کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے سب کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ اس سے درخواست کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ اسے روکے، اسے مزید بھٹکنے سے بچائے۔ وہ جسے صراطِ مستقیم سمجھ رہا ہے، وہ تو کچھ اور ہے..... اور اگر کچھ ہو گیا تو اس کی ذمے دار وہ خود ہوگی۔

شہلا حیدر نے فون اٹھایا تھا۔

''مجھے حیدر صاحب سے بات کرنی ہے۔''

''آپ کون بول رہی ہیں؟'' وہ اس کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر مشکوک ہو گئی۔

''میں..... میں.....'' وہ خاموش ہو گئی۔

''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں..... میں آپ سے کہاں مل سکتی ہوں؟''

''جہاں آپ کہیں؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''نہیں، میں آپ سے خود آ کر ملنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، کل ہاسٹل آ جائیے۔''

''کیا..... آپ ورکنگ ویمن ہاسٹل میں ہیں.....؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جی..... جی ہاں.....''

''آپ کا نام.....؟'' اس کے لہجے میں بلا کا تجسس تھا۔

''مسز پیٹر.....!''

''آپ وہی..... اس اسکٹ میں.....'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''مائی گاڈ..... او کے..... ٹھیک ہے، میں کل شام کو آپ کی طرف آؤں گی۔'' اس نے ایک دم اپنا لہجہ نارمل کرتے ہوئے کہا۔

اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس سے کیوں ملنا چاہتی ہے مگر اس کے لہجے میں تجسس اور روکھا پن کسی اچھی بات کی طرف اشارہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ بہت مضطرب رہی مگر دوبارہ فون نہ کیا کیونکہ شاید حیدر کا موبائل اس کے پاس تھا۔ وہ کالج سے جلد واپس آ چکی تھی اور اس وقت سے ہی اس کی آمد کی منتظر تھی۔ شام کو ایک دم ہاسٹل میں افراتفری سی پھیل گئی۔ وارڈن اور نوکرانیوں کی دوڑیں ادھر سے اُدھر لگ رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں بھی بھنک پڑی

تھی، وہ جانتی تھی کہ اس کے پیچھے کیا بات تھی۔ اچانک مس حیدر اس کے کمرے میں آ گئیں۔

''آپ لوگ سب جائیں مجھے ان سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے۔'' مس حیدر نے وارڈن اور دوسری ورکرز کو کہا۔

''آپ کوئی ٹھنڈا وغیرہ...... میرا مطلب ہے ادھر ہی بھجوا دوں۔'' مس افضال نے کہا۔

''نہیں، کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس آپ لوگ جایئے......'' اس کا لہجہ تحکمانہ تھا اور مزاج اکھڑا ہوا۔

''آپ بیٹھیں پلیز......''

''میں، آپ کے صرف چند منٹ لوں گی مگر یہ دروازہ اچھی طرح بند کر دیں تاکہ ہماری گفتگو کوئی تیسرا بندہ نہ سن سکے۔'' وہ بولڈ انداز میں بولی۔

''جی فرمایئے۔'' اس نے دروازہ بند کرنے کے بعد کہا۔

''میں آپ کے اور پاپا کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہوں۔ میں آپ سے صرف یہی کہنا چاہوں گی کہ اگر آپ کی خواہشات پوری نہیں ہو سکیں تو اس کا بدلہ آپ کس کس سے لیں گی...... کتنے لوگوں کے سکون اور ان کی زندگیاں ڈسٹرب کریں گی۔'' وہ غصّے سے بولی۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ڈھیروں پانی اس کے اوپر گرا دیا ہو۔

''آپ نے میری ماں کو بے سکون زندگی دی اور اب مجھے...... میرے پاس بہت محبت کرنے والا آئیڈیل باپ تھا اور میرا آئیڈیل آپ نے مجھ سے چھین لیا ہے۔ میرے تخیل کو کرچی کرچی کر دیا ہے۔ میری سوچیں منتشر ہو گئی ہیں۔ جس باپ کے بغیر میں سانس بھی نہیں لیتی تھی، اب اس کی موجودگی میں مجھے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے کیونکہ آپ انھیں ان کی حیثیت سے گرا رہی ہیں۔'' وہ انتہائی کاٹ دار لہجے میں بولی۔

''میں...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... آپ...... اگر آپ کو خوشیاں نہیں ملیں تو دوسروں کو کیوں تباہ کرنے پر تلی ہیں۔ آپ نے تو مجھ سے میرا سارا کچھ چھیننے کی کوشش کی ہے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں، میں خاموشی سے یہ ''محبت ڈراما'' دیکھتی رہوں گی۔ میں اتنی کمزور نہیں۔ میں آپ کو وارننگ دے رہی ہوں کہ آئندہ نہ تو پاپا کو فون کریں اور نہ ہی ان سے ملنے کی کوشش کریں...... ورنہ......

اس کا انجام......؟ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور وہ ہمیشہ کی طرح حیرت سے ساکت کھڑی رہ گئی۔ اسے کوئی توجیہہ پیش نہ کرسکی۔ اس کی غلط باتوں کو رد نہ کرسکی۔ وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر ایک کی بھی تردید نہ کرسکی۔ وہ جہاں کھڑی تھی۔ وہیں بیٹھ گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے شدت سے رواں ہوئے۔ مس حیدر کیسے اس کی تذلیل کر کے گئی تھی۔ چند منٹوں میں اسے اتنا بے عزت کیا تھا کہ اپنا آپ اسے زہر لگنے لگا۔

کب تک...... یا خدا کب تک یہ تذلیل میرا مقدر رہے گی...... اب تو بچے بھی اٹھ کر مجھے ذلیل کرنا شروع ہو گئے ہیں۔ شاید کچھ لوگ دنیا میں صرف اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ دوسرے انھیں قدم قدم پر ٹھوکریں لگائیں، انھیں ذلیل کریں، انھیں رسوا اور بے عزت کریں...... اور وہ خاموشی سے سب کچھ سہتے رہیں۔ وہ تو اپنے دفاع میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ بس ہمیشہ کی طرح سنتی رہی، سوچتی رہی اور روتی رہی۔ کاش زندگی میں کوئی ایک لمحہ تو ایسا آئے جب وہ اپنا مؤقف کھل کر بیان کر سکے۔ کسی کے دعوے کو جھٹلا سکے۔ دوسروں کی جھوٹی باتوں اور الزامات کو رد کر سکے مگر قدرت کبھی بھی اسے ایسا موقع نہیں دیتی۔ ساری رات وہ روتی رہی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔

اس نے اگلے دن کالج سے چھٹی بھی کر لی تھی۔ مس افضال اور دوسرے لوگ بھی پریشان تھے کہ مس حیدر اسے کیا کہہ کر گئی تھیں کہ اس کے بعد تو وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے آنسو بے اختیار ٹوٹی مالا کے موتیوں کی طرح گرتے رہے۔ سینے کے اندر سے ہوک سی اٹھتی، آہیں اور سسکیاں ہر سانس کا لازم وملزوم حصہ بن گئیں۔ آنکھیں لمحوں میں نم ہو جاتیں۔ وہ بہت بھلانے کی کوشش کرتی مگر مس حیدر کے الفاظ گویا اس کے دماغ کے خلیوں کے ساتھ چپک گئے تھے۔ مٹنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ مس افضال خود اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ بھی اس کی حالت دیکھ کر افسردہ ہو گئیں۔

''مسز پیٹر، یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ آپ جیسی خاتون، یوں کسی بات پر حوصلہ کھو دے گی، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نہیں جانتی مس حیدر نے آپ سے کیا کہا ہے اور نہ میں یہ جاننے میں کوشاں ہوں لیکن آپ کو یہ حالت ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ پلیز، اپنے آپ کو نارمل کیجیے، ہاسٹل میں بہت چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ سب لوگ یہ جاننے کے لیے متجسس ہو رہے ہیں کہ آخر مس حیدر آپ سے کیا کہہ کر گئی ہیں اور آپ کیوں پریشان ہیں۔ آپ کی مخلص ساتھی ہونے کے ناتے آپ کو مشورہ دیتی ہوں کہ پلیز، اپنے آپ کو سنبھالیے۔

حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ چند دنوں بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' مس افضال نے اسے بہت دلاسا دینے کی کوشش کی۔

''نہیں مس افضال...... میرے حالات کبھی نہیں بدلیں گے...... میں نے بڑے بولڈ اسٹیپس لے کر بھی دیکھے مگر...... میں کیا کروں، بعض لوگوں کے ہر اٹھتے قدم الٹے ہی کیوں پڑتے ہیں۔ کتنے نصیب والے لوگ ہوتے ہیں جن پر پروردگار اتنا مہربان ہوتا ہے کہ ان کے الٹے کاموں کو بھی وہ اپنے کرم سے سیدھا کر دیتا ہے۔ میں تو منتظر ہی رہی۔ ساری زندگی اسی تگ و دو میں گزر گئی شاید میری زندگی میں بھی کوئی ایسا لمحہ آئے جب میری بھی سنی جائے مگر کچھ لوگ صرف تمنا ہی کر سکتے ہیں۔ اپنی نا تمام آرزوؤں کے ساتھ ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ میں اب دعا کرتی ہوں کہ خدا مجھے جلد اٹھا لے۔ میرے اردگرد کہیں بھی امید کی کرن نہیں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ سائے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں اور میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح اب پھڑ پھڑا رہی ہوں۔ جب انسان خود ہی اپنی نظر میں گر جائے تو پھر اسے لوگوں کی کیا پروا۔ ہاسٹل کے لوگ جو مرضی کہیں، حالات میرے بس میں تو نہیں۔ رسوائیاں اگر میرا مقدر ہیں تو میں انھیں روک تو نہیں سکتی۔''

''خدا کے لیے یوں مایوسی کی باتیں مت کریں۔ آپ کیوں اس قدر بددل ہو رہی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں خود مس حیدر سے بات کروں کہ وہ آپ سے کیوں ناراض ہیں۔''

''خدا کے لیے یہ غضب نہ کیجئے...... جو بات بھی ہوئی ہے، میرے اور ان کے درمیان ہوئی ہے، اسے ختم سمجھیں...... اس بات کو دُہرانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں، میں اب مزید کیچڑ برداشت نہیں کر سکتی۔''

''پھر آپ یوں مایوس ہونا بھی چھوڑ دیں اور...... اور ولیم بھی تو ہے، اس کی خوشیاں بھی تو آپ کو دیکھنی ہیں۔''

''نہیں مس افضال...... پہلے مجھے اس کی امید تھی، اب وہ بھی نہیں رہی۔''

''کیوں......؟ خدا نہ کرے، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟''

''میں نے کہا نا بعض لوگ صرف دکھ سہنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں...... پھر یا تو بیمار ہو کر بستر کے ساتھ لگ جاتے ہیں یا پھر مر جاتے ہیں۔ میں بھی ایسے لوگوں میں سے ایک ہوں۔ میں تو خدا سے کہتی ہوں کہ میں نہ تو سرکش تھی نہ باغی...... میں نے تو کبھی تجھ سے شکوہ بھی نہ کیا پھر کیوں تو نے مجھے اس قدر آزمایا ہے کہ میں اب تھک گئی ہوں۔''

''مسز پیٹر...... آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ اللہ اپنے پیاروں کو ہی آزماتا ہے۔''

جس کو دنیا میں انسانوں سے پیار نہ مل سکا، اس کو خدا پیار کرے گا۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مس افضال...... یہ محض ڈھکوسلے ہیں۔ خوش فہمیاں ہیں، اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں ہیں اور کچھ نہیں......'' اس کے لہجے میں بلا کی شکستگی تھی۔

''اس وقت میں آپ سے کوئی بحث نہیں کروں گی...... اس وقت آپ بہت مایوسی کا شکار ہیں۔ ان دنوں آپ میرے روم میں کیوں شفٹ نہیں ہو جاتیں...... کم از کم ہم دونوں باتیں تو کر سکیں گے۔''

''نہیں...... میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ جب تنہائی اور رسوائی مقدر ہو چکی ہو تو پھر فرار کیسا......؟''

''آپ دل مت چھوڑیں، پلیز...... خدا سے اچھی امید رکھیں۔''

''مس افضال! آپ بھی تو کب سے پُر امید ہیں...... کیا ہوا؟''

مس افضال کی آنکھوں میں ایک دم آنسو نمودار ہوئے اور پھر ان کے لیے روکنا محال ہو گیا۔ وہ خاموشی سے چلی گئیں۔ اس نے بھی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے رگڑا اور ہاتھوں کی لکیروں میں کہیں گم ہو گئی۔

.......✡.......

کالج میں اینول ڈے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں بیٹھی پروگرامز ترتیب دے رہی تھیں۔ دسمبر کا آغاز ہو چکا تھا اور سرد ہواؤں کی شدت میں بھی اضافہ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ لان میں، کیفے ٹیریا میں، غرض ہر جگہ اسٹوڈنٹس مصروف نظر آ رہے تھے۔ کلاسز نہ لینے کا اچھا بہانہ بھی انھیں ملا ہوا تھا۔ ڈسکشنز، قہقہے اور ایکٹنگ۔ سب کچھ عروج پر تھا مگر وہ اپنے کمرے میں نیٹ کے سامنے بیٹھا رہتا۔ اسے فادر کی میل موصول ہوئی تھی کہ فارن ڈیلی گیشنز ریلیجیس ورکشاپس کے لیے آ رہے ہیں اور اس کی شرکت ان میں بہت ضروری ہے۔ فادر نے اس کا نام بھی لکھوا دیا تھا۔ اینول ڈے کے بعد اس کے ایگزامز بھی تھے مگر فادر کو اس کی اسٹڈیز کی نسبت اس کی مذہبی سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اگر کوئی کلاس ہوتی تو وہ اٹینڈ کرتا ورنہ واپس آ جاتا۔ ان کی کلاس کرسمس کے حوالے سے ایک اسکٹ تیار کر رہی تھی۔ اس میں ایک پادری کے رول کے لیے سب نے ولیم کا نام تجویز کیا مگر ولیم کو اس بات پر آمادہ کون کرے، وہ تو کسی سے فالتو بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے تو بس اپنی

سرگرمیاں اور اسٹڈیز عزیز تھی۔ سب لوگ یہی پروگرام بنا رہے تھے کہ کون اس کو آمادہ کرے، اسی لمحے فرسٹ ایئر کی آئے نور آتی ہوئی دکھائی دی۔ جب سے آئے نور نے کالج میں داخلہ لیا تھا، ہر کوئی اس کی ذہانت اور خوبصورتی کا زبردست مداح ہو گیا تھا۔ اس کا سینس آف ہیومر بھی سب بہت انجوائے کرتے۔ لڑکوں کو پٹانا اور بدتمیزوں کو پٹانا اس کو خوب آتا تھا۔

''کیوں نہ آئے نور کی خدمات لی جائیں......'' رملہ نے کہا۔

''مگر وہ ہماری کلاس فیلو تو نہیں......'' اویس بولا۔

''تو کیا ہوا......؟ ولیم کو کون سی خبر ہوتی ہے کہ کون کلاس میں آیا ہے اور کون نہیں...... اپنے مطلب کے لیے سب جائز ہے......'' افشین نے رائے دی۔

''چلو......کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟'' ذاکر نے بھی اپنی رائے دینی ضروری سمجھی۔

''افشین جاؤ ذرا اس کو بلا کر لاؤ۔'' رملہ نے اسے کہا۔

''ٹھیک ہے......تم لوگ بھی تو آؤ نا......'' اس نے اویس اور ذاکر کو کہا۔

آئے نور اگلے ہی لمحے ان کے درمیان بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔ ''یار! کیوں مجھ سے کوئی گناہ کروانے پر تلے ہو......اگر وہ اپنی عبادت میں بزی ہے تو ہمیں کیا تکلیف ہے؟''

''مگر وہ اس کالج کا اسٹوڈنٹ بھی تو ہے نا......اس پر یہ فرض ہے کہ وہ ہماری یعنی کہ اپنی کلاس فیلوز کی مدد بھی کرے، کیا اس کی کوئی ذمے داری نہیں......؟'' رملہ نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں، یہ تو ہے...... چلو تم مجھے اس کے کمرے تک پہنچا دو...... میں کوشش کرتی ہوں...... باقی تمہاری قسمت۔ نتائج کی ذمے دار میں نہیں ہوں گی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟'' افشین نے کہا۔ سب لوگ اسے اس کا کمرا دکھا کر باہر کونے میں اس کا انتظار کرنے لگے۔

''ایکسکیوزمی!...... مے آئی کم ان......'' ولیم کے دروازہ کھولنے پر اس نے فوراً کہا۔

''یس...... بٹ آئی......''

''اوکے...... اوکے! آئی ایم یور نیو کلاس فیلو...... آئے نور۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں، بہت بری بات ہے۔'' وہ جلدی جلدی بولی۔

''مگر آپ یہاں کیسے......؟'' ولیم اس تیز طرار سی لڑکی کی اچانک آمد پر حیران ہو رہا تھا۔

''آپ کا کمرا بہت بور لگ رہا ہے۔ آئی مین...... کوئی ہیرو، ہیروئن نظر نہیں آ رہی...... بروس لی، جیمز بانڈ اور جیکسن کے بغیر تو کسی لڑکے کا کمرا سجتا نہیں، لگتا ہے آپ......؟''

''آپ مطلب کی بات کیجیے اور آپ کو کسی بھی بات پر تنقید کا کوئی حق نہیں۔''

''اوہ...... آئی ایم سوری......'' وہ جھجل سی ہو کر بولی۔

''آپ کیا لینا پسند کریں گی...... کافی یا...... پھر؟'' وہ اسے شرمندہ دیکھ کر بولا۔

''نو، تھنک...... ایکچوئیلی...... کالج میں اینول ڈے ہو رہا ہے۔ ایک رول ہے جو آپ کو ہی سوٹ کرے گا۔ ہم سب کی خواہش ہے کہ وہ رول آپ کریں......''

''سوری...... میں بہت بزی ہوں اور ان کاموں میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''بائی داوے...... آپ کو کن کاموں میں دلچسپی ہے......؟''

''گاڈ کے......'' وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''گڈ...... ویری گڈ...... لیکن گاڈ تو بہت سوشل ہے۔'' وہ ابرو اچکائے ہوئے بولی۔

''وہاٹ ڈو یو مین......؟''

''اٹس کلیئر...... وہ صرف عبادت میں تنہائی اور خاموشی چاہتا ہے۔ عملی طور پر وہ بہت سوشل ہے۔ اس لیے تو اس نے کنٹریز، آئی لینڈ اور سوسائیٹز بنائی ہیں پھر سوسائٹی میں رہنے کے طریقے اور اصول بھی تو اسی نے بنائے ہیں۔ وہ لوگوں کا لوگوں سے ملنا پسند کرتا ہے اسی لیے تو کہتا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملو تو محبت سے ملو۔ ایک دوسرے کو تحفے دو...... ایک دوسرے سے اچھی اچھی باتیں کرو۔ ایک دوسرے کی مدد کرو۔''

''آپ......؟'' اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''ہاں، ہاں...... کہیے، آپ رک کیوں گئے۔ کیا خدا ایسا نہیں کہتا؟''

''مگر ہمارے ریلجن......''

''کیا ہے آپ کے ریلجن میں...... کہ دنیا سے علیحدہ ہو جاؤ...... ٹھیک ہے، آپ کے اپنے مورل کوڈز ہیں...... مگر ہمارے کوڈز میں تو یہی ہے کہ آپ اس کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں اور آپ کو ہماری مدد کرنی ہے۔''

''سوری...... میں بہت مصروف ہوں۔''

''وی ڈونٹ کیئر...... آپ کو ہر صورت میں رول کرنا ہے۔''

''میں نے کہا نا......'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''اور میں نے بھی کہا نا...... کہ میں اس کمرے سے تب جاؤں گی جب آپ رول کرنے کی ہامی بھریں گے۔''

''ٹھیک ہے...... آپ بیٹھیے، میں جا رہا ہوں۔'' اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''ایک منٹ...... ایک منٹ، سنا ہے آپ لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں، یہ کیسی مہمان نوازی ہے...... مہمان اندر ہے اور میزبان جا رہا ہے۔''

''جب مہمان اوور ہو رہا ہو......'' وہ درشتی سے بولا۔

''تو اسے برداشت کرنا چاہیے......'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''افوہ...... آپ کیوں مجھے ڈسٹرب کر رہی ہیں......؟''

''اس لیے کہ ہم آپ کی وجہ سے ڈسٹرب ہیں۔''

''میں نے ایسا کیا، کیا ہے؟''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ کچھ کر نہیں رہے۔''

''بھئی، میں انٹرسٹڈ نہیں......''

''لیکن ہم کیا کریں...... ہم تو آپ ہی میں انٹرسٹڈ ہیں۔'' وہ اِک ادا سے آنکھیں مٹکا کر شرارت سے بولی تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی سفید رنگت سرخ پڑنے لگی۔ اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہونے لگیں۔

''آپ پلیز......؟''

''آپ بھی پلیز......''

''او کے...... میں سوچوں گا۔'' وہ اس سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے کل تک سوچ لیجئے گا ورنہ میں کل پھر آؤں گی......''

''آپ...... میرا مطلب ہے میں خود آ جاؤں گا۔''

''دیٹس گڈ......'' وہ مسکراتی ہوئی باہر نکلی تو اس نے شکر ادا کیا۔

''لگتا ہے...... تم اپنے مقصد میں کامیاب لوٹی ہو۔''

''جی بالکل...... اس نے سوچنے کی ہامی تو بھر لی ہے۔ ویسے سمجھو کہ کام ہو گیا ہے۔ قسم سے مجھے تو اس غریب پر ترس آ رہا تھا۔ ایسا کیوٹ سا لڑکا ہے اور تم لوگ اس کو تنگ کرنے پر تلے ہو۔ کیوں گھسیٹ رہے ہو اسے......'' آئے نور ذرا خفگی سے بولی۔

''یار! تم بھی کمال کرتی ہو، ہماری عزت کا مسئلہ ہے۔ ہمارا اسکٹ اس کے بغیر ادھورا ہے اور ہم نے اس کو شریف سا رول ہی دینا ہے۔ ویسے آپ ان کی بہت طرف داری کر رہی ہیں، خیر تو ہے نا......؟'' رملہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں نے اس کو بہت تنگ کیا...... وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اب میں چلتی ہوں۔کل ملوں گی۔'' وہ کتابیں اٹھا کر چلی گئی اور سب لوگ پھر پلاننگ کرنے لگے۔

وہ اس اچانک افتاد پر ایک دم گھبرا گیا تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی صرف کمرے تک محدود کر رکھی تھی ورنہ اس سے قبل وہ مری میں ہر فنکشن میں بہت دلچسپی سے شرکت کرتا تھا کوئی بھی فنکشن اس کے بغیر ادھورا سمجھا جاتا مگر جب سے فادر نے اس کو گاڈ سے انٹروڈیوس کروایا تھا، وہ بہت سوبر ہو گیا تھا۔ وہ گناہ اور ثواب کی ڈوری سے بندھ گیا تھا ہر قدم ڈر ڈر کر اٹھاتا۔ اب نور کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''گاڈ از سوشل۔''

''ہاؤ از اٹ پاسیبل......!'' وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے فادر سے کانٹیکٹ کیا۔ وہ آن لائن تھے۔ اس نے ان سے یہ سوال پوچھا۔

''فادر! ٹیل می......از گاڈ سوشل؟'' اس نے لکھا۔

''وہاٹ نان سینس...... گاڈ، اس طرح کی باتیں پسند نہیں کرتا۔'' فادر نے اسے جھڑکا۔

''فادر......آپ مجھے بتائیں......کیا یہ سچ ہے؟'' وہ بھی مصر تھا۔

''گاڈ انسان نہیں...... جو وہ سوشل ہو۔''

''تو پھر وہ کیا ہے......کیا وہ واقعی سوشل نہیں......؟''

''تم کیسی باتیں کر رہے ہو...... آج تم کس سے ملے ہو؟''

''فادر! آپ مجھے میرے سوال کا جواب دیں......اگر خدا سوشل نہیں تو پھر وہ کیوں ایک دوسرے کو ملنے کو کہتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد اور ایک دوسرے سے محبّت کرنے کو کہتا ہے؟ اگر وہ ان سوشل ہو تو وہ علیحدہ رہنے کا کہے گا، کیا فادر یہ سچ نہیں......''

''یس......ہی از سوشل۔سنو، تم مجھے کل ہی ملو۔'' غصّے میں فادر آف لائن ہو گئے۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کیسا تضاد پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بہت سے تضادات موجود ہیں۔ وہ لڑکی تو بہت نان سیریس سی لگی تھی اور اس کی نان سیریس بات میں کیسی سچّائی تھی کہ فادر بھی بالآخر حقیقت مان گئے تھے۔ اس کا ہنستا، مسکراتا چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کا باتیں کرنے کا کانفیڈنٹ اور بولڈ اسٹائل، اس کی

ہنسی... اور اس کا ترکی بہ ترکی جواب دینا اور اس کی آنکھوں میں شرارت۔ وہ سو نہیں پا رہا تھا۔ اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی بات پر سوچے گا مگر وہ تو... بات کے بجائے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی ذہن سے نہیں ہٹ رہی تھی...... وہ آنکھیں بند کرتا تو وہ کھٹ سے اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی اور وہ آنکھیں کھول دیتا۔

گاڈ...... مائی ڈیئر کرائسٹ...... سیومی... '' وہ مزید کوئی دعا نہ کر پاتا...... اس کا مسکراتا سرخ و سفید...... گول سا چہرہ... بڑی بڑی سیاہ شرارت سے بھرپور مسکراتی آنکھیں...... گہرے سیاہ ابرو...... وہ کوئی ایول اسپرٹ تو نہیں بلکہ جنت کی حور معلوم ہوتی تھی۔ اچانک وہ کہاں سے آ ٹپکی تھی۔ اس نے تو اسے کلاس میں نہیں دیکھا تھا مگر وہ خود بھی تو کلاس فیلوز کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔

''نور...... شہزادہ ولیم ابھی تک نہیں پہنچا...... '' رملہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

''یار ابھی نو ہی بجے ہیں...... پرنسیس لوگ اتنی صبح کہاں اٹھتے ہیں انھیں تو اٹھانا پڑتا ہے اور پرنسیس ہے نا وہ ادھر ہی جا رہی ہے... اس نے وعدہ تو کیا تھا...... کیا خیال ہے ہمیں انتظار کر لینا چاہیے......''

''نہیں نہیں...... تم جاؤ اسے بلا کر لاؤ...... اور اگر وہ آ گیا نا تو میری طرف سے ٹریٹ پکی...... '' افشین نے اسے لالچ دیا۔

''یہ بتاؤ ٹریٹ کہاں دو گی......؟''

''اپنا ٹی بار ہے نا...... '' افشین ہنس کر بولی۔

''نہیں جناب...... میکڈونلڈ کی بات کرو...... کے ایف سی کی بات کرو... یا پھر......''

''بس بس...... بس ہم اسٹوڈنٹ ہیں ہمیں رعایت دی جائے......''

''یہ رعایت صرف حکومت دیتی ہے۔ اسٹوڈنٹس، اسٹوڈنٹس کو نہیں دیتے اور سنو پرنس بھی ہمارے ساتھ چلے گا...... '' نور آنکھیں مٹکا کر بولی۔

''واقعی...... '' سب نے حیرت سے کہا۔

سب لوگ منتظر رہے مگر وہ نہ آیا۔ بہت انتظار کے بعد نور کو اس کے کمرے میں بھیجا گیا مگر اسے سخت مایوسی ہوئی جب اس کا کمرا لاکڈ دیکھا۔ اس نے اردگرد اسٹوڈنٹس سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو صبح سویرے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ نور کو سخت خفت کا سامنا تھا اسے پکا یقین تھا کہ وہ اگلے دن ضرور ان کے درمیان ہوگا مگر وہ تو بغیر بتائے ہی کہیں چلا گیا تھا... اس کا

مطلب ہے اس نے اس کی انسلٹ کی تھی۔ اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آج تک کسی نے بھی اس کی بات کونہیں جھٹلایا تھا اور ...... وہ ...... سب لوگ آئے نور کا مذاق اڑا رہے تھے مگر ظاہری طور پر شرمندہ ہونا گویا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

''یار ہوسکتا ہے وہ بیمار پڑ گیا ہو...... کچھ بھی ہوسکتا ہے...... آخر وہ بھی تو انسان ہے۔ اس کو گھر سے بھی کال آسکتی ہے۔ ہزار مسائل ہوتے ہیں۔ تم لوگ تو بس یونہی دل چھوڑ دیتے ہو...... کل وہ آجائے گا۔ فکر کیوں کرتے ہو۔'' اس نے سب کو تسلی دی۔

''نور اس نے تمھیں بنایا ہے...... اور ویسے بھی اس نے آنے کا وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ اس نے سوچنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کا ذہن نہ مانا ہو۔'' رملہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''بھئی وہ کل آجائے گا...... کہا نا......'' وہ مکمل اعتماد کے ساتھ بولی۔

''ٹھیک ہے کل تک انتظار کر لیتے ہیں۔ اگر کل تک نہ آیا تو ہم اپنا اسکٹ چینج کر لیں گے......'' اویس نے مشورہ دیا۔

''ویسے تم لوگوں کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ ایسا اسکٹ لکھوا اور پھر ہیرو بھی اسے ہی رکھو...... تم لوگ بھی حد کرتے ہو......'' نور ذرا منہ بنا کر بولی۔

''یار تمھیں کیا معلوم باقی لوگ ایسے زبردست اسکٹس کر رہے ہیں...... اور ہماری کلاس میں کوئی اس قابل تو ہے ہی نہیں کہ کچھ بھی ڈھنگ کا کر سکے۔ شوخیاں مستیاں ان سے کروالو۔ کوئی کریئٹو کام ان سے نہیں ہوسکتا۔ یہ تو میرے انکل نے اسکٹ لکھ دیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ رول کوئی کر سکے گا۔ میں نے جلدی سے ولیم کا نام لے دیا۔ انھوں نے اسکٹ تو لکھ دیا مگر ولیم اب مان نہیں رہا۔ اتنی جلدی نیا اسکٹ لکھوانا بھی تو مشکل کام ہے۔'' رملہ نے پوری تفصیلات بتائیں۔

''اچھا کل تک انتظار کرلو...... میں اس سے بات کروں گی...... آئی ہوپ کل وہ آجائے گا۔'' نور نے پھر انھیں امید دلائی۔ مگر سب لوگ بددلی کا شکار ہو چکے تھے۔

ولیم تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔ اس نے فادر سے دبے دبے الفاظ میں رول کرنے کی اجازت مانگی تو وہ غصے میں آگئے۔

''ولیم تم اپنے فرائض بھول رہے ہو...... مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ تم اس قدر امیچور ہو۔ میں تمھیں اپنے ارادوں میں مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب تمھیں کہا ہے کہ تم نے ورکشاپس میں شرکت کرنی ہے تو اس کے علاوہ اور کوئی سوچ تمھارے ذہن میں نہیں

ہونی چاہیے۔''

''......مگر فادر وہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور......''

''ولیم...... کلاس میں بہت سے لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں یہ رول ان میں سے کوئی بھی کرلے گا مگر تمہاری جگہ ورکشاپ میں شرکت کوئی اور نہیں کرسکتا۔ انڈرسٹینڈ......'' فادر ذرا تلخی سے بولے۔

اسے فادر کا رویہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ فادر نے آہستہ آہستہ اس کی سوشل لائف ختم کردی تھی۔ ہر وقت مذہبی سوچوں نے اس کے ذہن کو جس راہ پر گامزن کرنا شروع کیا تھا وہ وہاں پہنچتے پہنچتے تھک سا گیا تھا...... اتنے سوالات ذہن میں اٹھتے...... اتنی نئی سوچیں ابھرتیں کہ وہ کبھی کبھی خود ہی جھنجلا جاتا۔ آہستہ آہستہ مذہب اس کے لیے ایک ایسی آزمائشی سیڑھی بنتا جارہا تھا جس کے ہر زینے پر قدم رکھتے ہوئے وہ کئی بار کچھ سوچنے پر مجبور ہوجاتا۔ وہ پکا ارادہ کرکے آیا تھا کہ اس نے کوئی رول نہیں کرنا اور ان لوگوں کو صاف نہ کہنی ہے۔ شام ہورہی تھی جب وہ لوٹا...... فادر نے خصوصی طور پر اس کے لیے کالج انتظامیہ سے کچھ خاص مراعات لے رکھی تھیں۔ وہ جب چاہے آئے جائے...... اسے کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا اور ویسے بھی وہ اچھے، ذہین اور بے ضرر طلبا میں شمار ہوتا تھا۔ اساتذہ بھی اس سے بہت خوش تھے۔ وہ ہر ایک کی گڈ بک میں تھا۔ آئے نور کو دیکھ کر وہ ایک دم چونکا...... وہ ہاسٹل کے باہر بے چینی سے چکر لگارہی تھی۔ اس وقت وہاں اس کی موجودگی اسے قطعی غیر متوقع لگی۔ وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا اندر داخل ہونے لگا......تو وہ اس کے پیچھے آ گئی۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کب سے آپ کا انتظار کررہی ہوں؟''

''آپ کو کس نے انتظار کرنے کو کہا ہے...... آپ نے کیوں تکلیف کی......؟''

''جس شخص کو اس کا وعدہ یاد نہ رہے اسے یاد دلانے کے لیے کبھی کبھی انتظار بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''میں نے آپ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا...... کیا میں نے ایسا کچھ کہا تھا......؟''

''آپ نے کہنے کا نہیں غالباً سوچنے کے بارے میں کہا تھا اور سوچنے کے بعد ہمیشہ کچھ کہا جاتا ہے۔ آپ نے تو کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا اور صبح سے غائب ہیں...... مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔''

''دیکھیں مس......''

''آ ئے نور.....''

''جی ...... جی ...... میں بہت مصروف ہوں۔ میں ابھی بھی فود کے پاس سے آ رہا ہوں مجھے بہت ضروری ورکشاپس میں شرکت کرنی ہے میں ان فضول ڈراموں میں شرکت نہیں کرسکتا۔ آپ میرے پرابلمز کو کیوں نہیں سمجھتیں.....'' وہ اکتا کر بولا۔

''کیا آپ میرے پرابلم کو سمجھتے ہیں......؟''

''میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے آپ سے کوئی مطلب نہیں ...... میری اپنی حدود ہیں اور آپ کی اپنی...... آئی ایم سوری......'' اس نے جان چھڑانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں اتنے بہت سے لوگوں کو ہرٹ کر کے آپ گاڈ کو خوش کر لیں گے۔ گاڈ آپ سے کبھی بھی خوش نہیں ہوگا...... جو لوگ اپنے جیسے لوگوں سے وعدے پورے نہیں کر سکتے وہ خدا سے کیا وعدہ پورا کریں گے۔'' وہ قدرے خفگی سے بولی۔

''آپ میرے پیچھے کیوں پڑی ہیں جبکہ...... میں......'' مایوسی کے سائے اس کے چہرے پر لہرانے لگے وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بے بسی سے بولا۔

نور ایک لمحے کو ٹھٹکی۔ اس نے اس کے چہرے پر یاسیت اور آنکھوں میں بے بسی کی لہر دیکھی تھی۔

''میں آپ کے کمرے میں کچھ دیر کے لیے آنا چاہتی ہوں۔ آپ سے بیٹھ کر بات کرنا چاہتی ہوں......'' اس نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے بنا کچھ کہے اس کے آگے چلنے لگا...... وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اسے اندر جانے کے لیے راستہ دیا۔ وہ کمرے میں رکھی ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹیبل سے گلاس اٹھایا منرل واٹر سے اسے بھرا اور اس کے آگے کر دیا۔

''تھینک یو......'' اس نے خاموشی سے گلاس لے لیا۔ دونوں کافی دیر خاموش رہے۔

''یہ رول کوئی اور بھی تو کر سکتا ہے...... سب لوگ میرے لیے ہی کیوں کونشئس ہیں۔'' بالآخر اس نے خود ہی سکوت توڑا۔

''آپ مجھے بہت بے ضرر نفیس اور سچے انسان لگتے ہیں۔ میں حقیقت بتائے دیتی ہوں۔ میں آپ کی کلاس فیلو نہیں ہوں مگر کالج فیلو ضرور ہوں۔ آپ کی کلاس نے مجھے خصوصی طور پر آپ کے پاس بھیجا ہے اور یہ رول آپ کے لیے ہی لکھوایا گیا ہے۔ کلاس میں کوئی بھی اس رول کو ٹھیک طرح سے پرفارم نہیں کر پائے گا۔ میں نے اسکٹ تو نہیں پڑھا مگر اس کی

ڈیمانڈ ہی آپ ہیں۔ میری ان کے ساتھ شرط بھی لگی ہے کہ آپ یہ رول ضرور کریں گے...... اگر آپ نے یہ رول نہ کیا تو میری بہت انسلٹ ہوگی...... اور پھر ہو سکتا ہے...... میں دوبارہ کالج نہ آؤں......'' وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

''رئیلی...... یو آر سو چِی......''

''جی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اوہ...... آئی سی......'' وہ قدرے مسکرایا۔ ''ٹھیک ہے کل میں آ جاؤں گا......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''تھینک یو...... آئی ایم رئیلی گریٹ فل ٹو یو......'' اس کی آواز میں خوشی کی کھنک تھی۔

''اٹس مائی پلیزر......'' وہ بھی مسکرا کر بولا۔

اگلی صبح وہ ہاسٹل سے باہر نکل رہا تھا۔ جب وہ اس کی طرف مسکراتی ہوئی آئی۔

''آپ کے کلاس فیلوز آپ کا انتظار کر رہے ہیں......''

''کہاں ہیں سب......؟''

''سب لوگ لائبریری میں بیٹھے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تو ادھر ہی چلتے ہیں......'' وہ پُرسکون لہجے میں اعتماد سے بولا۔ جیسے ہی سب نے دونوں کو آتے دیکھا تو حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نور کو پُرستائش نگاہوں سے داد دی۔

''لو بھئی...... میرا وعدہ تو پورا ہو گیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام......'' نور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہم سب لوگ بھی ہال میں ہی چلتے ہیں...... یہاں پر تو بات بھی نہیں ہو سکتی۔'' رملہ اٹھتے ہوئے بولی اور اس کے ساتھ سب لوگ ہی اٹھ گئے۔

''تم بھی ہماری ریہرسل دیکھنے آنا......'' افشین نے کہا۔

''سوچوں گی......'' وہ ذرا اسٹائل سے منہ بنا کر بولی تو ایک دم اس کی نظر ولیم کی طرف اٹھی۔ وہ پُرشوق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا وہ چونک سی گئی اور جلدی سے افشین کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمھیں اپنی ٹریٹ یاد ہے نا......؟''

''ہاں...... ہاں...... ٹی بار میں......''

''نہیں...... کہیں اور......''

''ٹھیک ہے اینول ڈے کے بعد......اور تمھیں بھی......''

''ہاں......ہاں...... مجھے بھی یاد ہے......'' وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ولیم اپنا رول پڑھنے لگا۔ اس کا رول ایک سلجھے ہوئے، حساس پرنس کا تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پادری بن جاتا ہے اور لڑکی غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر نن بن جاتی ہے...... دونوں اپنی زندگی کا مشن ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا بنا لیتے ہیں۔ اسکٹ میں زیادہ زور، جذبات، کیفیات اور ڈائیلگز پر تھا۔

''ٹھیک ہے مجھے سمجھ آ گئی ہے مگر نن کا رول کون کرے گا؟'' ولیم نے اسکرپٹ پڑھتے ہوئے کہا۔

''حور یہ ہماری کلاس فیلو ہے...... وہ نن کا رول کرے گی...... وہ ابھی آنے والی ہے۔'' رملہ نے اسے بتایا۔

''نور کیوں نہیں......'' ولیم کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''بھئی وہ ہماری کلاس فیلو نہیں......'' افشین نے جلدی سے جواب دیا۔

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی اس کے لیے کلاس فیلو بننا کون سا مشکل کام ہے......'' ولیم مسکرا کر بولا۔

''ہاں......مگر......؟'' رملہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

''میرے خیال میں یہ رول ان سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں زور، کیفیات اور جذبات پر ہے اور میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے وہ اس میں کافی تیز ہیں......'' وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔

''ٹھیک ہے اسے بھی دیکھ لیں گے مگر پہلے حور یہ کو......'' رملہ نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد حور یہ آئی خوبصورت سی نازک سی دبلی پتلی سفید یونیفارم میں۔ چاسر کی پرائریس کی طرح حسین و نازک نازنین...... وہ نن کے رول کے لیے ہر لحاظ سے فٹ لگتی تھی۔ اس کا ایکسنٹ بہت اچھا تھا۔ مگر ڈائیلاگ ڈلیوری اچھی نہیں تھی۔ جذبات الفاظ کے ساتھ میچ نہیں کر رہے تھے وہ ڈائیلاگز یوں بول رہی تھی جیسے رٹے رٹائے جملے......اور اس بات کو سب لوگ بہت محسوس کر رہے تھے۔ ولیم اور رملہ نے اس کے ساتھ بہت کوشش کی۔ ہر ڈائیلاگ دونوں نے ادا کر کے بتایا مگر اس کی پک شارپ نہیں تھی۔

''میرا خیال ہے نور کو دیکھتے ہیں۔'' رملہ خود ہی بولی اور اسے بہت منت سماجت کر کے آمادہ کیا۔ واقعی اس کی ڈائیلاگ ڈلیوری بہت اچھی تھی۔ ریہرسل شروع ہو چکی تھی اور سب لوگ بہت ڈوب کر کردار ادا کر رہے تھے۔ رملہ اور ذاکر...... افشین اور اویس...... دو کپلز کے کردار ادا کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹے موٹے کردار تھے جو کلاس کے دوسرے لوگ کر رہے تھے۔

ریہرسل کرتے ہوئے سب لوگ بہت انجوائے کرتے۔ معمولی معمولی باتوں پر قہقہوں کا دور چل پڑتا...... تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آرام کرنے بیٹھ جاتے...... پھر کیفے ٹیریا چل دیتے۔ بہت دنوں کے بعد ولیم اپنے آپ کو فریش محسوس کر رہا تھا۔ اس کا رول پرنس سے پادری کا تھا۔ سب لوگ اسے پرنس کہہ کر بلاتے...... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت دنوں بعد وہ کھلی فضا میں...... سانس لے رہا ہو...... اتنے دنوں نیٹ کے آگے بیٹھ بیٹھ کر اور بائبل کے مختلف ورژنز پڑھ پڑھ کر اس کا ذہن تھک سا گیا تھا۔

''نور...... میں یہ رول صرف تمھارے لیے کر رہا ہوں......'' کیفے ٹیریا میں بھاپ اڑاتی چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے اسے آہستہ سے کہا۔

''کیوں......؟'' اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری پرسٹیج کے لیے...... اور گاڈ کو خوش کرنے کے لیے...... ورنہ میں فادر کے ساتھ کمٹڈ تھا اور وہ مجھ سے ناراض بھی ہیں۔ وہ کل سے نیٹ پر مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے...... لیکن مین انھیں منا لوں گا۔ ورکشاپس تو اگلے مہینے ہیں۔ معلوم نہیں فادر مجھے کیوں یہ رول نہیں کرنے دے رہے تھے...... لیکن جب میں نے تمہاری آنکھوں میں مایوسی دیکھی تو مجھے دکھ سا ہوا اور مجھے لگا کہ واقعی گاڈ مجھ سے ناراض ہو جائے گا...... اگر......! اگر تم ناراض ہو گئیں تو......'' وہ مسکرا کر بولا۔

''تم اپنے فیصلوں میں بہت جلد باز لگتے ہو......؟''

''ہاں...... شاید...... میں ایسا ہی ہوں...... اور اکثر میں اچانک کوئی اہم فیصلہ کرتا ہوں تو اس میں کامیاب بھی ہوتا ہوں......''

''جیسا کہ رول کرنے کا......؟''

''ہاں...... ممکن ہے...... اس میں بھی......''

''پرنس تم میں اتنی الوفنس کیوں ہے...... تم حقیقت میں بھی تو پادری نہیں بننا

چاہتے......؟'' نور کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

''ہاں......تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے......فادر یہی چاہتے ہیں......''

''اور تم......؟'' نور حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

''شاید......میں بھی......''

''اس میں ''شاید'' کیوں ہے......اس میں تمہارا اپنا ارادہ اور عزم ظاہر نہیں۔''

''پلیز اس پر بات مت کرو......'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''جو مسئلے ڈسٹرب کریں ان کو پہلے ڈسکس کرنا چاہیے......''

''اور جو زیادہ ڈسٹرب کریں ان کو حالات پر چھوڑ دینا چاہیے......''

''ٹھیک ہے......میں اس پر آئندہ بات نہیں کروں گی......مگر میں اتنا جان گئی ہوں کہ یہ تمھارے دل کی آواز نہیں......اور جب دل کچھ کہے اور دماغ کچھ تو پھر زبردست تضاد جنم لیتا ہے......تم منتشر ہو جاؤ گے اور بکھر جاؤ گے......اس لیے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا......'' آئے نور نے اسے ہمدردی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو......'' وہ آہستہ سے بولا۔

وہ کالج سے ہاسٹل واپس آیا ہی تھا کہ فادر آ گئے......انھیں یوں اچانک دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا......وہ کچھ خفا خفا سے لگ رہے تھے۔

''فادر آپ......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ولیم تم نے میرے سمجھانے کے باوجود اسکٹ میں حصہ لیا......تمھیں ورکشاپ کے لیے ہوم ورک کرنا ہے۔ اور تم ان فضول، لغو کاموں میں مصروف ہو گئے ہو۔ الس آل ربش......'' وہ سخت غصے میں بولے۔

''فادر ورکشاپ اگلے مہینے ہے اور یہ تو صرف کچھ دنوں کی بات ہے۔ میں دونوں کام آسانی سے کر سکتا ہوں۔ اسی لیے میں نے یہ رول کرنا قبول کیا ہے......؟''

''مائی سن......تم پادری بن رہے ہو۔'' وہ سخت لہجے میں بولے۔

''آئی ایم سوری فادر......''

''او کے......مگر آئندہ خیال رکھنا۔''

''رائٹ فادر......'' وہ آہستہ سے بولا۔

فادر بنا کچھ کہے چلے گئے۔ فادر کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ جب فادر پہلے ملتے

تھے تو بہت محبّت اور شفقت سے پیش آتے تھے اس کے کندھے تھپتھپاتے تھے..... اسے گلے لگاتے تھے اور اب فادر جب سے اس سے ناراض ہوئے تھے سیدھی طرح بات بھی نہیں کرتے تھے..... ان کے لہجے میں بھی تلخی ہوتی تھی اور آنکھوں میں غصہ..... لفظوں میں ترشی تھی اور حرکات وسکنات میں بھی وہ دھمکی سی محسوس کرتا وہ فادر سے یہ توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دل ٹوٹنے لگا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوا تھا۔ وہ لہجوں سے اندرونی احساسات و جذبات محسوس کرنے کا عادی تھا۔ مما اور اس کے درمیان بہت کم شدید غصّے کا اظہار ہوتا۔ وہ ہمیشہ مما سے بہت سوفٹ ٹون میں بات کرتا۔ وہ سوچ میں اپنی عمر سے زیادہ پختہ اور میچور تھا۔ وہ تو مخاطب کے احساسات کو سمجھ کر بات کرنے کا عادی تھا۔ صرف فادر کی وجہ سے اس میں اور مما میں سرد جنگ چھڑ گئی تھی۔ مگر شدید تلخی کا تبادلہ کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ فادر کی طرف بھی ان کی محبّت اور شفقت کی وجہ سے کھنچتا چلا گیا تھا۔

فادر کی پرسنالٹی کا یہ رخ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ یہی سوال اس کے ذہن میں بار بار ابھرتا کہ فادر اسے کیوں اتنا محدود رکھنا چاہتے ہیں کیوں اسے ہر کام سے روکنا چاہتے ہیں۔ وہ پائلٹ بننے کا خواب لے کر جوان ہوا تھا اور اس نے اپنے ذہن سے بہت مشکل سے اپنا یہ آئیڈیل کھرچا تھا۔ ورنہ جب تک مری میں رہا اس کے پاس ہر شکل اور سائز کے جہاز اور ان کے پوسٹرز ہوتے تھے کبھی وہ فائٹر پائلٹ بننے کے خواب دیکھتا تو کبھی کمرشل..... کبھی اپنے آپ کو آرمی یونیفارم میں دیکھتا تو کبھی پی آئی اے..... اتنے سارے خواب..... جو بچپن سے لے کر اب تک اس کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ جوان ہوئے تھے اور ان سارے خوابوں کے ساتھ اس کے جذبات بھی اسی طرح پروان چڑھے تھے وہ سب فادر کے کہنے پر اسے اپنے دماغ کے ایک ایک خلیے سے خود نوچنے پڑے تھے اور یہ کس قدر مشکل تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کو بہت منایا تھا۔ بارہا سمجھایا تھا۔ اپنی زندگی سے خواہشات کے دائرے اور خوشیوں کو محدود تر کر دیا تھا مگر فادر اس کے احساسات کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اسکٹ میں رول کرنے سے کسی کا بھی کوئی نقصان نہیں تھا۔ اس نے ہزار دیے سے اس بات پر سوچا تھا مگر فادر کی ناراضی سمجھ سے باہر تھی۔

جیسے جیسے دن قریب آ رہے تھے۔ تیاریاں عروج پر تھیں۔ پورے کالج کو ڈیکوریٹ کیا جا رہا تھا۔ بہت سی کلاسز کے طلبا نے مختلف اسکٹس اور پروگرامز ترتیب دیے تھے۔ کچھ مزاحیہ کچھ سنجیدہ..... اساتذہ بھی ان کی بھرپور رہنمائی کر رہے تھے۔ ملبوسات بنوائے جا رہے

تھے۔۔۔۔ اک ہنگامہ سا بپا تھا۔ پروگرام کی کامیابی کی ٹینشن بھی تھی اور تفریح کا زبردست موقع بھی تھا۔ اس سکٹ کی وجہ سے سب لوگ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ ایک دوسرے کے احساسات کو بھی سمجھنا شروع ہو گئے تھے۔ ولیم گو کہ سمجھدار اور موقع شناس تھا مگر اچانک فیصلے کرنے کا عادی تھا۔ شاید یہ عادت اس نے اپنی مما سے ورثے میں پائی تھی۔ نور ہر بات کو بہت سوچ سوچ کر فیصلہ کرنے کی قائل تھی لیکن کسی حد تک وہ ضدی بھی واقع ہوئی تھی۔ رملہ تھوڑی سی خود پسند تھی اور افشین تو سیدھی سادی ہر بات ماننے والی لڑکی تھی۔ اویس اور ذاکر میں بہت دوستی تھی۔ ذاکر کی اپنی کوئی رائے نہ تھی جو اویس کہتا وہی ذاکر پر کرنا لازم ہوتا۔ اویس کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملانا تو ذاکر پر فرض تھا۔ سب لوگ ذاکر کو چھیڑتے تو وہ مسکرا کر اویس کی طرف دیکھتا۔۔۔۔ اس کا اویس کی طرف مسکرا کر دیکھنے کا اسٹائل سب لوگ بہت انجوائے کرتے۔

فنکشن والے دن سب لوگوں نے اپنے اپنے گھر سے کسی نہ کسی کو انوائٹ کیا تھا ویسے بھی اینول ڈے تھا۔ پیرنٹس کا آنا تو لازمی سمجھا جاتا ہے مگر ولیم کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ اس نے مما کو انوائٹ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پچھلی دفعہ جب وہ مما سے مل کر آیا تھا تو ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور اب مصروفیت کی وجہ سے نہ تو انھیں ملنے جا سکا اور نہ ہی فون کر سکا اس کا پروگرام تھا کہ فنکشن کے اگلے دن وہ مما سے ملنے جائے گا۔ شہر کی انتظامیہ کے بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ حیدر اور شہلا بھی مدعو تھے مگر شہلا نہ جا سکی اور صرف حیدر کو ہی جانا پڑا۔ ملک منصور بھی مدعو تھا۔ وہ شزا کے ساتھ گیا چونکہ الیکشنز قریب تھے اس لیے عوامی رابطہ مہم کے سلسلے میں ایسے پروگرامز میں شرکت سیاستدانوں کے لیے ہمیشہ فائدہ مند رہتی ہے۔ اسی بات کے پیش نظر وہ اسٹوڈنٹس کے اس فنکشن میں گیا وگرنہ اس سے قبل اس کی جگہ شزا ہی شرکت کرتی تھی۔ حیدر اور منصور نے ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

ولیم اور آئے نور کی ایکٹنگ اور ان کے اسکٹ **Broken Hearts** کو سب لوگوں نے بے حد پسند کیا خصوصی طور پر ولیم کی ایکٹنگ اور اس کے ایکسنٹ کو بہت سراہا گیا۔ ہر ایک کی زبان پر پرنس ولیم کا نام تھا۔ پڑھائی کے علاوہ ایکٹنگ میں بھی اسے سرٹیفکیٹس اور میڈلز دیے گئے۔ سب لوگ بہت خوش تھے اور فنکشن کے بعد سب لوگ افشین کے گرد اسے پارٹی کا وعدہ یاد دلانے کے لیے جمع ہو گئے۔

"بھئی چھٹیوں کے بعد پروگرام رکھ لو۔۔۔۔" افشین نے جان چھڑانا چاہی۔

''نہیں..... پارٹی آج ہی چاہیے اور وہ بھی کے ایف سی میں.....''

''تھوڑی سی رعایت دے دو.....'' افشین منمنائی۔

''ہم کچھ نہیں سننا چاہتے.....'' آئے نور بولی۔

''لیکن ولیم اور آئے نور پر بھی تو پارٹی بنتی ہے.....ان لوگوں کو تو خصوصی انعامات ملے ہیں۔'' رملہ نے ٹانکا لگایا۔

''ہاں..... ہاں..... یہ تو ہم بھول ہی گئے۔'' اویس بولا تو ذاکر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہماری کوئی کمٹمنٹ نہیں تھی.....ویسے بھی میرے راستے آج کے بعد آپ لوگوں سے جدا ہیں.....میں تو بس کرٹسی میں آ گیا اور رول کر دیا ورنہ..... میں تو..... خیر..... پھر سہی'' اس نے آئے نور کی طرف مسکراتے ہوئے ذومعنی الفاظ میں کہا۔

''اوہو..... یہ کوئی رومانس تو نہیں شروع ہو گیا.....؟'' افشین نے سادگی سے کہا تو دونوں گڑبڑا گئے۔

''وہاٹ نان سینس..... اب میں تمہاری کلاس میں کبھی نہیں آؤں گی پہلے ہی میرے کلاس فیلوز مجھ سے ناراض ہیں۔ میں بھی کرٹسی میں آ گئی ..... ورنہ.....'' آئے نور مصنوعی خفگی سے بولی۔

''بائی دا وے..... دونوں ایک دوسرے کی کرٹسی میں آئے ہیں تو پھر ٹریٹ کیسی.....؟'' اویس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں..... کیوں..... اتنا کام کیا ہے۔ میں نے تمھارے لیے۔ ٹریٹ کا وعدہ ہوا تھا کہ نہیں یاد رکھو آئندہ بھی تم لوگوں کو مجھ سے کام پڑ سکتا ہے۔'' آئے نور نے گویا دھمکی دی۔

''اوکے بھئی..... تھینک یو ویری مچ.....میرے پاس جتنے پیسے ہیں ان میں جو کچھ انجوائے کر سکتے ہو کر لو.....''

''چلو سب لوگ نکالو.....سوائے میرے.....'' آئے نور نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور میرے علاوہ بھی..... کیونکہ میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں اور یہ اس ماہ کا خرچ ہے میں مما کو مزید پیسوں کے لیے تنگ نہیں کر سکتا..... اور ویسے بھی یہ وعدہ میری موجودگی میں نہیں ہوا تھا۔ میں تو تم لوگوں کا گیسٹ ہوں.....'' ولیم نے صاف گوئی سے کہا۔

''ٹھیک ہے بھئی..... کل کا پروگرام رکھ لو آج تو بہت تھک گئے ہیں۔ کل چلیں

کے....'' رملہ نے رائے دی۔

''اوکے..... کل سب تیار رہنا اور چھٹی کوئی نہ کرے.... آئے نور نے گویا وارننگ دی سب مسکراتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ولیم ہاسٹل لوٹا تو اس کے لیے فون کال تھی......

''ولیم..... آپ کے لیے کئی دفعہ فون آ چکا ہے مگر آپ فنکشن میں بزی تھے۔ اس لیے کونٹیکٹ نہیں ہو سکا۔'' آپریٹر نے اسے بتایا۔

''کس کا فون ہے.....؟'' ولیم نے قدرے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''ورکنگ ویمن ہاسٹ سے مس افضال بات کر رہی ہیں.....''

''اوکے.....'' اس نے فون پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہیلو آنٹی خیریت تو ہے نا؟''

''بیٹا آپ کی مما بہت بیمار ہیں اور اسپتال میں ہیں.....'' وہ اسے ایڈریس بتانے لگیں۔

''میں ابھی آتا ہوں.....'' اس نے فون رکھتے ہوئے کہا اور وارڈن کو بتا کر چلا گیا۔

اسپتال میں مس افضال کے علاوہ ایک دو اور خواتین تھیں۔ ''آنٹی، مما کو کیا ہوا ہے؟'' اس نے پریشانی میں مس افضال سے پوچھا۔

''بیٹا بہت دنوں سے وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھیں اور پھر بخار ہونا شروع ہو گیا اور آج تو حد ہی ہو گئی۔ چلتے چلتے اچانک گر پڑیں۔ بی پی اس قدر ہائی ہو گیا کہ ناک سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ شاید برین ہیمرج.....''

''اوہ نو.....'' وہ مایوسی سے بولا اور رونا شروع ہو گیا۔

''حوصلہ رکھو بیٹا.....'' مس افضال نے اسے پیار سے سمجھایا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے..... پچھلی دفعہ میں آیا تھا تو مما مجھ سے ناراض تھیں شاید یہ ڈپریشن اسی وجہ سے ہے.....'' وہ بہت گلٹی محسوس کر رہا تھا۔

''نہیں بیٹا..... تم یونہی فیل مت کرو..... ایسی کوئی بات نہیں.....'' مس افضال حقیقت جانتی تھیں اس لیے اسے سمجھا رہی تھیں۔

''آئی نو آنٹی..... یہ میری وجہ سے ہی ہوا ہے.... آئی لو مما..... اینڈ شی لوز می مور دین می..... وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکیں..... اسی لیے یہ سب ہوا ہے..... آپ نہیں جانتی نا.....'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بیٹا...... آپ اتنا محسوس نہ کرو...... سب ٹھیک ہو جائے گا......'' وہ مزید کچھ نہ کہہ سکیں۔ وہ اسے حقیقت بتانا چاہتی تھیں مگر کچھ نہ بتا سکیں۔ کہاں سے شروع کرتی اور کیا بتاتی...... انھیں تو خود بھی صحیح طرح معلوم نہ تھا کہ مس شہلا حیدر نے کیونکر ان کی انسلٹ کی تھی۔

''بیٹا آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں......'' مس افضال نے راز داری سے پوچھا۔

''کس...... کس لیے...... آنٹی......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ڈاکٹر کچھ آپریشن کی بات کر رہے تھے ابھی کلیئر تو نہیں...... مگر ممکن ہے......''

''میرے پاس تو صرف پاکٹ منی ہوتی ہے...... مما کے پاس ہی...... معلوم نہیں ان کے پاس بھی کچھ ہے کہ نہیں......'' ولیم افسردگی سے بولا۔

''اچھا تم پریشان نہ ہو...... میں کچھ کرتی ہوں......'' انھوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

وہ ساری رات ماں کے پاس بیٹھا رہا۔ ان کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ لیکن ڈاکٹر مطمئن نہیں تھے اور انھوں نے کچھ ٹیسٹ کروانے کو کہا تھا۔ وہ بھی فکر مند ہو گیا...... وہ اب ہاسٹل شفٹ ہو چکی تھی۔ مس افضال ان کی بہت دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ وہ بھی ہاسٹل پہنچا تو سب لوگ اسے ناراض ملے مگر جب اس کی مما کا سنا تو سب خاموش ہو گئے۔ پھر کسی نے بھی ٹریٹ کی بات نہ کی وہ اندر ہی اندر بہت پریشان تھا اور بہت چپ چپ بھی۔ آئے نور اس کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''ولیم تم اس قدر پریشان کیوں ہو...... کیا تم اپنی پریشانی مجھ سے شیئر نہیں کرو گے......'' آئے نور نے اس سے ہاسٹل جا کر پوچھا۔

''نہیں......'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''کیوں......؟''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں......''

''ولیم ہم بہت سے کام بغیر فائدے کے بھی تو کرتے ہیں......''

''مثلاً......''

''مثلاً...... مثلاً...... میں جانتی ہوں تمھارے اور میرے راستے جدا جدا ہیں۔ مجھے سب کچھ اچھی طرح معلوم ہے مگر میں بے بس ہوں۔ میرے دل میں تمھارے لیے ایسا جذبہ بیدار ہو چکا ہے جو میرے لیے بہت قیمتی اور شاید تمھارے لیے بہت ارزاں ہو...... میں جانتی

ہوں یہ سب بے فائدہ ہے مگر میں ان خوبصورت یادوں کو..... ان لمحوں کو اپنا خوبصورت ماضی بنانا چاہتی ہوں ایسا ماضی کہ جب مستقبل میں کبھی تھک جاؤں تو اس کی کھڑکی کھول کر تازہ ہوا کے جھونکوں سے تازہ دم ہوسکوں......" آئے نور کی آنکھوں میں دکھ بھی تھا، شکستگی بھی اور ایک چمک بھی۔"

"آئے نور..... تم بھی..... کیا تم بھی ایسا محسوس کرنے لگی ہو...... میں تو سمجھا تھا کہ یہ سب میرا واہم ہے..... کیا ہم دونوں..... اوہ گاڈ......" ولیم کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"ولیم میں اپنے آپ کو بہت سمجھاتی ہوں کہ تم اور میں..... لیکن میں کیا کروں کہ میری حالت اس مچھلی کی سی ہے جو جانتی ہے کہ خشکی پر موت اس کا مقدر ہے مگر خشکی پر جانے کی اس کی تڑپ شدید تر ہوتی جارہی ہے ولیم وہ خشکی کا جزیرہ تم ہو...... میں جانتی ہوں تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں..... تمہاری منزل سے تو میں پہلے دن سے آگاہ ہوں..... لیکن میں بہت بے بس ہوں...... معلوم نہیں تمہارا اور میرا تعلق کیسا ہے اور کیا ہوگا...... چاہے ہمارا انجام کچھ بھی ہو مگر میرا ہر قدم تمہارے ساتھ اٹھے گا...... تم اپنے ہر دکھ سکھ میں مجھے اپنا شریک پاؤ گے..... کیا اب بھی نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں کیا پریشانی ہے؟" آئے نور کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی جس سے اس کے اندر کا خلوص جھانک رہا تھا۔

"نور تم نے مجھے اور پریشان کردیا ہے....." وہ ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری ہر پریشانی شیئر کرنا چاہتی ہوں..... آزما کر تو دیکھو......"

"مما بہت بیمار ہیں اور ڈاکٹروں نے ان کے کچھ ٹیسٹ کروانے کو کہا ہے...... مگر....." ولیم رک سا گیا۔

"مگر کیا......؟"

"نور میں یہ صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ پلیز اسے راز میں رکھنا......"

"ولیم ..... مجھے آئندہ یہ الفاظ مت کہنا...... یہ میری توہین ہوگی۔"

"اوکے...... ہمارے پاس اتنے..... آئی مین اتنے ریسورسز نہیں کہ......"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے..... میرے ایک ملنے والے انکل ادھر ہی جاب کرتے ہیں۔ تم بس فکر مت کرو..... مجھے بتا دینا۔ میں خود آنٹی کو لے کر چلوں گی اور دیکھو میرے سامنے کبھی ہمت نہ ہارنا...... مجھے بولڈ اور نڈر لڑکے اچھے لگتے ہیں..... زندگی میں کچھ بھی مشکل نہیں سوائے ان راستوں کے جہاں ہمیں محسوس ہو کہ خدا ہمارے ساتھ نہیں..... تم

مجھے بس انفارم کر دینا میں تمھیں بھی پک کرلوں گی اور آنٹی کو بھی.....'' وہ اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

''تھینک یو......'' وہ زخمی مسکراہٹ سے بولا۔ اس لمحے اس کا دل کرچی کرچی ہو رہا تھا۔ اس نے سارا بچپن محرومیوں میں گزارا تھا مما سے کبھی بے جا ضد نہیں کی تھی وہ جانتا تھا کہ مما کے پاس کبھی بھی اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ اپنی ضد منوا سکتا۔ اس نے تو ضد ہی کرنا چھوڑ دی تھی اور اب مما کے علاج کے لیے بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ابھی وہ اس قابل ہی نہیں ہوا تھا۔ ایک لمحے کو فادر اس کے ذہن میں آئے مگر دل نہیں مانا تھا۔ فادر کے رویے نے اسے قدرے متنفر کر دیا تھا۔

ورکشاپ میں صرف ایک دن باقی تھا اور فادر اسے صبح سویرے ملنے ہاسٹل آئے۔ وہ سخت غصے میں تھے۔

''ولیم تم اس قدر کیئر لیس ہو گئے ہو...... تمھیں ذرا بھی خیال نہیں کہ تمھیں ورکشاپ میں شرکت کرنی ہے اور تم نے مجھ سے کوئی کونٹیکٹ نہیں کیا۔''

''آئی ایم سوری فادر...... میری مما بہت بیمار تھیں اور مجھے ان کے کچھ خاص ٹیسٹ کروانے ہیں۔''

''وہاٹ ڈو یو مین...... تم ورکشاپ میں شرکت نہیں کرو گے......''

''یس فادر......'' اس نے اچانک اپنا فیصلہ انھیں سنایا۔

''وہاٹ نان سینس...... تم جانتے ہو تمہارا فیوچر کیا ہے......؟''

''نو فادر...... میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میری ماں بہت بیمار ہے اور انھیں اس وقت میری ضرورت ہے......''

''ڈونٹ بی سلی...... کیا تم جانتے ہو تمہارا کتنا بڑا نقصان ہو گا......؟''

''نو فادر...... لیکن اگر مما کو کچھ ہو گیا تو اس سے بڑا نقصان اور میرے لیے کیا ہو گا......؟''

ولیم تم اس قدر بدل گئے ہو...... کیا اس لیے میں تمھیں لاہور لایا تھا؟''

''معلوم نہیں میں بدلا ہوں کہ نہیں مگر آپ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ فادر اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے......؟'' اس نے استفہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''میں...... میں ورکشاپ میں شرکت کرتا......'' وہ قدرے گھبراہٹ میں جھنجھلا کر بولے۔
''سوری فادر مجھ میں نہ تو اتنا اسٹیمنا ہے اور نہ اتنی سوجھ بوجھ۔''
''ولیم...... یو......'' فادر کو اس کی بات پر سخت غصہ آیا اور وہ غصّے سے مٹھیاں بھینچتے چلے گئے۔

وہ مطمئن تھا اس نے جو بھی فیصلہ کیا تھا ٹھیک کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نور آ گئی اور اس نے اسے ساری بات بتائی۔

''تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے...... ظاہر ہے آنٹی کو اس وقت صرف اور صرف تمہاری ضرورت ہے یہ بتاؤ ٹیسٹ کب کروانے ہیں۔ میں نے بات کر لی ہے۔ انکل نے بہت تسلی دی ہے فکر کی کوئی بات نہیں، میں کب آؤں......؟''

''کل چلیں گے...... مگر ابھی تم کہاں جا رہی ہو......؟''

''کہیں نہیں...... یونہی...... مارکیٹ جا رہی تھی تو تمہاری طرف آ گئی۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو، کیا کہیں جانا ہے......؟''

''ہاں...... میں اس وقت شدید اسٹریس میں ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں...... تمھارے ساتھ......''

''ٹھیک ہے...... چلو......''

وہ آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتی ہوئی نہر کے پاس سے گزر رہی تھی۔ شدید ٹھنڈ اور دھند نے اردگرد کو اور بھی خوبصورت بنا رکھا تھا نہر کے یخ پانی سے بھاپ سی اڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی...... دونوں خاموش تھے۔

''ولیم کیا تم فادر کی وجہ سے پریشان ہو......؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔ وہ سیٹ کے ساتھ سر ٹکائے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔

''ولیم میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں......؟''

''کیا......؟'' اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''تم اس قدر پریشان کیوں ہو......؟''

''نور میں نے ساری زندگی پریشانیاں ہی تو دیکھی ہیں مگر کبھی ان کو اپنے اوپر طاری نہیں کیا مگر اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میں جکڑا جا رہا ہوں...... میرا دل، دماغ اور روح سخت اذیت میں ہیں...... سمجھ نہیں آ رہا مجھ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئی ہیں۔''

''تم کیوں ایسا محسوس کر رہے ہو......؟''

''معلوم نہیں...... مگر دل پر ایک بوجھ سا ہے۔ تمھیں معلوم ہے مما میری وجہ سے بیمار ہوئی ہیں، فادر بھی مجھ سے ناراض ہیں اور تم......تم......''

''ولیم میں تو تم سے ناراض نہیں......'' اس نے گاڑی کو ایک دم بریک لگاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں...... مگر میں تمھارے بارے میں بھی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا ہوں۔''

''تم کیوں میرے بارے میں سوچتے ہو...... جبکہ میں جانتی ہوں کہ تمھارے اور میرے راستے کبھی بھی مل نہیں پائیں گے مگر اس سڑک اور نہر کی طرح ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے...... میری جانب سے اپنا ذہن پرسکون کر لو...... مجھے تو تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ مجھے تو صرف اور صرف تم سے بے غرض محبت ہے...... اور ضروری نہیں کہ ہر محبّت اپنا حق بھی وصول کرے......'' وہ پرسکون لہجے میں بولی۔

''مگر میں تو لمحہ بہ لمحہ شیٹرڈ ہو رہا ہوں۔ تم نے تو اپنے آپ کو سمجھا لیا ہے مگر میں...... کس طرح......؟''

''ولیم...... میری ایک بات یاد رکھنا مجھے وضاحتیں دینے والے لوگ سخت ناپسند ہیں۔ اپنے آپ کو مضبوط بناؤ۔ تم جو بات کہو ٹھوس لہجے میں کہو تمھارے لہجے میں مایوسی مجھے غصہ دلاتی ہے۔ میں نے زندگی سے ہارنا نہیں سیکھا مگر میں نے حقیقت سے بھی آنکھیں نہیں چرائیں۔ میں جانتی ہوں میرا اور تمہارا تعلق چاند اور چکور جیسا ہے، جو کبھی نہیں مل سکتے مگر کیا چکور چاند کی محبّت میں اس کی طرف پرواز کرنا چھوڑ دیتا ہے...... جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ کبھی بھی اس کو نہیں پا سکے گا...... وہ ہار نہیں مانتا مگر موت قبول کر لیتا ہے...... میں تمہاری طرف بڑھی ہوں...... جانتی ہوں کہ تم میرا مقدر نہیں۔ مگر...... مگر ایک امید میرے اندر ہے اور وہ مجھے ہارنے نہیں دیتی...... میرے سامنے اپنے بکھرنے کی باتیں کبھی بھی نہ کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی......'' اس نے گاڑی کو ایک دم ریس دی۔

ولیم اس کی باتوں سے گڑبڑا گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ نور یوں بگڑ جائے گی۔ ''آئی ایم سوری......''

''نو سوری...... ایسے الفاظ تمھارے پاس بہت زیادہ ہیں ان کو یوں میرے سامنے کثرت سے استعمال مت کیا کرو...... مجھے ڈھیٹ قسم کے سخت جان لوگ پسند ہیں۔''

وہ مسکرا کر بولی۔

''مجھے لسٹ بنا کر بتا دو کہ تمھیں کس کس قسم کے لوگ پسند ہیں میں ویسا ہی بننے کی کوشش کروں گا......'' وہ بھی مسکرا کر بولا۔

''گڈ...... زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کرو...... اگر پریشانی ہے تو اس کو بولڈلی فیس کرو...... یوں منہ لٹکائے مجنوں بننے سے فائدہ...... ہاں کشکول ہاتھ میں ہو تو خیرات مل سکتی ہے ورنہ دل ہی کڑھتا رہے گا اور اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''اب بولو...... کچھ کھاؤ گے......''

''ہاں...... کافی پیوں گا...... مگر آج پیمنٹ میں کروں گا۔''

''اوکے...... ایز یو وش...... میرے پاس کون سے ڈالرز ہیں...... خوشی سے کیجئے......'' اس نے ایک اوسط درجے کے ریسٹوران کے سامنے گاڑی پارک کی اور دونوں کافی پینے اندر چلے گئے۔

تم کتنی بڑی نعمت ہو...... وہ کافی کے سپ لیتے ہوئے سوچ رہا تھا ورنہ چند لمحے پہلے وہ کتنا ڈسٹرب تھا اور اب بہت حد تک اپنے آپ کو نارمل محسوس کر رہا تھا۔

''ولیم جس دن تم چرچ جوائن کرو گے نا...... وہ ہماری ملاقات کا آخری دن ہوگا...... میں نے یہ سوچ لیا ہے مسٹر...... خیر چھوڑو......''

''بات پوری کرو......'' وہ ایک دم ٹھٹکا۔

''اس بات سے تمہارا کوئی کنسرن نہیں...... جس کا تم سے کنسرن تھا وہ میں نے مکمل کر دی ہے۔''

''نور تم بہت مختلف لڑکی ہو اور بہت مختلف باتیں کرتی ہو۔ تم مجھے اکثر چونکا دیتی ہو......''

''اس لیے کہ مجھے چونکنا اور چونکانا اچھا لگتا ہے......''

''تم ایسی کیوں ہو......؟''

''کیسی......؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''اب بنو مت......''

''ٹھیک ہے...... تو تم بناؤ مت......''

''نور......'' وہ غصے میں جھنجلانے لگا۔

''ہاں..... پرنس......'' دونوں مسکرا دیے۔

''اب بولو...... کہاں چلو گے......؟''

''مجھے مما کے پاس ڈراپ کر دو۔''

''رائٹ سر......'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اسے ورکنگ ویمن ہاسٹل ڈراپ کرنے کے بعد وہ کل دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی اور وہ اس کے بارے میں سوچتا رہ گیا مگر اب اس سوچ میں مایوسی نہیں تھی۔ ہمت تھی اور حوصلہ تھا۔

......✡......

شہلا کا باپ کے ساتھ تناؤ ابھی تک برقرار تھا۔ وہ مبہم انداز میں باپ کے رویے، اس کی حرکات وسکنات، ان کی فون پر باتوں کو مشکوک انداز میں دیکھنے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ شک کا بیج آہستہ آہستہ نشوونما پاتا جا رہا تھا گو کہ حیدر نے مسز پیٹر کے ساتھ ہر طرح کا رابطہ منقطع کر دیا تھا مگر وہ شہلا کو مطمئن نہیں کر پایا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک خلیج تھی جو بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ حیدر بھی بس ضرورت کے تحت اس سے بات چیت کرتا اور وہ بھی اسے زیادہ سے زیادہ نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی۔ انہی دنوں شہلا کے ننھیال سے اس کی خالہ کے بیٹے اسد علی شاہ کا رشتہ آ گیا۔ اسد ایم بی اے کرنے کے بعد مزید پڑھائی کے لیے کینیڈا گیا تھا اور اب پڑھائی مکمل کرنے کے بعد وہ واپس آ رہا تھا۔ اس لیے اس کی ماں اس کے آتے ہی اس کی شادی کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ لوگ سب حویلی آ رہے تھے۔ حیدر نے بھی شہلا کے ساتھ وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔

''پاپا یہ آپ کو اچانک میری شادی کا خیال کیسے آ گیا......؟'' وہ حیدر سے اسد علی شاہ کے بارے میں سن کر تیکھے انداز میں بولی۔

''اس لیے کہ رشتہ انھوں نے اب مانگا ہے...... اگر وہ پہلے مانگتے تو میں پہلے ہاں کر دیتا۔''

''اس کا مطلب ہے آپ اپنے طور پر فیصلہ کر چکے ہیں اور اگر میں انکار کر دوں تو......؟'' اس کی نظروں میں معنی خیز استفہام تھا۔

''تمھیں انکار کرنے کا پورا حق ہے......'' وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ دونوں گاؤں پہنچے تو لوگ ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ بوڑھے اور جوان

آگے بڑھ بڑھ کر حیدر سے ہاتھ ملا رہے تھے اور انھیں چوم رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں شہلا کے سر پر پیار پھیر رہیں تھیں۔ حویلی میں ایک دم شور سا بلند ہوا۔ شفق اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ جب سے وہ حویلی آئی تھی وہ بہت مطمئن اور خوش تھی۔ یہاں ہر طرح کا آرام اور تحفظ تھا۔ وہ بہت پرسکون تھی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا وہ کمرے سے باہر نکلی تو نوکروں کی ادھر اُدھر دوڑ سی لگی تھی۔ اس نے حیرانی سے ایک نوکرانی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ حیدر شاہ اور شہلا بی بی آئے ہیں۔ وہ ان سے اس وقت ملنا چاہتی تھی مگر بشریٰ آپا نے اسے منع کر دیا جو پوری حویلی کی نگران اور حویلی کے سب سے پرانے خادم جمال بابا کی بیٹی تھیں۔ بشریٰ آپا اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ حویلی کے ساتھ منسلک ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی مگر سارا دن وہ حویلی کے کاموں میں گزارتی تھیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی شہر سے حویلی آیا ہی رہتا۔ تمام نوکر چاکر اناج اور جانوروں کی دیکھ بھال کے علاوہ ہر نئے مسئلے سے حیدر کو آگاہی بشریٰ آپا کی ہی ذمہ داری تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی نرم دل خاتون تھی شفق کے ساتھ بھی وہ بہت محبت سے پیش آتیں۔ سب لوگ انھیں آپا ہی کہہ کر بلاتے تھے۔ بشریٰ آپا کے کہنے پر وہ رک گئی۔

''مگر آپا میں ان سے ملنے کب جاؤں گی......؟ وہ قدرے بے صبری سے بولی۔

''وہ آرام کر لیں۔ کھانا وانا کھا لیں اس کے بعد . . .

''ٹھیک ہے...... پھر آپ مجھے ان سے ضرور ملوا دیجئے گا......

''اچھا بابا...... تم اداس کیوں ہو رہی ہو...... وہ ادھر ہی ہیں۔ ہم سے مل کر ہی جائیں گے۔''

''آپا ان کے آنے پر ہر دفعہ یونہی رونق اور گہما گہمی ہو جاتی ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... اور نہیں تو کیا۔ وہ گاؤں کی بڑی سرکار ہیں۔ ان کے آنے سے تو گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے......''

''اور شہلا بی بی...... وہ کیسی ہیں......؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''بہت سوہنی...... بہت اچھی...... جیسا باپ ویسی بیٹی ...... اللہ ان دونوں کو لمبی حیاتی دے دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ غریب غربا کے تو مائی باپ ہیں۔''

''یہ لوگ یونہی اچانک گاؤں آتے ہیں......'' اس نے پھر سوال کیا۔

''ہاں...... اور نہیں تو کیا، ان کا اپنا گھر بار ہے جب دل چاہتا ہے آ جاتے ہیں۔ ان کو بھلا کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اچھا اب میں باورچی خانے میں جا کر انتظام

وغیرہ دیکھوں۔'' وہ چادر سر پر اوڑھتے ہوئے بولیں۔

رات گئے تک وہ منتظر رہی مگر کوئی بھی اسے بلانے نہ آیا اور نہ شہلا اس طرف آئی۔ اگلے دن صبح سویرے وہ پھر بشریٰ آپا کے پاس کچن میں چلی گئی۔

''آپا آپ نے تو کہا تھا کہ میں رات کو ان سے مل سکتی ہوں مگر آپ نے مجھے بلایا نہیں......''

''ہاں......کہا تو تھا مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ لوگ کس ارادے سے آئے ہیں......؟''

''کیا مطلب......کس ارادے سے؟''

''ارے بھئی......شہلا بی بی کے رشتے کے سلسلے میں۔ ان کے ننھیال سے آج لوگ ادھر اکٹھے ہو رہے ہیں اور آج بھی سب بہت مصروف ہیں۔''

''کیا شہلا بی بی کی شادی ہو رہی ہے......؟''

''معلوم نہیں......ابھی تو رشتے کے لیے آ رہے ہیں۔ آگے کیا ہوتا ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

''کیا شہلا بی بی خوش ہیں......؟''

''پتا نہیں......کچھ اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی ہیں۔ اس سے پہلے تو کبھی بھی وہ ایسی نہیں لگیں۔ معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے......''

''رشتہ پسند نہیں ہو گا......''

''اونہوں......ایسی بات بھول کر بھی نہ کرنا۔ اس خاندان میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ ایسی آزاد باتیں وہ شہر میں ہی چھوڑ آتے ہیں۔ اگر پسند نہ ہوتا تو وہ گاؤں نہ آتے، بات کچھ اور ہے۔ مجھے تو وہ کچھ حیدر سائیں سے ناراض لگی ہے۔ اللہ بہتر کرے......'' وہ کچن میں اِدھر سے اُدھر مسلسل چکر لگا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں۔

''تم جا کر آرام کرو......جیسے ہی وہ مجھے فارغ نظر آئے میں تمھیں بلوا لوں گی۔''

''ٹھیک ہے آپا......'' وہ بے دلی سے اٹھ کر چلی گئی۔

دوپہر تک اور مہمان آ گئے۔ شہلا کی خالہ، خالو اور ان کے عزیز و اقارب سب اکٹھے ہو کر حیدر سے شہلا کا ہاتھ مانگنے آئے تھے۔ حیدر نے پھر شہلا سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے پاپا جیسے آپ مناسب سمجھیں اور ویسے بھی اب ہمارے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ میرا شادی کر لینا ہی بہتر ہے۔''

''یہ محض تمہارا وہم اور اپنی سوچ ہے وگرنہ ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی میں کسی بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں اگر تمھیں یہ رشتہ منظور ہے تو میں ہاں کر دیتا ہوں۔ میں زبردستی کا قائل نہیں۔ سوچ لو...... پھر مجھے جواب دے دینا۔'' حیدر کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔

''شاہ جی...... شفق بی بی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔'' اسی لمحے بشریٰ آپا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں تو شہلا نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

''ہاں بلالو اسے اور اسے یہاں کوئی مسئلہ تو نہیں......؟'' حیدر نے پوچھا تو شہلا کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

''نہیں...... شاہ جی...... آپ اس سے خود پوچھ لیں۔'' بشریٰ آپا کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ شہلا استفہامیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی مگر کچھ نہ بولی اور نہ ہی انھوں نے کچھ بتانا مناسب سمجھا۔ تھوڑی دیر بعد شفق کمرے میں داخل ہوئی۔ خوبصورت، دراز قد، نازک سی لڑکی، شہلا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''السلام علیکم انکل......''

''وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہیں آپ...... سب ٹھیک تو ہے نا...... کوئی تکلیف تو نہیں آپ کو یہاں؟'' حیدر نے جلدی جلدی سارے سوال ایک دم پوچھ ڈالے۔

''نہیں انکل...... میں بہت آرام سے ہوں بس آپ سے کچھ کہنا تھا......''

''ہاں کہو...... کیا کوئی خاص بات ہے......؟''

''انکل...... وہ...... میں......'' وہ شہلا کی موجودگی میں ہچکچا رہی تھی۔

''اچھا...... اس وقت میں جلدی میں ہوں آپ مجھے موبائل پر رنگ کر کے بتا دینا آپ کے پاس اپنا موبائل تو ہے نا......''

''جی انکل......''

''ٹھیک ہے بیٹا...... اللہ حافظ۔'' انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ شہلا کے ساتھ خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

شہلا کا موڈ سخت آف تھا۔ رشتے کی نوعیت تو کچھ کچھ سمجھ میں آ گئی تھی مگر پاپا نے کبھی بھی چھوٹے سے چھوٹا کام اس سے ڈسکس کیے بغیر نہیں کیا تھا۔ ایک لڑکی نہ جانے کب سے حویلی میں رہ رہی تھی اور اسے خبر تک نہ تھی۔ اس کا مطلب ہے پاپا اب آہستہ آہستہ خود ہی اسے اپنے سے دور کر رہے تھے۔ ان کے دل میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں...... اس نے

شوہروں کو بھائیوں کو اور بیٹوں کو بدلتے تو سنا تھا مگر باپ کو بدلتے خود دیکھ لیا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے ساتھ صرف اس عورت کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ وہ سارا راستہ گاڑی میں خاموش بیٹھی رہی۔ نہ حیدر نے اس سے کوئی بات کی اور نہ ہی اس نے...... گھر پہنچتے ہی اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ شادی کے لیے راضی ہے اور جلد از جلد شادی کرنا چاہتی ہے۔

حیدر کے لیے یہ اچنبھے کی بات نہ تھی وہ جانتا تھا کہ وہ غصّے میں یہ سب کر رہی ہے مگر وہ اسد علی شاہ کی طرف سے مطمئن تھا اس لیے غصّے کی کوئی پروا نہ کی اور اس کی خالہ زبیدہ کو فون کر کے مبارکباد دے دی۔

اسد علی شاہ ایک ہفتے تک پاکستان پہنچ رہا تھا اور اس کے آنے کے دو دن بعد شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ شادی گاؤں میں ہی ہونا طے پائی۔ حیدر نے تبسم اور فاطمہ آپا کو بھی فون کر کے اطلاع دے دی اور انھیں جلد آنے کو کہہ دیا تا کہ شادی کی تیاری میں وہ شہلا کی مدد کر سکیں کیونکہ اس کی ماں تو موجود نہیں تھی اور سارے کام حیدر کے ذمے ہی تھے۔ شہلا بھی بجھی بجھی اور بہت اداس تھی۔ اس نے اپنی ساری سرگرمیاں ختم کر دیں تھیں صرف ضروری کام کے سلسلے میں باہر نکلتی۔ حیدر نے اسے شاپنگ کے لیے کہا مگر وہ پھر بھی نہ مانی۔ بہت دنوں کے بعد اس کا موڈ اچانک ٹھیک ہوا تھا اور دونوں زیورات کی خریداری کے سلسلے میں باہر گئے۔ حیدر نے اسے فری ہینڈ دے رکھا تھا کہ جو جو اسے پسند ہو وہ خرید لے اور اس نے اپنی پسند کے بہت سے زیورات پیک کروائے۔ حیدر پیمنٹ کرنے لگا تو موبائل بج اٹھا...... اس نے نمبر دیکھا اور ایکسکیوز کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ شہلا نے حیرت سے مشکوک انداز میں باپ کی طرف دیکھا۔ اس کا موڈ پھر آف ہو گیا۔

''ہاں بولو شفق بیٹا کیا بات ہے......''

''انکل...... میں نے آپ سے سہیل کے بارے میں ڈسکس کرنا ہے۔ پاپا نے خواہ مخواہ اسے پھنسا دیا ہے اور وہ اپنی ماں اور بہنوں کا اکلوتا سہارا ہے۔ انکل وہ بے قصور ہے۔ پاپا نے اپنی پوزیشن بچانے کے لیے اسے مہرے کے طور پر استعمال کیا ہے اور مجھے یقین ہے اس کے گھر والوں کی بھی خبر نہیں لی ہو گی۔ انکل پلیز آپ سہیل کے لیے کچھ کریں...... اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی......''

''ٹھیک ہے تم مجھے ان کا ایڈریس بتا دو اور سہیل سے میں خود جیل میں ملنے جاؤں گا۔''

''شکریہ انکل...... آپ بہت اچھے ہیں۔''

''اوکے بیٹا خدا حافظ......'' وہ موبائل آف کر کے اندر آیا تو شہلا نے سارے زیورات واپس رکھوا دیے تھے اور سخت غصّے میں بیٹھی تھی۔

''پاپا چلیں...... مجھے یہ زیورات پسند نہیں۔''

''کیوں کیا ہوا......تم نے سارے زیورات خود پسند کیے تھے اور میں ابھی پیمنٹ ہی کرنے والا ہوں بھئی آپ نے ہماری بیٹی کو کیوں ناراض کر دیا۔'' وہ سیلز مین سے مخاطب ہو کر بولا۔

''سر ہم تو خود حیران ہیں۔ میڈم پیکنگ کے بعد انھیں واپس کر رہی ہیں۔ ہم نہیں جانتے وہ کیوں ناراض ہوئی ہیں۔''

''آپ انھیں دوبارہ پیک کروا کے گاڑی میں رکھوا دیں اور بل مجھے دے دیں۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے......'' وہ غصّے سے پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ حیدر نے خاموشی سے پیمنٹ کی اور باہر آ گیا۔

''شہلا یہ کیا حرکت ہے......تم کیوں ایسا کر رہی ہو......؟'' حیدر خفگی سے بولا۔

''میں نہیں جانتی پاپا......لیکن جب بھی اس عورت کا فون آتا ہے میرا دل جلنے لگتا ہے اور خون کھولنے لگتا ہے......'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''کس عورت کا......؟'' حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہی مسز پیٹر کا......''

''کیا مطلب...... کیا تم اس سے ملی ہو؟'' حیدر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔

''ہاں...... میں اس سے ملی تھی......''

''تم نے اس سے کوئی......'' جواباً وہ خاموش رہی......

''شہلا مجھے تم سے ایسی باتوں کی قطعی امید نہیں تھی۔ تم عورتیں کیسی مخلوق ہو۔ بغیر حقیقت جانے ایک دوسرے سے حسد کرنے لگتی ہو اور بعض اوقات اس رقابت میں ایک دوسرے کا کتنا بڑا نقصان کر دیتی ہو، میں اپنے آپ پر فخر کرتا رہا کہ میں نے اپنی بیٹی کی ایسی تربیت کی ہے کہ وہ جہاں بھی جائے گی میرا سر فخر سے بلند کرتی جائے گی اور شہلا تم اس قدر...... مائی گاڈ مجھے یقین نہیں ہو رہا......اور......اور......تم جانتی ہو اس وقت کس کا فون تھا۔ شفق کا گاؤں سے فون تھا۔ وہ بیچاری اپنا ایک مسئلہ ڈسکس کر رہی تھی۔ لو دیکھو...... دیکھو یہ

نمبر..... ہے' اس نے شفق کا نمبر اسے دکھاتے ہوئے موبائل اس کی گود میں پھینکا اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگا...... اسے سخت دکھ ہو رہا تھا۔ ایسا دکھ زندگی میں کبھی بھی اس نے محسوس نہیں کیا تھا جو وہ اب کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ایک دو دفعہ اس نے بری طرح اوور ٹیک کرنے کی کوشش کی۔ شہلا پشیمان اور شرمندہ سی اپنی جگہ بیٹھی تھی۔

''آئی ایم سوری پاپا......'' اس نے گاڑی سے نکلتے ہوئے کہا۔ حیدر جواباً خاموش رہا اور اس کے بعد اس نے شہلا سے کوئی بات نہ کی۔ اسے شہلا کی اس حرکت پر سخت افسوس تھا کہ وہ نفرت اور حسد میں اس حد تک دور نکل گئی تھی کہ اس نے باپ کے احساسات کی بھی پروا نہیں کی اور اس نے قدم قدم پر بیٹی کے احساسات کی پروا کی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی برسوں کی محنت اکارت گئی ہو۔ شہلا حیدر اس کی سوچ سے کتنی مختلف نکلی تھی۔ وہ ایسی نہ بن سکی تھی جیسا اس نے بنانا چاہا تھا۔ انسان کے اندر کیا کچھ ہوتا ہے اور کیا کیا پکتا رہتا ہے دوسرا انسان کتنا لاعلم رہتا ہے وہ تو اس کی بیٹی تھی اور اس کی بظاہر تربیت کر کے وہ سمجھا تھا کہ وہ اس کو اپنی سوچ کے قالب میں ڈھال چکا ہے مگر وہ تو بہت مختلف نکلی تھی۔

شہلا اپنے کمرے میں بند تھی اور حیدر اپنی سوچ میں گم تھا۔ دونوں کے درمیان گہری خاموشی اور سرد مہری کی وسیع خلیج حائل تھی۔ فاطمہ آپا اور تبسم آپا دونوں آ چکی تھیں اور شادی کی تیاریوں میں گرم جوشی سے حصہ لے رہی تھیں۔ زیورات اور ملبوسات کے علاوہ بقیہ جہیز کی ساری تیاری ان کے ذمے تھی۔ دونوں صبح سے شام تک بازار کے چکر لگاتی رہتیں۔

حیدر کو شہلا کی حرکت پر افسوس کے ساتھ ساتھ دکھ بھی تھا۔ اس نے تو مڑ کر شہلا کی خبر بھی لی تھی۔ اس سے کوئی کونٹیکٹ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے شہلا کی خفگی کے پیش نظر اور مغیث بھائی کے سمجھانے پر دوبارہ اس سے سارے رابطے منقطع کر دیے تھے اور اب شہلا کی زبانی اس سے ملاقات کی خبر ہوئی تو وہ جاننا چاہتا تھا کہ شہلا نے اس سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تھی نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ شہلا نے ضرور کوئی نہ کوئی بات اس سے کہی ہوگی کیونکہ شہلا کے تیور اور اس کے بات کرنے کے انداز سے ہی اس نے اندازہ لگا لیا تھا اور اب وہ اس سے جلد از جلد رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے موبائل پر فون کیا مگر فون آف تھا۔ اس نے ہاسٹل فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ باہر گئی ہے شام کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت خراب ہے وہ فون نہیں سن سکتی۔ اسے یہ سن کر قدرے تشویش ہوئی۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا مگر ہاسٹل میں نہیں...... کہیں باہر...... اور اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے اس

سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اگلے دن صبح سویرے ہاسٹل پہنچ گیا۔ انچارج ابھی نہیں آئی تھی۔ مس افضال سے ہی ملاقات ہو گئی۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھتا رہا۔ مس افضال جانتی تھیں کہ وہ سر پرائز وزٹ کا عادی تھا شاید اسی لیے صبح سویرے پہنچ گیا ہے۔

''مسز افضال...... میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتا ہوں؟''

''جی فرمایئے......''

''کچھ روز پہلے شہلا حیدر ہاسٹل وزٹ کے لیے آئی تھیں تو انھوں نے کس چیز پر زیادہ زور دیا۔ آئی مین کس چیز کی ڈیویلپمنٹ کے بارے میں...... کیونکہ میرے ساتھ ان کی تفصیلاً بات نہیں ہو سکی اور ویسے بھی ایک ہفتے بعد ان کی شادی ہے اور شادی کی مصروفیت میں ایسے معاملات تو زیرِ بحث نہیں لائے جاتے میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ آپ لوگوں کی خیریت بھی دریافت کرلوں۔ مجھے ان کے وزٹ کا تو علم تھا مگر تفصیلات ڈسکس نہیں ہو سکیں۔'' وہ قدرے رک رک کر بولا۔

''مس شہلا اچانک ہی مسز پیٹر سے ملنے آئی تھی اور بس ان سے ملنے کے بعد چلی گئیں۔'' مس افضال نے نارمل لہجے میں بتایا۔

''مسز پیٹر سے...... مگر کیوں...... کیا کوئی خاص بات تھی؟''

''معلوم نہیں...... ان کے کمرے میں ہی ان سے کچھ بات ہوئی اور...... اس کے بعد......''

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' وہ بے چینی سے بولا۔

''اس کے بعد مسز پیٹر بہت پریشان تھیں اور پھر بیمار پڑ گئیں۔ ان کو برین ہیمرج ہو گیا......''

''کیا......؟'' حیدر کو سخت غصہ آ رہا تھا مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔

''اور اب تو بیچاری...... ڈاکٹر ان کے بارے میں پریشان ہیں۔ برین ہیمرج کا بہانہ بنا ہے۔''

''اب کیا ہوا ہے......؟''

''ڈاکٹرز نے ٹیسٹ کروانے کو کہا...... اور ان کی رپورٹس بھی اچھی نہیں آئیں۔''

''کیا مطلب......؟''

''ان کو برین ٹیومر ہے......اور ستم ظریفی دیکھیے بیچاری کے پاس اتنے ریسورسز بھی نہیں کہ وہ علاج کرواسکیں۔ بیٹا تو ابھی خود تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ہم لوگ اپنے طور پر کوشش تو کر رہے ہیں مگر آپ کو تو معلوم ہے کہ اس علاج میں بہت پیسہ چاہیے...... اچھا ہوا آپ آ گئے اور میری آپ سے بات ہوگئی۔ سر اگر ممکن ہو سکے تو انسانیت کے ناتے ہی ان کی مدد کر دیجیے......'' مس افضال نے ہمدردی سے کہا تو حیدر کے لیے مزید وہاں رکنا محال ہو گیا۔

''ٹھیک ہے میں پھر آؤں گا......'' وہ دروازے کی طرف منہ کر کے جلدی سے باہر نکل آیا۔ گاڑی میں آ کر اس نے رومال اپنی آنکھوں پر رکھا۔ جیسے ہی رومال نے آنکھوں کو چھوا نہ جانے کہاں سے آنسو بغیر کسی رکاوٹ کے رومال میں جذب ہوتے رہے۔ مس افضال کے الفاظ مسلسل اس کے کانوں میں گونج رہے تھے......''انسانیت کے ناتے ان کی مدد کر دیجیے۔'' اسے اس پر، اس کی قسمت پر شدید دکھ ہو رہا تھا۔ اس نے تو مس افضال سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس وقت وہ کہاں تھی وہ اس کے بارے میں اس قدر ڈپی ہو چکا تھا کہ اس کا سامنا کرنے سے بھی گھبرا رہا تھا۔ وہ کافی دیر یونہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ وہ کسی سے سب کچھ ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔ شہلا کو ڈانٹنا چاہتا تھا مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شہلا پہلے ہی ناراض تھی اور......اس کا سامنا کرنے کی اس میں ابھی ہمت نہ تھی وہ اپنے حوصلے کو یکجا کرنا چاہتا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اندر ہی اندر شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ گھر پہنچا تو اطلاع ملی کہ اسد علی شاہ پاکستان پہنچ گیا ہے اور اسی شام ان لوگوں نے حیدر اور اس کی دونوں بہنوں کو کھانے پر انوائیٹ کیا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس سے ملنے کا موقع ضائع ہو گیا۔

''حیدر تم مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہو۔'' تبسم آپا نے راستے میں اس سے پوچھا۔

''نہیں......ٹھیک ہوں آپا......ایسی کوئی بات نہیں۔''

''بیٹی سے جدائی کا دکھ ہوگا۔'' فاطمہ آپا مسکرا کر بولیں۔

''شہلا بھی مجھے ناراض ناراض لگ رہی ہے، حیدر بھائی کیا ابھی تک وہ......؟''

''معلوم نہیں......شاید......'' حیدر آہستہ سے بولا۔

''اس کا کیا حال ہے......؟'' تبسم آپا نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''معلوم نہیں......''

''کیوں تم اس سے ملے نہیں......؟''

''نہیں......''

''کون...... اور آپ لوگ کس کی باتیں کر رہے ہیں؟'' فاطمہ آپا بے صبری سے بولیں۔ دونوں جواباً خاموش رہے۔ تبسم آپا نے حیدر کی طرف دیکھا اور حیدر نے آپا کی طرف......مگر کوئی بھی کچھ نہ بولا۔

''آپ شہلا کی بات تو نہیں کر رہے......'' فاطمہ آپا جلد ہی بھانپ گئیں۔

''ہاں'' حیدر نے جواب دیا۔

''کیا وہ پاکستان میں ہے......؟''

''ہاں......''

''کیسی ہے وہ...... سچ مجھے بہت یاد آتی ہے بہت اچھا وقت اس کے ساتھ گزارا ہے۔ بڑی پیاری سی بہن تھی ہماری...... آپا کسی روز اس سے ملنے نہ چلیں۔'' فاطمہ آپا کی طبیعت میں ابھی تک جلد بازی اور بے پروائی سی تھی۔ دونوں پھر خاموش رہے۔

''ویسے حیدر تم بھی ابھی تک اسے نہیں بھلا پائے......'' فاطمہ آپا نے مسکراتے ہوئے مذاقاً کہا تو دونوں نے قدرے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

''فاطمہ......تم کس قدر غیر سنجیدہ باتیں کر رہی ہو۔تم ابھی تک نہیں بدلیں۔ وہ بیٹی کی شادی کر رہا ہے اور تم کیا قصے لے کر بیٹھ گئی ہو۔'' تبسم آپا نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''آپا تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہیومن نیچر ہے۔ انسان کے اندر کے احساسات اور جذبات تو نہیں بدلتے نا...... چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

''لیکن بعض اوقات وقت اجازت نہیں دیتا کہ ایسی باتوں کو ڈسکس کیا جائے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس بات کا ذکر نہ ہی کیا جائے اور سنو شہلا کے سامنے بالکل ہی ذکر نہ کرنا۔'' تبسم آپا نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

حیدر خاموشی سے سنتا رہا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ تبسم آپا سے سب کچھ ڈسکس کرے۔ تبسم آپا کے ساتھ شروع سے اس کی بہت انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ وہ اسے تائی اماں کی طرح ہی ٹریٹ کرتی فاطمہ آپا اور تبسم آپا میں دس سال کا فرق تھا اور حیدران دونوں سے چھوٹا تھا جب اس کے والدین حادثے کا شکار ہو گئے۔ حیدر صرف چھ ماہ کا تھا جب تایا ابا نے اس کی ذمے داری سنبھالی۔ تائی اماں اس وقت کافی بوڑھی ہو چکی تھیں اور تبسم آپا کالج جاتی تھیں۔ تب سے حیدران کے ساتھ بہت اٹیچڈ تھا۔ شہلا اور حیدر کو تبسم آپا نے بہت محبت سے پالا تھا۔ دونوں کی عمروں میں صرف چند ماہ کا فرق تھا۔ آپا ایک طرف حیدر کے منہ میں فیڈر

دیتیں ایک طرف شہلا کے...... اور ان دونوں کے درمیان تکیہ رکھ دیتیں مگر دونوں تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوئے ہوتے۔ ایک دوسرے کے فیڈرز چھینتے۔ آپا ہر رات دونوں کو اپنے پاس لٹا کر کہانیاں سناتیں۔ ان کے جھگڑے نمٹاتیں۔ فاطمہ آپا ان دونوں سے بڑی تھیں اس لیے اکثر انھیں ڈانٹتی رہتیں، وہ بھی بہت پیار کرتیں مگر ان کے پیار کا انداز مختلف تھا وہ پہلے مارتیں، ڈانٹتیں پھر مناتیں اور پیار کرتیں۔ تبسم آپا کی محبت میں صرف ٹھنڈک اور سکون تھا جبکہ فاطمہ آپا کی محبت میں مذاق اور مار کٹائی زیادہ تھی۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے دونوں میں لڑائی جھگڑا کم ہوتا گیا اور شدید محبت پیدا ہوگئی۔ حیدر نے جب کالج سے آنا ہوتا تو تبسم آپا کی جگہ وہ جاگتی رہتی۔ اس کے کھانے پینے اور ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ ان کی اس محبت کو فاطمہ آپا بھرپور انداز میں انجوائے کرتیں۔ کبھی شہلا کو لیلیٰ کہہ کر پکارتیں اور اسے مجنوں...... وہ حیدر سے بھی سرِ عام مذاق کرنے سے باز نہ آتیں اور وہ مسکرا کر باہر نکل جاتا۔ تبسم آپا، فاطمہ آپا کو اکثر ان باتوں پر ڈانٹتیں مگر وہ بھرپور قہقہے لگاتی ہوئی باہر نکل جاتیں یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا ملاپ نہیں ہوگا۔

ہر کوئی ذہنی طور پر تیار تھا کہ حیدر کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد شہلا ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے گی مگر سید صاحب کے اچانک فیصلے نے سب کو دنگ کر دیا۔ ہر کوئی سوچ میں پڑ گیا کہ دونوں کیسے ایک دوسرے کے بغیر جی پائیں گے۔ اس واقعے کے بعد حیدر نے جو سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا اور اپنی زندگی سے خوشیوں اور مسرتوں کو خیر باد کہا تو پھر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس کے سامنے کسی بھی بات کا ذکر کیا جاتا۔ فاطمہ آپا ساہیوال بیاہی گئیں۔ کبھی کبھار گاؤں آنا ہوتا اور اکثر دونوں بہنوں کی ملاقات ہی نہ ہونے پاتی۔ یہ موقع ایسا تھا کہ حیدر نے دونوں کو بلا لیا اور حیدر کی محبّت میں دونوں گھر بار چھوڑ کر آ گئی تھیں۔ تبسم آپا حیدر سے اپنی اولاد جیسی محبت کرتی تھیں۔ اس کے احساسات کو سمجھتی تھیں اور ہر قدم پر اس کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھتی تھیں۔ اندر سے تبسم آپا بھی شدید متمنی تھیں کہ شہلا سے ملاقات ہو۔ وہ اسے دیکھنا اور پیار کرنا چاہتی تھیں مگر حیدر کے سامنے کوئی بھی ایسی بات کر کے وہ اس کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھیں۔ حیدر بھی ان سے اس کی باتیں کرنا چاہتا تھا اور انھیں اس سے ملوانا چاہتا تھا مگر مغیث بھائی کے سمجھانے پر اب وہ ان کے سامنے بھی کوئی بات نہیں دُہرانا چاہتا تھا اور پشاور میں گھر سے رخصت کرتے وقت آپا نے بھی تو یہی کہا تھا کہ ماضی جب کہیں دفن ہو چکا ہے اسے دفن ہی رہنے دو۔ اسے کرید کر حال کو قبرستان مت بناؤ۔ اس

نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس سے رابطہ نہیں کرے گا اور اسی لیے واپس آنے کے بعد اس نے شہلا کو کبھی فون نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی قسم کا رابطہ کیا تھا۔ وہ آپا کی کہی ہوئی باتوں کا بہت احترام کرتا تھا۔ ماں جیسی بہن کا وہ دل سے معتقد تھا۔ ان کا کہا نہ کبھی ٹالا تھا اور نہ ہی رد کرنے کی کوشش کی تھی۔

اسد علی شاہ سب کو بہت پسند آیا۔ وہ شہلا کے لیے بہترین میچ تھا۔ شادی کی تاریخ تو پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ بس دوسری اہم باتیں ڈسکس کرنا باقی تھیں۔ شادی کی تیاریاں بھی تقریباً مکمل تھیں۔ حیدر کی مصروفیات میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا مگر وہ اس کے ذہن میں تھی۔ بار بار فون ملاتا مگر جواب ندارد شادی سے فارغ ہو کر وہ جلد از جلد اس کے پاس جانا چاہتا تھا مگر اس دوران ہی اس نے مس افضال کو دو لاکھ کا چیک بھجوایا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہ کریں۔

٭

آفاق کئی روز سے گھر نہیں آیا تھا۔ ملک منصور الیکشن کے سلسلے میں دن رات مصروف تھا۔ کئی بار شزا کو بھی جلسے اٹینڈ کرنا پڑتے۔ سحر گھر میں بیٹھے بیٹھے سخت بور ہو گئی تھی۔ شام ہو رہی تھی اس نے کلب جانے کا سوچا۔ آج وہاں اچھی خاصی گیدرنگ تھی۔ وہ حیران تھی کہ آج ایسی کیا خاص بات ہے کہ سب خواتین یوں جمع تھیں۔ مسز زبیر نے اسے دیکھ کر بیہودہ سا نعرہ لگایا تو سب نے ان کا ساتھ دیا اور ایک گونج دار قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

''بہت دنوں بعد یہ چاند ادھر نکلا ہے...... کوئی خیر خبر ہی نہ دی کہ آج کل چاند کی اس چاندنی سے کون لطف اندوز ہو رہا ہے۔'' مسز زبیر نے اسے اپنے قریب جگہ دیتے ہوئے کہا۔

''مسز زبیر چھوڑیے بھی...... یہ تو بتایئے آج اتنی رونق کس سلسلے میں ہے۔ کیا کوئی اہم بات ہے یا پھر ملک میں کوئی آفت آ گئی ہے کیونکہ ایسی گیدرنگ یا تو ملک وقوم کے ساتھ خالی خولی ہمدردی کے لیے ہوتی ہے یا پھر کسی اور اہم بات کے لیے......'' اس نے آنکھ دبا کر کہا اور مسز زبیر کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''یار تم بھی کمال کرتی ہو...... میں تمھیں فون کرنے کا سوچ ہی رہی تھی تم نے بھی رابطہ نہیں کیا۔ بڑی زبردست خبریں ہیں۔ تمھیں معلوم ہے مس حیدر کی شادی ہو رہی ہے......'' مسز زبیر نے کہا۔

''واقعی...... زبردست...... لیکن یہ سب کب اور کیسے ہو رہا ہے......؟''

''کیوں بھی یہ ناممکنات میں سے تو نہیں جو تم یوں چونکی ہو......'' مسز اکمل اپنی لے میں بولیں۔ وہ ہر ایک کو تنک کر جواب دینے کی عادی تھیں اس لیے کوئی بھی ان سے زیادہ فری ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔

''دراصل......اچانک اچھی خبر سن کر انسان چونک ہی جاتا ہے نا......'' مسز عبید نے اسے ڈیفنڈ کرنا چاہا۔

''اچھا تو کہاں ہو رہی ہے......''

''اپنے ہی کسی کزن سے......سید لوگ ہیں غیر ذات میں تو جاتے نہیں ورنہ شہلا حیدر کے لیے رشتوں کی کمی تو نہیں تھی......'' مسز عبید نے جواب دیا۔

''ہاں تو اور زبردست خبر کیا ہے......؟'' اس نے سرگوشی کے انداز میں مسز زبیر سے پوچھا۔

''ابھی بتاؤں گی بڑی مسالے دار خبر ہے۔ بس ان لیڈیز کو اِدھر اُدھر ہو لینے دو......'' مسز زبیر نے بھی سرگوشی کی۔

''واقعی کوئی ایسی خبر ہے......''

''ہاں بھئی......تم بھی انجوائے کرو گی۔''

''کہیں پتے بدلنے کی کہانی تو نہیں......'' اس نے طنزیہ انداز میں پچھلی بات دُہرائی۔

''ارے نہیں بھئی......اس سے بھی گرما گرم......ہاں تو مسز اکمل آپ کیا کہہ رہی تھیں......واقعی اس وقت تو ملکی سیاست کا اللہ ہی حافظ ہے......کون جیتے گا کون ہارے گا کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے۔'' مسز اکمل کو انھوں نے طنزیہ انداز میں کہا کیونکہ مسز اکمل کے شوہر دو دفعہ الیکشن ہارنے کے بعد پھر پورے جوش و خروش سے سیاست کے میدان میں اترے تھے اور اب اپنی جیت کے بارے میں بہت پُراعتماد تھے۔ مسز زبیر اِدھر اُدھر کی باتیں لیڈیز کے ساتھ کر رہی تھیں اور وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی کہ کب اسے وہ بات سنائیں جس کے لیے وہ اتنا انتظار کر رہی تھی۔

''مسز زبیر اب سنا بھی چکیں۔'' اس نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

''اچھاؤ آؤ واک کریں......'' اور وہ لان کے ایک کونے میں اسے لے گئیں۔ ''یار بڑے مزے کی خبر ملی ہے......''

''کیا......؟'' بتا بھی دو اب۔''

''حیدر شاہ کی محبوبہ دریافت ہو چکی ہے......''

''کیا مطلب......؟'' اسے جیسے کرنٹ لگا۔

''ہاں بھئی......کوئی مسز پیٹر ہے اور ورکنگ ویمن ہاسٹل میں رہتی ہے...... حیدر شاہ اس کا بڑا پکا عاشق نکلا...... سچ مجھے تو رشک آتا ہے اس عورت پر...... بندہ بھی کیسا زبردست پھانسا...... مجھے تو اس عورت سے ملنے کا کریز ہو رہا ہے......'' وہ حسرت بھرے لہجے میں بولیں۔

''مسز زبیر میں بھی اس سے ملنا چاہوں گی مگر آپ کو یہ ساری خبر کس نے دی......؟''

''لو...... میری خبریں کبھی جھوٹی نہیں ہوتیں اور شہلا کی باپ کے ساتھ ناراضی کی وجہ بھی وہی عورت ہے......''

''واقعی......؟''

''اور نہیں تو کیا...... چلو کسی دن بہانے سے ورکنگ ویمن ہاسٹل چلتے ہیں۔ اس عورت سے ملنے...... میں بس حیدر شاہ کی چوائس دیکھنا چاہتی ہوں۔ کلب کی کئی خواتین نے بڑی کوشش کر دیکھی مگر وہ تو کس کی بات سننا گوارا نہیں کرتا...... اور سناؤ تمھارے ساس سسر کا کیا حال ہے...... آج کل تمہاری ساس الیکشن کمپین میں بہت آگے آگے ہیں...... لگتا ہے تمھارے سسر کے ساتھ ان کی خوب نبھ رہی ہے......'' وہ قہقہہ لگا کر بولی......

''ہاں......ظاہر ہے......ان کی ذات سے ان کو فائدے ہی فائدے ہیں۔''

''اور ہاں تمہارا شوہر آج کل کن چکروں میں ہے......؟'' مسز زبیر کسی کو بخشنے والی نہیں تھیں۔ ہر ایک کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتی تھیں۔

''وہ......وہ بھی ٹھیک ہے......'' وہ گھبرا کر بولی۔

''تمھیں اسے شکنجے میں جکڑنا نہیں آیا۔ بڑے پر پرزے نکال رہا ہے۔ سنا ہے کسی مہ رخ کے ساتھ اس کا چکر ہے...... ہاں...... مہ رخ بھی تو اسی ہاسٹل میں رہتی ہے......تم اپنی رقیب سے مل لینا میں اپنی سے......'' اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

''مسز زبیر کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں......''

''یار......تم میں بھی عقل کی بڑی کمی ہے...... متاثرین حیدر میں ہم بھی تو شامل ہیں۔ بس نہ جانے کیسے...... کب...... کہاں اس شخص سے امپریس سی ہو گئی ہوں مگر وہ تو...... خیر......تم بھی اپنے شوہر کو قابو میں رکھو...... کسی دن مہ رخ آ گئی نا تمھارے گھر...... تو بس تمہاری چھٹی......اور تم وہاں بھی نہیں جا سکو گی جہاں سے آئی ہو......''

مسز زبیر نے ایسا تیر مارا تھا کہ وہ تلملا اٹھی...... مسز زبیر انتہائی کینہ پرور عورت تھی جو ہر وقت قیمتی زیورات، ملبوسات اور خوشبوؤں سے لبریز ہوتی مگر اس کا اندر اتنا سیاہ اور گندہ تھا کہ وہ کسی پر بھی کیچڑ اچھالنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اسی لیے وہ ہر ایک کی کمزوری جاننے کی تاک میں رہتی۔ کسی نہ کسی کی کوئی نہ کوئی بات ایسے وقتوں کے لیے ضرور اپنے پاس محفوظ رکھتی۔ سحر کے لیے وہاں رکنا محال ہو گیا تھا۔ وہ دو چار باتیں کرنے کے بعد خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آئی۔

مسز زبیر اکثر اسے یونہی زچ کیا کرتی تھیں کسی نہ کسی بات کی طرف اشارہ کر کے مگر آج تو حد ہی کر دی تھی ہر بات صاف صاف اس کے منہ پر دے ماری تھی اور خاص طور پر آفاق کے حوالے سے اور اس کے اپنے حوالے سے اسے شدید صدمہ ہوا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مسز زبیر نے بھری محفل میں اس کے ننگے جسم پر چابک مارے ہوں۔ آنسو ایک دم اس کی آنکھوں میں تیرنے لگے...... انسان کہیں بھی چلا جائے ماضی سے فرار ممکن نہیں اور حال ہمیشہ ماضی کی طرف دھکیلتا ہے اور مستقبل دونوں سے جواب طلب کرتا ہے...... انسان کچھ بھی ہو جائے کہیں بھی چلا جائے...... اس کا اصل ہمیشہ منہ کھولے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے......

وہ بار بار آفاق کا نمبر ملا رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ آفاق کو تین دن ہو گئے تھے وہ گھر نہیں آیا تھا اور یقیناً کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہوگی جو مسز زبیر کو خبریں پہنچی تھیں۔ اس کے ذہن میں مسز زبیر کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اس کا ذہن ایک نام پر اٹک گیا تھا۔ ''مہ رخ...... آفاق اور مہ رخ......''

گھر بالکل سنسان ہو رہا تھا۔ باہر لان میں کہیں کہیں روشنی تھی۔ چوکیدار گیٹ پر تھا۔ اتنے بڑے گھر سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔ رات کی تاریکی میں جیسے جیسے اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے ہر شے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایسی تنہائی، ایسا خوف کبھی بھی زندگی میں محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی۔ وہ کسی سے بات کرنا چاہتی تھی مگر کوئی بھی تو ایسا نہ تھا...... یہ کیسا گھر تھا جہاں ایک دوسرے سے بات کرنے کو ترسے...... کوئی بھی کسی کے ساتھ وفادار نہ تھا ہر کوئی مفاد کا بندہ تھا۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہ تھی۔ نہ محبت نہ الفت شاید نفرت بھی نہیں...... وہ زندگی میں پہلی دفعہ اس گھر میں کھل کر روئی...... دھاڑیں مار مار کر...... اپنی بے بسی پر...... اپنی تنہائی پر اور شاید اپنی بے عزتی پر...... اس نے چرس سے بھرے دو تین سگریٹ پیے...... وہ آج اپنے آپ کو ختم کرنا چاہتی

تھی۔ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ نہ جانے کس وقت آفاق آیا...... اسے کوئی ہوش نہ تھا، آفاق خود بھی تو نشے کی کیفیت میں تھا اسے کسی کی کیا پروا...... صبح دیر سے اس کی آنکھ کھلی تو آفاق اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔

''آفاق تم کب آئے......؟'' اس نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں......'' وہ مدہوشی کے عالم میں بولا۔

''کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم کتنے دنوں بعد گھر آئے ہو......؟''

''مجھے نہیں معلوم......''

''تو تمھیں کیا معلوم ہے......؟''

''کچھ نہیں......'' وہ پھر سو گیا۔

''اس کے پاس جب ہوتے ہو تو تمھیں سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔'' وہ غصے میں بولی۔

''تنگ مت کرو...... چپ کر جاؤ اور مجھے سونے دو۔''

''نہیں سونے دوں گی...... تم نے میری نیندیں حرام کر دی ہیں اور میں تمھیں آرام سے سونے دوں۔''

''منگتی دفعہ ہو جاؤ یہاں سے......'' آفاق نے سوئے سوئے انداز میں کہا۔

''کیا بکواس کی تم نے......'' اس نے آفاق کو جھنجوڑ کر اٹھایا اور اس کا بازو مروڑا...... غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا...... اس کا اصل...... اس کا ماضی بار بار سامنے آ رہا تھا......

''تم...... تمہاری یہ جرأت......'' آفاق نے اٹھ کر گھونسوں سے اس کی تواضع شروع کی تو رکنے میں نہ آ رہا تھا۔

''تم آج مجھے ختم ہی کر دو...... تا کہ یہ قصہ ہی پاک ہو۔'' اس نے چاقو آفاق کی طرف پھینکا۔

''تم کیا سمجھتی ہو...... تمھیں مار کر میں اپنے آپ کو عذاب میں ڈالوں اور سنو تمھیں بھی میں یوں آسانی سے مرنے نہیں دوں گا...... تمہاری بوٹیاں کتوں کے آگے ڈال دوں گا مگر تمھیں پھر بھی مرنے نہیں دوں گا۔''

''تم میرا قصور تو بتاؤ...... آخر تم کیوں اتنے سفاک ہو گئے ہو؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''میں تم سے...... اور تمھارے جیسی سب عورتوں سے نفرت کرتا ہوں۔ تم عورتیں صرف تباہ و برباد کرتی ہو......''

''اور مہ رخ...... مہ رخ......''

''ہاں...... ہاں...... اس سے بھی نفرت کرتا ہوں۔'' وہ غصے سے چلایا۔ اور اسے جیسے ایک دم سکون مل گیا ہو جیسے اس کے جلتے کلیجے پر ٹھنڈی پھوار سی پڑ گئی ہو۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھی......

''آفاق...... تم میرے ساتھ جو مرضی کرلو...... میری بوٹیاں بھی کتوں کے آگے ڈال دو مگر مہ رخ سے شادی نہ کرنا...... اس کو کبھی میرے سامنے نہ لانا...... بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیے......'' وہ محبت سے اس کے گلے لگ کر بولی۔

''پیچھے ہٹو...... میں تم سب سے تنگ آ گیا ہوں...... نہ جانے کیوں میں نے تم سے شادی کی......''

''اور آفاق میں نے بھی...... میں بھی کیسی سزا بھگت رہی ہوں کاش تم جان سکو......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''تم...... تم تو یہاں عیش سے رہ رہی ہو...... کس چیز کی کمی ہے یہاں۔''

''یہاں کمی ہی کمی تو ہے۔ انسانوں کی...... محبتوں کی...... اور سچے جذبوں کی۔ تمہارے اس گھر میں چیزیں تو بہت ہیں مگر انسان نہیں بستے۔ یہاں کچھ بھی نہیں۔'' وہ خالی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے کر بولی۔ وہ بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا اور وہ خاموشی سے اس کے لیے ناشتہ لینے چلی گئی۔

مما کی رپورٹس آ چکی تھیں اور ولیم بے حد پریشان تھا۔ ٹیومر اچھا خاصا پھیل چکا تھا۔ آپریشن بہت ضروری تھا مگر اس کے لیے پیسے بالکل نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مما کی زندگی خطرے میں تھی۔ اس کا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو بار بار آ رہے تھے۔ آئے نور اس کی فیلنگز کو سمجھ رہی تھی اسے بھی یہ جان کر بہت دکھ ہوا تھا۔

''ولیم تم کیسے بی ہیو کر رہے ہو...... اس وقت تمہاری مما کو تمہارے حوصلے کی ضرورت ہے تمہارے آنسوؤں کی نہیں...... اور پلیز میرے سامنے اپنے آپ کو اتنا کمزور اور بے بس نہ شو کیا کرو......'' آئے نور ذرا سخت لہجے میں بولی۔

''نور...... اتنی بڑی بات ہو جائے اور انسان کو صدمہ بھی نہ ہو...... تم کیسی لڑکی ہو......؟''

''ہاں میں ایسی ہی ہوں۔ میں نے تمہیں کہا نا کہ میں زندگی کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی عادی ہوں۔ مجھے روتے، منہ بسورتے لوگ سخت ناپسند ہیں۔''

''تو پھر میں کیا کروں......؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''بہادر اور حوصلہ مند انسان ایسے لمحوں میں کیا کرتے ہیں...... یہ تمھیں خود سوچنا ہے...... کہ تمھیں کیا کرنا ہے......تم کب تک یوں دوسروں کے سہارے چلتے رہو گے۔تم تو رولنگ اسٹون ہو۔کبھی مما نے کک لگا دی، کبھی فادر نے......تو کبھی نور نے......'' وہ خفگی سے بولی۔

''میں تم سے آئندہ بات بھی نہیں کروں گی......'' وہ بیگ اٹھا کر چل دی۔

''پلیز نور......ایسا مت کرنا......ورنہ میں......میں......''

''میں کیا بولو......؟'' وہ غصّے میں اس کی طرف مڑی۔

''کچھ نہیں......''

''بات مکمل کرنے کا بھی تم میں حوصلہ نہیں۔تم کیا کرو گے...... مجھے تم بہت مایوس کر رہے ہو...... میں تو تمھیں بہت سمجھدار سمجھتی تھی مگر تمہارا رویہ بالکل بچگانہ ہے۔''

''نور......سمجھنے کی کوشش کرو......میرے پاس صرف میری ماں ہے۔''

''اور کیا تم جانتے ہو کہ میرے پاس کوئی بھی نہیں......'' اس کے اس انکشاف پر وہ چونک گیا۔

''کیا مطلب......؟''

''میں نائنتھ کلاس میں تھی جب میری ماں نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا......اور جانتے ہو......اس کے چھ ماہ بعد ڈیڈی کی ڈیڈ باڈی امریکا سے آئی ان کا وہاں ایکسیڈنٹ ہوا تھا ان کی ڈیڈ باڈی کے ساتھ خود میں قبرستان گئی تھی۔کیا کبھی تم نے کچھ میرے منہ سے سنا...... میرے منہ سے مایوسی اور بددلی کی باتیں...... میں اتنی سی عمر میں کیسے بے آسرا ہوئی اور کون کون میرا سہارا بنا...... مجھے کیسے کیسے تجربات ہوئے...... اور میں کیسے اتنی میچور ہو گئی۔تم کیا جانو...... تمھیں تو رونے دھونے سے ہی فرصت نہیں...... مجھے اپنی چوائس پر بھی افسوس ہے کہ میں نے محبت بھی ایسے شخص سے کی جو میرے لیے کبھی ڈھال نہیں بن سکے گا۔میرے آنسو نہیں پونچھ سکے گا بلکہ مجھے خود ہی سارے کام کرنے پڑیں گے...... دیکھو نا کیسی بیڈ لک ہے......'' وہ ہونٹ سکوڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

''آئی ایم رئیلی سوری......''

''اٹس آل رائٹ...... مجھے تمہاری اس سوکھی اور لفظی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ میں اب بہت پریکٹیکل ہو چکی ہوں۔ میں نے خالی لفظوں پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے...... میں حقیقت کی تلاش میں رہتی ہوں۔''

''تم نے مجھے کبھی بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا......'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

''مجھے ہمدردیاں سمیٹنا سخت ناپسند ہے اور اپنے بارے میں کسی کو کچھ بتا کر میں ہمدردیاں نہیں سمیٹنا چاہتی...... ہاں کبھی اتفاق بھی ایسا نہیں ہوا۔ بہرحال آج تو تم جان گئے ہونا......''

''اور تمھارے بہن بھائی...... وہ سب کہاں ہیں؟''

''کوئی بھی نہیں...... میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور ان کی شادی کے پندرہ سال بعد پیدا ہوئی۔ میری پیدائش امریکا میں ہوئی اور زیادہ تر وقت میں امریکا میں گزارتی رہی ہوں۔ ڈیڈی کی ڈیتھ کے بعد میں کہیں نہیں گئی۔ اب چند دن بڑے چچا کے پاس رہتی ہوں۔ چند دن چھوٹے چچا کے پاس چند دن پھوپھو کے پاس۔ میرا تو کوئی مستقل ٹھکانا نہیں۔ ڈیڈی نے کافی پیسہ اور امریکا میں پراپرٹی میرے لیے چھوڑی ہے۔ جیب خرچ گاڑی کا خرچہ اور دوسری ضروریات کے لیے خرچہ بڑے چچا سے ملتا ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔''

''کیا تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو......''

''ہاں...... اگر نہ بھی ہوں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس لیے مطمئن ہونا ہی پڑتا ہے۔ بے چینی اور اضطراب صرف ڈپریشن اور پریشانیاں ہی دیتا ہے اور کچھ نہیں ...... اس لیے میں کرائسس میں بھی مطمئن رہتی ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' وہ قدرے حیرت سے بولا۔

''میں تمھیں بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔ ویلیم میں ممی، ڈیڈی کی موت کے بعد بہت ڈپریشن میں تھی یوں لگتا تھا جیسے میں سائیکو کیس بنتی جا رہی تھی کہ ایک دن میں نے تنہائی میں سوچا کہ انسان تو اپنے خوابوں کے سہارے جیتا ہے اور گزر جائے وہ تو ماضی بن جاتا ہے اور ماضی تو کبھی مڑ کر واپس نہیں آتا۔ ہمیں اس شے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے جو ہمارے ہاتھ آ سکے۔ مجھے میرے خواب بہت عزیز تھے اور خوابوں کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے...... اب میں اپنے مستقبل کے لیے جدوجہد کر رہی ہوں۔ میں بے معنی کھوکھلی اور دوسروں کے سہارے زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔''

''نور...... تمھارے خواب کیا ہیں......؟''

''میرے خواب بہت سے ہیں لیکن میری خواہش ہے کہ جب میں مروں تو میرے لیے زمین بھی روئے اور آسمان بھی...... میں انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔''

ولیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مزید کچھ نہ پوچھ سکا۔

''ولیم اب تم بتاؤ میری زندگی سخت گزری ہے یا تمہاری......''

''جو جس پر گزرتی ہے وہ اسے ہی ٹف جانتا ہے لیکن تمہاری بھی یقیناً بہت ٹف لائف گزری ہے۔''

''گزری نہیں...... اب بھی گزر رہی ہے مگر...... خیر تم اپنی سوچو کہ اب تم نے آنٹی کو کس طرح ڈیل کرنا ہے...... کیا انھیں سب علم ہے۔''

''نہیں...... صرف میں اور آنٹی افضال جانتے ہیں۔ لیکن مما زیادہ تر کمرے میں رہتی ہیں۔ میرے خیال میں ان کا آپریشن جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔ ٹیسٹ تو ہو گئے مگر......''

''باقی بھی سب کچھ ہو جائے گا۔ میری مما کی جیولری میرے پاس ہی ہے۔''

''نہیں...... میں یہ نہیں لوں گا۔''

''تم مجھے لوٹا دو گے جب کسی قابل ہو جاؤ گے ورنہ میں یہی سمجھوں گی کہ میں نے اپنی ماں کی بیماری کے لیے انھیں بیچ دیا لیکن سنو اگر تم کسی قابل ہوئے اور مجھے نہ لوٹا پائے تو میں سمجھوں گی تم نے امانت میں خیانت کی ہے۔'' وہ اس کی بات پر حیران رہ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''یوں کیا دیکھ رہے ہو......؟'' نور نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ گاڈ نے کیسے کیسے عجیب لوگ بنائے ہیں......''

''ہاں بھئی عجوبے کسے اچھے نہیں لگتے...... اور مجھے کس عجوبے میں شمار کرتے ہو آٹھویں میں یا نویں میں......'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''پہلے اور آخری میں......''

''وہ کیوں......؟''

''بھئی باقی سارے تو اپنی جگہ فکسڈ ہیں جیسے ہیں نظر آ رہے ہیں اور تم بہت ان پرڈکٹ ایبل ہو۔ کس لمحے کیسے ری ایکٹ کرو...... کوئی نہیں جانتا......''

''شکر ہے تم نے اپنی رائے تو دی...... ولیم ویسے ایک بات میں سنجیدگی سے سوچ

رہی ہوں۔ آنٹی کی بیماری میں تمھیں ہر وقت ان کے پاس ہونا چاہیے اور ہاسٹل میں تم رہ نہیں سکتے۔ ہمارا گھر بند پڑا ہے میں بڑے چچا سے بات کر کے وہ کھلواتی ہوں۔ اگر وہ مان گئے تو تم لوگ ادھر شفٹ ہو جانا...... اب میں چلتی ہوں اور آنٹی کو میری طرف سے پوچھنا......" وہ گاگلز لگاتے ہوئے جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور وہ حیرت سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ سنجیدگی سے اس کی باتوں پر سوچ رہا تھا کہ کس طرح مما کو بتائے۔ اس کے لیے کتنے حوصلے کی ضرورت تھی۔ وہ تو ہمیشہ سے مما سے ایسی باتیں سننے کا عادی تھا۔ اب ان کو کیسے، کس طرح سب بتائے...... وہ الفاظ سوچتا رہا، ہمت یکجا کرتا رہا، سچویشن پر غور کرتا رہا...... کہ اسی اثنا میں آنٹی افضال کا فون آ گیا۔ اس کی مما کو دورہ پڑا تھا ان کی حالت بہت خراب تھی اور انھیں اسپتال لے کر جانا تھا۔

"آنٹی...... میں آ رہا ہوں بس کچھ......"

"سنو ولیم...... پیسوں کی فکر نہ کرو...... میرے پاس کچھ پیسے ہیں بس تم آ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے آنٹی......" اس نے نور کو فون کر کے بتایا۔

"ولیم میں آ رہی ہوں اور سنو تم نے آنٹی کو کچھ بتایا تو نہیں۔"

"نہیں، ابھی تو میں ان سے ملنے ہی نہیں گیا ابھی آنٹی افضال کا فون آیا ہے اور میں ہاسٹل جا رہا ہوں۔"

"میں بھی پہنچ رہی ہوں......" اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

"نور بیٹی کس کا فون تھا......" اس کے بڑے چچا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"انکل...... میرے کلاس فیلو کا...... اس کی مما بہت بیمار ہیں۔ انھیں کینسر ہے اور انکل میں نے آپ سے اجازت لینی تھی کہ میں اپنا گھر کچھ دنوں کے لیے انھیں دینا چاہتی ہوں۔ اس کی مما ہاسٹل میں رہتی ہیں اور وہ خود بھی۔ اس وقت ان کے پاس کوئی آسرا نہیں۔"

"کیا نام ہے اس کا......؟"

"ولیم......"

"ولیم......" انکل نے ذرا منہ چڑھایا۔ "تم کب سے اسے جانتی ہو......؟"

"انکل...... یہ کام میں انسانیت کے ناتے کرنے جا رہی ہوں۔ اس لیے ایسے سوالات بے معنی ہیں۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"مگر ہمیں ان کے بارے میں معلوم تو ہونا چاہیے......"

''میں ان کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ لوگ کرسچن ہیں۔ مما اس کی ورکنگ ویمن ہاسٹل میں پندرہ سولہ سالوں سے رہ رہی ہیں۔ اب کینسر کی پیشنٹ ہیں اور وہ خود او لیول کا اسٹوڈنٹ ہے۔''

''کل کو وہ لوگ کوئی مسئلہ نہ پیدا کر دیں......''

''مجبور اور بے بس لوگ خود بہت بڑے مسئلے ہوتے ہیں وہ دوسروں کے لیے کیا مسائل پیدا کریں گے۔ آپ بے فکر رہیے۔''

''نور......تم ابھی اتنی سمجھدار نہیں ہو......''

''انکل تجربات انسان کو سب سمجھا دیتے ہیں۔ مجھے بھی کر لینے دیجئے......''

''ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی......'' اس کے چچا ہتھیار ڈالتے ہوئے بولے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنی بات منوانے کی ہمیشہ سے عادی ہے اور جو کام وہ کرنا چاہے تو پھر کوئی اسے نہیں روک سکتا۔ سارے خاندان میں وہ خود سر اور ضدی مشہور تھی۔ بہت سے لوگوں کی اس کے بارے میں مختلف آرا تھیں جن کی وہ قطعی پروا نہیں کرتی تھی۔

''تھینک یو انکل......'' اس نے فارمیلٹی کے طور پر کہا وگرنہ وہ جانتی تھی کہ انکل کی اس میں کوئی فیور نہ تھی۔ وہ اسے کسی طرح بھی نہیں روک سکتے تھے۔ اس نے تو محض انھیں اطلاع دی تھی۔

ڈاکٹروں نے انھیں فوری آپریشن کے لیے ایڈمٹ کر لیا تھا۔ آپریشن کر کے ٹیومر نکال دیا تھا اور انھوں نے اچھی طرح سے اسے ریموو بھی کر دیا تھا۔ وہ مسلسل ان کے ساتھ اسپتال میں رہی۔

''ولیم اب تم لوگ میرے گھر شفٹ ہو جانا۔ میں نے بڑے چچا سے بات کر لی ہے انھوں نے اجازت دے دی ہے اور اب تمھیں آنٹی کا بہت خیال رکھنا ہے۔ میرا گھر ہر طرح سے آرام دہ ہے تمھیں اور آنٹی کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں بھی زیادہ تر وقت ادھر ہی رہنے کی کوشش کروں گی اور سرونٹ کوارٹر میں ہمارا پرانا نوکر نذیر اور اس کی فیملی رہتی ہے تم لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''تھینک یو نور......'' مارے تشکر کے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ جواباً خاموش رہی اور اس کی طرف گہری نگاہ سے دیکھنے لگی۔

''ولیم آپریشن کی پیمنٹ کیسے کی ہے......''

''وہ...... آنٹی افضال نے۔''

''میں نے تم سے کچھ کہا تھا......''

''مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی انھوں نے سب کچھ کر دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے اگر ضرورت پڑی تو مجھے بتا دینا۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

''نور...... ایک بات پوچھوں......؟''

''ہاں پوچھو......''

''نور...... تم اتنے بڑے بڑے اسٹیپس لیتی ہو تمھارے گارڈین کچھ نہیں کہتے۔''

''نہیں......'' وہ آہ بھر کر بولی۔ ''کیونکہ جب وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھے تو انھوں نے اس کا غلط استعمال کیا اور ان کے غلط رویوں نے مجھے اپنے فیصلوں میں آزاد بنا دیا۔''

''میں سمجھا نہیں......''

''ضروری نہیں کہ ہر بات کی سمجھ آ جائے...... بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آئیں تو بہتر ہے انسان کو کچھ ڈسکور کرنے کی جستجو تو رہتی ہے نا؟''

''اگر تمھارے ممی ڈیڈی زندہ ہوتے تو کیا تب بھی تم یہی کرتیں......؟''

''نہیں...... تب میں بہت مختلف ہوتی۔ جب آپ کو اندازہ ہو کہ کوئی آپ کی فکر کرنے والا موجود ہے۔ آپ کو ڈی گریڈ نہیں کرے گا اور آپ کی فیلنگز کو سمجھے گا تو ظاہر ہے رویہ بھی مختلف ہوگا۔ رویے ماحول کے مطابق پروان چڑھتے ہیں۔ میں جب چار دن ایک چچا کی طرف آٹھ دن ایک کی طرف۔ دس دن پھوپھو کی طرف رہنے لگی تو کسی بھی گھر میں میری کوئی حیثیت نہ رہی۔ میں ایک لڑھکتا پتھر بنی رہی۔ ہر کوئی اپنی مرضی مجھ پر چلاتا۔ میں گھر کے ایک ایک فرد کی مرضی کے مطابق چلنے لگی۔ ولیم میں تھک گئی تھی۔ میرا اندر اتنا ذلیل ہو چکا تھا کہ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی میری عزتِ نفس ختم ہونے لگی ان دو تین سالوں میں، میں نے اتنا کچھ سہا، سمجھا اور پھر اپنے آپ کو مضبوط کیا کہ مجھے کیا کرنا ہے اب انھیں میری مرضی کے مطابق چلنا ہے۔ میرے ماں باپ میرے لیے بہت کچھ چھوڑ کر مرے ہیں۔ میری اپنی ایک حیثیت ہونی چاہیے۔ میری اپنی شخصیت اور پہچان ہونی چاہیے اور پھر میں نے یکدم اپنے آپ کو بدلا۔

اداسیاں، محرومیاں، دکھ، سب کچھ اپنے اندر کہیں دفن کر دیے۔ اب میں ایک منفرد شخصیت کی مالک ہوں۔ اب سب میری رائے کو اہمیت دیتے ہیں۔ ولیم جب آپ کے پاس

کہنے کو بہت کچھ ہو مگر کہنے کا حوصلہ نہ ہو تو اس کا مطلب ہے آپ ایک ناکام انسان ہیں۔ آپ کی حیثیت سوسائٹی میں زیرو ہے اور آپ اپنی ذات کے ساتھ بہت ناانصافی کر رہے ہیں۔ بہت بڑا نقصان...... اور تمہاری شخصیت کا یہ پہلو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ تم ایک اچھے انسان ہو مگر ایک دم اٹک جاتے ہو۔ پھر کوئی تمھیں چلاتا ہے یا تم اچانک کوئی فیصلہ کر لیتے ہو جیسے میں نے بھی ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اس میں بھی بہت پرُعزم ہوں......'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کونسا......؟'' وہ چونکا۔

''کیا تم واقعی نہیں جانتے...... اور اب میں یہ نہیں سننا چاہتی کہ تم کچھ نہیں جانتے۔'' وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

''نہیں، میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ آہستہ سے مطمئن لہجے میں بولا۔

''بس میں یہی سننا چاہتی تھی......''

''کیا تم اس سے اپنے اندر کی تسکین چاہتی ہو؟''

''نہیں...... میری محبت تمھارے ریسپونس کی محتاج نہیں اور میں نے پہلے بھی یہ تمھیں بتا دیا تھا۔''

''تو پھر......؟''

''میں تمہارا اقرار چاہتی تھی۔''

''میں بہت پہلے اس کا اقرار کر چکا ہوں۔''

''انسان اپنی رائے بدلتا بھی تو رہتا ہے اور میں تم سے کچھ بھی توقع کر سکتی ہوں۔''

''نہیں نور...... تم مجھے جو چاہے سمجھو۔ اچھا، برا...... کمزور، بزدل، بیوقوف...... کچھ بھی مگر یہ یقین رکھنا کہ اب میرے دل میں صرف اور صرف دو لوگ رہتے ہیں۔ ایک میری ماں اور دوسری تم تم نے اپنی محبت کے لیے تو چاند اور چکور کی مثال دے دی تھی۔ میرے پاس ایسی کوئی مثال نہیں صرف یہی کہوں گا جیسے کرائسٹ گاڈ اور مدر میری سے محبت کرتے تھے۔ ان کے لیے بھی تو صرف دو ہستیاں تھیں میری طرح۔''

''کیا تم کرائسٹ سے بہت محبت کرتے ہو؟''

''ہاں...... بہت۔''

''اور اگر تمھیں اپنا راستہ اچانک بدلنا پڑے تو......؟''

''ناممکن۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''ایسے سوالوں کے جوابات جذبات سے نہیں عقل سے دیتے ہیں...... اگر تم ایک لمحے کے لیے اس پر کچھ سوچتے تو شاید مجھے تم پر حیرانی نہ ہوتی...... جیسی اب ہوئی ہے......'' نور نے پرُسکون لہجے میں کہا۔ ولیم اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

وہ دونوں اسپتال کے لان میں کافی دیر سے چکر لگا رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ مسز پیٹر اب ہوش میں تھیں ہاسٹل سے بہت سی خواتین ان کی خیریت پوچھنے آئی تھیں اور اس لیے وہ دونوں باہر آ گئے بلکہ آنٹی افضال نے ہی دونوں کو باہر بھیج دیا تھا۔

''ولیم...... میں نے تم میں ایک مثبت تبدیلی دیکھی ہے......'' وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا......؟''

''تم آنٹی کے سامنے بہت مستحکم رہتے ہو اور رونی شکل بھی نہیں بناتے...... مجھے یہ سب اچھا لگتا ہے۔''

''شکر ہے تمھیں مجھ میں کچھ تو اچھا لگا......'' وہ مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''کوشش کرتے جاؤ افاقہ ہوتا جائے گا......'' وہ ہنس کر بولی۔

''تھینک یو مس۔''

چند روز بعد وہ اسپتال سے نور کے گھر شفٹ ہو گئی۔ ولیم بھی ان کے ساتھ تھا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں ہر وقت سناٹا سا چھایا رہتا۔ ولیم ہر وقت مما کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا۔ وہ بھی دن بھر وہیں ہوتی اور شام کو گھر جاتی۔ دو تین دن تو بڑے چچا نے برداشت کیا پھر خود ان لوگوں سے ملنے چلے گئے۔ نور مسز پیٹر کو دوائیں دے رہی تھی اور ولیم کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

چچا کو یوں اچانک دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

''انکل آپ......؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں...... اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ آپ کی مہمان ہیں۔ ان کی خیریت پوچھنا ہم پر بھی فرض ہے۔ اسی لیے چلا آیا۔

''تھینک یو بھائی صاحب......'' مسز پیٹر نے جواب دیا۔ اسی لمحے کمرے میں داخل ہوا اور انھیں دیکھ کر چونکا۔ چچا بھی حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ گورا چٹا، لمبا تڑنگا خوبصورت نیلی آنکھوں اور تیکھے نقوش والا لڑکا انھیں ایک دم بہت مختلف سا لگا۔ ایسا مختلف چہرہ

کہ بعض لوگ جنھیں دیکھ کر کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ تو تصور میں کچھ اور سوچ کر آئے تھے۔ وہ ان کی سوچ سے بہت مختلف نکلا تھا۔

''گڈ ایوننگ انکل......'' ولیم نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''گڈ ایوننگ......'' انکل نے قدرے محبت سے جواب دیا۔

''سر تھینک یو...... آپ اور نور ہمارے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ مما اور میں آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔ میں خود آپ سے ملنا چاہ رہا تھا مگر مما کی خرابی طبیعت کی وجہ سے میں حاضر نہیں ہو سکا......'' وہ بہت شائستگی سے بولا۔

''کوئی بات نہیں...... بائی داوے آپ لوگ کہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔'' نہ جانے کیوں چچا کے ذہن میں کچھ اٹک سا گیا تھا۔

''یہیں سے...... میرا مطلب ہے لاہور سے......'' ولیم نے جلدی سے جواب دیا۔

''مگر آپ...... آپ کچھ مختلف لگتے ہیں......'' وہ کچھ متجسس ہو کر بولے۔

''ہاں میرے پاپا انگلینڈ سے تھے......''

''تھے...... کیا مطلب......؟''

''ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ اس لیے مما لاہور آ گئیں۔'' ولیم تفصیلات بتا رہا تھا اور مسز پیٹر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ انھوں نے جو کچھ ولیم کو بتا رکھا تھا وہ وہی کچھ بتا رہا تھا۔

''اینی وے نائس ٹو میٹ یو...... میں یہی تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔''

''کیا انکل......؟'' نور نے حیرت سے پوچھا۔

''اٹس آل رائٹ ناؤ...... اب میں چلتا ہوں۔'' وہ مطمئن سے چلے گئے۔

''نور مجھے تمھارے انکل کچھ پُراسرار سے لگے ہیں۔'' دونوں انھیں گیٹ تک چھوڑنے آئے اور وہیں باتیں کرنے لگے۔

''لگتے ہیں مگر ایسے ہی نہیں۔ ان کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ خواہ مخواہ جیمز بانڈ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''تم جانتے ہو وہ کیا کرتے ہیں......؟ سراغ رساں ہیں اور نام نہاد بزنس مین بھی۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''واقعی......'' ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

''اور نہیں تو کیا، ہر بات میں مین میخ نکالیں گے۔ ہر بات کو ٹیڑھا کر کے دیکھیں گے مگر رزلٹ ہمیشہ الٹا ہی نکلتا ہے۔ دیکھا کیسے پوز کر رہے تھے جیسے کچھ سونگھتے سونگھتے یہاں پہنچے ہوں۔ اسی لیے تو میں انھیں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی تھی بلکہ ڈر بھی گئی تھی کہ کچھ الٹا سیدھا مسئلہ ہی نہ کھڑا کر دیں۔ چچی تو ان سے سخت تنگ ہیں۔''

''اور تم......؟''

''مجھے ان کی نفسیات اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے اس لیے آسانی سے ہینڈل کر لیتی ہوں۔ ایک دم ایسے پوز کریں گے جیسے اچانک قیامت آ گئی ہو اور اگلے ہی لمحے نارمل ہو جائیں گے۔ ویسے وہ میچور انسان نہیں۔ ان کو دھوکا دینا دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ اسی لیے تو سلمیٰ چچی ہر وقت ان کو ڈانٹتی رہتی ہیں۔''

''اچھا......'' وہ حیرت زدہ سا تھا۔ ''لیکن خطرناک بھی بہت ہیں......لوگوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا بہت شوق ہے اس لیے اچانک چھاپے مارتے ہیں۔ اگر ہم دونوں کو اچھے موڈ میں دیکھ لیتے تو اب تک قیامت آ چکی ہوتی۔ شکر ہے تم باہر گئے ہوئے تھے مگر پھر بھی ہوشیار رہنا......'' وہ مذاقاً بتا رہی تھی کہ اچانک چچا کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ گیٹ کھلا تھا اس لیے دونوں گیٹ کی ایک ایک سائیڈ کی طرف ہو گئے۔ نور نے مسکراتے ہوئے ولیم کی طرف دیکھا۔

''بیٹا ذرا میری بات سننا......'' انھوں نے گاڑی سے نکلتے ہوئے کہا۔

''یس انکل......''

''تمھارے فادر کی ڈیتھ کب ہوئی اور تم لوگ کب لاہور آئے......؟''

''آئی ایم سوری انکل...... مجھے صحیح سے نہیں معلوم۔ مگر شاید میری پیدائش سے پہلے۔ میں مما سے پوچھ کر بتاؤں گا مگر خیریت تو ہے نا......؟''

''ہاں......تمہارا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا ہے۔''

''میرا چہرہ......مگر کس سے......؟''

''ہے کسی سے......تم چھوڑو اس کو مگر مجھے اس کے بارے میں انفارمیشن چاہیے......''

''جی ضرور......'' اس نے کہا۔

''او کے...... میں پھر آؤں گا......'' وہ گاڑی ریورس کرتے ہوئے بولے۔

''مائی گاڈ...... یہ کیا مصیبت ہے......نور تم نے ہمیں کہاں پھنسا دیا ہے۔''

''فکر نہیں کرو...... اب یہ تمھیں بہت مصروف رکھیں گے...... کچھ دنوں کے بعد

کہیں گے کہ تم ان کے ساتھ ان کے کام میں شامل ہو جاؤ۔ تمھیں معقول معاوضہ بھی ملے گا......'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''تمھارے چچا کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

''بالکل نہیں...... ایسا سوچنا بھی مت...... اب جلدی سے گیٹ بند کرو کہیں پھر نہ آ جائیں۔ میں تمھیں ایک راز بتاؤں گی تو تم ان کے شر سے محفوظ رہو گے۔''

''تو ابھی بتا دو نا......'' وہ بے صبری سے بولا۔

''افوہ بابا بتا دوں گی......''

''ویسے بائی داوے...... یہ گھر میں کیا کرتے ہیں......؟''

''گھر میں دبکے بیٹھے رہتے ہیں۔ چچی کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی گھر میں ہوں تو لگتا ہے کوئی ہے ہی نہیں...... اسی لیے تو بیچارے باہر ہی اپنا ایڈونچر پورا کرتے ہیں۔''

''کیا یہ تمھارے گارڈین ہیں......؟''

''ہاں...... ان کی کوئی اولاد نہیں۔ اس لیے ڈیڈی نے بھی ڈیتھ سے پہلے دل میں انھیں میرا گارڈین بنا دیا۔ ان جیسا بندہ پورے خاندان میں نہیں۔ مجھ پر ہر طرف سے نگاہ رکھتے ہیں اور نگاہ بھی ایسی...... کہ پوچھو مت عقاب سے زیادہ تیز نگاہیں ہیں لیکن نگاہیں جتنی تیز ہیں عقل اتنی ہی کم۔ تمھیں بھی اندازہ ہو جائے گا۔''

نور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور دونوں گیٹ اچھی طرح بند کر کے اندر آ گئے۔ مسز پیٹر چچا کی غیر متوقع آمد اور سوالات سے پریشان ہو گئی تھیں۔

''آنٹی آپ پریشان نہ ہوں۔ انکل کی باتیں سیریس نہ لیں دراصل وہ سراغ رساں ہیں اس لیے ہر ایک سے سوالات پوچھتے رہتے ہیں۔'' نور نے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے مما...... پاپا میری برتھ سے کتنے ماہ پہلے فوت ہوئے تھے......؟'' ولیم نے اچانک سوال کیا تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ولیم...... پاگل ہو گئے ہو کیا...... آنٹی کی حالت تو دیکھو اور تم کیسے سوالات کر رہے ہو۔ آنٹی آپ آرام کریں ہم ابھی آتے ہیں۔'' وہ دروازہ بند کر کے اسے ساتھ لے کر باہر آ گئی۔

''تم بھی کمال کرتے ہو، اتنے میجر آپریشن کے بعد تو انسان کی یادداشت بھی ٹھیک نہیں رہتی اور تم انھیں ایک برا واقعہ یاد دلانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

’’اوہ میں تو بھول ہی گیا......‘‘ ولیم تاسف سے بولا۔

’’اب میں چلتی ہوں اور اب آنٹی کو آرام کرنے دینا اپنی فضول باتوں سے ڈسٹرب نہ کرنا......‘‘ وہ بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

’’تم نے وہ راز نہیں بتایا......‘‘ ولیم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا۔

’’اوہ...... ہاں...... ایسا کرو مین گیٹ پر باہر سے تالا لگا دو اور پیچھے ایک سائیڈ گیٹ ہے چھوٹا سا، اسے بھی تالا لگا دو پھر دیوار پھلانگ کر اندر چلے جانا۔‘‘

’’کمال کرتی ہو وہ ڈیٹیکٹو ہیں اگر دیوار پھلانگ کر آ گئے اور ہمیں گھر کے اندر پایا تو......‘‘

’’میں انھیں بتا دوں گی کہ تم جب بھی گھر سے باہر جاتے ہو تالا لگا کر جاتے ہو اور باقی ملازم گھر کے اندر ہی ہوتے ہیں اور آنٹی بھی اور ظاہر ہے وہ تم سے سوالات کرنے آئیں گے۔ آنٹی سے یا ملازمین سے نہیں کیونکہ ان کا ٹارگٹ تم ہو۔ ان سے بچ سکتے ہو تو بچو ورنہ تمہارا اللہ حافظ ہے۔‘‘ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی وہ بھی مسکرانے لگا۔

شہلا کی شادی پر دور و نزدیک سے مہمان آئے تھے۔ خوب گہما گہمی اور رونق تھی۔ حویلی کی جدید آرائش کے لیے شہر سے خصوصی طور پر ٹینٹ سروس والے لوگ آئے تھے۔ حویلی سے ملحقہ وسیع رقبے پر محیط باغ میں برات کا فنکشن ارینج کیا گیا تھا۔ تبسم اور فاطمہ آپا اس کے سارے چاؤ پورے کر رہی تھیں۔ اس کے ہر طرح سے ناز و نخرے اٹھائے جا رہے تھے۔ حویلی کے نوکر، نوکرانیاں اور ان کے خاندان بھرپور انداز میں شرکت کر رہے تھے۔ ایسی زبردست شادی شفق نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے تیار ہو رہے تھے۔ جس دن سے شہلا گاؤں آئی تھی شفق اندر ہی اندر شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ شدید احساسِ محرومی نے اس کے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا تھا۔ حیدر انکل نے ہر ایک سے اسے اپنے ایک دیرینہ دوست کی بیٹی کے ناتے متعارف کرایا تھا۔ تبسم آپا اسے دیکھ کر ایک لمحے کو چونکی تھیں۔ اس کے خدوخال نین نقش، سب کافی حد تک شہلا سے ملتا تھا اور نام بھی جانا پہچانا۔ آپا نے حیدر کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور پھر خاموشی سے شفق کی طرف دیکھنے لگیں۔

’’حیدر یہ تمھارے کس دوست کی بیٹی ہے؟‘‘ آپا نے اچانک پوچھا تو وہ بھی چونک گیا۔

’’وہ آج کل امریکا میں ہے...... یہ اس کی اکلوتی اولاد ہے اس لیے میرے پاس

چھوڑ گیا۔'' حیدر انھیں تفصیلات بتا کر نئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپا مطمئن ہوگئیں کیونکہ وہ منصور اور حیدر کے تعلقات سے بہت اچھی طرح واقف تھیں اور منصور اپنی بیٹی حیدر کے پاس چھوڑے گا۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شہلا سے اس حد تک مشابہت اتفاقیہ بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اس کو مزید نہ کریدا۔ شہلا حیدر تو ہر ایک سے ملی جلی تھی۔ اس سے کیا فرق ہوتی۔ دونوں بہنیں انتظامات دیکھنے میں مصروف تھیں وہ بری طرح نظر انداز ہو رہی تھی۔ مایوں کی رات بھی وہ اپنے کمرے میں بند رہی کسی نے اس کو بلانا ضروری نہ سمجھا۔ ہر کوئی مصروف تھا اور وہ کسی کے لیے بھی ضروری نہ تھی۔ اس نے ماں کی غیر موجودگی اور باپ کی موجودگی میں جس طرح کی بے آسرا زندگی گزاری تھی اس نے اس کو تنہائی، یاسیت اور دکھ کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں دیا تھا اور عابد والے واقعے نے تو اس کی روح تک کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ اس کا انسانیت پر سے ہی اعتبار اٹھ گیا۔ اگر مما انھیں یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاتیں تو شاید وہ آج کی شفق سے بہت مختلف ہوتی۔

اس کے پاس تو کوئی ایسا رشتہ نہ تھا جس کی طرف وہ اعتماد سے دیکھتی۔ شہلا حیدر اسے بہت خوش قسمت معلوم ہو رہی تھی جس کے اتنے لاڈ اٹھائے جا رہے تھے اور جس کا اتنی محبت کرنے والا باپ موجود تھا۔ یہ دن اس پر بہت بھاری تھا۔ وہ ہر لمحہ اندر ہی اندر نہ جانے کتنے آنسو پیتی رہی۔ مگر جتنی اپنے آپ کو تسلیاں دینے کی کوشش کرتی اتنی بکھرتی جا رہی تھی۔ اس کے حافظے میں کوئی ایک شخص بھی تو ایسا نہ تھا جس نے کبھی بھی زندگی میں اس کے لیے پریشانی اٹھائی سوائے سہیل کے اور وہ بھی نہ جانے کس حالت میں ہوگا۔ اسے بھی پاپا نے جیل کی تاریک کوٹھڑی میں بند کروا دیا تھا اور اب وہ تنہا تھی۔ باہر ساری رات ڈھول بجتے رہے۔ عورتیں گیت گاتی رہیں مگر وہ افسردہ سی اپنے کمرے میں گیلی لکڑیوں کی طرح سلگتی رہی۔ رات شمع کی مانند آہستہ آہستہ اپنے اختتام کو پہنچنے والی تھی جب بشریٰ آپا کو ایک دم افسوس سا ہوا۔ وہ شاید کھانا کھائے بغیر سو رہی تھی اور مایوں کی رسم میں بھی موجود نہیں تھی حیدر شاہ کو معلوم ہوگا تو وہ کتنے ناراض ہوں گے اور وہ یہ بات اب کسی سے نہیں کرنا چاہتی تھیں مگر انھیں یوں اس کا لاوارثوں کی طرح بیٹھے رہنا بہت قابل رحم لگا۔

اگلی صبح انھوں نے جھنجوڑ کر اسے خود ناشتہ کروایا مگر کوئی بات نہ کی۔ ''تم آج برات میں کیا پہنو گی......؟'' بشریٰ آپا نے اس کی توجہ دوسری طرف کرانا چاہی۔

''میں......معلوم نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اچھا سا سوٹ پہننا..... کیا تمھارے پاس اچھے کپڑے ہیں میرا مطلب ہے کوئی چمک والے؟''

''نہیں.....''

''تو تم نے مجھے بتایا ہی نہیں.....''

''کیا بتاتی.....؟''

''اچھا میں دیکھتی ہوں۔ شہلا بی بی کا کوئی سوٹ لا دوں۔'' بشریٰ آپا اپنی ہی لے میں بولیں تو اس نے چونک کر انھیں دیکھا مگر خاموش رہی۔ اسے شدید تذلیل محسوس ہوئی کہ اب وہ دوسروں کی اترن پہنے گی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کبھی کبھی زندگی کیسے موڑ پر لا کھڑا کرتی ہے کہ انسان خود ہی چونک جاتا ہے۔ وہ خود لاکھوں، کروڑوں کی مالک اب کتنی بے وقعت ہوگئی تھی۔ اس کی وارڈ روب قیمتی سے قیمتی ملبوسات سے بھری رہتی تھی۔ مگر نہ اسے کپڑوں کی پروا ہوتی تھی نہ زیورات کی اور نہ ہی زندگی کی..... اس کے لیے سب کچھ بے معنی تھا اور اب بے معنی چیزیں بھی اپنی حیثیت دکھانے لگی تھیں۔ شام کو برات سے پہلے بشریٰ آپا شہلا حیدر کا ایک کامدار جامنی اور شاکنگ پنک سوٹ لے کر آئیں۔

''شفق یہ تم پر بہت اچھا لگے گا.....''

وہ خاموش رہی اور سوٹ کو دیکھتی رہی۔

''کیا تمھیں پسند نہیں آیا.....؟''

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

''بتاؤ نا کیا بات ہے..... کوئی دوسرا لے آؤں۔''

''نہیں آپا..... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں شادی میں نہیں جاؤں گی۔''

''ہیں..... ہیں..... کیا کہا تم نے..... تم شہلا بی بی کی شادی میں نہیں جاؤ گی تو حیدر سائیں کیا کہیں گے۔''

''انھیں کونسی فرصت ہے.....''

''یہ مت کہو، وہ تو مایوں کی رسم میں ادھر نہیں آئے ورنہ اب تک..... اور یہ بھی تو دیکھو کہ وہ تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں اور تم ان کی بیٹی کی شادی میں نہیں جاؤ گی تو وہ کیا سمجھیں گے۔''

''کچھ نہیں سمجھیں گے..... کسی کو کسی کے نہ جانے سے نہ فرق پڑتا ہے اور نہ آنے سے میں کسی کے لیے بھی اہم نہیں۔ آپا بس آپ جائیں میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

"نہیں شفق بیٹی یوں مت کہو...... اچھا نہیں لگتا۔ تم میری خاطر چلو...... یوں سمجھو اپنی ماں کی خاطر......" بشریٰ آپا نے محبّت اور اپنائیت سے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

شہلا حیدر سرخ اور نیوی بلیو کا مدار غرارے میں زیورات سے لدی ہوئی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایسی حسین پری جس پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ تبسم آپا اور فاطمہ آپا اس کی بلائیں لیتے نہیں تھک رہی تھیں۔ اس کا سارا ننھیال جمع تھا مگر وہ خود بہت افسردہ تھی۔ وہ رخصتی سے پہلے حیدر شاہ سے ملنا چاہتی تھی۔ تبسم آپا حیدر شاہ کو بلا کر ایک کمرے میں لے گئیں شہلا پہلے سے ہی وہاں بیٹھی تھی۔ حیدر نے ایک ٹک اسے دیکھا جیسے اس کی بلائیں لے رہا ہو اور پھر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے، خیریت تو ہے نا......؟"

"پاپا آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ یہ میں جانتی ہوں اور یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ جتنے آپ وسیع القلب ہیں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اسی لیے میں آپ سے سب باتوں کی معافی چاہتی ہوں۔" وہ حیدر کے قدموں میں گر گئی۔

"اٹھو یہاں سے...... میں نے ہمیشہ تمھیں اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ کبھی بھی روایتی باپ بننے کی کوشش نہیں کی۔ شہلا مجھے اپنی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ یاد نہیں آتا جب میں نے تم سے کوئی زیادتی کی ہو۔ میں خود بہت منفرد باپ بننے چلا تھا اور تمھیں منفرد بیٹی بنانے مگر شاید ہم سب انسان اندر سے ایک ہی ہوتے ہیں کبھی احساسات، جذبات اور انسان کی سوچ بھی بدلی ہے۔ مگر تم نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے......" حیدر نے آہ بھر کر کہا۔ "تم نے اپنے باپ کو شک کی نگاہ سے دیکھا......" حیدر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "مگر خدا نے شاید ہر باپ کو اتنا وسیع القلب بنایا ہے کہ جب بھی اپنی اولاد کی طرف بدلے کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اس کی نگاہ خود بخود جھک جاتی ہے وہ اولاد کے لیے بددعا تو کر ہی نہیں پاتا۔ وہ بڑی ہی بدنصیب اولاد ہو گی جس کے لیے کوئی باپ بددعا کرے گا۔ میرے دل میں اب بھی تمھارے لیے برے جذبات نہیں...... تم جہاں رہو خوش رہو۔" حیدر نم آنکھوں سے مڑنے لگا۔

"نہیں پاپا، میں ایسے نہیں جاؤں گی جب تک آپ میرے گناہوں کا کفارہ نہ بتا دیں......" وہ رونے لگی اور اس کا مسکارا بہہ کر اس کے چہرے پر میک اپ کی تہوں پر لکیریں چھوڑنے لگا۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ تم نے واقعی کوئی گناہ کیا ہے......؟" حیدر کی نظروں میں گہرا

استفہام تھا۔

"ہاں......شاید میرا ضمیر مجھے ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔"

"کس بات پر......"

"اس پر کہ جو میں نے آپ سے کہا......"

"اور اس پر نہیں جو تم نے اس عورت سے کہا......"

"نہیں......"

"کیا تم جانتی ہو کہ تمھارے جانے کے بعد وہ کس قدر بیمار پڑ گئی اور اسے برین ہیمبرج ہو گیا......"

"اوہ......نو......" وہ چلائی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ "آئی ایم سوری...... آئی ایم رئیلی سوری......" وہ اپنا زیور نوچنے لگی...... "پاپا کاش آج مجھے یہ سب نہ بتاتے۔ میرے لیے تو اس احساس کے ساتھ جانا ہی مشکل ہو رہا تھا کہ میرا باپ مجھ سے ناراض ہے اور آپ نے مجھے یہ خبر بھی سنا دی۔"

"خاموش ہو جاؤ شہلا اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں بھی تمھیں نہیں بتانا چاہتا تھا مگر تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے بتانا پڑا۔

شہلا جب ہم کسی دوسرے پر چلاتے ہیں یا زیادتی کرتے ہیں تو ایک لمحے کو یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ سننے والا بھی ہماری طرح کا انسان ہے۔ اس کی بھی مجبوریاں ہو سکتی ہیں۔ اس کے بھی دکھ ہو سکتے ہیں اور اس کے بھی احساسات آپ کی طرح ہی نازک ہو سکتے ہیں۔ ہم ساری اچھائیاں اپنے لیے اور ساری ندامتیں اور برائیاں دوسروں کے لیے ہی کیوں سوچتے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم خوشی خوشی اپنے سسرال جاؤ۔"

"نہیں، اب نہیں...... میں آج ہی شادی سے انکار کر دوں گی۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے۔ دکھ تو تم نے مجھے دیا ہی ہے اور اب ایسا صدمہ بھی دینا چاہتی ہو کہ ضرار حیدر جان سے بھی جائے۔ تمھارے اور میرے درمیان جو کچھ ہے اسے صرف میں، تم اور تبسم آپا جانتے ہیں اور اس طرح کی حرکت کر کے تم لوگوں پر کیا واضح کرنا چاہتی ہو کتنی زبانوں اور کتنی نگاہوں کو میرے اور اپنے لیے ایک امتحان بنانا چاہتی ہو۔ میں تبسم آپا کو بھیج رہا ہوں۔ جو کچھ خاموشی سے چل رہا ہے اسے چلنے دو۔"

"پھر آپ کو مجھے معاف کرنا پڑے گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''جاؤ شہلا...... اگر تمھیں اس سے تسکین ملتی ہے تو یہ بھی کیا...... تم خوش رہو......''

اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل گیا۔

اسد علی شاہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا دونوں کی جوڑی چاند اور سورج سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ شہلا کے ننھیالی بار بار دونوں کو چوم رہے تھے مبارکبادیں دے رہے تھے مگر شہلا کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ تھی۔ وہ خاموش سی بیٹھی تھی مگر اسد علی شاہ بہت چہک رہا تھا۔ شفق کی نظریں ان دونوں پر تھیں۔ وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھی اور نہ جانے کیا کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے اندر شدید احساسِ محرومی تھی۔ ہر چیز کی کمی وہ اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ خوشی کی، اعتماد کی، سکون کی، تحفظ کی، عزت کی اور رشتوں کی محبت والفت کی...... اس کے ماں باپ زندہ تھے مگر وہ اپنے آپ کو شروع سے ہی بے آسرا اور لاوارث محسوس کرتی آ رہی تھی۔ کیا یہ زندگی یونہی یاسیت اور تنہائی کی نذر ہو جائے گی۔ میری زندگی میں خوشی کی کوئی رمق کوئی کرن، کوئی خوشبو، کوئی جھونکا کبھی نہیں آئے گا۔ زندہ انسانوں کے لیے یہ چیزیں آکسیجن کا کام کرتی ہیں اور میری آکسیجن تو رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کاش میں بھی اس آکسیجن کی طرح جلد ختم ہو جاؤں اور پھر کچھ نہ رہے۔ نہ شفق نہ اس کی تنہائی، نہ اس کا خوف اور نہ اس کے دکھ کاش میں خاک میں خاک ہو جاؤں۔ میں نے اور آفاق نے زندگی سے کیا پایا ہے۔ ہم دونوں نے کس طرح کی زندگیاں گزاری ہیں۔ جس عمر میں چہروں پر مسکراہٹیں اور قہقہے رعنائیاں پیدا کرتے ہیں ہم نے تنہائیاں، خوف اور سکوت چہروں پر سجا لیا اور نتیجہ کیا نکلا وہ دلگرفتہ بن گیا اور میں سائیکو...... وہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا رویہ نارمل انسانوں جیسا نہیں رہا تھا۔ اسے شدید ڈپریشن ہونے لگا وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔ کسی نے نہ اس کے آنے کا نوٹس لیا نہ جانے کا۔ نہ کسی نے بیٹھنے کو کہا اور نہ اب جانے کو۔

بعض لوگ حشرات الارض کی طرح ہوتے ہیں جن کے ہونے نہ ہونے سے اہل زمین کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ ماں کا چھوڑ کر جانا۔ پاپا کا شزا کے ساتھ مسکراہٹیں بکھیرتا چہرہ اور اس رات فلک کی موت پر بلک بلک کر رونا۔ اس کا اکرم کے ساتھ سونا عابد اور زویا کا ڈاج دینا...... یہ سب اسے شدید تہہ و بالا کرنے لگا اس نے ایک زوردار چیخ ماری وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگی۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی...... کتنا چیختی رہی...... کس کس کو مدد کے لیے بلاتی رہی اسے کہاں کہاں درد ہوتا رہا...... کسی کو بھی خبر نہ ہوئی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور اس سے خون بہہ

رہا تھا۔ باہر شادی کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ ڈھول زور زور سے پیٹے جا رہے تھے رسومات جاری تھیں۔ رخصتی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ شہلا کو بہت محبت اور پیار سے رخصت کیا گیا۔ حیدر نے خود اسے گاڑی میں بٹھایا وہ باپ کے گلے لگ کر بہت روئی۔ حیدر کی بھی آنکھیں نم تھیں مگر برسی نہیں۔

''پاپا آپ نے مجھے......'' اس نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

''ہاں...... ہاں......بس اور کچھ نہیں۔'' اس نے اس کی پیشانی کو چوما۔ اسد علی شاہ کو گلے لگایا اور محبت سے دونوں کو رخصت کر دیا۔ لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے۔

رات کافی گہری ہو رہی تھی رفتہ رفتہ رات کی خاموشی اور سکوت نے ہر ایک شے پر اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ تبسم آپا اور فاطمہ آپا کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہیں اور پھر تھکاوٹ کی وجہ سے وہ بھی سونے کے لیے چلی گئیں۔ سب لوگ جا چکے تھے مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی شہلا حیدر کھٹ سے اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ بائیس تئیس سال سے دونوں کا ساتھ تھا۔ بہت دکھ سکھ اکھٹے شیئر کیے تھے۔ زندگی کے ہر پہلو کو ڈسکس کیا تھا۔

انسانی رویوں پر بحثیں کی تھیں۔ اس نے اسے اپنی پشت پر بٹھا کر حویلی کی سیر کرائی تھی۔ اس کے لیے سائیکل اور موٹر سائیکل چلائی تھی۔ ایک دفعہ اس کے لیے رکشہ بھی کرائے پر لے کر چلایا تھا۔ اس کے لیے ہر وہ کام کیا تھا جس کی وہ تمنا کرتی اور جب وہ کھلکھلا کر قہقہے لگاتی تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اس کی آج تک اس نے کوئی خواہش رد نہیں کی تھی۔ اس کی ایک محبت کے جواب میں دس محبتیں لوٹائی تھیں۔ اس کو زندگی میں کبھی بھی تنہا نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو اس نے اپنے لبوں سے چوما تھا۔ اتنی محبتیں، اتنی چاہتیں، اتنی عنایتیں، اتنا اعتماد سب کچھ تو اس نے اسے دے دیا تھا اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں رکھا تھا مگر شہلا حیدر کسی ایک محبت کا حق بھی ادا نہ کر سکی اور باپ کے احساسات اور جذبات کو سمجھنے کی دعویدار ایک لمحے میں اپنے وعدے اور اقرار سے پھر گئی کہ وہ بھی اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہے۔ اس کے شدید ردعمل نے حیدر کو بہت تکلیف دی تھی۔ جب خون کے رشتے یوں بدل جائیں تو دوسروں پر کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ہر رشتہ اسے ناپائیدار اور مفاد پرست لگنے لگا۔ مگر اس کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی کہ ہم سب انسان خطاؤں کے پتلے ہوتے ہیں اور مختلف حالات میں انسان کا غیر متوقع ردعمل اس کی ساری زندگی کی کہانی کا

آئینہ دار نہیں ہوسکتا۔ ایسی مثبت سوچ اس کو انسانیت پر سے اعتبار کھونے نہیں دیتی تھی۔ شہلا حیدر فراک پہننے کی عمر سے لے کر عروسی جوڑے تک لمحہ بہ لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

کاش وہ انہی اچھے جذبات کے ساتھ رخصت ہوتی تو حیدر کا دل یوں کرچی کرچی نہ ہوتا مگر حالات کا انسان کے بس میں ہونا اور انسان کے ردعمل کا ان کے مطابق ہونا بھی شاید انسان کے اپنے بس میں نہیں۔ وہ شہلا حیدر کو قصوروار سمجھتے ہوئے بھی اور اس کے پوزیسو رویے کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اسے قصوروار نہیں ٹھہراتا تھا۔ باپ اور اولاد کے درمیان رویوں کا یوں حائل ہونا قابل مذمت تو تھا مگر ان نیچرل نہیں تھا۔ حویلی کے اس کمرے میں یادوں کا خزانہ تھا۔ جس شے کی طرف دیکھتا یادوں کے دریچے وا ہوتے جاتے...... شہلا کے ساتھ گھنٹوں آتش دان کے پاس بیٹھ کر کالج اور یونیورسٹی کی باتیں کرنا...... محبّت اور وارفتگی کی باتیں کہہ سن کر مسرور ہونا...... ایک دوسرے کو تنگ کر کے خوش ہونا...... اور پھر طاہرہ کی سنگت میں اس کمرے اور اس کی چیزوں کو شیئر کرنا۔

بیڈ کے ساتھ جھولتی ایزی چیئر پر بیٹھے بیٹھے اس کا اونگھنا اور طاہرہ کے شکوے سننا کمرے کے ایک کونے میں رکھے لکڑی کے جھولے میں شہلا حیدر کو جھولا جھلانا...... کونے میں رکھی ٹیبل اور اس پر رکھے لیمپ کی روشنی میں حیدر کا شہلا کو پڑھانا...... سب کچھ اپنی جگہ پر تھا اور ان سے منسلک یادیں بھی جوں کی توں ذہن میں موجود تھیں مگر وہ انسان نہیں رہے تھے۔ ان چیزوں کو چھونے والے...... اپنی یادیں ان پر نقش کرنے والے اور یادوں کو زندگی بخشنے والے...... کوئی بھی تو نہیں رہا تھا، سب اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن تھے...... اور وہ خود بھی...... کسی دن ایک یاد بن جائے گا...... جیسے شہلا یاد بن گئی تھی...... طاہرہ اور شہلا حیدر بھی...... اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج چکے تھے۔ مارچ کے مہینے میں خنکی کافی حد تک کم ہو چکی تھا۔ بہار کی آمد نے وجودوں پر جمی خنکی کی تہوں کو کافی حد تک کرید ڈالا تھا اور اب وہ نرم، گرم، ٹھنڈے خوشگوار جھونکوں سے انھیں موسم کے حسین تغیّر سے معطر کر رہے تھے۔ اس نے کھڑکیاں کھولیں اور شہلا کے جھولے کے پاس آ کر رک گیا...... اسے اپنے ہاتھوں سے جھلانے لگا جیسے وہ بچپن میں اسے جھلانے کا عادی تھا۔

یادیں ہی یادیں تھیں۔ اچھی اور تلخ...... خوبصورت اور کریہہ...... اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو رہا تھا...... وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا...... اور برآمدے میں آہستہ آہستہ چلنے لگا...... چودھویں کا چاند پورے صحن کو اپنی ٹھنڈی ڈھلتی روشنی سے منور کر رہا تھا۔ وہ نادانستہ

اتنے لمبے برآمدے کا چکر لگا رہا تھا۔ برآمدے میں موجود قطار در قطار کمروں کے دروازے بند تھے مگر چلتے چلتے وہ رک گیا..... شفق کے کمرے کے سامنے...... اس کا دروازہ آدھا کھلا تھا اور آدھا بند تھا...... لائٹ آن تھی...... اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ اُس نے بشریٰ آپا سے کہہ رکھا تھا کہ سوتے وقت ہر ایک کا دروازہ اچھی طرح بند ہونا چاہیے۔ مگر شاید شادی کی وجہ سے کسی کو بند کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو دنگ رہ گیا۔ شفق زمین پر گری تھی اور خون اس کے ماتھے سے بہہ کر اب جم چکا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا اور جلدی سے اسے اٹھا کر بستر پر لٹایا...... وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ جب سے اس نے سید صاحب کی جگہ جانشینی اختیار کی تھی اس نے ڈاکٹری کو خیرباد کہہ دیا تھا اور پولیٹکس میں آنے کے بعد اسے پریکٹس کی فرصت تو بالکل ہی نہیں ملتی تھی۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس لایا۔ اس کا خون صاف کر کے بینڈج کی اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور حیدر کو یوں اپنے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ چونک گئی۔

"انکل...... آپ...... کب...... یہاں آئے......؟"

"مجھے چھوڑو...... مگر یہ بتاؤ کہ آپ کو کیا ہوا تھا اور کب سے ایسا ہو رہا ہے؟"

"معلوم نہیں انکل...... ایک دم بہت شدید چکر آیا اور مجھے لگا جیسے میں وہیں گر جاؤں گی۔ اس لیے میں کمرے میں آ گئی اور پھر کب میں گر گئی مجھے یاد نہیں......"

"بیٹا مجھے لگ رہا ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔" حیدر نے پیار سے پوچھا تو اس کی آنکھوں سے جیسے چشمے ابل پڑے...... اتنے آنسو کہ تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔

"آپ رو کیوں رہی ہیں کچھ تو بتائیں...... ہر مسئلے کا حل ہے......"

"نہیں انکل...... ہمارے مسئلوں کا کوئی حل نہیں۔"

"مگر پھر بھی...... کچھ تو بتاؤ نا......" اس نے اسے دلاسا دیا اور جیب میں سے رومال نکال کر اس کی آنکھوں کو صاف کیا تو وہ اور شدت سے رونا شروع ہو گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"دیکھو...... اگر آپ کچھ نہیں بتاؤ گی تو میں کیسے جان پاؤں گا کہ آپ کس بات سے پریشان ہو...... کچھ تو بتاؤ آخر ہوا کیا ہے...... رونے سے مسئلے حل تو نہیں ہوتے......" وہ اسے سمجھا رہا تھا اور وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔

''انکل...... کیا میری مما بہت بری تھیں......؟'' اس کے اس سوال پر حیدر چونک گیا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''آپ کیوں ایسا پوچھ رہی ہو بیٹا......؟'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''انھوں نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے...... انھوں نے ہمیں یوں چھوڑ دیا جیسے جانور اپنے بچوں کو اِدھر اُدھر پھینک کر چلے جاتے ہیں...... انکل آئی رئیلی مس ہر......''

''ہاں میں جانتا ہوں لیکن تمھارے پاپا نے بھی تو ان کے ساتھ بہت زیادتیاں کی تھیں۔''

''مگر اس میں ہمارا کیا قصور تھا...... ہم نے کیا گناہ کیا تھا۔ ان دونوں نے ہم سے ہمارا بچپن، ہماری شرارتیں، مسکراہٹیں اور سب کچھ ہی تو چھین لیا...... شہلا باجی تو بہت خوش قسمت ہیں کہ انھیں آپ جیسا باپ ملا اور ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں نہ مما نہ پاپا...... نہ بہن اور بھائی بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم روتے تھے تو کوئی آنسو پونچھنے والا نہ ہوتا تھا اور دکھی ہوتے تھے تو کوئی دکھ سن کر تسلی دینے والا نہ ہوتا تھا۔ میں اور آفاق پوری زندگی کھل کر نہیں ہنسے...... انکل جو لوگ دوسروں کی خوشیوں کو چھین لیں کیا انھیں معاف کیا جا سکتا ہے...... خدا کرے وہ بھی اسی طرح مشکلات سے گزریں...... انھیں بھی اندازہ ہو کہ دکھ اور غم جب خون میں گردش کرتا ہے تو کیا محسوس ہوتا ہے......'' وہ بے تکان بولتی جا رہی تھی۔

''بس کرو شفق بیٹا...... اتنی بددعائیں مت دو...... نامعلوم کون کتنے کرب سے پہلے ہی گزر رہا ہے......'' حیدر آہستہ سے بولا تو وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''انکل...... آپ مما کو اچھی طرح جانتے تھے نا؟''

''ہاں......''

''تو پھر انھوں نے ایسا کیوں کیا......؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں بیٹا......؟''

''کیوں انکل، آپ تو ان سے محبت کرتے تھے نا؟'' شفق کے منہ سے نادانستہ نکلا تو حیدر نے اس کی طرف حیران کن نگاہوں سے استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

''آئی ایم سوری...... لیکن پاپا جب بھی مما کو کوستے تھے تو آپ کو بھی ضرور انوالو کرتے تھے......'' وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی اور حیدر بنا کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''سوری انکل...... آپ ناراض تو نہیں ہیں...... نہ جانے کیسے اچانک میرے منہ

سے نکل گیا......'' شفق اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی۔

''ہم بہت سی باتوں میں دوسروں کو الزام دینے کے عادی ہوتے ہیں اور...... اور تمہارا باپ بھی ان میں سے ایک تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ اس کی شادی سے پہلے تھا جب ہم کزنز تھے مگر شادی کے بعد وہ منصور اور تم لوگوں سے بہت مخلص تھی اس نے تو مڑ کر بھی حویلی کی طرف نہیں دیکھا۔ منصور نے اس پر اتنا تشدد کیا اور اتنی ذہنی اذیتیں دیں کہ وہ خود ہی سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی طرف سے اپنا ذہن صاف کرلو......اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ کوئی بھی ماں اپنے بچوں کو چھوڑ کر مطمئن زندگی نہیں گزارتی۔'' حیدر نے شہلا کا دفاع کرنے کی پوری کوشش کی۔

''لیکن......؟''

''لیکن کچھ نہیں......اب جاؤ اور آرام کرو......'' حیدر کہہ کر خاموشی سے آگے بڑھ گیا اور وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

......۞......

ملک منصور کی الیکشن کمپین بہت کامیاب جا رہی تھی اور شزا اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اسے اپنی کامیابی یقینی نظر آ رہی تھی۔ دونوں ایک جلسے سے تھکے ہارے رات کے تین بجے لوٹے تھے...... الیکشن نے اچانک دونوں کا پھر سے ملاپ کرا دیا تھا ورنہ ملک منصور تو کئی کئی دن گھر نہ آتا تھا، کہاں ہوتا تھا......کس کے ساتھ ہوتا تھا اس نے سوالات کرنے کے سارے حقوق شزا سے چھین لیے تھے۔ اگر شزا کبھی رعب سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو اگلے ہی لمحے اسے اپنی حیثیت کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا۔ اس نے ہر طرح سے صرف شائل اور سمیر کے لیے اس سے کمپرومائز کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا کیونکہ وہ آفاق اور شفق کو دیکھ کر دہل جاتی اور ملک منصور کو اس کے حالات پر چھوڑ دیتی۔

''منصور اس الیکشن میں آپ کے جیتنے کے کتنے پرسنٹ چانسز ہیں......؟''

''تمھیں کیا لگتا ہے......؟'' وہ فاتحانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''حالات تو اچھے ہی لگ رہے ہیں......''

''اور یہ سمجھو کہ گیم اپنے ہاتھ ہی میں ہے...... اس دفعہ میں نے سارے مہرے بڑی ہوشمندی سے استعمال کیے ہیں......تم دیکھنا انشاء اللہ جیت ہماری ہوگی...... چیف منسٹر کے عہدے تک پہنچنے کے لیے میں نے اس دفعہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔''

''کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں......''

''کچھ نہیں...... میں یونہی کہہ رہا تھا......'' وہ بات کو پلٹنے میں ماہر تھا اور شزا سمیت وہ کسی بھی عورت پر مکمل اعتبار نہیں کرتا تھا۔ وہ اعتماد ضرور دیتا تھا مگر خود اعتبار نہیں کرتا تھا۔ وہ سیاست کا شاطر اور منجھا ہوا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ خوبصورتی سے لے کر ذہانت اور مکارانہ چالوں تک وہ ہر چیز پر مکمل عبور رکھتا تھا۔ دراز قد، خوبصورت نقوش، سفید رنگت، سڈول توانا جسم، سفید اور کہیں کہیں سے جھانکتے ہوئے کالے بال، تھری پیس سوٹ میں پائپ پیتے ہوئے وہ بہت سلجھی ہوئی گرومڈ پرسنالٹی لگتا اور اس کا ٹھہرا ٹھہرا لب و لہجہ اور سوچ کر بات کرنے کا انداز اسے پیدائشی سیاستدان ظاہر کرتا۔

سب جانتے تھے کہ اس چمکدار پرسنالٹی کے پیچھے کتنا بھیانک ذہن اور مکار سوچ ہے۔ وہ اپنی ہر خوبی کو کیش کرانے کا عادی تھا اور کس طرح کس کو کیسے ایکسپلائٹ کرنا ہے اس فن سے بھی بخوبی آشنا تھا۔ اسی لیے آج تک اس نے جتنے الیکشنز میں حصّہ لیا تھا کبھی نہیں ہارا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے گاؤں کی سیٹ سے جیتا تھا اس نے گاؤں والوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا کہ اس کے مقابلے میں آنے والا پہلے ہی اس کے حق میں بیٹھ جاتا ہر الیکشن کے بعد اسے وزارت میں حصّہ ملنا ضروری سمجھا جاتا تھا اور اب ایک ہی جست میں وہ چیف منسٹر کا عہدہ لے کر اپنا دیرینہ خواب پورا کرنا چاہ رہا تھا اور اپنے ان خوابوں میں اس نے شزا کو بھی شریک کر رکھا تھا کیونکہ این جی او چلانے کی وجہ سے شزا کی سماجی حیثیت بھی کافی مستحکم تھی اور وہ اس کی حیثیت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی جب کہ وہ شزا کی...... مگر دونوں اندر ہی اندر ایک دوسرے کے ساتھ جس حد تک مخلص تھے دونوں خوب جانتے تھے۔ شزا اس کا جواب سن کر خاموش ہو گئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اپنے رازوں میں کسی دوسرے کو شریک کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔

''منصور...... آپ سے ایک بات پوچھنا تھی......''

''ہاں...... کیا بات ہے......؟'' اس نے لینڈ کروزر ٹرن کرتے ہوئے پوچھا۔

''منصور...... شفق بہت دنوں سے نظر نہیں آ رہی۔ کہیں باہر چلی گئی ہے؟'' شزا شاید زندگی میں پہلی بار قدرے تشویش سے بولی۔ منصور نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا مبادا کہیں وہ سب کچھ جانتے ہوئے اسے ڈاج تو نہیں دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سچ کی لہر دیکھ کر وہ قدرے اطمینان سے بولا۔

''ہاں...... وہ کچھ روز کے لیے انگلینڈ گئی ہے۔''

''اچھا...... خیریت تو ہے...... بغیر بتائے......''

''کیا وہ پہلے بتا کر جاتی تھی اور ویسے بھی وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہے۔''

''لیکن منصور گھر میں ایک فرد رہتا ہو تو اس کے آنے اور جانے کا دوسروں کو اندازہ ہو ہی جاتا ہے...... اسے گئے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔''

''آ جائے گی...... تم کیوں اتنا انٹرسٹ شو کر رہی ہو...... وہ لوگ تو تمھیں دیکھنا بھی نہیں چاہتے......'' منصور کا ہمیشہ سے یہی مہرہ کامیاب رہا تھا۔ وہ شزا کو ہمیشہ بچوں کے خلاف باتیں بتاتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب تک شفق، آفاق اور شزا ایک دوسرے سے متنفر رہیں گے۔ گھر میں اس کے خلاف کوئی محاذ نہیں کھل سکے گا۔ اس نے بچوں کے ساتھ شزا اور شہلا کے ساتھ جتنی زیادتیاں کی تھیں وہ ان سب سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ کسی بھی صورت میں ان کا اتحاد اس کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا اس لیے شروع دن سے اس نے شزا کو ان سے متنفر رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا بچپن سے ہی شفق اور آفاق کو سوتیلی ماں سے بچنے کے مشورے دیتا تھا۔ اس شخص نے گھر اور باہر ایسی مکارانہ چالوں کی بساط بچھا رکھی تھی کہ وہ آکٹوپس کی طرح اپنی طرف اٹھنے والی ہر شے کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی...... وہ ان سب کی طرف سے بہت مطمئن تھا...... اسے گھر کا سکون نہیں چاہیے تھا۔ اس کا سکون تو ہمیشہ گھر سے باہر ہوتا اور ملک کا سکون بھی اس کے لیے نقصان دہ تھا اس لیے وہ سیاسی جوڑ توڑ اور سازشوں میں برابر کا شریک رہتا...... منصور کا جواب سن کر وہ خاموش ہو گئی اور پھر مزید کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت نہ رہی۔

''شزا...... سمیرا اور شمائل سے بہت دنوں سے بات نہیں ہوئی...... کیا کر رہے ہیں آج کل؟'' اس نے شزا کا موڈ آف دیکھ کر اس سے پوچھا۔

''منصور شمائل آپ کو بہت مس کرتی ہے۔ اب وہ لاہور آنا چاہ رہی ہے۔ مری میں اس کا دل نہیں لگ رہا ہے۔''

''نہیں...... نہیں...... یہاں کیا رکھا ہے...... اگر اس کا دل ادھر نہیں لگ رہا تو میں اس کو انگلینڈ، امریکا جہاں بھی وہ جانا چاہتی ہے ادھر بھیج دیتا ہوں۔''

''نہیں منصور، وہ آپ کو مس کرتی ہے۔ مجھے مس کرتی ہے۔ وہ گھر میں رہنا چاہتی ہے وہ ہم دونوں سے متنفر ہو رہی ہے۔ آپ بھی تو سوچیں کب اس سے ملنے گئے تھے اور اکثر

وہاں جا کر بھی آپ اس سے مل کر نہیں آتے۔'' شزا نے بلاواسطہ اس پر چوٹ کی۔ منصور نے پہلو بدلا اور گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔

''لیکن یہاں آ کر وہ اور ڈسٹرب ہو جائے گی۔''

''کیوں......؟''

''بھئی میں اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہوں اور تم بھی تو ہر وقت مصروف رہتی ہو پھر وہی مسئلہ ہوگا۔ اسے سمجھاؤ کہ یہاں آنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ اسے کنوینس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''منصور میں بچوں کو کیسے سمجھاؤں...... کیا کوئی بھی ماں باپ بچوں کو گھر آنے سے روک سکتے ہیں۔'' شزا جھنجلا کر بولی۔ ملک منصور اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ ''منصور وہ بڑی ہو رہی ہے اور سمجھدار بھی بہت ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ ہم دونوں کو ناپسند کرنے لگے اور پھر خود ہی بکھر جائے جیسے شفق اور آفاق۔''

''اگر وہ ہمیں ناپسند کرنے لگے گی تو ہم اسے روک تو نہیں سکتے اور شفق اور آفاق کو کیا ہوا ہے، ٹھیک ٹھاک تو ہیں۔''

''منصور کیا وہ ٹھیک ہیں......؟'' شزا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں تو کیا ہوا ہے انھیں سب کچھ تو نارمل ہے......''

منصور آپ کو سب معلوم ہے کہ آفاق کیا کچھ کرتا رہتا ہے اور شفق کس قدر ضدی اور خودسر ہے وہ بعض اوقات اس قدر جنونی ہو جاتی ہے کہ مجھے تو اس سے خوف آنے لگتا ہے۔

''کم آن شزا...... یہ ہم سب امیروں کی اولادوں کے ساتھ مسئلہ ہے بلکہ اب تو اسٹیٹس سمبل بن چکا ہے تھوڑی سی ابنارملٹی، مختلف اور منفرد ہونے کا شوق...... ان کے دکھاوے اور ان کے اسٹائلز، جب تک یہ سب کچھ نہ ہو وہ کیسے منفرد لگیں گے......'' وہ لائٹ موڈ میں بولا۔

''لیکن منصور...... میں اپنی شمائل اور سمیر میں یہ سب کچھ ڈیویلپ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''ویری گڈ...... تم تو آج مجھے چونکا رہی ہو......'' وہ ہنستے ہوئے بے پروائی سے بولا۔

''کیوں......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اپنی بورژوا سوچ سے...... آج کل تو منسٹرز کی بیویاں خود ایسے شوق پالتی ہیں کہ تھوڑی سی ابنارملٹی خود بخود ڈیویلپ ہو جائے۔ پھر سائیکلوجسٹ کے پاس سیشنز کے لیے

جائیں...... اٹس پارٹ آف آور ماڈرن سوسائٹی......'' منصور ہنستے ہوئے بولا۔

وہ اس کی باتیں سن کر خاموش ہوگئی۔ اس شخص سے جیتنا آسان نہیں تھا۔ وہ سوسائٹی کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا۔ مردوں کی شاطرانہ چالوں اور عورتوں کی چلتر بازیوں اور بناوٹی رویوں سے...... وہ ہر چیز کو لائٹلی لینے کا عادی تھا۔ واقعی یہ شخص بہت گٹسی ہے۔ وہ جتنا اس کو ناپسند کرتی تھی اتنی معترف بھی ہوتی جاتی تھی۔

''یار تم آنے والے دنوں کے بارے میں سوچو جب تم وائف آف چیف منسٹر ہوا کروگی ہر فنکشن میں تم ہی تم ہوگی۔'' منصور کے لہجے میں آنے والے دنوں کی امید اور لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''ہاں......تب تک نہ جانے تم؟''

''ہاں...... یہ بھی خوب کہی...... میں جانتا ہوں تمہارا اگلا جملہ کیا ہوگا...... بھئی تمہاری ٹون، تمہارے ایکسنٹ اور تمہارے دیکھنے کے انداز سے مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو اور تمہارا کیا مطلب ہے...... آخر تمہارے ساتھ زندگی گزاری ہے۔'' اس نے شزا کو خوش کرنے کے لیے اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھا تو وہ مسکرا دی...... ملک منصور اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا اور اب وہ مسرور سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''منصور آپ نے سحر کو دیکھا ہے اس میں کتنا چینج آ گیا ہے۔'' وہ ایک دم بولی۔

''کون...... وہ بھکارن...... ابھی تک یہیں ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''منصور آپ ایسے کہہ رہے ہیں۔ جیسے آپ کو معلوم ہی نہیں۔''

''قسم لے لو ڈارلنگ...... میں نے کبھی اس فقیرنی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ میرے پاس ایسے کیڑے مکوڑوں کو دیکھنے کی فرصت نہیں اور ویسے بھی میں فی الحال اسے چھیڑ کر کوئی نیا ایشو نہیں اٹھانا چاہتا۔ چیف منسٹر بن جاؤں تو سب سے پہلے اپنے گھر کو اس گند سے صاف کروں گا اور تم خواہ مخواہ پینک مت ہوا کرو......'' منصور نے گاڑی گیٹ کے اندر لاتے ہوئے کہا۔

''میں تو اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔''

''گڈ......''

''میں یونہی ڈسکس کر رہی تھی کہ اب تو وہ بہت بدل گئی ہے کلب میں اس کا بڑا نام ہے......گیمبلنگ میں تو بہت ایکسپرٹ ہو چکی ہے۔''

''اونہہ..... کیا ٹڈی اور کیا ٹڈی کا شوربہ۔'' وہ تمسخرانہ قہقہہ لگا کر بولا تو وہ بھی ہنس دی۔

گھر میں گہرا سکوت تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی شہرِ خموشاں میں داخل ہو گئے ہوں۔ تمام کمروں کی لائٹس آف تھیں صرف پورچ اور لاؤنج کی آن تھی گھر میں اتنا سناٹا دیکھ کر شزا شکایتی لہجے میں اس سے بولی۔ ''منصور اگر شائل اور سمیر گھر آ جائیں تو گھر میں رونق تو ہو ہی جائے گی۔''

''شزا پھر وہی بات...... ان کو گھر سے دور ہی رکھو تو بہتر ہے۔ میں جب چیف منسٹر بن جاؤں گا تو خود ہی بلا لوں گا۔'' اس نے اسے جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ ملک منصور کے ارادوں اور نیتوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ شخص محض بہانے گھڑنے کا عادی تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بیڈروم میں چلی گئی اور جاتے ہی سو گئی مگر وہ نہ جانے کب تک فون پر الیکشن اور اس پر مبنی صورتِ حال اپنے پی اے سے ڈسکس کرتا رہا۔

سہیل جیل میں نہایت اذیت کی حالت میں تھا۔ سزا کے بعد ملک منصور نے مڑ کر بھی اس کی خبر نہیں لی تھی کہ وہ کن حالوں میں تھا۔ وہ اپنی حالت سے ہی اندازہ لگا رہا تھا کہ اس نے یقیناً اس کے گھر والوں کی بھی خبر نہیں لی ہوگی اور اس کا کسی طرح ان سے رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ چند دنوں میں ہی اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اچانک ایک دن اس کی ماں ملنے آئی تو اس کی حالت دیکھ کر بلکنا شروع ہو گئی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ اسے چپ کرانے کے لیے بہت تسلیاں دے رہا تھا مگر وہ روئے جا رہی تھی۔

''سہیل بیٹا...... خدا کے لیے تم سچ کیوں نہیں کہتے۔ مجھے اس لڑکی نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا پھر بھی تم نے الزام اپنے سر لے لیا اور دیکھو وہ کیسے احسان فراموش لوگ ہیں۔ جس کے لیے تم نے یہ سب کیا اس نے ایک دفعہ بھی مڑ کر ہماری خبر نہیں لی۔''

''اماں کس نے...... آپ شفق کی بات کر رہی ہیں۔ وہ تو شاید۔''

''نہیں...... تمھارے مالک نے...... وہ تو میں جانتی ہوں کہ اس کے باپ نے اسے گولیاں مار دی تھیں۔ ان بڑے لوگوں کو خدا ہی جانے۔ مگر بیٹا میرا تو سہارا تو ہے۔ ہماری حالت سے بھی تو اچھی طرح واقف ہے اب تو نوبت فاقوں تک آ گئی ہے۔ پر تو فکر نہ کر...... بس کسی طرح باہر آنے کی سوچ۔''

''ہاں اماں، اب کچھ تو سوچنا پڑے گا۔ وہ شخص واقعی اس قابل نہیں تھا کہ اس کے

ساتھ نمک حلالی کی جاتی۔ میں نے اپنی زندگی اس کی خاطر داؤ پر لگا دی ہے اور وہ کس قدر بے حس نکلا......مگر آپ فکر نہ کریں۔ اس ایڈریس پر جا کر آصف نام کے لڑکے کو میرے بارے میں بتائیں اور کہیں کہ میں اسے جیل میں ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ماں کو ایڈریس اچھی طرح یاد کرایا اور آصف کے اخبار کا دفتر وغیرہ اسے سمجھا دیا۔ آصف اس کے گاؤں کا ہی لڑکا تھا اور اس کا بہت اچھا دوست تھا وہ ایک اخبار میں صحافی کے طور پر نوکری کرتا تھا۔ ملک منصور کی پریس کانفرنسوں میں اکثر اس کی ملاقات سہیل سے ہوتی تھی اور سہیل کے ساتھ رفتہ رفتہ اس کی دوستی گہری ہوتی گئی۔ اس اندھیرے میں صرف آصف ہی اسے امید کی کرن نظر آئی۔ اماں نہ جانے کیسے اس تک پہنچی کہ اگلے دن آصف اس کے پاس تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اسے قدرے تشویش ہوئی۔

''یار مگر تم نے قتل کیوں کیا......؟''

''بس...... پوچھو مت۔ مگر اس وقت میں نے جس کام کے لیے تمھیں بلوایا ہے وہ دوسرا ہے......''

''کیا مطلب......؟''

''ملک منصور کی الیکشن میں پوزیشن کیسی جا رہی ہے...... اور ان کے چیف منسٹر بننے کے کتنے پرسنٹ چانسز ہیں۔''

''بہت اسٹرونگ پوزیشن ہے بلکہ تمام حلقوں میں یہی کہا جا رہا ہے کہ چیف منسٹر کی سیٹ صرف ملک منصور کے لیے ریزرو ہے۔''

''آصف تم میری بات سنو......'' اس نے آصف کے کان میں کچھ سرگوشی کی آصف کے چہرے پر مختلف رنگ آ جا رہے تھے۔

''یار دیکھو مروا نہ دینا......''

''دیکھو تمہاری جاب تو رسک ہی لینا ہے اور یہ کام جو تم کرنے جا رہے ہو۔ کم اہم تو نہیں......'' سہیل نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا۔

''میں کل تم سے ملنے آؤں گا......''

''ٹھیک ہے...... میں انتظار کروں گا......'' سہیل نے اطمینان سے کہا۔

''لیکن اگر مجھے گاؤں جانا پڑ گیا تو پھر زیادہ وقت لگ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے مگر پہلے ان لوگوں سے معاملہ طے کرنا پھر کوئی قدم اٹھانا۔'' سہیل نے

اسے گائیڈ کیا۔

''ہاں...... ظاہر ہے ان کی سپورٹ کے بغیر تو ایسے رسکی کام نہیں کیے جا سکتے، دعا کرنا......'' آصف نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

ملک منصور باقاعدگی سے سارے تھانے والوں کو منتھلی بھجواتا تھا۔ اسی لیے ان کی زبانیں بند تھیں ورنہ شفق کا معاملہ کب کا پریس میں جا چکا ہوتا۔ ایس ایچ او نے سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اس لیے وہ شفق والے معاملے سے بے فکر تھا۔ وہ بس الیکشن کا منتظر تھا اور اس کے بعد وہ ہر فکر سے آزاد ہوگا۔

جوں جوں الیکشن کے دن قریب آ رہے تھے اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں وہ ہر حلقے میں ہونے والی تمام سرگرمیوں کی پل پل کی خبر رکھتا۔ ہر طرف اس کے کارندے پھیل چکے تھے اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہتے۔ اس کے تینوں موبائلز ہر وقت مصروف رہتے۔

الیکشن میں دو دن باقی رہ گئے تھے وہ تمام اخباروں میں شائع ہونے والے سرویز سے صبح سویرے لطف اندوز ہوتا تھا اخبار ناشتے کی ٹیبل پر اس کے سامنے تھا اور وہ پوری طاقت سے چیخ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پورے گھر میں زلزلہ آ گیا ہو...... سحر اور شزا بھی اپنے کمروں میں سے بھاگتی ہوئی باہر آ گئیں۔ آفاق بھی دوڑتا ہوا باہر آ گیا...... یوں لگ رہا تھا جیسے ملک منصور پاگل ہو گیا ہو وہ موبائلز اٹھا اٹھا کر زمین پر پھینک رہا تھا اور گالیاں بکتا جا رہا تھا۔

''منصور...... ہوش کرو...... آخر کیا ہوا ہے؟'' شزا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''پانی لاؤ...... جلدی سے پانی لاؤ......'' شزا چلائی سحر بھاگ کر پانی کا گلاس لے آئی۔ شزا نے اسے پانی پلانا چاہا تو اس نے گلاس اٹھا کر زمین پر دے مارا۔

''آخر بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے......؟'' شزا نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کے کندھے دبانے لگی۔ ملک منصور نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر جیسے پرسکون ہو گیا۔ شزا نے اپنے کمرے میں سے کچھ گولیاں لا کر اسے زبردستی کھلا دیں...... اور اسے وہیں صوفے پر لٹا دیا، آفاق اور سحر دور کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی آگے نہ بڑھا...... چرمرا اخبار ٹیبل کے نیچے گرا پڑا تھا۔ آفاق نے آگے بڑھ کر اخبار اٹھایا اور دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''آفاق اس میں کیا لکھا ہے......؟'' سحر نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس گیم ختم......'' اس نے اخبار اس کے آگے پھینکا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سحر نے بھی اخبار حیرت زدہ نظروں سے دیکھا اور وہیں رکھ کر آفاق کے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔

ملک منصور اب اونگھ رہا تھا شنزا نے بھی اخبار اٹھایا تو چونک گئی۔ سارا کچھ ختم ہو گیا تھا......اور ایسی سچویشن میں ملک منصور کا ہارٹ فیل نہ ہونا بہت بڑی بات تھی۔ شنزا کو بھی سب کچھ ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ ملک منصور کے الفاظ اسے یاد آ رہے تھے۔ اس دفعہ میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے......اتنی بڑی کامیابی کے قریب پہنچتے پہنچتے وہ اچانک گھٹنوں کے بل گر گیا تھا اور اب دوبارہ اٹھنا بہت ہمت کی بات ہوگی۔

''آفاق اب کیا ہوگا......؟'' سحر حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

''ہو گا کیا...... انکوائری ہوگی اور شاید الیکشن سے ہی انھیں ڈس کوالیفائی کر دیا جائے......ایف آئی آر کٹنے کے بعد ہو سکتا ہے وہ کسی وقت بھی اریسٹ ہو جائیں۔''

''لیکن یہ سب اچانک کیسے ہوا......؟''

''مخالفین کی سازش ہے ......کسی نے بڑی گہری گیم کھیلی ہے......؟''

''مگر کس نے......؟''

''ظاہر ہے اپوزیشن نے...... وہ لوگ تو گھات میں لگے ہوئے تھے۔''

''لیکن دو سال بعد اس ایشو کا اٹھنا...... اور وہ بھی عین اس وقت جب الیکشن سر پر ہیں۔ واقعی کسی کی سازش ہی لگتی ہے۔'' سحر بولی۔

''سیاست سے بڑھ کر گندی چیز کوئی نہیں، کون کس وقت کلین بولڈ ہو جائے کسے خبر ہے......؟'' آفاق نے تشویش سے کہا۔

''آفاق تمھیں دکھ ہو رہا ہے ...'' سحر نے اس کا افسردہ چہرہ دیکھ کر کہا۔

''نہیں...... جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ ایسا تو ایک دن ان کے ساتھ بھی ہونا ہی تھا۔''

کچھ دیر بعد باہر گاڑی کی آواز آئی تو آفاق تقریباً بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکلا وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شنزا اور ملک منصور دونوں کہیں جا رہے تھے۔

''کون ہے باہر......؟'' سحر نے حیرت سے پوچھا۔

''پاپا اور شزا آنٹی...... کہیں جا رہے ہیں ؟''

''واقعی......'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں...... وہ واقعی بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو بے ہوش ہو چکا ہوتا......'' آفاق قدرے حیرت سے بولا۔

''سیاست اعصاب کو مضبوط بنا دیتی ہے۔'' سحر بولی۔

''اور سیاستدانوں کو ڈھیٹ......'' آفاق سرد لہجے میں بولا۔

ملک منصور کو اس کڑے وقت میں پارٹی نے الیکشن سے علیحدہ کر دیا تھا اور اب وہ روپوش تھا۔ اس کا اس وقت کہیں چلے جانا ہی بہتر تھا۔ شہر میں اس کا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

آصف بھی کہیں روپوش تھا اور سہیل اس کا شدت سے منتظر تھا البتہ کچھ پولیس والوں کی زبانی اسے باہر کے حالات کا علم ہوا تھا اس لیے وہ مطمئن تھا۔ آصف کا اس وقت روپوش ہونا ہی بہتر تھا۔ الیکشن کے بعد کی صورتِ حال کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔

شزا اخبار کھولے حیرت سے اسٹوری پڑھ رہی تھی۔ ملک منصور نے دو سال پہلے اپنی...... سیکرٹری کو قتل کیا تھا۔ اس کی ساری تصویریں اور کہانی اخبارات میں شائع ہو چکی تھی۔ اس اسکینڈل کے منظرِ عام پر آتے ہی ملک منصور کی مقبولیت کا گراف جس تیزی سے نیچے گرا وہ سب کے لیے حیران کن بات تھی۔

''ملک صاحب یہ تصویریں کس کے پاس تھیں......'' شزا بار بار ملک منصور سے پوچھ رہی تھی...... جب اسے اس کے ایک دیرینہ دوست کے پاس علاقہ غیر میں راتوں رات چھوڑنے جا رہی تھی۔

''مجھے اچھی طرح یاد نہیں لیکن وہ رپورٹر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اسے تو میں نے خود ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن جس نے بھی میرے ساتھ یہ گیم کھیلی ہے میں اسے جہنم رسید نہ کر دوں تو ملک منصور میرا نام نہیں۔'' اس کا خون بدلے کی آگ سے کھول رہا تھا۔ ''شزا تم اس صحافی کا نام جاننے کی کوشش کرو......''

''اس اسکینڈل کا اس وقت منظرِ عام پر آنا کوئی گہری سازش معلوم ہوتی ہے۔''

''جو کوئی بھی ہے ملک منصور اسے چھوڑنے والا نہیں۔ ایسے واقعات تو آئے دن

ہوتے رہتے ہیں مگر اس وقت اس کا جو استعمال کیا گیا ہے یہ کسی شاطر ذہن کی کارستانی ہے۔ میرا خواب تو پورا ہونے سے رہا لیکن میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اس شخص سے بدلہ نہ لے لوں...... میری ساری محنت اکارت گئی اور سب کچھ بھی......شزا تم ہمت نہ ہارنا...... ہمیں اپنے بچوں کے لیے اپنا کھویا ہوا وقار واپس لینا ہے۔''

''شزا حیرت سے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی کن باتوں پر یقین کرے۔اب والی یا پہلے والی باتوں پر۔

الیکشن میں ملک منصور کی پارٹی واضح اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی اور چیف منسٹر شپ بھی انہی کے حصے آئی تھی۔ ملک منصور نے یہ خبر سنی تو دل مسوس کر رہ گیا۔ ہاتھ آئی چیز جب اچانک پھسل کر دریا میں گر جائے تو سوائے ہاتھ ملنے کے باقی کیا رہ جاتا ہے۔یہی حال ملک منصور کا تھا۔ وہ مسلسل اب اپنی پارٹی سے رابطہ کیے ہوئے تھا اور حالات پر اس کی گہری نظر تھی۔

آصف پر دو دفعہ قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ اپوزیشن کے جن لوگوں نے اسے مہرے کے طور پر استعمال کیا تھا اور اسے ہر طرح کے تحفظ کی ضمانت دی تھی اب پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ملک منصور کی پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد انھیں شدید سیکیورٹی رسک لاحق تھا۔ان کے خلاف بھی مقدمے بن سکتے تھے۔کئی فائلیں کھل سکتی تھیں۔اس لیے انھوں نے آصف کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اب وہ بھی پناہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔شیروں کی کچھار میں ہاتھ ڈال کر وہ پچھتا رہا تھا۔شزا بھی اس کو ٹریس آؤٹ کرنے کی کوشش میں تھی۔سہیل بھی مزید پریشانی اور الجھنوں کا شکار ہو چکا تھا۔ پولیس اب اس پر پہلے سے زیادہ تشدد کرتی کیونکہ وہ ہر روز جیل میں کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا کر دیتا تھا۔اس کے بال سر سے صاف کر دیے گئے تھے اور اس کی رنگت جل کر سیاہ ہو چکی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے مزید گہرے ہو چکے تھے...... ہر لمحہ اسے ملک منصور کا خطرہ لاحق رہتا۔اب اس شخص سے اسے کوئی بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ ہر دن خطرے سے پُر ہوتا اور ہر آہٹ خوف سے۔

شمائل مری سے ڈرائیور کے ساتھ اکیلی آ گئی تھی۔ ڈرائیور اسے کچھ ضروری سامان دینے گیا تھا مگر وہ خود ہی اس کے ساتھ آ گئی تھی۔شزا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں......شمائل اتنی خودسر اور خود مختار ہو سکتی تھی اسے قطعی اندازہ نہ تھا۔اس نے حیرت سے

اس کی طرف دیکھا۔

''تم......تم......اچانک یہاں کیسے آ گئیں اور اسکول والوں نے تمھیں کیسے آنے دیا......؟''

''مم......مما......وہ۔''

''میڈم...... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' نئے ڈرائیور شوکت نے سرگوشی کے انداز میں کہا تو وہ چونک گئی۔

''شائل تم کمرے میں جاؤ...... میں ابھی آتی ہوں۔'' شائل بوجھل قدموں سے اٹھ کر چلی گئی۔

''ہاں کیا بات ہے......؟''

''میڈم......شائل بی بی بہت پریشان ہیں اور......اور......انھوں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی مگر بچ گئیں اسکول والے، میڈم اس دن سے آپ کو اور ملک صاحب کو فون کرنے کی کوشش کررہے ہیں مگر فون ملتا ہی نہیں۔ میں جب سامان دینے گیا تو ان کی مس نے مجھے میڈم صاحب سے ملوایا۔ شائل بی بی نے انھیں گھر آنے کے لیے بہت تنگ کر رکھا تھا اور وہ گھر والوں کی اجازت کے بغیر آنے نہیں دیتے۔ میں آپ کو فون کرنے آ رہا تھا کہ مجھے سڑک پر آفاق صاحب مل گئے تو میں نے انھیں اسکول چلنے کو کہا پہلے تو مانے نہیں مگر پھر مان گئے اور اسکول والوں نے ان کے کاغذ دیکھ کر شائل بی بی کو آنے دیا۔ میڈم صاحب بول رہی تھیں کہ وہ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں رہیں۔ ہر وقت پریشان رہتی ہیں۔ ان کا علاج کروائیں پھر اسکول بھیجیں۔''

''اور سمیر......؟'' شزا نے اس کے بارے میں پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہیں......انھیں کوئی مسئلہ نہیں۔''

''اچھا تم جاؤ......'' شزا آہستہ سے بولی۔ شائل اور خودکشی......اسے قطعی یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس قدر شدید فرسٹریشن کا شکار ہوسکتی ہے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اندر کمرے میں گئی تو وہ بستر پر لیٹی تھی۔ اس کا پژمردہ چہرہ اس کے اندر کی داستان سنا رہا تھا۔ اسے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا مگر اس نے اپنے غصّے کو کنٹرول کیا۔

''کیا بات ہے شائل......تم کیوں اپ سیٹ ہو......؟'' وہ شائل کو اپنے ساتھ لگا کر بولی تو وہ رونا شروع ہو گئی۔

''بولو نا ڈیر...... کیا بات ہے......؟''

''کچھ نہیں......'' وہ بس روئے جا رہی تھی۔

''کچھ تو بتاؤ...... اور تم نے خودکشی کی کوشش کیوں کی......؟'' وہ دھیمے مگر شکایتی لہجے میں بولی۔

''میں زندگی سے بیزار ہو گئی ہوں......''

''مگر کوئی وجہ بھی تو ہو......''

''میں سروائیو نہیں کرنا چاہتی......''

''پھر وہی بات......؟''

''ابھی تم آرام کرو...... میں تمھارے لیے کھانا لگاتی ہوں۔'' وہ اسے بستر میں لٹا کر باہر چلی گئی۔

شمائل شدید ڈپریشن کا شکار تھی اور شہزا کو اس کی یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہو رہا تھا۔ ملک منصور تمہاری زندگی کا حاصل کیا ہے......؟ تمہاری ساری اولاد ہی ڈپریشن کی ماری ہے نہ جانے تمھارے جینز میں کیا ہے کہ ہر کوئی ڈسٹرب ہے......اب سمیر...... یا خدایا اس کو اپنی امان میں رکھنا...... وہ ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھی اور ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی۔ ملک منصور کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی اولاد کیا سوچ رہی ہے اور کیا کر رہی ہے اس کے نزدیک تو سب کچھ ماڈرن سوسائٹی کے فیشنز ہیں۔ ان کا مخصوص اسٹائل ہے......اور شمائل کا خودکشی کرنا...... مائی گاڈ...... اٹس ٹو مچ...... اس کا مطلب ہے وہ ہائپر ہو چکی ہے اور اب مزید کچھ غلط ہوا تو وہ شاید...... نہیں...... مجھے اسے بچانا ہے ہر قیمت پر...... میں اسے یوں بکھرتا نہیں دیکھ سکتی...... میں اس کی ماں ہوں اور ایک ماں کیسے برداشت کر سکتی ہے کہ اس کی اولاد اس کے سامنے یوں بکھرتی چلی جائے۔ کھانا لگا کر وہ اسے بلانے گئی تو وہ اونگھ رہی تھی۔

''بیٹا اٹھو کھانا کھا لو......''

''میرا دل نہیں چاہ رہا......''

''پلیز تھوڑا سا...... آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اسے زبردستی باہر لے کر آئی اور خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی رہی۔ اسی لمحے سحر باہر سے آئی تو شہزا اور شمائل کو دیکھ کر چونک گئی۔ محبّت کا یہ انداز اسے بہت انوکھا لگا اور وہ بھی اس گھر میں۔ کیا یہاں بھی محبّت کا وجود ہے...... اس نے حیرت سے شمائل کی طرف دیکھا...... شمائل بھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''ممایہ کون ہے......؟''

''آفاق کی بیوی......''

''انھوں نے کب شادی کی اور وہ مری میں ان کے ساتھ......'' سحر نے کمرے میں جاتے ہوئے اس کی بات سن کر معنی خیز مسکراہٹ سے شزا کی طرف دیکھا اور اندر چلی گئی۔ شزا اس کی اس مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گئی تھی مگر خاموشی سے اسے کھانا کھلانے لگی۔

''شائل تم نے بتایا نہیں کہ تم اپ سیٹ کیوں ہو......؟''

''معلوم نہیں......'' وہ مایوسی سے بولی۔

''ہر فرسٹریشن کا کوئی ریزن بھی ہوتا ہے اور ضرور اس کا بھی ہوگا۔''

''مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا۔ میں ہاسٹل لائف سے تنگ آ گئی ہوں۔ وہاں اتنی تنہائی اور اداسی ہے کہ میرا دل گھبراتا ہے۔ مما میں کس سے آپ لوگوں کی باتیں کروں۔ سمیر میری باتیں سننا نہیں چاہتا اور میں آپ کو اور پاپا کو بہت مس کرتی ہوں مگر آپ لوگ ہمیں بالکل مس نہیں کرتے۔ پانچ ماہ ہو گئے ہیں پاپا ایک دفعہ بھی ملنے نہیں آئے اور اب بھی وہ نظر نہیں آ رہے۔ مما کیا آپ لوگ واقعی ہم سے پیار نہیں کرتے؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''یہ تم سے کس نے کہا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تم لوگوں سے پیار نہ کریں۔''

''مگر پاپا......''

''وہ بہت مصروف ہیں......تم اچھی طرح جانتی ہو......''

''اور ان کی وہ تصویر اخبار میں......''

''اوہ مائی گاڈ......'' شزا بڑبڑائی۔ ''وہ سب جھوٹ ہے۔''

''مگر میں نہیں سمجھتی کہ وہ سب جھوٹ ہے......'' وہ پورے وثوق سے بولی۔

''کیوں...... جب میں کہہ رہی ہوں کہ تمھارے پاپا ایسے نہیں اور یہ مخالفین کی سازش ہے......پھر تم کیسے اتنے یقین سے کہہ سکتی ہو......''

''اس لیے کہ ایک دفعہ پاپا مجھے اسکول ملنے آئے تھے تو گاڑی میں، میں نے اس لڑکی کو دیکھا تھا......'' وہ آہستہ سے بولی۔ اس کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔

''ہاں......تو وہ ان کی سیکرٹری تھی۔ اس لیے ان کے ساتھ ہر جگہ جاتی تھی۔'' شزا کا دل کرچی کرچی ہو رہا تھا مگر وہ کسی صورت میں ملک منصور کا امیج اس کی نظروں میں گرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

''مما...... میں آپ جیسی باتیں نہیں کرسکتی لیکن مجھے یہ سب کچھ بہت ہرٹ کرتا ہے۔ دوسرے بچوں کے ماں باپ آتے ہیں تو اتنے اتنے دن وہ انھیں مس کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اچھی اچھی باتیں سناتے ہیں۔ مما آپ لوگ تو کبھی اکٹھے ہی نہیں آئے اور پھر آپ کی کوئی اچھی اچھی باتیں ہمارے پاس ہیں ہی نہیں...... مما اب میں واپس نہیں جاؤں گی...... یہیں لاہور میں کسی کالج میں ایڈمیشن لے لوں گی۔''

''ٹھیک ہے ابھی تو تم ادھر ہی ہو...... مگر کچھ دنوں کے بعد تمھیں ادھر ہی جانا ہے......''

''نہیں مما...... اب میں کبھی واپس نہیں جاؤں گی۔'' وہ پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی اور شزا وہیں ٹیبل پر سر پر ہاتھ رکھے سوچ میں گم ہوگئی یہ سب کیا ہو رہا ہے...... باہر سے کتنا خوبصورت اور اندر سے کتنا بھیانک کتنے ناپائیدار رشتے اور کتنی کھوکھلی زندگیاں...... کوئی ایک رشتہ بھی تو مضبوط نہیں...... ہر رشتے کی بنیاد شکستہ اور عمارت میں وراڑیں تھیں...... تف ہے اس ماڈرن سوسائٹی پر...... ملک منصور...... تمہاری اس سو کالڈ سوسائٹی کے اسٹائلز پر...... اسے نفرت سی ہونے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ کہیں دو کمروں کا فلیٹ لے کر رہ لے...... سب کچھ ختم کر دے...... ساری سرگرمیاں اور کچھ بھی نہ رہے...... مگر یہ محض ایک سوچ تھی۔ وہ جس لائف اسٹائل کی عادی ہو چکی تھی۔ اس میں ایڈونچر کے طور پر تو کچھ دن کہیں گزارے جا سکتے تھے مگر ہمیشہ نہیں...... عجیب سی آزمائش سامنے کھڑی تھی۔ ثمائل کی صورت میں...... اور ابھی سمیر باقی تھا...... نہ جانے وہ کیا کرے گا؟ شزا کو بھی شدید ڈپریشن ہو رہا تھا۔ ملک منصور تم نے ہم سب کو یہ کیا مرض دے دیا ہے......؟ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی۔

''کس کو فون کر رہی ہو......؟'' شزا نے حیرت سے پوچھا۔

''ولیم کو......''

''کون ولیم......؟''

''میرا کلاس فیلو......''

''مگر وہ تو مری میں ہے۔''

شزا کو کچھ کچھ سمجھ آنے لگا۔ وہ اس کی بے تابی دیکھ رہی تھی اور اس کے جھنجلانے سے اندازہ لگا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پتا نہیں کیا مصیبت ہے...... نمبر ہی نہیں مل رہا...... مما میں ڈرائیور کے ساتھ اس

کے کالج جا رہی ہوں۔'' وہ فون بند کرتے ہوئے بولی۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ تم ابھی ادھر ہی ہو اور نمبر مل ہی جائے گا۔''

''نہیں، میں اسے جلد ملنا چاہتی ہوں......''

''مگر کیوں......؟'' شزا نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں اتنی بے چینی دیکھ کر پوچھا۔

''بس...... یونہی...... آپ نہیں سمجھیں گی۔'' وہ بنا کچھ کہے باہر نکل گئی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا اس نے اسے ایڈریس بتایا اور اس کے کالج پہنچ گئی۔ مگر اسے سخت مایوسی ہوئی جب معلوم ہوا کہ وہ کئی روز سے کالج نہیں آیا اور ہاسٹل بھی نہیں آتا۔

''وہ کہاں جا سکتا ہے......؟'' وہ شدید الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔

''آپ اپنا نام اور فون نمبر لکھ کر دے دیں۔ جیسے ہی وہ آئے گا۔ میں بتا دوں گا وہ آپ کو کال کر لے گا۔'' ولیم کے روم میٹ ذیشان نے اس کو پریشان دیکھ کر کہا۔

''ٹھیک ہے......'' اس نے ایک کاغذ پر اسے اپنا فون نمبر لکھ کر دے دیا۔

ولیم سے نہ ملنے کا اسے شدید قلق تھا۔ جب سے ولیم نے کالج چھوڑا تھا اور لاہور شفٹ ہوا تھا وہ شدید افسردہ رہنے لگی تھی اسے وہاں رہتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک اس میں انوالو ہو چکی تھی۔ صرف ایک وہی تو تھا جس سے وہ اپنی اور گھر کی ساری باتیں کرتی تھی اور وہ اسے ہر وقت کنسول کرتا رہتا تھا۔ مگر اس کے آنے کے بعد وہ شدید تنہائی کا شکار ہو گئی تھی۔ کوئی ایک بھی تو وہاں نہیں رہا تھا جس سے وہ اپنا دکھ سکھ کہتی...... اپنی باتیں شیئر کرتی...... اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زندگی رک سی گئی ہو...... کوئی بہت عزیز از جان ساتھی چھن گیا ہو...... وہ اکثر نیٹ پر اس سے رابطے میں رہتی ولیم نے ہی اسے اپنے کالج کا ایڈریس اور فون نمبر سب کچھ میل کیا تھا مگر اب دو تین ماہ سے نیٹ پر بھی رابطہ نہیں رہا تھا۔ ان سب فیکٹرز نے اس کے ذہن کو شدید ماؤف کر دیا تھا۔ اس نے اپنی کاپیاں کتابیں اس کے نام اور مس یو سے بھر دی تھیں۔ اگر اتفاق سے وہ کاپی کسی کلاس فیلو کے ہاتھ لگتی اور وہ اس کا مذاق اڑاتی تو اس کا اچھا خاصا جھگڑا ہو جاتا۔

وہ روز بروز چڑچڑی اور بدمزاج ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی وہ سترہ سال کی ہوئی تھی اور ذہن بھی اتنا میچور نہیں ہوا تھا کہ اپنے آپ کو سمجھاتی...... وہ اپنی سوچوں کے دھارے میں بہتی گئی۔ ہر وقت تخیل میں ڈوبے رہنا اور ولیم سے باتیں کرنا اسے اچھا لگنے لگا۔ ولیم اس کی ذات کا محور بن گیا۔ اس کا پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ صبح آنکھ کھلتے ہی پہلا خیال اور

پہلی سوچ ولیم کے بارے میں ہوتی اور آنکھیں بند کرتی تو وہ خوابوں میں ہوتا۔ ولیم کی سوچ نے اس کے دل و دماغ کو اپنے شکنجے میں اس طرح جکڑ لیا تھا کہ اب فرار ناممکن نظر آتا تھا۔

جس دن اس نے پاپا کی تصویر لائبریری میں اخبار میں دیکھی تو اسے شدید شاک لگا تھا۔ باپ کی پرسنالٹی کا یہ پہلو پہلی دفعہ اس کے سامنے کھل کر آیا تھا وہ سخت اذیت میں تھی۔ سمیرا ابھی کلاس فور میں تھا۔ اسے ان باتوں کی سمجھ ہی نہیں تھی اور وہ اس کے ساتھ ایسی باتیں ڈسکس کر کے اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ سب کچھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی چیز اطمینان چاہ رہی تھی۔ کوئی ایک تو کہہ دے کہ نہیں اس کا باپ ایسا نہیں۔ یہ سب کچھ محض کہانی ہے۔ ایسے میں اسے ولیم کی یاد ستانے لگی۔ ...مگر اس تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ وہ ڈپریشن میں ہاسٹل آئی تو اس کی روم میٹس عزا اور ندا اس کے پاپا کے بارے میں ہی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ اب بچی تو نہیں تھی کہ ان باتوں اور ان کے لہجے کو نہ سمجھتی وہ ان کی باتیں سن کر بھڑک گئی اور تینوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ شدید غصے میں تھی جب اس نے تیز چاقو سے اپنے بازو کی نس کاٹ دی۔ ہر طرف کہرام مچ گیا اسے جلدی سے اسپتال لے جایا گیا مشکل سے اس کی جان بچی تھی۔ وہ روز بروز چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ بات کو سمجھنا اور اعصاب پر کنٹرول رکھنا اس کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ جب اسے اپنی خواہشات پوری ہوتی نظر نہ آتیں تو وہ انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ اس کی کیسی پرسنالٹی ڈیویلپ ہو رہی تھی۔ شزا کے لیے یہ لمحۂ فکریہ تھا۔

وہ گھر آ کر بھی انتہائی بے چین تھی۔ بار بار فون ملاتی۔ نمبر نہ ملتا تو جھنجلا جاتی۔

''شمائل یہ لڑکا کون ہے......؟'' شزا نے اس کی بے چینی بھانپتے ہوئے پوچھا۔

''مری میں آپ کو ملوایا تو تھا......''

''کون...... وہ کرسچن......''

''ہاں......'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''تم اس میں اتنی انٹرسٹڈ کیوں ہو...... تم جانتی ہو کہ ہم میں اور ان لوگوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے......''

''میں کچھ نہیں جانتی...... صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ بہت اچھا ہے اور میں اسے بہت مس کرتی ہوں اتنا کہ شاید آپ لوگوں کو بھی نہیں۔''

''شمائل...... تم کیوں اس قدر جذباتی ہو کر سوچتی ہو......''

''مم...... میرے بس میں کچھ نہیں۔ میں ایک کمزور شخصیت ہوں......''

''تم کیوں اس قدر کمزور ہو...... اور اپنے آپ کو کمزور کیوں سمجھتی ہو......؟''

''مجھے آپ لوگوں نے کمزور بنا دیا ہے اور اب مجھے ہر وقت کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھے ہر اسٹیپ پر گائیڈ کرے...... مجھ میں تو صحیح اور غلط کا سینس بھی نہیں رہا......'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''تو کیا وہ لڑکا تمھیں مضبوط بناتا ہے......'' شزا نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں...... وہ میری ہر اچھی اور بری بات سنتا ہے......''

''وہ تمھیں صرف دوست سمجھتا ہے اور تم دوسری سائیڈ پر جا رہی ہو...... کیا تم سمجھتی ہو یہ سب؟''

''ہاں...... میں اسے یہی بتانا چاہتی ہوں......''

''کیا......؟'' شزا کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ وہ شمائل کے منہ سے پہلی دفعہ ایسی بے باک باتیں سن کر حیران ہو رہی تھی اور مزید جاننا چاہتی تھی کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔

''میں اس کے بغیر نہیں رہ سکی۔''

''شٹ اپ شمائل...... اپنی حد نہیں بھولو۔''

''میں کچھ نہیں جانتی، کچھ بھی نہیں۔'' وہ رو پڑی۔

''تمہارا باپ تم دونوں کو مار دے گا۔''

''آئی ڈونٹ کیئر...... اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو ہم دونوں ساتھ مریں گے۔''

''تم خواہ مخواہ پاگل ہو رہی ہو...... یہ گھر نہیں پاگل خانہ لگتا ہے......'' وہ غصے سے بولی۔

''میں کچھ نہیں جانتی...... مجھے بس ولیم چاہیے......''

''شمائل بکواس نہیں کرو...... میں تمھیں آرام سے سمجھا رہی ہوں اور سنو میں تمھیں خود مری چھوڑنے جا رہی ہوں۔''

''نہیں مما...... آپ ایسا نہیں کریں گی اور اگر ایسا کیا تو میری ڈیڈ باڈی آپ کے ساتھ جائے گی......'' وہ گویا دھمکی دیتے ہوئے بولی۔

''شمائل اسٹاپ دس نان سینس......'' وہ غصے سے چلائی۔

''چلائیں مت......'' وہ بھی غصّے سے پھنکارتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں غصّے سے باہر ابلنے کو تھیں۔ شنزا کو اس کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ اس کی وجہ سے اس قدر پریشان ہو رہی تھی کہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک نئی مصیبت ان کی منتظر تھی۔ نہ جانے وہ کیسے گردشِ ایام میں جکڑے جا رہے تھے کہ ہر طرف سے پریشانیاں اور الجھنیں انھیں اپنی گرفت میں لے رہی تھیں۔

شام ہو رہی تھی۔ شمائل ٹی وی کی تیز آواز کر کے اکیلی بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اسے گھر آنے کا جتنا گریز تھا اب وہ گریز رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔ گھر میں تو ہاسٹل سے بھی زیادہ تنہائی اور وحشت تھی۔ اگرچہ شنزا اپنی طرف سے اسے زیادہ سے زیادہ وقت دیتی مگر اس کے اپنے بے شمار کام اور مصروفیات تھیں اور پھر ملک منصور کو وہ اس مسئلے سے نکالنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ ایک طرف صحافی کو ٹریس آؤٹ کرنا تھا۔ اخبارات کے دفاتر سے رابطے جاری تھے تو دوسری طرف پارٹی ورکرز اور ملک منصور کے قریبی لوگوں کو اس کی مدد کے لیے اکسانا تھا۔ کوشش کے باوجود کافی وقت باہر لگ جاتا۔ سحر اپنے کاموں میں مصروف رہتی اور جس دن سے وہ گھر آئی تھی۔ آفاق گھر نہیں آیا تھا۔

شمائل فون پاس رکھے ہر وقت منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہتی...... کسی وقت، کسی لمحے شاید اس کا فون آ جائے...... دل ہر وقت اس کی یاد میں کھویا رہتا۔ وہ ابھی بھی اسے اتنا مس کر رہی تھی کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود اس کو سارے لاہور میں جا کر جگہ جگہ تلاش کرے مگر اسے نہ تو ڈرائیونگ آتی تھی اور نہ ہی راستوں کا زیادہ علم تھا۔ اچانک فون کی بیل زور زور سے بجنے لگی...... وہ چونک گئی اور جلدی سے ٹی وی کی آواز کم کی۔

''ہیلو......شمائل سے بات کرنی ہے......''

''کون......؟ ولیم......تم......'' وہ جیسے اچھل پڑی۔

''ہاں......شمائل تم کب آئیں؟''

''ولیم...... میں تمھیں بے حد یاد کر رہی ہوں۔''

''تھینک یو......'' وہ مسکرا کر بولا۔

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں......بس تم جلدی سے آ جاؤ......''

''نہیں شمائل، یہ ممکن نہیں۔ میں مما کے پاس ہوں اور ان کی طبیعت بہت خراب ہے آج میں ہاسٹل اپنی کچھ کتابیں لینے گیا تو ذیشان نے تمھارے بارے میں بتایا۔ اس لیے

فون کر رہا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔"

"ولیم...... کیوں اپ سیٹ ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ولیم آئی مس یو سو مچ۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس میں اپ سیٹ ہونے والی کیا بات ہے؟"

"ولیم...... پلیز تم سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"کیا......؟"

"اچھا تم مجھے اپنا ایڈریس دو میں خود آتی ہوں......"

"ٹھیک ہے...... لیکن اس وقت نہ آنا...... شام ہو رہی ہے کل آ جانا۔"

"نہیں، میں ابھی آؤں گی...... تم مجھے اپنا ایڈریس دو......" وہ ایڈریس لکھنے لگی۔

ایڈریس لکھ کر اس نے ڈرائیور کو سرونٹ کوارٹر سے بلایا اور خود اس کے ساتھ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد شزا آئی تو اسے یہ جان کر سخت تشویش ہونے لگی۔

ولیم مما کے پاس ہی تھا اور آئے نور گھر واپس جا چکی تھی۔ ولیم نے گیٹ کے باہر لگا تالا کھول دیا تھا۔ وہ اب اس کا منتظر تھا۔ اس کی گاڑی گیٹ کے باہر ہارن بجا رہی تھی۔ ولیم باہر آیا...... اور گیٹ کھولا تا کہ اس کا ڈرائیور گاڑی اندر لے آئے۔

"شمائل کیسی ہو؟" ولیم مسکرا کر بولا۔

"میں ٹھیک نہیں ہوں۔"

"کیوں......؟" وہ اس کا غیر متوقع جواب سن کر حیران رہ گیا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

"کیا یہ تمہارا گھر ہے......؟"

"نہیں...... ایک دوست کا...... مما بیمار ہیں اس لیے اس دوران ہم یہاں رہ رہے ہیں۔ ہاسٹل میں مما کو اٹینڈ کرنا میرے لیے مشکل تھا...... لیکن تم کب آئیں...... آج کل تو چھٹیاں نہیں ہیں۔"

"ہاں...... میں نے بتایا نا کہ میں بہت اپ سیٹ تھی......"

"مگر کیوں......؟"

"کیونکہ تم وہاں نہیں......"

"کم آن شمائل...... ڈونٹ بی سلی۔ تم ایک سمجھدار لڑکی ہو۔"

''میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔''

''وہاٹ نان سینس......'' وہ غصّے میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اور اگر تم مجھے نہ ملے تو......تو میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گی۔''

''شمائل...... یہ تم کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں چرچ جوائن کرنے والا ہوں اور ہمارے اور تمھارے درمیان تو ویسے بھی بہت فرق ہے۔ اپنے آپ کو نارمل رکھو......''

''میں کچھ نہیں جانتی......تم میری بات سمجھو۔''

''ادھر بیٹھو......'' اس نے اسے اپنے سامنے بٹھایا۔ ''اب صحیح بات بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے......؟''

''ولیم...... میں بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں۔ نہ میں وہاں کسی سے بات کر سکتی ہوں اور نہ یہاں......مما پاپا کے بارے میں تم اچھی طرح جانتے ہو۔ ان کو ہماری کوئی پروا نہیں۔ میری لائف میں نہ کوئی امید رہی ہے اور نہ ہی کوئی اچھی بات......تم ہر وقت مجھے یاد آتے ہو۔ میں کیا کروں، دنیا میں صرف تم ہی ہو...... جو مجھے اچھے لگتے ہو۔''

''لیکن شمائل جو اچھا لگے......ضروری تو نہیں کہ اس سے محبت بھی ہو جائے اور میں تو تمھیں ابھی سے بتا رہا ہوں کہ میں چرچ جوائن کرنے والا ہوں۔ میں تو صرف مما کی وجہ سے رک گیا کیونکہ وہ بہت بیمار ہیں۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''اپنی اسٹڈیز کی طرف دھیان دو...... اور اپنے لیے کوئی اچھی مصروفیت ڈھونڈو......اور ویسے بھی ہم لوگ ابھی اس ایج میں ہیں کہ ہمیں ایسی باتیں سوٹ نہیں کرتی۔ تم کچھ دن یہاں ریلیکس کرو......اور پھر واپس چلی جاؤ۔ یہی بہتر ہے......'' ولیم اسے سمجھا رہا تھا اور وہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''ٹھیک ہے میں واپس چلی جاؤں گی۔ تم بھی یہی کہتے ہو اور مما بھی...... کسی کو بھی میرا یہاں رہنا پسند نہیں......'' وہ افسردگی سے بولی۔

''نہیں شمائل، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم ایسی باتوں میں اپنا وقت ضائع کرو۔ اپنی اسٹڈیز مکمل کرو۔ پھر تو تمھیں لاہور ہی آنا ہے......'' ولیم بہت نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

''اب میں چلتی ہوں......'' وہ بے دلی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''مما سے نہیں ملو گی......''

''نہیں...... آج نہیں...... پھر سہی......'' وہ اب مزید وہاں رکنا نہیں چاہ رہی تھی۔

ولیم کو اس کے خیالات اور حالات جان کر سخت پریشانی ہوئی۔ وہ شروع سے ہی یہ محسوس کرتا چلا آرہا تھا کہ شمائل کے گھر والوں کو واقعی ان بچوں کی قطعی کوئی پروا نہیں۔ ان کے ماں باپ کا رویہ بچوں کے بارے میں بالکل نارمل نہیں تھا۔ جب تک وہ مری میں تھا ہر وقت شمائل کو سمجھاتا رہتا تھا اور واقعی اب وہ منتشر ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ نور سے اس کی باتیں ڈسکس کرے۔ وہ تو خود اپنی ہر بات نور سے ڈسکس کرنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ جس طرح وہ زندگی کا تصور نور کے بغیر نہیں کر سکتا تھا شاید اسی طرح شمائل بھی اپنے لیے اسے اتنا ہی اہم سمجھ رہی تھی۔ یہ کیسی چین تھی۔ وہ چونک سا گیا مگر شمائل بہت جذباتی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

......۞......

شہلا اسد اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ اسد سے اسے جو محبت ملی تھی وہ کبھی اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ قدرت اس پر یوں فراخ دلی سے نظرِ کرم کرے گی۔ خالہ اور ان کے سب گھر والے بھی اسے بہت پیار کرتے۔ وہ لوگ شادی کے فوراً بعد ڈیفنس شفٹ ہو چکے تھے حیدر نے ایک کاٹن مل شہلا کو جہیز میں دی تھی اور اسد اب اپنا بزنس اسٹیبلش کرنے کے چکروں میں تھا۔ وہ لوگ خود بھی بہت امیر تھے۔ خاندانی جاگیردار، روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ ہر طرح سے خوش تھی اور اپنا نیا گھر ڈیکوریٹ کرنے میں مصروف تھی۔ لیکن جب فارغ بیٹھتی تو ایک دم حیدر نظروں کے سامنے آجاتا اور اداس ہو جاتی۔ حیدر خود اسے بہت کم فون کرتا۔ حیدر کی اس بے رخی سے وہ شرمندگی محسوس کرتی۔

شہلا کی شادی سے فارغ ہونے کے بعد حیدر نے مس افضال کو خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔

''سر تھینک یو ویری مچ، آپ نے جو پیسے بھیجے تھے وہ مل گئے تھے بلکہ مسز پیٹر کا آپریشن بھی ہو چکا ہے۔ میں نے آپ سے ایک دو بار کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کی کہ شکریہ ادا کر دوں مگر رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔'' مس افضال بہت مشکورانہ لہجے میں بول رہی تھیں۔

''شکریے کی بات نہیں...... آپ اس بات کو چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ اب ان کی

طبیعت کیسی ہے......؟''

''کیموتھراپی کا ایک کورس ہو چکا ہے اور آپ تو جانتے ہیں یہ کیسی جان لیوا بیماری ہے۔ اس بیماری سے لڑنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ تو بیچارہ مریض ہی جانے۔ مسز پیٹر بیچاری بہت مصیبتیں اٹھا رہی ہیں۔''

''مس افضال میں ان سے ملنا چاہتا ہوں......''

''سر آپ......؟'' مس افضال نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......اس میں کیا حرج ہے۔ ایز اے ہیومن بینگ......''

''ہاں......حرج تو کوئی نہیں مگر وہ یہاں نہیں رہتیں۔''

''تو پھر......وہ کہاں چلی گئیں......؟''

''اپنے کسی عزیز کے پاس......'' مس افضال بتانا مناسب نہیں سمجھ رہی تھیں۔

''کس عزیز کے پاس......؟''

''معلوم نہیں......''

''مس افضال کیا واقعی آپ نہیں جانتیں یا پھر مجھے نہیں بتانا چاہتیں۔''

''نہیں......نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بھلا کیوں چھپانا چاہوں گی۔ دراصل میں اس سوچ میں پڑ گئی ہوں کہ واقعی آپ کا وہاں جانا بہتر ہے یا نہیں کیونکہ میں نے انھیں آپ کی ہیلپ کا بالکل نہیں بتایا۔''

''اور بتایئے بھی مت...... مجھے خود بھی یہ سب کچھ پسند نہیں۔ آپ پلیز مجھے ایڈریس بتا دیجئے اور ان کے پاس کون ہوتا ہے......؟''

''ان کا بیٹا ولیم......اور وہ ولیم کی کلاس فیلو کے گھر میں رہ رہی ہیں۔''

''اوہ آئی سی......آپ ایڈریس لکھوایئے۔'' مس افضال انھیں ایڈریس لکھوانے لگیں۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ اس کا آپریشن بھی ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ خود......

وہ مس افضال کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچا مگر کوٹھی کے باہر تالا لگا ہوا تھا وہ سخت مایوس ہوا۔ ہو سکتا ہے وہ اسپتال گئی ہو۔ اِدھر اُدھر سے پوچھنا بھی مناسب نہ لگا۔ وہ اسی شام دوبارہ گیا پھر تالا لگا ہوا تھا۔ اسے سخت تشویش ہو رہی تھی۔ اس نے مس افضال کو فون کرنے کا سوچا مگر یہی سوچ کر کہ وہ اس کے بارے میں مشکوک ہو جائے گی اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ وہ مسلسل دو تین دن جاتا رہا مگر ہر بار تالا دیکھ کر واپس آ جاتا۔ اسے سخت پریشانی

ہو رہی تھی۔ مختلف وسوسے اور واہمے اسے پریشان کر رہے تھے۔ خدانخواستہ اس کی طبیعت زیادہ ہی خراب نہ ہو وہ اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا حال پوچھنا چاہتا تھا۔ اس مشکل وقت میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر نہ جانے اس کی سوچ محض اک سوچ ہی کیوں رہ جاتی تھی۔ اس نے تنگ آ کر مس افضال سے رابطہ کیا مگر معلوم ہوا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں اپنی بہن کے پاس گئی ہیں۔ ان کی بہن کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ مس افضال ہی اس تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھی اور اب ان تک بھی رسائی ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ عجیب جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ وہ صبح شام اسی سڑک سے گزرتا۔ جیسے اس کے گھر جانے والا وہی راستہ ہو۔ کچھ دیر گاڑی روک کر گیٹ کو دیکھتا اور چل دیتا۔

عجیب سی سچویشن ہو رہی تھی اور بعض اوقات اسے اپنا ری ایکشن خود ہی عجیب سا لگتا۔ وہ ابھی بھی اس کے ساتھ کس قدر اٹیچڈ تھا۔ وہ اپنے آپ سے بارہا سوال کرتا کیا واقعی پہلی محبت کو بھلانا ممکن نہیں ہوتا......؟ نہ جانے کیوں شہلا کو سوچ کر ہی اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگتی۔ ناتمام حسرتوں اور آرزوؤں کے لیے دل میں ہوک سی اٹھی...... شہلا کاش تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتیں...... کاش ہم تم نہ ہوتے...... کاش تم مجھے دوبارہ نہ ملتیں۔

کاش اب تم مجھے ایک دفعہ مل جاؤ اور ہم دونوں صرف ایک دفعہ زندگی میں مل کر رو تو لیں...... کاش اسی طرح دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ کاش ہم دونوں اپنا اپنا غم کہہ کر اپنی روحوں کو ایک دوسرے کی گرفت سے آزاد کر دیں...... کاش عمروں کے اس موڑ پر ہمیں کچھ طمانیت مل سکے...... وہ درخت کے نیچے گاڑی میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا جب اچانک ولیم نے تالا کھولا...... وہ اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا...... یہ کیا معما تھا۔ ولیم تالا کھولنے کے بعد گیٹ کھول کر باہر جیسے کسی کا منتظر تھا اور پھر ایک لڑکی گاڑی میں آئی ولیم دوبارہ گیٹ بند کرنے لگا تو اس نے بھی جلدی سے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ بعض اوقات قدرت کیسے دلوں کی آواز سن لیتی ہے شاید وہی لمحہ قبولیت کا ہوتا ہے۔ ولیم حیرانی سے اسے اور اس کی بلیو وی ٹی آئی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی ایک ٹک ولیم کو دیکھا اور اسے پہلی نظر میں پہچان لیا۔ اس کے چہرے اور پرسنالٹی میں دو ملکوں اور دو تہذیبوں کے نمایاں ٹچ نے ولیم کا خود بخود تعارف کرا دیا تھا۔

''آپ...... آپ کون ہیں اور......؟'' ولیم سراسیمگی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''میں...... میں تمہاری مما کا کزن ہوں۔ضرار حیدر......''

''لیکن میری مما...... کا تو کوئی نہیں۔'' ولیم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ آئے نور بھی برآمدے میں رک کر دونوں کی گفتگو سن رہی تھی اور ادھیڑ عمر کے اس سوبر سے بندے کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

''آپ اپنی مما کو جا کر بتائیں کہ حیدر انکل آئے ہیں۔'' حیدر نے پُراعتماد ہو کر اسے کہا تو ولیم اندر چلا گیا۔ آئے نور مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ولیم باہر آیا۔

''آپ اندر آ جائیں......'' ولیم اور نور دونوں اسے مما کے کمرے تک لے کر گئے۔ ولیم اور نور کچھ بھی نہیں بول رہے تھے۔ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

شہلا بستر پر لیٹی ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہی تھی۔ اس کے سر کے سارے بال اتر چکے تھے۔ آنکھوں کی پلکیں اور ابرو تک جھڑ چکی تھیں کالے سیاہ ہونٹ اور سیاہ جلی ہوئی رنگت اس کی اندر کی اذیتوں کی کہانی بیان کر رہی تھی۔ اس نے سر پر ململ کا سفید دوپٹا لے رکھا تھا۔ حیدر تو اسے پہچان ہی نہ سکا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آ...... آپ یہاں کیسے......؟'' شہلا نے حیدر کو یوں افسردہ دیکھ کر پوچھا۔

''مس افضال نے بتایا تھا ہر روز آتا تھا مگر گیٹ کے باہر تالا دیکھ کر چلا جاتا تھا۔'' حیدر نے وضاحت کی۔

''اوہ...... آئی ایم سوری...... میں نے تالا کسی اور وجہ سے لگایا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ آپ......؟'' ولیم معذرت کرنے لگا اور نور کی طرف دیکھا۔

''پلیز اسے ہٹا دیں...... اسے دیکھ کر آنے والوں کو بہت کوفت ہوتی ہے۔'' حیدر نے اپنی جھنجلاہٹ ظاہر کی۔

''ہاں...... میں آج ہی اسے اتار دیتا ہوں......'' ولیم نے جواب دیا۔

''مما...... ہم لوگ انکل کے لیے کچھ لائیں؟'' ولیم نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کو کہا۔

''یہ ولیم ہے...... میرا بیٹا...... آپ اس سے مل تو چکے ہیں اور یہ آئے نور ہے۔ بہت اچھی بیٹی ہے۔ ولیم کی کلاس فیلو ہے۔ ہم اس کے گھر میں رہ رہے ہیں یہ سب اسی کی مہربانی ہے۔ ورنہ آج ہم کہاں در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔'' وہ تاسف سے بولی۔

''آنٹی پلیز ایسی باتیں تو نہ کریں۔'' نور جلدی سے بولی۔

''اور یہ حیدر ہیں...... میرے کزن۔'' شہلا ولیم سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

ولیم کی نظروں میں اَن گنت سوالات اور بے حد حیرانی تھی۔ وہ تو اب تک یہی جانتا تھا کہ اس کی ماں کا کوئی نہیں یہ اچانک رشتے دار کہاں سے پیدا ہو گیا اس کا مطلب ہے مما نے اسے سچ نہیں بتایا تھا اور اس کے لیے سب سے شاکنگ حیدر کا دوسری کمیونٹی سے ہونا تھا۔ اس نے نور کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بھی وہی کچھ تھا جو اس وقت وہ خود سوچ رہا تھا۔

''مما...... ہم آتے ہیں۔'' اس کے لیے وہاں رکنا مشکل ہو رہا تھا۔

''ولیم یہ سب کیا ہے...... مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا......'' نور نے باہر نکلتے ہی حیرت سے پوچھا۔

''اور مجھے بھی......'' وہ بھی حیرانی سے بولا۔

''سنو یہ کوئی عام شخص بھی معلوم نہیں ہوتے...... میں نے اس شخص کو کسی اخبار میں بھی دیکھا ہے اور ویسے بھی ان کا بات کرنے کا اسٹائل اور پرسنالٹی...... مجھے پورا یقین ہے یہ کوئی عام شخص نہیں ہیں......'' نور قدرے تشویش سے بولی۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ مما نے مجھ سے کیا کیا چھپایا ہے......؟''

''اُفوہ...... ایک تو تم فوراً بدگمان ہو جایا کرو...... انسان کو پہلے اچھی طرح سارے پہلوؤں کے بارے میں یقین کرنا چاہیے پھر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے......'' نور نے اسے سمجھایا۔

''نور میں پہلے ہی کچھ کم ڈسٹرب ہوں...... اور اوپر سے یہ سب؟''

''کیوں...... تم کیوں ڈسٹرب ہو......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے شمائل والی ساری بات اسے بتا دی۔

''تم تو مجھے اس وقت سینڈوچ لگ رہے ہو......'' وہ مسکرا کر بولی۔

''مذاق نہیں...... میں سیریس ہوں۔''

''اچھا بابا، تم کیا چاہتے ہو......''

''میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ ڈسٹرب نہ رہے۔ وہ بہت پریشانی میں یہاں سے گئی ہے اور دیکھو اس کی سوچ کس قدر احمقانہ ہے۔ وہ کتنا غلط سوچ رہی ہے......''

''اس میں غلط کیا ہے۔ سوچ تو سوچ ہوتی ہے۔ کیسی بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں...... وہ احمق ہے اس لیے کہ اس نے ساری بات تمھیں بتا دی......'' نور کے لہجے میں شرارت تھی۔

''پلیز بی سیریس...... میں اس کے خیالات جان کر پریشان ہو گیا ہوں۔''

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے جب تم نے اسے کہہ دیا ہے کہ تم چرچ جوائن کر رہے ہو تو وہ خود ہی سمجھ جائے گی......''

''لیکن وہ مجھے بہت زیادہ پریشان لگی ہے اور وہ کچھ حد تک جنونی ہو چکی ہے۔''

''وہ تو ہر انسان ہوتا ہے، کوئی تھوڑا کوئی زیادہ۔''

''تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''آخر تم کیا سمجھانا چاہتے ہو یہ کہ وہ تم سے محبت کرنے لگی اور اب تمھیں بھی کچھ ایسا سوچنا پڑے گا ٹھیک ہے اگر تم ایسا سوچتے ہو تو جو تم کرنا چاہتے ہو کر لو، مجھے کوئی اعتراض نہیں...... میں ہمیشہ سے ناتمام آرزوؤں کے ساتھ جینے کی عادی ہوں۔ میں نے جہاں اتنا کچھ کھویا ہے، سہا ہے یہ بھی سہہ لوں گی۔''

''کم آن نور......''

''تو پھر کیا چاہتے ہو تم......؟'' وہ خفگی سے بولی۔

''مجھے نہیں معلوم......'' وہ اکتا کر بولا۔

''ولیم...... ابھی تک تمہارا زندگی کی طرف رویہ ناسمجھی کا شکار ہے۔ تم ہر بات، ہر سوچ کو واضح انداز میں کیوں نہیں سوچتے اور جو تم کہتے ہو اس کے بارے میں تمھارے اندر تضاد کیوں ہے۔ تمہاری اب تک کسی بھی بات کے بارے میں ایک رائے ہو جانی چاہیے...... جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میری اتنی محنت ضائع گئی ہے۔ میں تمھیں بار بار کہتی ہوں کہ میں تمھیں اپنے ہر ارادے، ہر سوچ اور ہر بات میں پازیٹو اور اسٹرونگ دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہارا یوں جھنجلانا، پریشان ہونا اور ہر بات پر وضاحتیں چاہنا مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگتا۔'' وہ گلاس میں کوک ڈالتے ہوئے بولی۔ ولیم اس کی باتیں دھیان سے سن رہا تھا۔ وہ ہر روز ایسی نصیحتیں سننے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔

''ٹھہرو...... میں یہ اندر دے کر آتی ہوں۔'' وہ گلاس ٹرے میں رکھ کر اندر چلی گئی......اور دروازے پر دستک دی۔

''کم ان......'' مسز پیٹر نے کہا۔ اس نے گلاس ٹیبل پر حیدر کے سامنے رکھا اور ایک ٹک دونوں کو دیکھا۔ مسز پیٹر اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھیں اور حیدر کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ کسی نے کچھ بھی نہ کہا وہ گلاس رکھ کر باہر آ گئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

حیدر بیٹی کے رویے کی اس سے معافی مانگ رہا تھا اور وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔

''شہلا تم سب کچھ کہہ کیوں نہیں دیتیں......'' حیدر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا کہوں......میرے پاس تو کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں...... نہ لفظ رہے ہیں اور نہ ہی اتنی یاد داشت...... معلوم نہیں کس لمحے میں اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ ہوسکتا ہے یہی لمحہ آخری ہو......''

''تم مایوسی کی باتیں چھوڑ دو، تمھیں ٹھیک ہونا ہے...... ہر صورت میں اور ہر قیمت پر......'' حیدر پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

''نہیں، حیدر اب یہ ممکن نہیں......''

''میں ایسی باتیں تم سے سننا نہیں چاہتا۔''

''مگر حقیقت تو تم بھی جانتے ہو......''

''حقیقت کچھ بھی ہو...... میں خدا کی خدائی پر بھی یقین رکھتا ہوں۔''

''ہاں اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں رہ جاتا۔ ہم بے بس انسان یہ نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے......'' وہ پھر بے اعتمادی سے بولی۔

''تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو...... آج سب کہہ دو......''

''کس کے بارے میں کیا کہوں...... زندگی کے اتنے سال اپنے آپ سے سب کچھ تو کہتی اور سنتی رہی ہوں۔''

''تمھیں شہلا سے جو شکوہ ہے وہی کہہ دو۔ اگر مجھ سے ناراض ہو تو کہہ دو کچھ تو کہو کہ تمھارے دل کا بوجھ کم ہو۔''

''حیدر مجھے کسی سے بھی کوئی شکوہ نہیں۔ شہلا تو میری بیٹی جیسی ہے اور تم سے کیا کہوں۔ پوری دنیا میں صرف ایک تم ہی تو ہو جس سے میں کبھی بھی ناراض نہیں ہوئی۔ حیدر زندگی بڑا ہی گورکھ دھندا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ کاش میں پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ کاش تم میری زندگی میں نہ آئے ہوتے۔ کاش ہم تم ہی نہ ہوتے۔'' وہ اپنی ہی لے میں کہہ رہی تھی اور حیدر حیران کن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ وہ چند ثانیے پہلے سوچ رہا تھا اب وہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ کوئی اتنا بھی دل کے قریب ہوسکتا ہے۔ جو دل کی باتوں کو بنا کہے سن لے۔ حیدر نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں...... کاش ہم تم نہ ہوتے۔'' نادانستہ حیدر کے منہ سے نکلا اور اس کے اندر کا کرب اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ ''کاش میں تمھیں کبھی اس حالت میں بھی نہ دیکھتا۔ تم سوچ نہیں سکتی کہ اس وقت میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔''

''گناہوں کی سزا کسی نہ کسی صورت میں تو ملنی ہوتی ہے۔'' شہلا آہستہ سے بولی۔

''کون سے گناہ؟'' حیدر چونکا۔

''حیدر...... میں نہیں جانتی کہ کس وقت مجھے موت آ جائے مگر اب سوچتی ہوں کہ شاید مجھ سے بہت زیادہ گناہ سرزد ہو گئے ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے کچھ ایسے فیصلے کیے جنھوں نے شاید کتنے ہی لوگوں کو برباد کر دیا ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''معلوم نہیں...... میری شفق، آفاق اور فلک کن حالات میں ہوں۔ حیدر تمھیں کچھ نہ کچھ خبر تو ہو گی۔ میرے بچے کیسے ہیں۔ معلوم نہیں منصور اور شزا نے ان کا خیال بھی رکھا کہ نہیں۔ منصور تو بچوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ شزا کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ حیدر مجھے تینوں بہت یاد آتے ہیں۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ میرے بچوں کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے اور ولیم...... ولیم چرچ جوائن کرنے کا سوچ رہا ہے۔ حیدر اس کو تو میں نے کوئی بھی مذہب ورثے میں نہیں دیا۔ میں نے تو صرف ایک اچھا انسان بنانا چاہا اور وہ صرف اور صرف اپنے نام سے ہی سب کچھ اخذ کر رہا ہے اور میں نے کتنی فاش غلطی کی۔ پیٹر جو اس کا وجود نہیں چاہتا تھا۔ جس نے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے خود اس سے اصرار کر کے کہا کہ وہ اس کا نام رکھے۔

حیدر میں نے کتنی بڑی غلطیاں کی ہیں میں خود اندر سے کیا ہوں اور دنیا کی نظر میں کیا بن گئی ہوں۔ میں نے زندگی میں جن چیزوں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اب مجھ سے سوال کر رہی ہیں۔ حیدر میں نے جو قدم بھی اٹھایا، غلط اٹھایا۔ میں نے زندگی میں جس جس سے جو بھی کچھ کہنا چاہا کبھی نہ کہہ سکی۔ بس سوچتی ہی رہ گئی اور میں سب لوگوں سے پیچھے رہ گئی۔ میں اپنی شناخت ڈھونڈنے چلی تھی اور اپنا وجود کھو بیٹھی۔ کیا تم نے مجھ جیسے لوگ بھی دیکھے ہوں گے۔ کتنے درماندہ بے خانماں، پستیوں کے مسافر، ذلتوں کے مارے ہوئے دھتکارے ہوئے۔''

''خدا کے لیے اس طرح سوچنا چھوڑ دو۔'' حیدر ملتجی لہجے میں بولا۔

''حیدر تم ہی بتاؤ کیا سوچوں، موت مجھے سامنے نظر آ رہی ہے۔ معلوم نہیں اگلا دن

بھی دیکھنا نصیب ہوتا ہے کہ نہیں۔ میں ولیم کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اس کے ساتھ بہت زیادتی ہو رہی ہے اور میں اسے بلا کر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی اور جب میں مروں گی تو میں کہاں دفن ہوں گی؟ میں نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا مگر حیدر......تم......تم گواہ رہنا کہ میں...... میں مسلمان ہی ہوں۔ میں تم لوگوں میں سے ہی ہوں۔'' اسی لمحے نور کمرے میں داخل ہونے لگی تھی تو اس نے یہ الفاظ سن لیے وہ سکتے میں آ گئی۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہیں سے لوٹ گئی۔ مسز پیٹر ہاتھ باندھے سسکیاں لے رہی تھیں۔ نور پھر لوٹی اور دروازہ تھوڑا سا کھول کر ان کی باتیں سننے لگی اس کے ذہن میں شدید کشمکش جاری تھی۔

''حیدر میں کبھی چرچ نہیں گئی اور نہ کبھی میں نے مذہب بدلا۔ میں تو بس حالات کے دھارے پر بہنے والا وہ پتا ہوں جو لہروں کے سنگ بہتا ہی چلا گیا۔ خزاں رسیدہ مرجھایا ہوا پتا۔ ہوا جس طرف لے اڑی، اڑتی گئی۔ پیٹر اور میں نے مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ دو انسان ہونے کے ناتے شادی کی۔''

''شہلا تم نے یہ کیا کیا اتنی بڑی بڑی غلطیاں اور تم کیا جانو کہ کون کون کیسے کیسے خمیازہ بھگت رہا ہے؟'' حیدر کے منہ سے نادانستہ نکلا تو وہ چونک گئی۔

''کون......میرے بچے......؟'' اچانک اس کے منہ سے نکلا۔

''نہیں......'' وہ بات کو بدلنا چاہتا تھا۔

''تو پھر کون؟''

''تم خود......ولیم اور میں؟'' وہ بے ربط انداز میں بولا۔

''میرے بچے تو ٹھیک ہیں نا!''

''ہاں......'' وہ آہ بھر کر بولا۔

''اب تو جوان ہو چکے ہوں گے۔''

''ہاں۔''

''فلک کیسی ہے؟'' وہ پُرامید لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

''تمھارے لہجے میں کچھ ہے، حیدر کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں، میں تمہاری باتیں سن کر پریشان ہو گیا ہوں۔ اب میں چلتا ہوں، کل آؤں گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے......سنو......'' حیدر رکا...... ''حیدر میں جسمانی اذیت میں تو ہوں ہی مگر ذہنی کشمکش نے مجھے دُہرے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ پلیز کچھ سوچو۔ ولیم کو اس سچویشن سے نکال دو۔ حیدر تم ہی میری آخری امید ہو۔'' اس کی آنکھوں میں بے انتہا بے بسی اور دکھ تھا۔ حیدر کے لیے مزید وہاں رکنا مشکل ہو گیا وہ واپس لوٹ آیا۔

نور کے لیے یہ انکشافات بہت انوکھے تھے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ظاہراً کچھ نظر آنے والے انسان اندر سے کتنے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس نے ولیم کو کچھ نہ بتایا۔ وہ کچن میں اس کا منتظر تھا۔ وہ تو انھیں چائے کا پوچھنے گئی تھی اور جب لوٹی تو گویا اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھی۔

''ولیم......میں گھر جا رہی ہوں۔'' وہ اچانک بولی۔

''ہیں...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔تم تو ان سے چائے کا پوچھنے گئی تھی اور ایک دم اپنا ارادہ بدل لیا۔کھانے پینے کے معاملے میں بھی تم اتنا چونکا سکتی ہو۔ میں نے سوچا نہیں تھا۔''

''وہ چلے گئے ہیں مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''یہ طبیعت کو اچانک کیا ہوا؟ ابھی چند لمحے قبل تو تم مجھے نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی اور اب......نور میں تمھیں واقعی نہیں سمجھ سکتا۔'' وہ بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی۔

''میں جا رہی ہوں۔'' اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ حیدر جا چکا تھا اور اب وہ اپنی گاڑی ریورس کر رہی تھی۔ ولیم اس کے پاس کھڑا تھا مگر اس نے نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور قدرے تیز رفتاری سے گاڑی باہر نکالی۔ ایک دم اسے زبردست جھٹکا لگا۔ وہ رکی اور پھر اتنی ہی تیزی سے گاڑی چلاتی ہوئی چلی گئی۔ ولیم اسے یوں دیکھ کر فکر مند ہو گیا۔

......۞......

شزا، شمائل میں اچانک رونما ہونے والی تبدیلی دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا سامان پیک کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے واپس مری جانے کا پروگرام شزا کو بتایا تھا۔

''تم ولیم سے ملنے گئی تھی، کیا وہ ملا؟'' شزا نے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

شزا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ مزید اس سے کیا پوچھے لیکن اتنا اندازہ تو اسے ہو رہا

تھا کہ یقیناً ولیم نے اسے کچھ ایسا کہا ہوگا اسی لیے وہ واپس جا رہی ہے ورنہ وہ تو واپس مری جانے کے نام سے ہی مشتعل ہو جاتی تھی۔ شزا خود اسے چھوڑنے جا رہی تھی۔ وہ سارا راستہ خاموش باہر دیکھتی رہی۔ دونوں نے راستے میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ شزا کوئی سوال کرتی تو وہ ہوں، ہاں میں جواب دے دیتی۔ اسے اتنا گہرا سکوت مگر آنکھوں میں شدید اداسی، بے بسی اور ویرانی کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ شزا اندر ہی اندر خوفزدہ تھی۔ وہ اسے بہت کچھ سمجھانا چاہتی تھی۔ اس کی طرف دیکھتی، لب کھولنے کی کوشش کرتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ اسے فضا مناسب نہیں لگ رہی تھی کہ وہ اس سے کچھ بھی کہتی۔ سارا سفر خاموشی میں کٹا۔ وہ سمیر سے بھی ملی۔ سمیر بہت خوشی خوشی ملا اور وہ اسے چھوڑ کر واپس آ گئی۔ رخصت ہوتے وقت شمائل کو اس نے اپنے ساتھ لگایا مگر وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ شمائل کا رویہ ابھی بھی بہت سرد تھا۔ نہ وہ اسے دوبارہ آنے کا کہہ سکی اور نہ ہی شمائل نے گھر آنے کی خواہش ظاہر کی۔

واپسی کا سفر بہت بے چینی میں کٹا۔ وہ شمائل کے احساسات کو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی بے تابیوں اور بے چینیوں کا اندازہ کر سکتی تھی مگر وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک عام مڈل کلاس طبقے کی ماں کی طرح ہر وقت اس کی دلجوئی نہیں کر سکتی تھی۔ سائے کی طرح ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ نہیں پھر سکتی تھی۔ اس کی حرکات پر نظر نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کو اپنے ساتھ لٹا کر اس کے دکھ سکھ شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے نئے نئے لوگوں سے ملنے سے روک بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے وہ بہت کچھ نہیں کر سکتی تھی اور جو تھوڑا بہت کر سکتی تھی اس کے کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بے بس اور مجبور ماں تصور کر رہی تھی۔

ملک منصور! تم ہر عورت کو کیوں اتنا بے بس کر دیتے ہو۔ شہلا، میں، شفق اور اب شمائل...... نہ تم بیوی کو عزت اور مقام دے سکے، نہ بیٹی کو محبت اور شفقت۔ اسے شہلا یاد آنے لگی۔ ملک منصور! تمھیں چھوڑا ہی جا سکتا ہے۔ شہلا نے شاید ٹھیک فیصلہ کیا تھا لیکن اس کے بچے برباد ہو گئے اور میں نے بچوں کے خوف سے تمھیں چھوڑا نہیں مگر میرے بچے پھر بھی بکھر گئے۔ حاصل کی تمنا میں حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا۔ ایک شخص نے اتنے لوگوں کو برباد کر دیا اور پھر بھی کس قدر بے فکر اور آزاد ہے۔ وہ جتنا اس کے بارے میں سوچتی تھی اتنی ہی شدید نفرت ہوتی جاتی تھی مگر وہ کچھ کر نہ سکتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک منصور کو چھوڑ کر سوسائٹی

میں اس کی حیثیت ایک تنکے جیسی نہیں رہے گی اور تنکے کی طرح بے وقعت ہونا گویا اس کے لیے موت تھی۔ وہ اپنی ذات کے خمار میں مبتلا تھی اور اس کے مفادات ملک منصور سے وابستہ تھے۔ اس نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک گلیمرس گرل سے کیا تھا اور ایک گلیمرس گرل کے لیے گمنامی کی زندگی کسی موت سے کم نہ تھی۔ وہ اپنی حدود سوچ رہی تھی۔ وہ کس حد تک ملک منصور سے کمپرومائز کرسکتی تھی اور جس حد تک وہ کرتی آئی تھی اس کے علاوہ مزید کس حد تک جا سکتی تھی۔ اسے اپنی راہیں مسدود نظر آرہی تھیں۔ سب کچھ بیکار تھا۔ اس کا موبائل بج رہا تھا۔

آصف ٹریس آؤٹ ہو گیا تھا۔ وہ فیصل آباد میں اپنے ایک دوست کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے اسے مزید معلومات دے کر فون بند کر دیا۔ اب ہر سوچ ختم ہو چکی تھی۔ صرف ایک سوچ باقی تھی کہ آصف کو پکڑنا ہے۔ ملک منصور سے وفاداری اسی صورت میں نبھائی جا سکتی تھی۔ اسے اس کی ساکھ ہر صورت میں برقرار رکھنی تھی۔ اس کا کھویا ہوا وقار واپس لانا تھا۔ یہی اس کی زندگی کا حاصل تھا اور یہی اس کی خواہش تھی۔ وہ آصف کو پکڑنے کے لیے پلاننگ کرنے لگی۔

٭

حیدر آزاد امیدوار کی حیثیت سے گاؤں کی سیٹ جیت چکا تھا اور اب پھر کوئی نہ کوئی وزارت اس کے حصے میں آنا تھی۔ سوسائٹی میں اس کی نیک نامی اور اچھی شہرت کے تمام لوگ مداح تھے۔ مخالفین کو بھی اس کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کا موقع کم ہی ملتا۔ وہ ہر حلقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اس لیے ہر حکومت میں اسے کوئی نہ کوئی عہدہ ضرور ملتا تھا۔ ملک منصور سے اس کے لاکھ اختلاف سہی مگر اس نے کبھی بھی اسے لیٹ ڈاؤن کرنے کی کوشش نہ کی جبکہ ملک منصور نے کئی دفعہ اس کی پوزیشن گرانے کی کوشش کی مگر قسمت ہر بار اس کا ساتھ دیتی۔ وہ ایک دن کے لیے گاؤں گیا تھا۔ کپاس کی فصلوں کو ایک خاص قسم کا کیڑا بہت تیزی سے تباہ کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں وہ کچھ زرعی ماہرین کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ شفق کئی دنوں سے اس کی منتظر تھی۔ اس نے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اکثر جواب نہ ملتا۔ وہ سخت پریشان تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل سہیل کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ وہ اس کے گھر کی کسمپرسی سے بھی اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہ غریب لوگ تھے اور سہیل ہی ان کا واحد سہارا تھا اور اب وہ جیل میں بند تھا تو وہ لوگ کس طرح گزر بسر کر رہے ہوں گے۔ شاید حیدر بھول چکا تھا اسی لیے تو سہیل کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ حیدر کی غیر متوقع اور اچانک آمد نے اسے خوش کر

دیا۔ وہ جلدی سے بشریٰ آپا کے پاس گئی اور حیدر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

''ٹھیک ہے، ابھی تو وہ مصروف ہیں، بعد میں مل لینا۔''

''اچھا تو میں ادھر ہی بیٹھ جاتی ہوں یہیں برآمدے میں۔'' وہ اس کے کمرے کے باہر ہی بیٹھ گئی۔

''ایسا بھی کیا ضروری کام ہے کہ تم اتنی بے چین ہو رہی ہو، اپنے کمرے میں جاؤ۔''

''بس ہے نا!'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ٹھیک ہے بابا! میں ان کو کہہ دیتی ہوں مگر وہ ان لوگوں کو تو فارغ کر دیں جو شہر سے ساتھ آئے ہیں۔ پہلے ان کی روٹی پانی کا بندوبست تو کر لوں۔'' بشریٰ آپا حسب عادت اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے بولیں۔

شام کو حیدر نکلنے والا تھا جب بشریٰ آپا اسے بلانے آئیں۔ وہ خوشی خوشی ملنے چلی گئی۔

''کہو بیٹا کیسی ہو آپ؟'' حیدر نے شفقت سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں انکل!''

''خیریت تو ہے نا، آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔''

''اوہ ہاں! واقعی میں بھول گیا۔ مجھے اس کا ایڈریس بھی دے دو۔ میں جاتے ہی سہیل سے ملوں گا۔ ویسے تم کیا چاہتی ہو۔'' حیدر نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے کر پوچھا۔

''انکل! وہ بے گناہ ہے۔ پاپا نے اپنی پوزیشن بچانے کے لیے میرا گناہ اس کے سر تھوپ دیا اور اس کی وجہ سے اس کی فیملی مشکل میں ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ رہا ہو جائے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے، کورٹ اسے سزا دے چکی ہے۔''

''انکل! یہاں سب کچھ ممکن ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''فرض کرو اگر فائلز دوبارہ کھلتی ہیں تو تم بھی اس میں انوالو کر لی جاؤ گی اور ہو سکتا ہے تمھیں سزا ہو جائے۔''

''انکل! مجھے اس کی پروا نہیں لیکن اب ہر وقت گناہ کے احساس سے میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے گناہ کیا ہے تو سزا بھی مجھے ملنی چاہیے، کسی بے گناہ کو نہیں۔''

''اور اگر تمھارے پاپا......''

''اب مجھے ان کی بھی کوئی پروا نہیں۔ وہ تو ویسے بھی آج کل مفرور ہیں۔'' وہ

آہستہ سے بولی۔

''تمھیں کیسے معلوم ہوا؟''

''سحر نے فون پر بتایا تھا اور میں نے اخبار میں بھی پڑھا تھا۔''

''او آئی سی! میں کل ہی اسے جا کر جیل میں ملتا ہوں۔''

''تھینک یو انکل!'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''ویسے اب آپ ٹھیک ہونا، کوئی مسئلہ تو نہیں؟''

''نہیں انکل! میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یوں لگتا ہے پہلی دفعہ گھر کی فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ سب لوگ بہت اچھے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔''

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے اس کے سر پر پیار دیا اور باہر چلا گیا۔

ملک منصور علاقہ غیر میں اپنے ایک دیرینہ دوست گل انداز خان کے پاس بالکل محفوظ تھا۔ اسے وہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا بلکہ گل انداز خان کی میزبانی سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ فون پر اپنی پارٹی سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کی پارٹی برسرِ اقتدار آ چکی تھی اور اس کے لیے اب راستہ بالکل صاف تھا۔ ایک ماہ کے اندر سارا سیاسی سیٹ اپ تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے خلاف سازشیں کرنے والے مخالفین بھی اب دبک کر بیٹھ گئے تھے اور پارٹی کے ارکان اس کی آمد کے منتظر تھے۔ ''اب کی بار وزیرِ اعلیٰ نہیں بن سکا تو کیا ہوا، اگلی دفعہ سہی۔'' اس نے آئندہ کی پلاننگ مکمل کر لی تھی۔ اس پورے عرصے میں اس نے اچھی طرح حالات کا جائزہ لیا تھا اور ان تمام لوگوں کے بارے میں سوچا تھا جو اس کے خلاف سازش میں ملوث تھے۔ آصف کے بارے میں شزا نے اسے بتا دیا تھا۔ آصف کو تصویریں پہنچانے والا کون تھا یہ بھی اب اسے یاد آ چکا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد آ گیا تھا کہ اس صحافی کو قتل کرنے کے بعد اس نے ریوالور اور تصویریں سہیل کی طرف پھینکی تھیں۔ سہیل نے ان کا کیا کیا اس نے دوبارہ پوچھنا گوارا نہ کیا۔ سہیل کے بارے میں سوچ کر اسے ایک دم حیرانی بھی ہوئی تھی۔ سہیل اس کا بااعتماد ساتھی تھا اور اس نے اپنی زندگی اس کے لیے داؤ پر لگا دی تھی تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ واپس جا کر جیل میں سب سے پہلے اسے ہی پوچھنے جائے گا۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔

سہیل پر روز بروز تشدد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک تو ملک منصور نے ایس ایچ او کو اس پر نظر رکھنے کو کہا تھا اور نظر رکھنے کا مطلب وہ اچھی طرح جانتا تھا اور دوسرے وہ جیل کی زندگی سے سخت تنگ آ چکا تھا۔ ملک منصور کی طرف سے بھی اس کے دل میں ہر وقت کھٹکا رہتا۔ وہ ہر روز کسی نہ کسی کے ساتھ کوئی پھڈا کرتا اور پھر اس پر اتنا تشدد کیا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جاتا۔ اس کا سارا جسم زخموں کے نشانات سے بھر چکا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی زخم رس رہا ہوتا۔ وہ سخت اذیت میں تھا جب ایک پولیس والے نے اسے ایک ملاقاتی سے ملانے کے لیے اسے کھولا۔ وہ ملاقاتی یقیناً ملک منصور ہوگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ملک منصور ہمیشہ اسے تنہائی میں ملتا۔ وہ کوئی عام ملاقاتی تو نہیں ہوتا تھا۔ سہیل، شفق کے انجام سے اچھی طرح واقف تھا اور اب اسے اپنا انجام بھی سامنے نظر آ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تو چونک گیا۔ ایسا ملاقاتی جس سے اس نے زندگی بھر ملاقات نہیں کی تھی اسے ملنے جیل میں آیا تھا۔ سہیل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ سفید کاٹن کے اجلے اجلے، اکڑے سوٹ میں سرخ و سفید رنگت، دراز قد، خوبصورت چہرہ، گرتے ہیئر وہ ایک لمحے کو چونک گیا۔

"آ...... آپ...... کون ہیں؟" سہیل نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"میں سید ضرار حیدر ہوں۔ شفق کا انکل!"

"شفق...... کا تو کوئی انکل نہیں۔"

"ہے، اس نے تمھیں بتایا نہیں ہوگا۔"

"میں اس کی ساری فیملی کو جانتا ہوں۔"

"کیا تم اس کے ننھیال کبھی گئے ہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم کیسے جان سکتے ہو۔ ہمارے ملک منصور کے ساتھ کچھ اختلافات ہیں اس لیے آپس میں میل جول نہیں اور اس وقت شفق نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔" حیدر نے اسے واضح انداز میں بتایا۔

"کیا مطلب...... کیا وہ زندہ ہے؟"

"ہاں اور میرے پاس گاؤں میں ہے لیکن اس کا ذکر کسی سے بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ملک منصور سے بھی نہیں!"

"وہ بچ کیسے گئی اور ملک منصور کو خبر بھی نہیں۔" سہیل بے حد حیران ہو رہا تھا۔

''ہاں یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ خیر اس بات کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم اب کیا چاہتے ہو؟''

''کیا مطلب؟'' سہیل نے چونک کر پوچھا۔

''شفق تمھارے اور تمھارے گھر والوں کے بارے میں بے حد پریشان ہے۔ وہ تمھیں آزاد دیکھنا چاہتی ہے۔''

''لیکن یہ تو اب ناممکن ہے جبکہ کورٹ مجھے سزا بھی دے چکی ہے۔''

''ہاں یہی تو میں اسے بتا رہا تھا۔''

''میں، شفق سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔'' سہیل آہستہ سے بولا۔ حیدر نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور پھر خاموش ہو گیا۔

''ٹھیک ہے، میں اسے تمھارے پاس لاؤں گا۔'' حیدر اٹھتے ہوئے بولا۔

''سر! جلدی کیجیے گا۔ اس سے پہلے کہ ملک منصور مجھے جان سے مار ڈالے۔''

''کیوں؟''

''میں جانتا ہوں، بس آپ شفق کو مجھ سے جلدی ملوا دیں۔''

''اچھا۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

شفق، حیدر کے فون کی ہر وقت منتظر رہتی۔ صبح سے شام تک وہ انتظار کی کیفیت میں بے قرار رہتی مگر کوئی فون نہ آتا وہ مایوس ہو جاتی۔ گو کہ حویلی میں ہر طرح سے آرام اور سکون تھا مگر اب وہ آہستہ آہستہ اس یکسانیت اور خاموشی سے تنگ آ گئی تھی۔ وہ اس گاؤں سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ سحر کا بھی بہت دنوں سے فون نہیں آیا تھا۔ کوئی ایک بھی تو ایسا نہ تھا جس سے وہ دل کی بات کرتی۔ اندر کا ڈپریشن اور باہر سکوت...... وہ بے حد مایوسی کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی جب اچانک بشریٰ آپا نے حیدر کے آنے کی اطلاع دی۔

''اس وقت......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں وہ جلدی میں ہیں اور تمھیں بلا رہے ہیں۔'' بشریٰ آپا نے کہا۔

''اچھا۔'' وہ دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے اس کے ساتھ ان کے کمرے میں گئی۔

''السلام علیکم انکل!''

''وعلیکم السلام! کیسی ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''تو پھر آپ تیار ہو جایئے، میں آپ کو لینے آیا ہوں۔''

''کہاں اور کس لیے؟''

''سہیل آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''کیا آپ اس سے ملنے گئے تھے؟'' وہ ایک دم پُر جوش ہو کر بولی۔

''ہاں۔''

''کیا وہ ٹھیک ہے؟''

''ہاں اور آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔''

''اچھا تو کب تک ہم جائیں گے؟''

''بس مغرب کی نماز کے بعد۔''

''ٹھیک ہے میں فریش ہو جاؤں۔'' وہ مسروری باہر نکل گئی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا۔ دونوں رات گئے لاہور پہنچے۔ حیدر کا ڈیفنس میں ایکڑوں پر محیط شاندار محل نما گھر تھا۔ شفق کا اپنا گھر بھی کسی محل سے کم نہیں تھا مگر اس گھر میں قدم رکھتے ہی ایک انوکھی طمانیت اور سکون کے گہرے احساس نے اسے گھیر لیا۔ اس گھر کے در و دیوار انتہائی آرٹسٹک اسٹائل میں ڈیکوریٹ کیے گئے تھے۔ جا بجا پینٹنگز، پینٹڈ گلاس ڈورز، وڈ ورک، قیمتی غالیچے، ڈرائنگ روم کی دیواروں پر میورل آرٹ، برونز اینڈ کرسٹل ڈیکوریشن پیسز، اس کے تصورات سے بھی حسین گھر تھا۔

''انکل! آپ کا گھر کس قدر خوبصورت ہے۔'' وہ اردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں میری بیٹی کے ہاتھوں نے اسے سنوارا ہے۔''

''انکل! آپ شہلا باجی سے بہت پیار کرتے ہیں۔'' وہ حسرت سے بولی۔

''ہاں، ظاہر ہے بھئی۔''

''انکل! کاش میرے پاپا بھی آپ جیسے ہوتے یا پھر آپ ہی ہمارے پاپا ہوتے۔'' اس نے اپنی ایک نامکمل آرزو کو بہت سادگی سے کہہ دیا تھا۔ حیدر اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ اس بات کے جواب میں کوئی تسلی بھی تو نہیں دی جا سکتی تھی۔ شفق کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''بیٹا! کچھ چیزیں انسان کے بس میں نہیں ہوتیں۔ قدرت ان کے فیصلے کرتی ہے اور ہم تو بس ان فیصلوں کو مانتے ہیں۔''

''انکل! قدرت ایسے فیصلے کیوں کرتی ہے جو بہت سے دلوں کو توڑ دیتے ہیں۔ بہت سے گھر اجڑ جاتے ہیں اور نہ جانے کتنی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ قدرت کیوں ایسا کرتی ہے؟'' وہ بے بسی سے بولی۔

''اس لیے کہ قدرت انھیں آزمانا چاہتی ہے۔ کائنات میں ہر شے کی آزمائش ہوتی ہے اور جو جتنے زیادہ اختیارات کا مالک ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ آزمایا جاتا ہے اور انسان کو تو اللہ نے ساری مخلوقات پر فوقیت دی ہے اس لیے اسے وہ سب سے زیادہ آزماتا ہے۔'' اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''انکل! ہماری آزمائش کب ختم ہوگی۔ لگتا ہے ہم ختم ہو جائیں گے مگر ہماری آزمائش ختم نہیں ہوگی۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''گھبراؤ نہیں انشاء اللہ بہتر ہوگا۔ آؤ کھانا کھاتے ہیں۔'' حیدر نے خانساماں کو کہہ کر کھانا لگوایا۔

''سر! شہلا بی بی کا فون آیا تھا۔'' کھانا رکھتے ہوئے خانساماں نے بتایا۔

''اچھا کیا کہہ رہی تھی؟''

''وہ آنے کا کچھ کہہ رہی تھیں۔ کل پھر فون کریں گی۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' حیدر سرد مہری سے بولا۔

شفق ایک لمحے کو چونکی۔ حیدر کا رویہ اسے کافی سرد لگا مگر وہ خاموش رہی۔ وہ کھانا سامنے رکھے نہ جانے کن سوچوں میں مگن تھی۔

''بیٹا! آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟''

''بس دل نہیں چاہ رہا۔''

''کیوں بھئی؟''

''انکل! جب شہلا باجی کا کھانا کھانے کو دل نہیں چاہتا تھا تو آپ کیا کرتے تھے؟''

''تو پھر میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتا تھا۔'' وہ ایک دم بولا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو شیشے کی ڈائننگ ٹیبل پر گرے۔

''کیا ہوا بیٹا! آپ تو بے حد حساس ہو۔''

''انکل! زندگی میں ایک دفعہ بھی ہمیں کسی نے اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھلایا۔ نہ مما نے اور نہ پاپا نے۔'' شدید احساسِ محرومی نے اس کو ایک دم جھنجوڑ ڈالا تھا۔

''تو بیٹا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ لاؤ میں اپنی بیٹی کو کھلا دیتا ہوں۔'' اس نے چاولوں کا چمچ اس کی طرف بڑھایا۔شفق نے اس کی طرف دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حیدر کی آنکھوں میں بھی نمی سی تیرنے لگی۔

''انکل! جن بچوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ کتنے محروم بچے ہوتے ہیں۔ وہ کیا کچھ کھو دیتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی نعمت، سب سے بڑا انعام۔'' وہ رو رہی تھی اور اس کے ہاتھ سے چمچ پکڑ کر اس نے پلیٹ میں واپس رکھ دیا تھا۔

''تم پریشان نہ ہو، اٹھو اور سو جاؤ۔'' حیدر نے شیر شاہ کو بلایا جو گھر کے تمام امور کا انچارج تھا اور ہر بات کا وہی جوابدہ ہوتا تھا۔شیر شاہ درمیانی عمر کا دراز قد، صحت مند پٹھان تھا اور حیدر اس کے ساتھ بہت ادب سے پیش آتا تھا۔

''شیر شاہ! بی بی کے لیے گیسٹ روم کھلوا دو۔'' حیدر نے اسے حکم دیا۔

''جی صاب جی! میں ابھی آیا بی بی صیب۔'' وہ باہر نکل گیا۔شفق نے ایک نوالہ بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ بہت تھک چکی تھی۔ حیدر بھی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

''انکل! سہیل ٹھیک تو ہے نا، وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟'' وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔ شاید کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔''

''اچھا'' وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''آ جاؤ بی بی صیب! کمرا ٹیک کر دی ہے۔''

''ہاں شیر شاہ! بی بی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ بھی میری بیٹی ہے۔'' حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا تو شفق نے زخمی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور شیر شاہ کے ساتھ گیسٹ روم میں چلی گئی۔

اگلے دن وہ بڑی سی چادر اوڑھ کر سہیل سے ملنے گئی۔ سہیل کو اس حلیے میں دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور سہیل اسے زندہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

''سہیل! تمہاری یہ حالت...... مائی گاڈ! میں اس سب کی ذمہ دار ہوں۔'' شفق کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ حیدر ایس ایچ او کے پاس بیٹا تھا اور وہ جیل میں اسے خود چھوڑ کر آیا تھا۔

''میری حالت کو چھوڑو، میں جانتا ہوں میری زندگی اب بہت تھوڑی ہے۔ بس

میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔''

''کیوں؟''

''ملک منصور نے آتے ہی مجھے شوٹ کر دینا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ ان کے خلاف اسکینڈل میں نے ڈس کلوز کروایا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بس میں مشتعل ہو گیا تھا اور آصف کو بھی انوالو کر لیا۔''

''کون آصف؟'' سہیل نے اسے ساری تفصیلات بتا دیں۔

''شفق! کسی طرح آصف کو بچانے کی کوشش کرو۔ میں تو زندگی سے ہاتھ دھونے والا ہوں مگر آصف...... اس بے چارے کا کیا قصور۔ وہ تو میری وجہ سے پھنس گیا۔ تم کسی طرح اسے بچانے کی کوشش کرو پلیز۔''

''لیکن تم......''

''میری فکر چھوڑو، بس گھر میں خیریت پوچھنے جانا۔ شاید وہاں تو فاقوں کی نوبت آ گئی ہے۔ اماں آئی تھیں، بہت پریشان تھیں۔'' سہیل کی باتیں سن کر وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔

''تم اپنا خیال رکھنا، کیا میں کورٹ میں حاضر ہو جاؤں؟''

''نہیں، اس کی اب قطعی ضرورت نہیں۔ بس تم آصف کو بچانے کی کوشش کرو۔'' سہیل کو اپنے سے زیادہ آصف کی فکر تھی۔

''میں پھر آؤں گی اور پریشان نہ ہونا۔''

''ہاں اب میرے دل کا بوجھ کافی کم ہو گیا ہے۔'' حیدر اسے لینے آ گیا تھا۔ واپسی پر اس نے حیدر سے آصف کے بارے میں بات کی۔

''ٹھیک ہے، مجھے اس کے بارے میں تفصیلات بتا دینا۔ میں اسے بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''انکل! میں آپ سے کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے؟''

''انکل! میں سہیل کے گھر جانا چاہتی ہوں اور ان کی کچھ مدد کرنا چاہتی ہوں مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''ٹھیک ہے تم میرے سیکرٹری اویس کے ساتھ چلی جانا اور جس طرح بھی ان کی مدد کرنا چاہو، اویس کو بتا دینا۔'' حیدر نے شفقت سے کہا۔

''تھینک یو انکل! یو آر رئیلی گریٹ!'' جواباً حیدر مسکرا دیا۔

اگلے ہی دن وہ اویس کے ساتھ سہیل کے گھر چلی گئی۔ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر اسے سخت دکھ ہوا۔ اس کی ماں سوکھ کر تنکا ہو گئی تھی اور اب حواسوں میں نہیں تھی اور دونوں بہنیں بھی شدید غم و غصے سے دوچار تھیں۔ گھر کا تقریباً سارا سامان بک چکا تھا۔ اسے ایک کپ چائے پلانے کے لیے بھی ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔

''آپ لوگ کیسے گزارہ کرتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''بس جی مانگ تانگ کر یا کوئی خود ہی خدا خوفی کر کے یا پھر کوئی صدقے خیرات میں دے جائے۔'' عذرا نے کہا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبانے لگیں۔

''اب آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو ہر ماہ یہ صاحب کچھ پیسے دے جایا کریں گے۔'' اس نے اویس کی طرف اشارہ کیا۔

''فی الحال آپ یہ تو رکھیں۔'' اس نے دس ہزار روپے عذرا کو دیے۔ سب حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ڈاکٹر اماں جی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' اس نے اماں کی حالت دیکھ کر پوچھا۔ اماں نے اسے بالکل نہیں پہچانا تھا بلکہ وہ تو اس کی آواز سن کر چارپائی سے بھی نہ اٹھی تھی۔

''جب سے بھائی کو سزا ہوئی ہے اور اب تو رو رو کر ان کی بینائی بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ نہ جانے ہم کس کے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خدا اس کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ باجی! ویسے آپ کیسے بچ گئیں۔ اماں نے تو بتایا تھا......''

''ہاں بس قدرت نے بچا لیا۔''

''آپ اتنی اچھی ہیں اور اللہ اپنے اچھے بندوں کو ہمیشہ مصیبت سے بچا ہی لیتا ہے۔''

''اچھا اب میں چلتی ہوں مگر آتی رہوں گی۔'' وہ جیسے کہیں گم ہو گئی تھی بے دلی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''شکریہ! آپ بہت اچھی ہیں۔'' دونوں بہنیں اسے خدا حافظ کہنے دروازے تک آئیں۔ سارا راستہ وہ بے چین رہی۔ عذرا کے الفاظ اس کے دماغ میں مسلسل ہتھوڑے بجا

رہے تھے۔ ''خدا اس کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کے اندر شدید چبھن اور پھانس تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کہہ دیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے چین نہیں مل رہا تھا۔ وہ گاڑی میں بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ ڈرائیور اور اویس اس کے ساتھ تھے۔ اویس نے ابھی فریش ایم بی اے کیا تھا۔ جاب کافی الحال مسئلہ تھا تو حیدر نے اسے پرسنل سیکرٹری رکھ لیا۔

''میڈم! ان لوگوں کی طرف ہر ماہ خود آنا پڑے گا یا پھر ان کے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کرا دیے جائیں۔'' اویس نے بغیر مڑے اس سے پوچھا۔

''نہ جانے ہم کس کے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خدا اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' عذرا کے الفاظ کسی تیز دھار چاقو کی طرح اس کے دماغ کی شریانوں کو کاٹ رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر لہولہان ہو رہی تھی۔

''میڈم!'' اویس نے مڑ کر اسے دیکھا مگر وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

''ایکسکیوز می میڈم!'' وہ پھر بھی باہر دیکھ رہی تھی۔ اویس نے قدرے شرمندگی سے ڈرائیور کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کہیں دور بھاگ جائے جہاں کوئی ایسی بازگشت نہ ہو۔ جہاں اس کا ماضی نہ ہو۔ یا خدایا! میرا ماضی میرے لیے کس قدر بڑا عذاب بن گیا ہے۔ میرا ماضی کتنا داغدار ہے اور حال بھی اور شاید مستقبل بھی ایسا ہو۔ اس نے سیٹ کے ساتھ سر ٹکا دیا۔

نور شدید الجھن کا شکار تھی۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کو جان کر ہر مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی عادی ہو چکی تھی لیکن مسز پیٹر کی باتیں اس کی سمجھ سے ابھی بھی باہر تھیں۔ وہ ولیم سے ملنے آئی تو وہ بہت دنوں کے بعد فادر سے ملنے گیا ہوا تھا۔ مسز پیٹر دوائیں کھا کر سو رہی تھیں اور وہ ان کے سامنے ایزی چیئر پر بیٹھی ان کے چہرے پر نظریں مرکوز کیے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ انسان کو جان لینا مشکل کام ہے۔ شاید دنیا کا سب سے مشکل کام۔ جو چیزیں سامنے نظر آ رہی ہوں ان کی تسخیر مشکل نہیں۔ چوٹیاں سر کی جا سکتی ہیں مگر دلوں کو ان کے سارے رازوں اور اسراروں سمیت تسخیر کرنا شاید دنیا کا مشکل ترین اور انوکھا کام ہے۔ شاید اسی لیے آج تک کسی نے بھی دل کی چوٹی سر کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مسز پیٹر کیا ہیں؟ اور ولیم! وہ بھی تو ان کی طرح نہیں۔ وہ تو شاید ان ساری باتوں سے ناواقف ہے اور اس کے لیے سب کچھ کس قدر غم انگیز ہو گا۔ وہ کیسے سب کچھ قبول کر پائے گا اور ان کے اور بچے بھی نہیں اور وہ ولیم کو اس

صورتِ حال سے نکالنے کی بات کر رہی تھی۔ ولیم...... چرچ...... فادر اور اس کا ان سب سے شدید لگاؤ......اس نے سب کچھ کہاں سے پایا تھا۔ وہ سوچوں میں گم تھی جب ولیم آ گیا۔

''تم کب آئی؟'' ولیم نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

''کافی دیر سے۔''

''خیریت تو ہے، تم آج کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟''

''ہاں، ہوں تو سہی۔''

''مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی۔''

''نہیں کیونکہ تم بھی پریشان ہو جاؤ گے اور تمہارا پریشان ہونا مجھے پسند نہیں۔''

''اچھا، ایسی بھی کیا بات ہے۔'' وہ کتابیں شیلف میں رکھتے ہوئے بولا جو وہ ہاسٹل سے لایا تھا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''ہاسٹل گیا تھا، کچھ کتابوں کی ضرورت تھی اور پھر فادر کے پاس گیا تھا۔''

''کیوں؟'' اس نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''تمھیں معلوم تو ہے وہ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔''

''تو پھر کیا اب ناراضگی ختم ہو گئی ہے۔''

''نہیں، انھوں نے مجھ سے ملنا گوارا ہی نہیں کیا۔ نہ جانے ان کو میرے بارے میں کیا شبہات ہیں۔ میں نے تو صاف صاف مما کی حالت کے بارے میں بتایا تھا پھر بھی...... پھر بھی وہ نہیں سمجھتے۔ کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ فادر سینے میں ایک انسان کا دل نہیں رکھتے۔ وہ اپنی ہر بات میں اصول، قواعد وضوابط کو لے آتے ہیں۔ زندگی میں کبھی کبھی اصول توڑنے پڑتے ہیں۔'' وہ مایوسی سے بول رہا تھا۔

''ولیم! نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ تم چرچ جوائن کر کے غلطی کرو گے۔''

''نہیں، کبھی نہیں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

''کیوں، تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اس لیے کہ میں جن مشکلات سے گزرا ہوں اب میں اپنا ذہن تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔ میری زندگی کا خواب پائلٹ بننا تھا۔ تم جانتی ہو اس خواب کو اپنے ذہن سے نوچنے کے لیے مجھے کتنا عذاب سہنا پڑا۔ ایک ایک لمحہ میرے لیے عذاب بن گیا تھا اور اب جبکہ میں یہ

سوچ چکا ہوں اب اس سوچ کو پھر بدلنا میرے لیے ناممکن ہے۔ میں اپنے آپ کو بار بار مصیبتوں میں نہیں ڈالنا چاہتا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔نور اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر خاموش ہوگئی۔

''مگر تم کیوں پریشان ہو؟ تم جیسی لڑکی کو پریشان دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گیا ہوں۔'' وہ مدھم سی مسکراہٹ سے بولا۔

''کیوں، میں انسان نہیں ہوں؟''

''ہاں ہو مگر بہت بولڈ جس سے شاید مسئلے بھی دور بھاگتے ہیں۔''

''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔''

''نہیں مجھے پورا یقین ہے۔''

''کبھی کبھی یقین بھی دھوکا دے جاتا ہے۔''

''اچھا الجھاؤ نہیں۔''

''کیسے نہ الجھاؤں۔اس وقت تو میں خود شدید الجھن میں ہوں۔'' وہ آہ بھر کر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا تم مجھ سے کچھ شیئر نہیں کرنا چاہتی یا پھر مجھے اس قابل نہیں سمجھتی؟''

''میرا خیال ہے دوسری بات زیادہ ٹھیک ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی۔''

''آنٹی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے؟''

''نہیں، حیدر انکل خود لے کر جائیں گے اور ہاں تمھیں بتانا تھا کہ ہم لوگ ادھر سے شفٹ ہو رہے ہیں۔''

''کہاں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''حیدر انکل کا گلبرگ میں ایک گھر ہے ادھر۔''

''ولیم! حیدر انکل اچانک کہاں سے آ ٹپکے۔کیا تم نے زندگی میں پہلے کبھی انھیں دیکھا......؟''

''نہیں اور مما کی حالت ایسی ہے کہ میں ان سے کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہتا۔نور! اب تو مما ہر وقت موت کی باتیں کرتی رہتی ہیں اور......اور مجھے بہت خوف آتا ہے۔'' وہ اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیوں؟''

''ان کے بعد میں کیا کروں گا۔ میری مما تو میرے لیے سب کچھ ہیں جیسے کرائسٹ کے لیے مدر میری...... اوہ گاڈ...... پلیز سیو ہر۔'' اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ وہ ولیم کو یوں پریشان دیکھ کر مزید کچھ کہہ کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''پھر کب شفٹ ہو رہے ہو؟''

''کل انکل لینے آئیں گے۔''

''ولیم! حیدر انکل دوسری کمیونٹی سے نہیں ہیں کیا؟'' اس نے عجیب استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''یونہی! کیا تمھیں حیرت نہیں ہوئی؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

''کیوں؟''

''ہوسکتا ہے مما بعد میں اپنا مذہب بدل چکی ہوں۔''

''نہیں، یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ ایک سچا مسلمان کبھی مذہب بدل نہیں سکتا۔ ہمیشہ وہی اپنی راہ بدلتے ہیں جن کا ایمان بودا اور کمزور ہوتا ہے اور جن کے دل و دماغ کمزور اور شبہات میں مبتلا ہوتے ہیں اور حیدر انکل کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ ایک اچھی مسلمان فیملی سے ہیں۔''

''تو پھر اس کا کیا مطلب ہوا؟'' ولیم نے یوں حیرت سے پوچھا جیسے اس کے سر پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔

''معلوم نہیں، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں خود اسی وجہ سے الجھن کا شکار ہوں۔ میں تم سے بالکل ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی مگر میں عجیب مخمصے میں ہوں۔'' نور آہستہ سے بولی۔

''تم نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ پلیز تم اس وقت چلی جاؤ۔ میں سخت گھٹن محسوس کر رہا ہوں۔ میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چاہتا ہوں۔'' ولیم کی ہمیشہ سے یہی عادت تھی۔ جب وہ شدید الجھن کا شکار ہو تو دروازے، کھڑکیاں اور لائٹ بند کر کے اندھیرے میں سوچتا رہتا اور ابھی بھی وہ اس ماحول میں اپنے آپ کو مدغم کر کے چند ثانیوں کے لیے اپنے آپ سے کچھ ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے میں چلتی ہوں مگر کچھ ہونے والا ہے۔ شاید بہت عجیب...... بہت

انوکھا......'' نور آہستہ سے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔ ولیم نے ماں کے چہرے کو بغور دیکھا۔ بیماری اور نقاہت نے صرف دو تین ماہ میں انھیں بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ ان کے چہرے پر پھیلا کرب اور یاسیت سب کچھ تکلیف دہ لگ رہا تھا۔ وہ ان کے کمرے سے نکل گیا اور اس کمرے میں چلا گیا جو اس نے قیام کے دوران اپنے لیے سیٹ کیا تھا۔ وہ خاموشی سے دروازے، کھڑکیاں اور لائٹ آف کر کے کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچتا رہا۔ مسلسل سوچتا رہا۔ وہ ہمیشہ ایسی سٹنگ کے بعد اپنے آپ کو ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کرتا تھا مگر کئی گھنٹے گزارنے کے بعد بھی وہ شدید الجھن سے دوچار تھا۔ وہ مزید الجھ گیا تھا۔ ایک بات کا سرا بھی اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی......بھنور میں پھنس گیا ہو۔ بیماریاں، ناراض فادر، قریب آتے ایگزامز، نور کی باتیں، حیدر انکل سے قرابت داری، مالی پریشانیاں سب کچھ کس قدر تکلیف دہ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے فرار چاہتا تھا مگر اب ایسی کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ فادر ناراض تھے اور نور خود الجھن میں تھی۔ وہ مزید پریشان ہو گیا۔

حیدر انھیں اگلے دن لینے آ گئے۔ ولیم اب حیدر اور مما کی طرف ہر بات پر چونک کر اور تنقیدی نگاہ سے دیکھتا۔ مما خاموشی سے جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ حیدر انھیں گلبرگ میں ایک وسیع و عریض ویل فرنشڈ بنگلے پر لے گئے۔

''حیدر! یہاں رہتے ہو؟'' مما نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ڈیفنس میں۔''

''اور یہاں کون رہتا ہے؟''

''یہ آپ لوگوں کے لیے خریدا ہے۔'' وہ آہستہ سے بولے۔ اس بات پر ولیم کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے شدید حیرت ہوئی۔ اس نے مما کی طرف دیکھا اور پھر حیدر انکل کی طرف مگر خاموش رہا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی؟''

''تھی، تم کسی غیر کے گھر پڑی رہو یہ ہمارے خاندان کی روایت نہیں۔'' ولیم نے پھر چونک کر دونوں کو دیکھا۔

''حویلی میں کون ہے؟'' شہلا نے ایک دم بے خیالی میں پوچھا۔

''کوئی نہیں، بس ملازم ہیں۔ کبھی کبھی میں بھی چلا جاتا ہوں زمینوں کی دیکھ بھال

کے سلسلے میں یا پھر کوئی اور مسئلہ ہو۔''

''اچھا، سب ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں۔''

''ولیم کو بھی...... کبھی......'' وہ ایک دم رک گئی۔ حیدر کچھ بھانپتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں بھئی، کیا کرنے کے ارادے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔ چرچ جوائن کرنے کا سوچ رہا ہوں۔'' اس نے جان بوجھ کر ایسا کہا تھا۔ حیدر نے حیرت اور استفہامیہ نگاہوں سے شہلا کی طرف دیکھا اور شہلا نے حیدر کی طرف...... اس کی نظروں میں بلا کا کرب، مایوسی اور بے بسی تھی۔ ولیم کو بہت عجیب سا لگا۔ نور کی باتوں اور الجھنوں کی وجہ سمجھ میں آنے لگی۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ تینوں اپنی اپنی جگہ شدید الجھن میں گرفتار تھے۔

......۞......

ملک منصور واپس آ چکا تھا۔ اسے اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کی پارٹی نے اس کا یوں استقبال کیا جیسے وہ کسی محاذ سے واپس آیا ہو۔ اخبارات نے اسے خصوصی کوریج دی۔ اس کے تو جیسے سارے گناہ دھل چکے تھے۔ وہ ہر طرح سے پاک صاف ہو کر آیا تھا۔ اب نہ کوئی کیس باقی تھا نہ کوئی مقدمہ کیونکہ اس کی پارٹی برسرِ اقتدار آ چکی تھی۔ اپنی حکومت سے کیسا خطرہ! ایسی پذیرائی دیکھ کر اس کا غم و غصہ اور زیادہ ہو جاتا۔ اسے یوں لگتا جیسے اسے نیچا دکھانے کے لیے کسی نے چند ثانیوں کے لیے شطرنج کی بساط پر اسے مات دے دی تھی اور اب وہ صاف بچ نکلا تھا مگر اس مہرے کو اب وہ اپنے ہاتھوں سے کچلنا چاہتا تھا۔ شزا اسے ایئر پورٹ لینے گئی۔ صحافیوں اور پارٹی ورکروں کی اتنی بڑی تعداد جمع تھی کہ وہ چونک گئی۔ ملک منصور! قدرت تم پر بڑی مہربان ہے، تم ہر دفعہ صاف بچ نکلتے ہو۔ نہ جانے کیوں قدرت تمہاری رسی دراز کر رہی ہے۔ اس نے پجیرو چلاتے ہوئے سوچا۔ ملک منصور اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

''پجیرو جیل کی طرف موڑ لو۔'' اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''کیوں؟''

''بس ضروری کام ہے، سہیل سے ملنا ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن پہلے گھر چلتے ہیں۔''

''نہیں، میں اپنے ضروری کاموں کو موخر کرنے کا عادی نہیں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا اور شہزا نے خاموشی سے سٹیرنگ اس طرف موڑ لی۔ جیسے ہی وہ جیل میں داخل ہوا، ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ اس کی غیر متوقع آمد نے سب کو چونکا دیا۔ اس کی سیاسی حیثیت سے کس کو انکار تھا۔ وہ الیکشن سے باہر ہو گیا تھا اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ سیاست سے ہی باہر تھا۔ اس کی پارٹی حکومت میں تھی اور وہ پارٹی کا لیڈر رہ چکا تھا۔ پارٹی اب بھی اس کے اشاروں کی منتظر رہتی تھی۔ وہ سیدھا سہیل کی طرف گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سہیل اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ جیل کی تاریک کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تا کہ اسے نظر نہ آئے۔ ملک منصور رکا...... اِدھر اُدھر دیکھا پھر دیوار کی طرف دیکھا۔

''تم پاتال میں بھی چلے جاؤ تو ملک منصور تمھیں ڈھونڈ نکالے گا۔ تم نے اسے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ تم جیسی چیونٹی شیر سے لڑنے چلی تھی۔'' ملک منصور کے لہجے میں نہایت نفرت اور حقارت تھی۔

''نہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''تم نے میرا کیریئر داؤ پر لگا دیا۔''

''اور آپ نے میری زندگی...... آپ نے میری زندگی کی کیا قیمت لگائی۔ یہی کہ میرے والے گھر سسک سسک کر مر رہے ہیں۔ کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں۔ آپ کتنی دفعہ ان کے پاس گئے ہیں۔ میں بھی مجبور تھا۔ جب آپ اپنا وعدہ بھول گئے تو مجھے بھی بھولنا پڑا۔ مفادات کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانا میں نے بھی آپ سے ہی سیکھا ہے۔'' سہیل بھی غصے سے بولا۔

''اور دشمن کو کچلنا، اس کو نرغے میں لے کر مات دینا شاید یہ نہیں سیکھا۔''

''ہاں اس میں، میں ہار گیا۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''لیکن مجھے ہار پسند نہیں۔ اس ہار کو اب میں تمھارے گلے کا ہار بنانا چاہتا ہوں۔ ملک منصور جب تک اپنے دشمنوں کو اپنے قدموں تلے روند نہ لے اس وقت تک سکون کا سانس نہیں لیتا۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی آپ جیسے وحشی درندے سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ کر گزریئے جو آپ چاہتے ہیں۔'' سہیل پرُمطمئن لہجے میں بولا۔ ملک منصور نے اس کی

طرف دیکھا، گہری سانس لی، ریوالور جیب سے نکالا۔

''لیکن یاد رکھیے! قدرت اپنے مظلوم بندوں کا حساب خود لیتی ہے۔ اے اللہ! اس بندے سے گن گن کر حساب لینا۔ اس نے کئی زندگیوں کو اپنی خوشی اور مفادات کی بھینٹ چڑھایا ہے۔'' سہیل نے چھت کی طرف منہ کر کے دعا کی۔

''تم جیسے لوگوں کی دعائیں پوری ہونے لگیں تو آسمان نہ پھٹ پڑے۔'' ملک منصور قہقہہ لگا کر بولا۔

''فرعون بھی تو یہی کہتا تھا اور آپ بھی اس وقت اپنے آپ کو خدا سمجھ رہے ہیں۔'' سہیل الفاظ چبا چبا کر بولا۔

''یہ بھی تمہارا ڈھونگ ہے سزا سے بچنے کا مگر میں تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں اس لیے اب تمھیں زمین پر رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' ملک منصور نے دو فائر کیے۔ سہیل وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ملک منصور اطمینان سے باہر آ گیا اور پجیرو میں بیٹھ کر چلا گیا۔

''سہیل ٹھیک ہے نا۔'' شزا نے ملک منصور کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں بالکل! اور وہ آصف کا کچھ پتا چلا۔'' ملک منصور نے پوچھا۔

''ہاں بہت مشکل سے ٹریس آؤٹ ہوا ہے۔ پہلے فیصل آباد میں تھا اور آج کل جھنگ میں ہے۔''

''جھنگ میں کس کے پاس؟''

''ہماری مخالف پارٹی کے ڈیرے پر۔ اب آپ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے لے آئیں پھر جو کرنا ہے کر لیں۔ میرا کام تو صرف اسے ٹریس آؤٹ کرنا تھا۔'' شزا آہستہ سے بولی۔

''تھینک یو ڈارلنگ! تم نے میرا بہت ساتھ دیا۔'' ملک منصور نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! آپ سے ایک بات کرنی ہے۔''

''ہاں ہاں کہو۔''

''شمائل بہت اپ سیٹ ہے اور اس نے اپنے آپ کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔''

''وہاٹ نان سینس......! لیکن کیوں؟''

''وہ بہت ڈسٹرب ہے۔ شاید ہماری وجہ سے۔ وہ آپ کو اور مجھے بہت مس کرتی

ہے۔ پچھلے دنوں گھر آئی تھی۔ اس میں بہت زیادہ تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ وہ میچور بھی ہو گئی ہے اور جنونی بھی۔ پلیز اس کے لیے کچھ کریں ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' شزا کی نیلی آنکھیں چھلکنے لگیں اس نے پجیرو کی رفتار اور بڑھا دی۔

''ٹیک اٹ ایزی ڈارلنگ! کچھ نہیں ہوتا۔ اس عمر میں ایسا تو ہوتا ہے۔ میں ذرا اس مسئلے سے فارغ ہو لوں تو پھر خود اس سے ملنے جاؤں گا۔''

''آخر وہ کب تک ہاسٹل میں رہے گی؟''

''اس بات کو چھوڑو، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ میں نے کہا ہے نا۔'' وہ یہ بات ڈسکس نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ شزا خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی مگر دل میں بے شمار خدشات تھے۔ اس شخص پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے یقین کرنا پڑتا تھا۔

شفق گاؤں واپس آ چکی تھی۔ حیدر انکل نے فون کر کے اسے بتایا تھا کہ آصف جھنگ میں ان کے ایک دوست کے پاس ہے۔ ملک منصور کا مخالف حیدر کا گہرا دوست تھا۔ ملک منصور کے اسکینڈل کے بعد ہر سیاسی شخصیت کی آصف سے اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی۔ ملک منصور نے آصف کو لاہور آنے کو کہا تھا اور اپنا ڈرائیور بھی بھیجا تھا۔ شفق آصف کی طرف سے مطمئن تھی مگر گاؤں آ کر بھی وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھی۔ سہیل کی ابتر حالت اور عذرا کی باتیں اسے ہر وقت ڈستی رہتیں۔ شدید گناہ کا احساس اس کے اندر کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہو کر اخبار پھیلائے اسے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جہاں اندرونی صفحے پر سہیل کی تصویر اور اس کے پُراسرار قتل کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ایک دفعہ خبر پڑھی۔ بار بار پڑھی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ ایک بے گناہ انسان اس کی وجہ سے موت کی نذر ہو گیا تھا۔ خدا واقعی اسے کیسے معاف کرے گا۔ وہ واقعی اس قابل نہیں تھی کہ اسے معاف کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب ہے پاپا واپس آ چکے ہیں اور...... اور اسی لیے سہیل خوفزدہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پاپا اسے نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے جلدی سے سحر کو فون ملایا۔ اس کا موبائل بند تھا۔ نہ جانے وہ کیوں اپنا موبائل ہر وقت بند رکھتی تھی۔ گاؤں آنے کے بعد ایک دو دفعہ اس نے اسے فون کیا تھا پھر نہ جانے کیوں رابطہ منقطع ہو گیا...... اس نے حیدر انکل کو فون ملایا۔

''انکل! سہیل قتل ہو گیا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔'' وہ آہ بھر کر بولے۔

''انکل! اسے پاپا نے قتل کیا ہے۔''

''مگر اس بات کو کون مانے گا۔''

''انکل! میں عدالت میں گواہی دوں گی۔''

''کیا فائدہ! کیا تم چشم دید گواہ ہو اور تمھارے پاپا بہت شاطر ذہن کے مالک ہیں اس لیے بیٹا ان باتوں کو مت سوچو۔''

''مگر انکل! وہ بے گناہ تھا۔''

''ہاں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''انکل! کب تک ایسا ظلم اور ناانصافی ہوتی رہے گی۔''

''جب تک لوگ مجبور ہیں اور ملک منصور جیسے لوگ زندہ ہیں۔ اچھا اب تم اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔''

''انکل! کیسے نہ سوچوں، وہ شخص میری وجہ سے مارا گیا ہے۔''

''تو پھر اب تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں...... میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میں تو بہت بے بس ہوں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ انکل! میں ابھی اس کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ دفنانے سے پہلے ایک دفعہ اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں ڈرائیور کو بھیج دیتا ہوں۔ تم چلی جاؤ اور اپنی چادر وغیرہ اوڑھ کر جانا۔ ہوسکتا ہے تمھارے پاپا بھی وہاں ہوں۔''

''وہ وہاں کیوں ہوں گے؟''

''ایسا ہی ہوگا تم دیکھ لینا۔ شاید تم نے خبر کی آخری لائن نہیں پڑھی۔ رسم قل ملک منصور کی کوٹھی پر ہوگی کیونکہ وہ اس کا خاص قریبی ملازم تھا۔''

''اوہ نو! ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وہ چونک گئی۔

''ایسا ہی ہے، بس یہی سیاست ہے۔ میں ڈرائیور کو بھیج رہا ہوں۔'' حیدر نے فون رکھتے ہوئے کہا۔

اس کا باپ اتنا کریہہ انسان ہوسکتا ہے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اتنا شاطر، اس قدر مکار، نہ اس کے نزدیک انسان اہم تھے اور نہ ہی جذبے، نہ رشتے، نہ جانے یہ سب کچھ وہ کس کے لیے جمع کر رہا تھا۔ اتنی حرص، اتنا لالچ، اف خدایا! کاش ہم اس شخص کی اولاد نہ

ہوتے۔ یہ کتنی زندگیوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔شاید مما نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا اور اس شخص سے جان چھڑالی تھی۔اس نے کرب سے سوچا۔وہ بشریٰ آپا کی نقاب والی چادر پہن کر گئی۔سہیل کے گھر میں جیسے کہرام مچا تھا۔اس کی ماں ابھی تک بے سدھ چارپائی پر پڑی تھی۔بس بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ بہنوں نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ کون آ رہا تھا، کون جا رہا تھا۔ملک منصور اور شزا وہاں پہلے سے موجود تھے۔شزا میت کے قریب ہی خاموش بیٹھی تھی اور ملک منصور باہر ٹینٹ میں دریوں پر۔ یہ شخص اور کہیں اس طرح بیٹھے،شفق نے اندر داخل ہوتے ہوئے ایک ٹک باپ کو دیکھا۔اس کے اندر نفرت اور حقارت سے آتش فشاں پھٹنے کو تھا۔وہ خاموشی سے اندر چلی گئی اور ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ جنازے میں بس چند منٹ باقی تھے۔اسے سہیل کی باتیں، اس کا لہجہ اور آخری ملاقات سب کچھ یاد آ رہا تھا۔پھر لوگ میت اٹھانے آئے تو ملک منصور سب سے آگے تھا چارپائی کو کندھا دینے کے لیے۔انسان اتنا سفاک بھی ہوسکتا ہے۔اس کے ذہن میں بار بار یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ جیسے ہی جنازہ لے کر گئے وہ واپس آ گئی۔سفر لمبا ہوتا جا رہا تھا اور تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ زندگی کتنی مختصر ہے مگر کس قدر تکلیف دہ......اس کا زندگی اور انسانوں سے اعتبار اٹھتا جا رہا تھا۔

سحر ہر وقت اپنے کمرے میں قید رہتی اور سوئی رہتی۔ جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ آفاق نے مہ رخ سے شادی کر لی ہے وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔آفاق اس خبر کے بعد گھر نہیں آیا تھا۔اس نے ہر جگہ اسے ڈھونڈا تھا۔ایک مہینہ تو وہ مری میں رہا پھر سوئٹزر لینڈ چلا گیا اور اب نہ جانے کہاں تھا۔وہ اس کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔اس نے تنگ آ کر نشہ شروع کر دیا تھا۔صرف یہی ایک راہِ فرار نظر آئی۔ وہ اپنے آپ سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس گھر سے، اس کی فضا سے، اپنے ماضی سے اور اس حال سے، اس کا کوئی مستقبل نہیں تھا اس لیے اسے اس کی قطعی پروا نہیں تھی۔اس نے کلب جانا چھوڑ دیا تھا۔اپنے آپ کا کوئی ہوش نہ تھا بس ہر وقت آفاق اور مہ رخ، نشہ اور وہ۔اس گھر میں پہلے بھی وہ ایک ناکارہ وجود تھی جس کی حیثیت ایک کارنس پر رکھے گلدان جتنی بھی نہ تھی اور اب کسی کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔اس کے اکاؤنٹ میں پیسے موجود ہوتے۔آفاق اپنے اس فرض سے بے خبر نہیں تھا اور وہ پیسہ کیسے اڑاتی، کسی کو بھی اس سے سروکار نہ تھا......سوسائٹی کے یہی تو فیشن ہیں۔سب ترقی کی طرف گامزن تھے یا پھر تنزلی کی طرف۔اس کا کسی کو شعور نہیں تھا اور سوچنے

کے لیے فرصت تو بالکل ہی نہیں تھی۔ اس لغو اور بے معنی زندگی کا حاصل کیا ہے؟ وہ سوچتی اور پھر سگریٹ پھونکنے لگتی۔

⁂

شمائل کے اسکول سے رزلٹ کارڈ آیا تھا اور ساتھ پرنسپل کا لیٹر بھی کہ وہ پڑھائی میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہی۔ ہر مضمون میں اس کے نمبر صفر یا ایک دو تھے۔ دس نمبر سے زیادہ کسی مضمون میں نہیں تھے۔ پرنسپل نے والدین کو آنے کے لیے کہا تھا۔ شنزا رزلٹ کارڈ دیکھ کر شدید پریشان تھی۔ اس نے ملک منصور کو بتایا۔

''یہ شمائل کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔ اس لڑکی نے تو تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔'' ملک منصور جھنجلا کر بولا۔

''میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ وہ شدید ذہنی الجھنوں کا شکار ہے۔''

''آخر اس کو تکلیف کیا ہے، ہر نعمت تو اس کو میسر ہے۔ پیسے اس کے اکاؤنٹ میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ پھر کس چیز کی کمی ہے؟''

''محبت کی، پیار کی اور اعتماد کی۔ ملک صاحب! اب وہ ہم پر اعتماد نہیں کرتی۔ وہ مجھ سے اب اپنی کوئی بات شیئر نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ہر بات، ہر مسئلے میں بہت شدت پسند ہوتی جا رہی ہے۔ وہ جتنی شدت پسند ہو رہی ہے اتنی غصہ ور بھی ہوتی جا رہی ہے۔ کاش! آپ اسے اس دفعہ ملتے تو پھر آپ کو معلوم ہوتا۔ وہ تو ہماری شمائل ہی نہیں لگتی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔''

''ہو جائے اگر اسے کسی کا احساس نہیں۔'' وہ غصّے سے بولا۔

''ملک صاحب! آپ جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اتنی بڑی بات اور آپ نے کس قدر عام انداز میں کہہ دی۔ وہ ہماری بیٹی ہے، کوئی کھلونا تو نہیں جو ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ جائے۔ کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' شنزا کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز کپکپانے لگی۔

''اوکے ریلیکس! تم کل ہی چلی جاؤ۔ کل میری بہت اہم میٹنگ ہے ورنہ میں بھی چلتا۔ میں ڈرائیور کو کہتا ہوں تم صبح سویرے چلی جاؤ۔'' ملک منصور دھیمے لہجے میں بولا اور وہ خاموش ہو گئی۔

اگلے دن وہ صبح سویرے مری کے لیے روانہ ہو گئی۔ شام ہو گئی تھی اس لیے وہ اسکول نہ گئی۔ اگلے دن صبح صبح ہی وہ اسکول پہنچ گئی۔ شمائل کو بلایا۔ وہ آئی تو وہ اسے دیکھ کر

حیران رہ گئی۔ اس کا حلیہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہ پہلے سے بے حد کمزور لگ رہی تھی۔ گندے ناخن، اس کے منہ سے بھی بہت بدبو آ رہی تھی۔ گندے چپڑے ہوئے بالوں کی پونی، نہ جانے کب سے وہ نہیں نہائی تھی۔ وہ بے حد گندی لگ رہی تھی۔

''شمائل بیٹا! یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟'' شزا نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا......؟ نو......نو...... آئی ایم رائٹ...... ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ...... آئی ایم دی بیسٹ...... بیسٹ...... بیسٹ...... ایسٹ اینڈ ویسٹ...... ویسٹ از دی بیسٹ...... آئی ایم دی بیسٹ......'' وہ بے ربط انداز میں الفاظ دہراتی رہی۔ شزا تو دل تھام کر رہ گئی۔

''کیا ہوا؟ آپ رو کیوں رہی ہیں۔ رونے سے آنکھیں خراب ہوتی ہیں۔ آنکھیں خراب ہوں تو صحت خراب ہوتی ہے اور صحت خراب ہو تو انسان مر جاتا ہے۔ مر جائے تو اچھا ہوتا ہے مگر پھر بھی آپ کیوں رو رہی ہیں۔ روتے تو وہ ہیں جو بیمار ہیں اور جن کو چوٹ لگی ہو۔ آپ کو کہاں چوٹ لگی ہے۔ یو نو آئی ایم دی بیسٹ۔''

''خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

''ڈانٹتی کیوں ہیں، جائیں یہاں سے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔ شزا ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جا چکی تھی اور وہ نہ جانے کتنی دیر روتی رہی۔ پھر وہ پرنسپل سے ملنے چلی گئی۔

''آیئے مسز منصور! ہمیں آپ کا شدت سے انتظار تھا۔ شمائل کی حالت......''

''ہاں میں دیکھ چکی ہوں۔ یہ کب سے ایسی ہے؟''

''جب آپ اسے چھوڑ کر گئی تھیں تو پورا ہفتہ اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ مسز منصور! وہاں کیا ہوا تھا کہ بچی نے اس قدر گہرا صدمہ لیا ہے۔ وہ بہت ڈپریسڈ ہے۔ کبھی آپ اس کا کمرا جا کر دیکھیں۔ مائی گاڈ! اس قدر گندا ہے اور پھر کسی کو اندر بھی گھسنے نہیں دیتی۔ خود اپنی صفائی کا خیال نہیں رکھتی۔ ہر وقت عجیب وغریب باتیں کرتی رہتی ہے۔ آئی ایم دی بیسٹ...... ایسٹ اینڈ ویسٹ...... یہ جملہ دہراتے دہراتے وہ تھکتی بھی نہیں۔ کلاس میں وہ اپنی مرضی سے جاتی ہے اور جب جاتی ہے تو لڑ جھگڑ کر آ جاتی ہے۔ مسز منصور! بہتر یہی ہے کہ آپ اسے گھر لے جائیں، اس کا علاج کروائیں۔ ٹھیک ہوتی ہے تو پھر چھوڑ جایئے ورنہ......''

''نہیں، پلیز ایسی بات نہ کریں۔ میری زندگی تو صرف ان دو بچوں کے دم سے ہے۔''

''ٹھیک ہے مگر اس کی وجہ سے اسکول میں بہت ڈسٹربنس ہے۔ پلیز سمجھنے کی

کوشش کریں۔"

"اور سمیر کیسا ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے، آپ اس سے مل سکتی ہیں۔"

"اچھا آپ شمائل کو بھجوا دیں اور اس کا سامان بھی، میں سمیر سے مل لوں۔"

"ٹھیک ہے آپ ویٹ کریں۔"

وہ سمیر سے ملنے گئی۔ وہ خوش باش ملا۔ اسے دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ اس کے لیے کچھ چیزیں لائی تھی۔ اسے دیں، وہ خوشی خوشی چلا گیا۔

وہ کافی دیر منتظر رہی مگر شمائل نہیں آ رہی تھی۔ وہ دوبارہ پرنسپل کے پاس گئی اور اس کے بارے میں پوچھا۔ پرنسپل نے آیا کو بلایا اور اس کے بارے میں پوچھا۔

"اس نے کمرا اندر سے بند کرلیا ہے اور دروازہ نہیں کھول رہی۔" آیا نے بتایا۔

"مائی گاڈ......!" شزا گھبرا کر بولی۔

"آپ گھبرائیں نہیں، کچھ نہیں ہوتا۔" پرنسپل خود گئیں۔ شزا بھی ساتھ تھی۔ پرنسپل نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہت آوازیں دیں مگر وہ تو جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ دروازے کی ایک سائیڈ پر روشن دان تھا۔ پرنسپل نے آیا کو اُدھر سے جھانکنے کو کہا۔ آیا اوپر چڑھی تو مسکراتی ہوئی نیچے آ گئی۔

"جی وہ تو سو رہی ہے۔" آیا نے بتایا۔ شزا نے سکون کا سانس لیا۔

"اب وہ تب ہی دروازہ کھولے گی جب وہ اٹھے گی اس لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔" پرنسپل نے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں ریسٹ ہاؤس جاتی ہوں۔ جب وہ اٹھے تو مجھے فون کر دیجیے گا۔"

شزا کہہ کر بوجھل قدم اٹھاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ وہ شدید ذہنی اذیت میں تھی۔ اس نے جیسی تیسی زندگی گزاری تھی۔ اسے اس کا اتنا قلق نہ تھا۔ ملک منصور نے اگر اسے محبت دی تھی تو اذیت بھی دی تھی۔ خوشیاں نہیں دی تھیں مگر ہر نعمت فراوانی سے دی تھی اس لیے اس نے کبھی اپنے آپ کو اتنا پست، کمزور اور شکستہ محسوس نہیں کیا تھا جتنا وہ اب کر رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رفتہ رفتہ اس کے ہاتھوں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ شمائل سے اسے بہت محبت تھی۔ وہ تخیل میں خود اسے بیاہنے کے خواب دیکھتی۔ ساری رسمیں پوری کرتی۔ اس کے چاؤ اور نخرے اٹھاتی۔ اس نے خود کس طرح ملک منصور سے شادی کی تھی اور اس سے پہلے اس کے کتنے افیئر

تھے، کتنے اسکینڈل تھے پھر بھی ملک منصور نے اسے قبول کیا تھا۔ وہ اپنا ماضی بھولنے کی کوشش کرتی مگر ماضی سے فرار ممکن نہیں۔ حال ماضی کی طرف دیکھتا ہے اور مستقبل حال سے سوال کرتا ہے اور ہر زمانہ مشکوک وجود کو مٹانے کے درپے ہوتا ہے۔ یہی وقت کا فلسفہ ہے یا پھر المیہ۔ اس نے آہ بھر کر سوچا۔

اگلے دن صبح وہ اسے لے کر لاہور کے لیے روانہ ہوئی۔ سارا راستہ نہ جانے وہ کیا بڑبڑاتی رہی۔ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی، خود سے باتیں کرتی رہی۔ کبھی کبھی اونچی آواز میں آئی ایم دی بیسٹ کا نعرہ لگاتی۔

''ممی! آوازیں سن رہی ہیں؟'' اس نے یک دم ماں سے کہا۔

''کہاں......کیسی آوازیں......؟''

''اسکول کی بیل بج رہی ہے۔ یہ سنیں......ابھی......'' وہ بغور سنتے ہوئے بولی۔ شزا نے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔

''مم! آپ کو پتا ہے میرے پاس فیریز آتی ہیں اور کبھی کبھی گاڈ بھی، ایک گھوسٹ بھی۔ میں آپ سے ملواؤں گی۔''

''پلیز چپ کر جاؤ اور تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔''

''نہیں، مجھے سونا پسند نہیں۔ جو سوتے ہیں وہ مر جاتے ہیں اور میں ابھی سونا نہیں چاہتی۔ آئی ایم دی بیسٹ...... لا...... لا...... لا......'' وہ گانے کی ٹون میں بولی اور ہاتھوں سے......اشارے کرنے لگی۔ شزا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ پہلی نظر میں کسی شہزادی کا گمان ہوتا۔ خوبصورت سفید رنگ، بیضوی چہرہ، نیلی سرمئی آنکھیں، اوپر کو مڑی ہوئی گھنی پلکیں، چھوٹی سی ناک اور خوبصورت تراشیدہ ہونٹ، دبلی پتلی، لمبی سی، خوبصورت جواں سال لڑکی کہاں کھڑی تھی۔ شاید زندگی کے کسی خطرناک موڑ پر۔ آگے کھائی تھی یا کھڈ وہ نہیں جانتی تھی۔ شزا...... سارا راستہ آنسو پیتی رہی اور اسے دیکھتی رہی۔ کبھی وہ نارمل ہو جاتی۔ نارمل انداز میں...... تیزی سے باتیں کرتی، پھر رک جاتی، پھر شروع ہو جاتی۔

وہ گھر پہنچی تو ملک منصور بیڈ روم میں گاؤن میں ملبوس کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی کی آواز سنتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ شمائل کو دیکھ کر چونکا پھر اپنے آپ کو نارمل کیا۔

''شمائل! مائی کیوٹ چائلڈ! ہاؤ آر یو ڈارلنگ؟'' وہ اسے پیار سے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

''فائن......آئی ایم دی بیسٹ......ایسٹ اینڈ ویسٹ......'' ملک منصور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، ماڈرن سوسائٹی کے فیشنز۔'' شزا روتے ہوئے بولی اور ملک منصور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کب سے؟''

''پچھلے کئی ماہ سے۔'' وہ ہونٹ چبانے لگا اور پھر فون ملایا۔ ''ڈاکٹر سے ٹائم لیا۔''

''کبھی کبھی نادانستہ کہی ہوئی بات قدرت کیسے قبول کرتی ہے۔ کاش آپ کبھی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے۔'' شزا کے ذہن میں ملک منصور کے کہے ہوئے جملے گونجنے لگے اور وہ بیٹھی روتی رہی۔ شمائل کو اس نے اس کے کمرے میں چھوڑا۔ اسے بستر پر لٹایا اور خود باہر آ گئی۔

''ڈاکٹر سے اس کا سیشن ہے۔ کل صبح دس بجے۔'' ملک منصور نے فون رکھتے ہوئے کہا۔ شزا خاموش رہی۔

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' ملک منصور مضبوط لہجے میں بولا۔

''نہیں، مجھے اب ایسا نہیں لگتا۔ وہ شاید......اب......'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''کم آن شزا! وہ اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔

''میں اور وہ اتنے مضبوط اعصاب کے مالک نہیں جتنے آپ ہیں۔''

''ڈارلنگ! تو ہونا چاہیے۔ زندگی میں مضبوط ہونا پڑتا ہے۔''

''بولڈ، مضبوط، چالاک اور...... اور......'' شزا نے آنکھیں حیرت سے پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''اور فریبی......!'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ہاں مگر ہر ایک کے لیے یہ ممکن نہیں۔'' وہ اپنا آپ اس سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

''اوکے ڈارلنگ! جسٹ ریلیکس! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ ایک پارٹی ڈنر ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ اپنا قیمتی ڈریس پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا پرفیوم لگا رہا تھا۔ نیوی بلیو پینٹ کوٹ میں گرے بالوں کے ساتھ وہ کس قدر وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس عمر میں بھی اس قدر ڈیشنگ اور ہینڈسم مگر اس کا اندر کتنا مختلف تھا۔

وہ ایک بے حس انسان تھا۔ شزا سوچ رہی تھی اس کی بیٹی کی حالت اتنی خراب تھی اور وہ ایک پارٹی ڈنر اٹینڈ کرنے جا رہا تھا اور ایسے ڈنرز میں کیا کچھ ہوتا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

''منصور! آفاق نے مہ رخ سے شادی کر لی ہے۔'' وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا...... کب؟''

''کیا واقعی آپ کو علم نہیں یا پھر......''

''وہ نظر آئے تو پتا چلے نا اور میں تو ابھی اپنی پوزیشن کے بارے میں ہی بہت الجھا ہوا ہوں۔ ایسے الجھے معاملات آسانی سے تو نہیں سلجھتے نا اور مہ رخ کیسی بے وقوف ہے۔ اس الو کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ چلو دونوں بے وقوف مل گئے ہیں۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''مگر وہ تو آپ کی سیکرٹری تھی۔''

''تھی، اب تو نہیں نا۔''

''اور اب......'' ملک منصور نے معنی خیز مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔

ملک منصور! تمہاری زندگی کا حاصل کیا ہے۔ تم کتنے گندے اور گھناؤنے کام کرتے ہو۔ کیا تم واقعی انسان ہو۔ اگر ہو تو کیسے؟ تم تو انسان کے روپ میں وحشی درندے سے بھی بڑھ کر ہو۔ وہ بیٹھی سوچتی رہی۔ کبھی شمائل کے بارے میں اور کبھی ملک منصور کے بارے میں۔ نہ جانے وہ کس مٹی سے بنا تھا۔

......✡......

آصف، حیدر کے سامنے بیٹھا تھا پریشان سا، مضمحل سا۔

''اب کیا چاہتے ہو؟'' حیدر نے اس سے پوچھا۔

''میں جلد از جلد یہ ملک چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں ورنہ ملک منصور اور اس کے آدمی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''اس کے علاوہ اور کوئی آپشن؟''

''نہیں، اب اس ملک میں میرا کوئی مستقبل نہیں۔ ہر کوئی دونوں ہاتھوں سے ایک دوسرے کو نوچ رہا ہے۔ مجھ جیسے ایماندار شخص کا اب یہاں بالکل گزارہ نہیں۔ سر! آپ ہی بتائیے کیا ہم جیسے لوگ یہاں رہ سکتے ہیں جہاں عدالتیں، انصاف، پولیس، تھانے، کچہریاں،

اخبارات ہر ہر جگہ پر ان لوگوں کا قبضہ ہے۔ یہاں ایسی کوئی عدالت نہیں جہاں مجھ جیسے لوگ اپنا مقدمہ لے کر جائیں۔ کوئی پولیس تھانہ نہیں جہاں ان کے خلاف ایف آئی آر کٹائی جائے۔ سہیل مارا گیا اور اسے اس شخص نے جیل میں مارا۔ کیا ہوا وہ اس کی تدفین میں گیا، اس کے قل کرائے، اخبارات میں خبر شائع ہوئی اور بس! مرنے والا وفاداری میں مارا گیا اور منوں مٹی تلے دب گیا۔ جس نے گناہ کیا وہ دندناتا پھر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ اور گریبان تو صاف ہیں، گناہگار تو ہم لوگ ہیں۔ میں زندگی بچانے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ شکر ہے آپ مل گئے ورنہ......"

"سہیل کو تمہاری بہت فکر تھی۔ اس نے ہی تمہاری مدد کو کہا۔ ٹھیک ہے میں تمہارے جانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ تم جلد چلے جاؤ گے۔"

"تھینک یو سر! اب میں کہاں جاؤں؟"

"تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ کچھ دن رہ لو پھر شاید موقع نہ ملے۔ میں جلد از جلد تمہارے کاغذات مکمل کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے لیکن وہاں...... خیر چھوڑیئے۔"

......✡......

"تمہیں ڈرائیور چھوڑ آتا ہے۔"

"اور اگر ملک منصور کو بھنک پڑ گئی تو؟"

"میں گاؤں کے زمیندار کو فون کر دوں گا۔ وہ تمہارا خاص خیال رکھے گا۔ گھبرانے کی بات نہیں اور ویسے بھی ملک منصور کو یہی معلوم ہے کہ تم جھنگ میں ہو۔ ہم بھی یہی ظاہر کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔

ولیم نے نور کو فون کر کے بلایا تھا۔ مما کا کیموتھراپی کا دوسرا کورس ہونا تھا اور وہ حیدر انکل کے ساتھ ہاسپٹل جا رہا تھا۔ نور نے بھی وہیں آنے کو کہا۔ ولیم اور حیدر باہر بیٹھے تھے جب نور پہنچی۔

"ہیلو انکل!"

"ہیلو بیٹا!" اس نے اس کے سر پر پیار کیا۔ تینوں خاموش ہو گئے اور پھر حیدر تھوڑی دیر کے بعد چلا گیا۔

''ولیم بیٹا! مجھے ضروری کام ہے اس لیے جا رہا ہوں۔ جب فارغ ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا۔'' حیدر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اس کے جانے کے بعد دونوں خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں کے ذہنوں میں اَن گنت سوال تھے مگر کوئی بھی پوچھنے میں پہل نہیں کر رہا تھا۔

''تمھارے ایگزامز کب ہو رہے ہیں؟'' بالآخر نور نے سکوت توڑا۔

''جون میں۔''

''تیاری کیسی ہے؟''

''بس ٹھیک ہے...... کوئی خاص نہیں...... ان حالات میں تیاری کرنے کے لیے وقت ہی کہاں ملتا ہے؟''

''ولیم...... تمہارا گھر کیسا ہے؟''

''بہت اچھا ہے۔''

''حیدر انکل کی فیملی بھی ادھر ہی رہتی ہے؟''

''نہیں، انکل ڈیفنس میں رہتے ہیں۔ یہ انھوں نے ہمارے لیے...... آئی مین، مما کے لیے خریدا ہے۔'' ولیم کے لہجے میں بدگمانی سی تھی۔

''اچھا......'' نور نے حیرت سے کہا اور پھر خاموش ہوگئی۔

مما فارغ ہو چکی تھیں مگر ان کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ انھیں بار بار ابکائیاں آ رہی تھیں۔ بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ رنگت ایک دم جلی جلی محسوس ہونے لگی۔ رپورٹس یہی بتا رہی تھیں کہ وہ اب کافی ریکور کر رہی ہیں مگر موجودہ حالات سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ شاید یہ ان کا آخری لمحہ ہے۔

حیدر خود ہی انھیں لینے آ گئے۔ نور بھی ان کے ساتھ گھر چلی آئی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی شہلا نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ولیم کی طرف۔ ان کی حالت دیکھ کر نور ادھر ہی رک گئی۔ حیدر بھی کمرے میں ہی تھے۔ شہلا کی حالت دیکھ کر ان کے چہرے پر کرب کے آثار بہت نمایاں تھے۔ وہ بہت خاموش نگاہوں سے شہلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نور نے اس کی طرف دیکھا پھر کسی بات کو محسوس کر کے خاموش رہی۔

''انکل...... میں آپ کے لیے چائے لاؤں......'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... وہ خانساماں کچن میں ہی ہے۔ اس کو کہہ دو...... وہ لے آتا ہے۔'' حیدر

نے آہستہ سے کہا اور وہ باہر نکل گئی۔

''حیدر...... حیدر...... حیدر......'' شہلا آنکھیں بند کیے آہستہ سے اسے پکارتی رہی۔

''ہاں...... کہو، کیا بات ہے؟'' وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے اوپر قدرے جھکتے ہوئے بولے۔ ولیم صوفے پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

''حیدر...... کیا...... خدا مجھے معاف کر دے گا...... میں نے بہت گناہ کیے ہیں...... دعا کرو، وہ مجھے معاف کر دے۔'' نہ جانے وہ کیوں ایسا مسلسل بول رہی تھی۔ شاید وہ شدید تکلیف میں تھی، اسی وجہ سے یا پھر موت سامنے نظر آ رہی تھی؟

''ہاں، شہلا...... خدا کیوں معاف نہیں کرے گا...... وہ رحمٰن جو ہے۔'' حیدر کے منہ سے شہلا سن کر ولیم ایک دم چونکا۔ وہ تو ساری زندگی مسز پیٹر ہی سنتا آ رہا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی تو وہ مری چلا گیا تھا اور مما کے بارے میں وہ کبھی مشکوک نہیں ہوا تھا اس لیے کیا جاننے کی کوشش کرتا۔

''کیوں نہیں کرے گا......تم کیوں ایسا سوچ رہی ہو؟''

''میں اس قابل جو نہیں......'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''ایسا مت سوچو...... میں تمھارے لیے دعا کروں گا......تم سونے کی کوشش کرو۔''

''ولیم کہاں ہے؟''

''یہاں ہے...... بیٹا ادھر آؤ......'' حیدر نے ولیم کو کہا۔ ولیم اٹھ کر مما کے پاس گیا اور اس کے اکڑے ہوئے سخت ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''مما! آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں نے گاڈ سے دعا کی ہے۔''

''ولیم......تم......تم کرسچن نہیں ہو، خدا کے لیے چھوڑ دو یہ سب، سنا تم نے......؟''

وہ ایک دم خود ہی پھٹ پڑی۔ حیدر اور ولیم چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ حیدر کو خود بھی قطعی توقع نہیں تھی کہ وہ یوں اچانک خود ہی سب کچھ بول دے گی اور ولیم کو جو شک تھا اب سب کچھ سامنے آنے والا تھا۔

''نہیں، مما...... آپ سینسز میں نہیں ہیں۔'' ولیم نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں سینسز میں ہوں...... اور...... شاید یہ میرا آخری لمحہ ہے۔ نہ تم کرسچن ہو اور نہ میں۔ میں تو مسلم...... ہوں اور تم...... میں نے تو تمھیں کچھ بھی نہیں دیا۔ تم تو خود ہی کچھ بن گئے...... اور میں دیکھتی رہ گئی۔ نہ جانے میں ہر دفعہ دیکھتی ہی کیوں رہ جاتی ہوں......؟'' وہ

آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور آنسو بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ نور بھی آ کر ان کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے بھی ساری بات سن لی تھی۔ ولیم کو شدید دھچکا لگا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، زندگی داؤ پر لگی تھی اور اسے علم ہی نہ تھا۔ مما کے اس انکشاف پر اسے مما پر غصہ آنے لگا وہ غصے میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''شہلا...... یہ تم نے کیا، کیا......؟'' حیدر نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

''حیدر......! اگر میں یہ نہ کہتی تو میرا خدا شاید مجھے کبھی معاف نہ کرتا۔ میں مرنے سے پہلے ایک دفعہ اسے ضرور بتانا چاہتی تھی۔''

''مگر اتنی بڑی بات اور اتنی اچانک......'' حیدر حیرانی سے بولے۔

''اگر اچانک موت آ جائے تو...... پھر بھی اسے فیس تو کرنا ہی تھا۔''

''اچھا تم آرام کرو......اور ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈالو۔''

''ہاں......اب میں ٹھیک ہوں...... یہ بات خنجر کی طرح میرے سینے میں پیوست تھی اور میں اس خنجر کو نکالنا چاہتی تھی۔ اب میں ٹھیک ہوں۔'' نور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ وہ مزید الجھ گئی تھی۔ ولیم سر جھکائے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں غم و غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا ہوا...... اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟'' نور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

''کیا یہ کوئی چھوٹی بات ہے......مما نے یہ سب کیا، کیا......اتنا بڑا ظلم......اور اب جبکہ میں سیڑھی پر قدم رکھنے والا ہوں، انھوں نے میرے قدموں سے زمین کھینچنے کی کوشش کی ہے...... اٹس اے گریٹ ٹریجڈی...... مما بہت......'' وہ ہونٹ چبانے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''ولیم بیٹا! یہ سب نادانستہ ہے۔ شہلا نے مجھے سب باتیں بتائی تھیں۔ تمہاری ماں ہمارے معاشرے کا ایسا کیریکٹر ہے جو ساری زندگی صحیح وقت اور موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور ایسے لوگ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کبھی انھیں لفظ نہیں ملتے تو کبھی موقع مناسب نہیں لگتا۔ کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو مصلحتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسی کشمکش میں غلط فیصلے کر لیتے ہیں۔ بنا سوچے سمجھے کہ ان کے فیصلوں سے دوسروں کا کیا کیا کچھ داؤ پر لگ جاتا ہے۔ کتنا بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں قسمت یا قدرت بھی کیوں ایسے لوگوں کا ساتھ نہیں دیتی۔ نہ جانے ان

کے اٹھتے قدم الٹے ہی کیوں پڑتے ہیں؟'' حیدر کے لہجے میں بلا کی شکستگی تھی وہ ولیم کا کندھا تھپتھپا کر بولے۔

''انکل!......تو میں کہاں ہوں...... میں کون ہوں......اور کہاں کھڑا ہوں؟'' وہ بھی غصے سے پھٹ پڑا۔

''تم اس وقت ایسی جگہ پر کھڑے ہو جہاں ایک طرف اونچی چوٹی ہے اور دوسری طرف گہری کھائی ہے۔اب فیصلہ تم نے ہی کرنا ہے۔'' حیدر نے پیار سے اسے سمجھایا۔

''انکل...... ہر دفعہ مجھے ہی کیوں فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔قدرت کیوں مجھے اس طرح آزما رہی ہے......اور ہر فیصلے میں مجھے کس قدر ذہنی الجھنوں سے گزرنا پڑتا ہے۔کاش! آپ اندازہ کر سکیں لیکن اب میں جو ہوں...... وہی رہوں گا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔حیدر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔نور کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی۔

''نہ جانے......مما ماضی میں کیا کیا کرتی رہی ہیں اور اب......'' ولیم ایک دم تلخ ہو کر بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' حیدر ایک دم دہاڑے۔

''نہ آپ میری سمجھ میں آ رہے ہیں اور نہ مما...... آپ دونوں میں کیا تعلق ہے اور پھر میں کون ہوں......میرا باپ کون تھا......؟''

''ولیم......! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' نور نے حیرت سے کہا۔

''نور مما نے مجھے دھوکا دیا ہے......اور اب پھر......''

''خاموش ہو جاؤ...... اور ان حالات میں آنکھیں بند کر کے سو جاؤ۔'' حیدر اسے قدرے ڈانٹتے ہوئے بولے۔

''کاش...... یہ آنکھیں ہمیشہ بند رہتیں......مگر...... میں نہیں جانتا مما نے ایسا کیوں کیا۔میں ان سے نفرت کرنے لگا ہوں۔''

''وہاٹ نان سینس ......تم لوگ والدین کے بارے میں ایک دم رائے کیوں بدل لیتے ہو؟'' حیدر نے پھر غصے سے کہا۔

''جب ان کا پاسٹ اس طرح کا ہوگا تو ایسا ری ایکشن بھی نیچرل ہے۔''

''وہ تمہاری ماما ہیں......'' نور بھی ڈانٹتے ہوئے بولی۔

''نور......!تم بھی مجھے ہی الزام دے رہی ہو؟''

''نہیں...... اپنے آپ کو نارمل رکھو...... اور پھر بات کرو۔ تم غصے میں سب کچھ بھول رہے ہو۔'' نور نے لہجہ دھیما کرتے ہوئے کہا۔

''والدین تو اولاد کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں اور مما نے مجھے داؤ پر لگایا...... ہر دفعہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم غلط سوچ رہے ہو...... تمہاری ماں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر تمھیں جنم دیا۔ تمہاری خاطر اس نے کیا کیا دکھ سہے ہیں۔ کس طرح کی زندگی گزاری ہے...... کاش کبھی تمھیں اس کا اندازہ ہو سکے۔'' حیدر نے کہا۔

''کاش وہ مجھے جنم دینے کے بجائے، پہلے ہی ختم کر دیتیں تو ان کا مجھ پر کتنا بڑا احسان ہوتا......''

''ولیم...... بیٹا! یہ آپ کے لیے ایک آزمائش ہے۔ اس کا بہادری سے مقابلہ کرو۔ پُرسکون ہو کر سوچو...... اور ابھی ذہن پر اتنا بوجھ مت ڈالو۔ میں ابھی چلتا ہوں...... اور مما کا خیال رکھنا۔'' وہ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

نور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور صورتِ حال کا جائزہ لیتی رہی۔ ولیم صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جیسے شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہو۔

''آخر تمھیں کیا بات اتنی پریشان کر رہی ہے......؟'' نور نے پوچھا۔

''اتنی بڑی بات کہ مما اس کمیونٹی سے تعلق رکھتی ہیں جس کے لیے میرے دل میں قطعی اچھے جذبات نہیں اور یہ کہ میرا کسی بھی کمیونٹی سے کوئی تعلق نہیں، نہ میرا تعلق ایسٹ سے ہے نہ ویسٹ سے۔ کتنا بڑا اور سنگین مذاق ہے...... یہ سب میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟''

''تمھارے دل میں ہمارے خلاف نفرت کیوں ہے......؟'' نور نے چونک کر پوچھا۔

''میں نہیں جانتا...... فادر سنیں گے تو کیا کہیں گے...... اور مما...... مما ساری زندگی میرے سامنے جھوٹ بولتی رہیں۔ مسز پیٹر کے نام سے سب کو دھوکا دیتی رہیں۔ نہ جانے انھوں نے مجھ سے اور کیا کچھ چھپایا ہے۔ میں ان پر کیسے اعتماد کر سکتا ہوں......؟'' وہ تلخی سے بولا۔

''ولیم! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی بے قابو ہو جاؤ گے۔ میں تو ہر لمحہ تمہاری اس عادت کو بدلنے کی کوشش کرتی رہی مگر لگتا ہے میں بری طرح ناکام ہوئی ہوں۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ...... اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتی......؟''

''میں صرف خاموش ہو جاتی...... سوچتی اور پھر وقت کو فیصلہ کرنے دیتی۔''

''تو کیا تم کوئی احتجاج نہ کرتیں......؟''

''ضرور کرتی...... مگر اس طرح نہیں، تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کبھی کبھی حالات ہم سے انوکھے فیصلے کرواتے ہیں اور اس وقت ہم کتنے بے بس اور مجبور ہوتے ہیں۔ فیصلہ کچھ کرنا ہوتا ہے اور کرتے کچھ اور ہیں۔ تم ہی بتاؤ کیا ایسا نہیں ہوتا......؟'' تب ولیم خاموش رہا۔

مما ساری رات شدید کرب میں بستر پر تڑپتی رہی تھیں۔ وہ ہر کروٹ پر کراہ رہی تھیں۔ بار بار انھیں ابکائیاں بھی آ رہی تھیں۔ ہر دفعہ کیموتھراپی کے بعد انھیں شدید تکلیف کا سامنا ہوتا تھا۔ ولیم سامنے بیٹھا تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نور جا چکی تھی اور وہ مسلسل ماں کے چہرے پر نظریں جمائے گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔ ماں کے کراہنے کی آواز بھی اسے ان کی طرف متوجہ نہیں کر رہی تھی۔

''ولیم...... ولیم......!'' وہ آہستہ آہستہ بلا رہی تھیں مگر وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔

''میں کہاں کھڑا ہوں...... میرے آگے پیچھے کیا ہے...... اور مجھے کہاں جانا ہے......؟'' یہ سوالات اسے بار بار تنگ کر رہے تھے اور وہ ان کے جوابات ڈھونڈنے میں لگا تھا۔

''ولیم...... ولیم......'' انھوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گلاس ہاتھ نہ آیا اور نیچے گر گیا۔ ولیم نے چونک کر مما کی طرف دیکھا۔

''آپ کو پانی چاہیے تھا...... تو مجھ سے کہتیں......'' اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

''کب سے تو بلا رہی تھی مگر تم......''

''اچھا...... میں لاتا ہوں......'' وہ کچن سے گلاس لینے چلا گیا انھیں سہارا دے کر اٹھایا اور گلاس لبوں سے لگایا۔ مما کا وجود بخار سے تپ رہا تھا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا پنجر ہو گئی تھیں۔ نہ جانے کیسی میڈیسنز اور کیسا علاج تھا جو ہڈیوں سے لگے گوشت کو بھی جلانے کے درپے تھا۔

مما پانی پی کر لیٹ گئیں۔ ولیم کا دل ایک لمحے کو مما کی اس حالت پر کڑھنے لگا۔ اس نے انھیں لٹا دیا اور پھر ایزی چیئر پر آ کر بیٹھ گیا۔

''اوہ گاڈ...... یہ میری کیسی آزمائش ہے...... میں کیوں ایسی اذیت سہہ رہا ہوں...... آخر کس لیے...... میرے ہم عمر لڑکے لڑکیاں کیسے ہر پریشانی اور غم سے آزاد ہیں اور میں اس قدر...... بے بس...... اور اتنی سخت آزمائش میں...... آخر میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں

ہوتا ہے......؟'' وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ جب حیدر کا فون آ گیا۔ اس گھر میں آنے کے بعد اس نے ولیم کو ایک علیحدہ موبائل لے کر دیا تھا۔

''ولیم بیٹا......مما کیسی ہیں؟'' حیدر نے پوچھا۔

''بہت تکلیف میں ہیں۔''

''اور تم کہاں ہو؟''

''ان کے پاس......ان کے کمرے میں......''

''اچھا...... یہ...... یہ میڈیسن میں ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا رہا ہوں۔ اس وقت جلدی میں یاد نہیں رہا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، تکلیف زیادہ ہو تو یہ کھلا دینا......''

''ٹھیک ہے انکل......!''

''اور تم ٹھیک ہو ناں......؟''

''جی......''

''او کے بائے......'' حیدر نے فون بند کر دیا۔

''یہ شخص بھی ایک معما ہے۔ نہ جانے فرشتہ ہے یا پھر......؟ لیکن مما کے خاندان سے صرف یہی ایک کیوں مما کی فیور کر رہا ہے؟'' ایک اور سوال اسے پریشان کرنے لگا۔ مما نے آج تک اسے کسی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ نہ اس کے اپنے باپ کے بارے میں اور نہ ہی حیدر انکل کے بارے میں۔ ڈرائیور گیٹ پر دوائیوں کا لفافہ دے کر جا چکا تھا۔ اس نے ان کی ہدایت کے مطابق مما کو دوائیں کھلا دی تھیں اور پھر آہستہ آہستہ ان کی تکلیف کم ہونے لگی......اور وہ نیند کی آغوش میں چلی گئیں۔

......✡......

ڈنر پارٹی ہالیڈے ان کے بینکوٹ ہال میں تھی۔ خوب انتظامات تھے۔ شہر کی کریم جمع تھی۔ تمام سیاستدان اپنی بیویوں کے ہمراہ آ رہے تھے۔ ملک منصور نے اس پارٹی کا خصوصی طور پر اہتمام کیا تھا۔ فرار کے بعد آف دی اسکرین ہونے کے بعد جو طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں ایسے میں اس طرح کی پارٹی کا منعقد کرنا بہت ضروری تھا۔ ہر طبقۂ فکر سے لوگ جمع تھے۔ سیاستدان، صحافی، بیوروکریٹس، ٹیکنو کریٹس، ماڈلز اور ادیب و دانشور بھی۔ اتنی گرینڈ پارٹی تھی اور ملک منصور نے شزا کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ اس دفعہ ملک منصور تو جیسے ہر ایک کو چونکا دینے پر مصر تھا۔ اس کے پہلو میں ایک ایرانی نژاد خوبصورت

جواں سال صحافی آئیکت تھی۔

آئیکت کا حسن و جمال دیکھ کر ہر کوئی ملک منصور کو حسد و رشک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ آئیکت کو پاکستان آئے ہوئے ابھی صرف چند روز ہی ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ بی بی سی کے نمائندہ کی حیثیت سے ایران اور مصر میں کام کرتی رہی تھی۔ اب وہ پاکستان چند روز کے لیے آئی تھی۔ علاقہ غیر میں اس علاقے کی غیر جانبداری اور ان کی رسوم و رواج کے بارے میں رپورٹ لینے وہاں گئی تو وہاں اس کی ملاقات ملک منصور سے ہوئی چونکہ وہاں پر اس کو زبان کا مسئلہ تھا اس لیے ملک منصور اس کا ایک مضبوط مددگار ثابت ہوا اور تب سے آئیکت کے ساتھ اس کے تعلقات بڑھنے لگے۔ وہ بے حد ذہین اور موقع شناس تھی۔ آج شزا کے بجائے آئیکت کو دیکھ کر کئی ایک نے تو ملک منصور پر جملے بھی کسے جنھیں آئیکت تو نہ سمجھ سکی مگر ملک منصور خوب انجوائے کرتا رہا اور دراصل اس پارٹی سے وہ دو فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو آئیکت کا انٹروڈکشن اور اس کی ایکسپٹنس اور دوسرے پارٹی کے لوگوں کے درمیان تھوڑی بہت رنجشوں کو دور کرنا۔

مسز زبیر بھی خصوصی طور پر مدعو تھیں اپنے بیوروکریٹ ہسبینڈ کے ساتھ اور ملک منصور، مسز زبیر کے کلب میں ہولڈ اور اس کی زبان کی گل افشانیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کسی کے بارے میں اچھے کمنٹس لینے کے لیے مسز زبیر کو پہلے مدعو کرنا اور خصوصی پروٹوکول دینا گویا اپنے لیے خصوصی راہ ہموار کرنے کے برابر تھا۔ اگر مسز زبیر کسی کی فیور میں جاتی تو بال اس کے کورٹ میں ہوتی اور پھر باقی گیم جیتنا مشکل نہ ہوتا۔

''آیئے مسز زبیر! یو آر لکنگ سوینگ، اسمارٹ اینڈ سوئٹ!'' ملک منصور اس کی سج دھج دیکھ کر کچھ چاپلوسی اسٹائل میں خصوصی طور پر خوشدلی سے بولا۔ ملک منصور کے ان کمنٹس پر زبیر صاحب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

''تھینک یو ملک صاحب! آپ کی ایسی پذیرائی ہی تو ہمیں آپ کی محفلوں کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ حسن اور حسن کی پذیرائی کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ حسن کو چاند سمجھنا ہر کسی کے بس میں کہاں۔ اس وقت آپ بھی تو یوسف ثانی لگ رہے ہیں اور پہلو میں چمکتا چاند، کیا کہنا۔'' مسز زبیر قہقہہ لگا کر بولی تو ملک منصور کا دلآویز قہقہہ فضا میں گونجنے لگا۔ زبیر صاحب کا تو گویا بیگم صاحبہ کی گفتگو میں مخل ہونا ان کے عتاب کو خواہ مخواہ دعوت دینے کے مترادف تھا اس لیے وہ انھیں وہیں چھوڑ کر اپنے کسی ہمدم سے محوِ گفتگو ہو گئے۔

''یہ چاند کہاں سے چرایا؟'' مسز زبیر نے آئیکت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''قدرت ہمیں خود ہی نوازتی ہے۔ ہمارا تو اس میں کوئی قصور نہیں اور ویسے بھی یہ اسم باسمیٰ ہیں یعنی مبارک چاند...... جیسا نام ویسا حسن اور آپ نے بھی حسن کو صحیح جانچا ہے۔'' ملک منصور اِک ادا سے بولا۔

''ماشاء اللہ! کیا قسمت پائی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار۔ شزا بھی کم قیامت تو نہیں۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

''ہاں مگر وہ چاند گہنا گیا ہے اور خزاں رسیدہ چیزیں ملک منصور کا دل نہیں لبھا سکتیں اس لیے قدرت خود بخود ہی شکر خورے کو شکر دے دیتی ہے۔'' ملک منصور نے پھر قہقہہ لگایا۔

''آپ پر تو مجھے رشک آتا ہے۔'' مسز زبیر اندر کے حسد کو چھپا کر بولی۔

''تھینک یو! اور ہمیں آپ پر پیار۔'' ملک منصور نے بھرے تالاب میں گویا کنکر پھینکا اور بڑے لاڈ سے کہا۔

''مگر ہر دفعہ تو آپ کا انتخاب کچھ اور ہی نکلتا ہے۔'' مسز زبیر نے اپنے دل کا پھپھولا پھوٹتے ہوئے محسوس کیا اور جل کر کہا۔

''کیا کریں، قدرت موقع ہی نہیں دیتی۔'' وہ پھر اپنے آپ کو صاف بچا گیا۔ وہ ایسی عورتوں کی چلتر بازیوں سے خوب واقف تھا اور ان کی زبان، ان کے لفظوں اور ان کی ادائیگی و مفہوم کو انہی کے لب و لہجے میں ادا کرنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ معاشرے کے اس طبقے سے بگاڑنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے بھئی، ہمارے انگور نہ جانے کھٹے ہی کیوں نکلتے ہیں۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''بھئی تم ہمیشہ میری گڈ بک میں رہتی ہو۔'' ملک منصور پھر خوشامدی لہجے میں بولا۔

تم اور ملک منصور کے قابل...... تمھارے بیک گراؤنڈ اور چلتر بازیوں سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔ شکر نہیں کرتی جو زبیر جیسا شوہر مل گیا اور تم ماڈرن سوسائٹی میں داخل ہو گئیں۔

ملک منصور نے اس کے جانے کے بعد سوچا۔ وہ آئیکت کو ہر ایک سے ملوا رہا تھا کہ وہ پاکستان میں خصوصی طور پر یہاں کی سیاست پر ریسرچ کرنے آئی ہے اور اس پروجیکٹ پر کام کرنے سے پہلے اس کے لیے اس طبقے کا ایکسپوزر بہت ضروری تھا مگر ہر کوئی اس کہانی کے پیچھے ایک اور کہانی بنتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ فجر کی اذانوں سے کچھ دیر پہلے پارٹی ختم ہوئی۔ خوب ہلا گلا ہوا۔ میوزک، ڈرنک، قہقہے، چٹکلے، سیاست بازی اور خوب پھلجڑیاں چلتی رہیں۔ ملک

منصور نے خوب دل کھول کر پیسہ لگایا تھا۔ سب کو بہت لطف آیا تھا۔ ہر ایک کو جو خصوصی پروٹوکول ملک منصور نے دیا تھا اس نے تو سب کے دلوں سے ملک منصور کے خلاف ساری رنجشیں مٹا دی تھیں۔ سب بہت خوش تھے۔ آئیکت کا قیام پی سی میں تھا اور وہ ملک منصور کی خصوصی مہمان تھی اس لیے ہوٹل میں بھی اس کے آرام کا خاص خیال رکھا جاتا۔

ملک منصور جس طرح محبت سے اسے ٹریٹ کر رہا تھا اسے سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ علاقہ غیر سے لے کر یہاں تک ملک منصور نے ایک دفعہ بھی اسے کچھ ایسا نہیں کہا تھا جس سے وہ اس شخص کے کردار کے بارے میں غلط اندازہ لگاتی۔ وہ تو ہر جگہ اس کے لیے بہترین گائیڈ اور گارڈ ثابت ہو رہا تھا۔ وہ رات کے آخری پہر اسے خود ہوٹل چھوڑنے گیا اس کے کمرے تک اور بہت محتاط اور محبت بھرے انداز میں اسے خدا حافظ کہا۔ وہ اس شخص سے رفتہ رفتہ بہت متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ باہر کے ملکوں میں گزارا تھا۔ وہ شخصیات کا اندازہ ان کے رکھ رکھاؤ اور گفتگو سے لگا لیتی تھی مگر اس شخص نے تو ہمیشہ اس سے بہت سلجھے انداز میں بات کی تھی۔ کسی بھی وقت اس کے دل میں کوئی بدگمانی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

ملک منصور اسے ہوٹل چھوڑنے کے بعد گھر چلا گیا۔ شزا اور شمائل دونوں بیڈروم میں سو رہی تھیں۔ وہ شمائل کے بیڈروم میں لیٹ گیا۔ صرف اسی کا دروازہ کھلا تھا باقی سب دروازے رات کو بند کر دیے جاتے۔ شزا، شمائل کو اسپتال لے کر جانے کے لیے تیار تھی جب ملک منصور کمرے سے باہر نکلا۔

''آپ کب آئے؟''

''رات کو ہی۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''کیسی رہی پارٹی؟''

''ہاں، اچھی تھی۔'' اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''کس سلسلے میں تھی؟''

''بھئی پارٹی کی طرف سے تھی جو روٹین میں ہے۔ تم تو جرح کر رہی ہو اور ہاں شمائل کو لے کر جا رہی ہو نا؟'' اس نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے جلدی جاؤ۔ ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہوا ہے؟''

''آپ نہیں چلیں گے۔''

''نہیں، تم چلی جاؤ، میں بہت تھکا ہوا ہوں اور مجھے کچھ کام بھی کرنا ہے۔'' وہ اکتاہٹ سے بولا۔

''اچھا'' اس نے خاموشی سے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا اور شمائل کو لے کر چل دی۔

ڈاکٹر نے تقریباً دو گھنٹے اس کا کیس بنانے میں لگائے۔ اس سے باتیں کیں۔ شزا نے بھی اس کے سارے سوالات کے ٹھیک ٹھیک جوابات بتا دیے۔

''ڈاکٹر صاحب! آخر اس کو پرابلم کیا ہے؟'' شزا نے پریشانی سے پوچھا۔

''میرے خیال میں انھیں شیزوفرینیا کا مرض لاحق ہے۔''

''شیزوفرینیا؟'' شزا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، یہ ایسی نفسیاتی بیماری ہے جو روز بروز پھیلتی جا رہی ہے پاکستان میں بھی اس کے مریضوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب! اسے یہ مرض کیسے لاحق ہو گیا؟''

''شیزوفرینیا میں دراصل شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں مگر شمائل کے کیس میں پیرنٹس، چائلڈ اینڈ فیملی انٹریکشن جیسے عوامل زیادہ کارفرما ہیں۔ آپ نے جس طرح کی ہسٹری بتائی ہے اس میں تو صاف یہی نظر آ رہا ہے کہ بچی بہت زیادہ حساس ہے۔ آپ لوگوں نے حتیٰ المقدور اسے اپنے سے دور رکھا۔ اس چیز کو، تنہائی کو اس نے بہت زیادہ محسوس کیا۔ اندر ہی اندر وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی رہی۔ اس کے نتائج میرا مطلب ہے آپ اس کی علامتوں سے خود ہی اندازہ کریں کہ حالات کہاں تک بگڑ سکتے ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب! یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟'' شزا آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولی۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں لیکن آپ کو اپنے رویوں میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ اسے بہت زیادہ محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ لڑائی جھگڑا تو اس کے سامنے بالکل نہیں ہونا چاہیے اور ہاں ایسے مریض سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرنی چاہیے۔ اگر تھوڑا سا بھی اشتعال دلایا جائے تو یہ لوگ زیادہ مشتعل ہو جاتے ہیں پھر خود کو اور دوسروں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور کبھی کبھی خود کشی بھی کر سکتے ہیں۔'' شزا کو ایک دم سب کچھ یاد آنے لگا۔

''کیا کبھی ایسا ہوا؟'' ڈاکٹر نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں لیکن جب وہ ٹھیک تھی۔ اس نے تین بار ایسی کوشش کی۔''

''اصل میں یہ بیماری اچانک نہیں ہوتی۔ اس کا کافی لمبا چوڑا بیک گراؤنڈ اور بہت سے فیکٹرز ہوتے ہیں۔ بحث و مباحثے سے اجتناب کریں۔''

''لیکن یہ تو گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی ہے۔''

''ہاں میں اسی کی طرف آ رہا تھا۔ مسز منصور! میں نے یہ ساری ہدایات ایک کاغذ پر لکھ دی ہیں۔ ان پر سختی سے عمل کریں اور پلیز بہت محتاط رویہ اختیار کریں۔'' ڈاکٹر نے میڈیسنز لکھتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو ڈاکٹر صاحب!'' وہ اٹھتے ہوئے بے دلی سے بولی۔ ''چلو شمائل بیٹا!'' اس نے پیار سے کہا۔ وہ ڈاکٹر کے بی پی آپریٹس کے ساتھ مسلسل کھیل رہی تھی اور اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

''اٹھو چھوڑو اسے، ڈاکٹر صاحب ناراض ہوں گے۔'' شزا تھوڑے سخت لہجے میں بولی۔ اس نے آپریٹس زور سے زمین پر پھینکا۔

''بیٹا! آپ کو اچھا لگتا ہے تو آپ لے جائیں۔'' ڈاکٹر نے محبت سے کہا تو وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

''مسز منصور! ایسا تلخ رویہ تو کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں۔ آپ اپنے لہجے کو بالکل بدل دیں۔ وہ نارمل انسان نہیں۔''

''تو کیا یہ پاگل ہوگئی ہے؟'' شزا نے بے بسی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں، ایسا مت کہیں۔ کسی بھی بیماری کا جب اٹیک ہوتا ہے تو اس وقت مریض نارمل تو نہیں ہوتا نا۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''ڈاکٹر صاحب! آپ فیس میں آپریٹس کے پیسے بھی ڈال لیجیے۔'' وہ نرم لہجے میں بولی۔

''ارے مسز منصور! ایسی کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات تو مریض ہمیں بھی گھر لے جانے کے لیے بضد ہوتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیے، ایسی کوئی بات نہیں۔'' ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

کون اپنے رویے میں تبدیلی لائے گا۔ ملک منصور جس کے نزدیک اولاد قطعی اہم نہیں ہے۔ جو بیٹی کی ایسی حالت دیکھ کر رات بھر پارٹی میں رہا۔ میں...... میں کس حد تک

اسے مطمئن کر پاؤں گی۔ وہ سب کچھ جانتی ہے اور گھر کا ماحول کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ جس کی بنیادوں میں بے حسی، آوارگی اور آلودگی شامل ہو چکی ہو کیا وہ لوگ بدلیں گے۔ کوئی بھی نہیں بدلے گا۔ کسی کے لیے بھی تو یہ لڑکی اور اس کی زندگی اہم نہیں۔ شمائل از تھنگ......اس نے گاڑی میں مایوسی اور بے بسی سے سوچا۔

یا خدایا! رشتے بھی زندگی میں کس قدر اہم ہوتے ہیں۔ زندگی اور رشتے اور جب رشتے ہی بے بنیاد ہو جائیں تو زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ محبّت کی چاشنی سے تو زندگی کا مزہ ہے اور جن بچوں نے محبت کا لمس محسوس نہ کیا ہو وہ ایسے نہیں بکھریں گے تو اور کیسے ہوں گے۔ ماڈرن سوسائٹی کے شکستہ وجود جنھیں نہ توجہ ملتی ہے اور نہ محبّت، جو ساری زندگی جذبوں کے لیے ہی تڑپتے تڑپتے مر جاتے ہیں۔

ٹریفک کے ریڈ سگنل پر ٹریفک کا سیلاب رک سا گیا تھا۔ ایک ہاکر نے زبردستی اخبار کا رونڈو سے اندر پھینکا۔ اس نے وقت گزارنے کے لیے اخبار کو الٹا پلٹا اور جلدی سے پیسے دیے۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر ملک منصور اور آئیکت کی مسکراتی تصویریں تھیں۔ اس نے بے خیالی میں ہی تفصیل پڑھنا چاہی مگر پیچھے رکے ٹریفک کے ہارنز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے جلدی سے گاڑی چلا دی اور ایک سائیڈ پر گاڑی پارک کر کے خبر پڑھنے لگی۔ ملک منصور کی طرف سے گرینڈ پارٹی! یہ شخص کتنا جھوٹا ہے اور کس قدر مکار بھی۔ آئیکت کی تصویر پر وہ مسلسل نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ اس کے اندر شدید رقابت اور دکھ کا احساس بیدار ہونے لگا۔ ملک منصور! تم نہیں بدلو گے۔ عورت تمھارے لیے محض کھلونا ہی ہے اور اب اس کی شامت آئے گی۔ اس کی پذیرائی کا مطلب شزا کی ذات کی نفی تھا اور جب کسی کو بھی اپنی ذات کی نفی کا احساس ہو تو وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ اس وقت وہ بھی شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کسی سے اپنا دکھ کہے مگر کوئی بھی تو پاس نہیں تھا۔ اس نے شمائل کی طرف دیکھا۔ وہ گم صم ونڈو سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر بکھری بکھری شخصیتوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اور کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔

......۞......

آصف کے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ حیدر نے اسے فون کر کے لاہور آنے کو کہا تھا۔ اس نے اس کا اٹلی جانے کا انتظام کر دیا تھا۔ حیدر کا ڈرائیور اسے لینے گاؤں گیا تھا۔ وہ گھر والوں سے مل کر ابھی گاڑی میں بیٹھنے ہی لگا تھا کہ کہیں سے سنسناتی گولیاں اس کے سینے

پر آ کر لگیں۔ اس کا ایک پاؤں گاڑی میں تھا اور ایک باہر، وہ وہیں زمین پر تڑپنے لگا۔ ڈرائیور بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور گاڑی کو ریس دے دی۔ آصف زندہ تھا یا مر گیا تھا اسے کچھ علم نہیں تھا۔ حیدر اس کی بات سن کے بے حد پریشان ہو گیا۔ ڈرائیور اس کے سامنے کھڑا اسے ساری تفصیلات بتا رہا تھا اور وہ سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''تم واپس جاؤ مگر گاڑی میں نہیں اور اپنا حلیہ بھی بدل کر جانا۔ جا کر ساری صورتِ حال کا جائزہ لو اور یہ موبائل رکھو۔ میں تم سے خود رابطہ کروں گا پھر باقی کی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' حیدر نے موبائل اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے سر!'' اس نے موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

حیدر کو یقین تھا کہ یہ کارستانی ملک منصور کی ہی تھی۔ اس کے علاوہ آصف کی کسی اور کے ساتھ کوئی دشمنی نہ تھی مگر ملک منصور کو اس کی خبر ہونا بہت حیرت کی بات تھی۔ اس نے تو ہر ممکن طریقے سے اسے صیغہ راز میں رکھنے کی کوشش کی تھی اور اب یقیناً وہ حیدر کے بارے میں بھی جان چکا ہوگا۔ اسے آصف پر یوں اچانک حملے کا سن کر سخت دکھ اور حیرانی ہوئی تھی۔ ملک منصور اس قدر سفاک تھا۔ پہلے سہیل کو خود قتل کیا اور اب آصف، شفق بھی اس سے محفوظ نہ رہی تھی۔ وہ کیسا انسان تھا۔ درندوں سے بڑھ کر وحشت اور درندگی اس کے اندر تھی۔ وہ سخت مایوسی کے عالم میں کمرے کا چکر لگا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اخبار پر پڑی۔ ملک منصور کی آئیکت کے ساتھ ہنستی مسکراتی تصویر۔ اس نے اخبار پکڑ کر بغور دیکھا۔

''تم واقعی شہلا کے قابل نہ تھے۔ تم نے اس کی زندگی تو برباد کی ہی اس کے ساتھ اور بھی بہت سی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا اور پھر بھی تم کس قدر مطمئن اور خوش نظر آ رہے ہو۔ ملک منصور! تم کس مٹی کے بنے ہو۔'' وہ اپنے آپ سے سوالات کر رہا تھا اور پھر گھڑی دیکھ کر اس نے موبائل کا نمبر ملایا۔

''ہاں کیا خبر ہے؟''

''سر، وہ مر چکا ہے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد لواحقین کے حوالے کی جائے گی۔ مغرب کے بعد جنازہ ہے۔'' ڈرائیور نے اسے بتایا۔

''اچھا۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''سر، اب میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''تم واپس آ جاؤ اور ہاں کوئی مشکوک شخص تو تمھیں وہاں دکھائی نہیں دیا۔''

''نہیں سر، سب گاؤں کے لوگ ہی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، تم واپس آ جاؤ۔'' حیدر نے کہا۔

اگلے دو تین دن وہ مسلسل اخبارات دیکھتا رہا۔ آصف کے بارے میں ذرا سی خبر بھی اخبار میں نہیں تھی۔ اس کا مطلب صاف ظاہر تھا مگر حقائق کے پس منظر میں کون دیکھتا ہے۔ وہ شفق کو کیسے بتائے گا۔ وہ تو پہلے ہی سہیل کی وجہ سے بہت ڈسٹرب ہے اور اب آصف......

شفق، سہیل کی ڈیتھ کے بعد شدید ذہنی اضطراب میں تھی۔ ایک تو گناہ کا شدید احساس اور دوسرے عذرا کے الفاظ دن رات، اٹھتے بیٹھتے اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ نہ دن کو چین آتا اور نہ رات کو نیند۔ نہ وہ کسی سے دکھ شیئر کر سکتی تھی نہ ہی کوئی کفارہ ادا کر سکتی تھی۔ کیا ساری زندگی یونہی سولی پر لٹکتی رہے گی۔ شدید احساسِ زیاں نے اس کو بہت حد تک ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے تنگ آ کر سحر کا نمبر ملایا۔ بہت بیلز جانے کے بعد کسی نے تنگ آ کر فون اکتاہٹ میں اٹھایا تھا۔ وہ سوئے سوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

''ہیلو سحر! تم کہاں ہو؟'' شفق آہستہ سے بولی۔

''کون؟''

''میں شفق بول رہی ہوں۔''

''کون شفق؟''

''سحر! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟''

''میں سحر نہیں، میں تو منگتی ہوں۔ در در بھیک مانگنے والی اللہ کے نام پر، ہاں کون، بولو کون ہو تم؟''

''سحر! کیا تم نشے میں ہو؟'' وہ اس کی آواز اور لہجے سے اندازہ لگاتے ہوئے بولی۔

''ہاں مگر اب تو کمبخت نشہ بھی نہیں ہوتا۔''

''آفاق کہاں ہے؟''

''آفاق...... آفاق...... میرا آفاق تو ماہ رخ نے چھین لیا۔'' وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''او مائی گاڈ! کیا اس نے شادی کر لی؟''

''پتا نہیں، وہ تو مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ گھر ہی نہیں آتا اور مجھ سے بات بھی نہیں کرتا۔ فون بھی نہیں کرتا اور اب تو مجھے مارتا بھی نہیں۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی، پاگل ہو

جاؤں گی۔ وہ جانتا بھی ہے کہ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں اس دنیا میں سب سے زیادہ پھر بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ کیا تمھیں معلوم ہے؟'' اسے تو جیسے موقع ملا تھا وہ اچانک پھٹ پڑی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دے۔

''سحر! تم فکر نہیں کرو، وہ آ جائے گا۔'' شفق نے اسے تسلی دی۔

''نہیں، اب نہیں آئے گا۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔ وہ تو مجھے دفنانے بھی نہیں آئے گا۔''

''سحر حوصلہ کرو۔ دیکھو ہمت نہ ہارو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اس گھر میں آج تک کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہوا۔'' اس نے خود ہی موبائل غصے سے دور پھینکا۔ شفق اس کے حالات سن کر بہت ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ اس نے تو اپنا دکھ شیئر کرنے کے لیے اسے فون کیا تھا اور وہ خود ہی پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کو توڑ کر کہیں بھاگ جائے۔ گو کہ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور وہ اِدھر محبوس نہیں تھی مگر اس کا دل فرار چاہ رہا تھا۔ اس نے حیدر کا نمبر ملایا۔

''ہاں بیٹا! کیا بات ہے؟''

''انکل! میں بہت پریشان ہوں اور شہر آنا چاہ رہی ہوں۔ انکل میں آ جاؤں۔''

حیدر اس کی بات سن کر چونک گیا۔ کہیں اسے آصف کی کوئی خبر تو نہیں مل گئی تھی۔

''بیٹا! آپ کیوں پریشان ہیں؟''

''معلوم نہیں۔ بس دل بہت پریشان ہے۔ نہ جانے کیوں ٹینشن سی ہو رہی ہے۔ میں نے سحر کو فون کیا تھا اور......''

''ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے؟''

''وہ بہت زیادہ اپ سیٹ ہے۔ شاید آفاق نے شادی کر لی ہے۔''

''او آئی سی!'' حیدر کو اس کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ ''ٹھیک ہے، ابھی ڈرائیور بہت مصروف ہے۔ دو تین دن بعد میں اسے آپ کی طرف بھیجوں گا پھر آ جانا۔''

''ٹھیک ہے انکل!'' وہ مطمئن لہجے میں بولی اور حیدر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ کیسے اس کو آصف کے بارے میں بتائے گا جبکہ وہ پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہے لیکن حقائق سے فرار تو ممکن نہیں۔ آج نہیں تو کل اسے حالات کا علم تو ہونا ہی ہے۔

دو دن بعد وہ ڈرائیور کے ساتھ شہر آ گئی تھی۔ وہ واقعی بہت پریشان تھی۔ حیدر نے

اسے بہت تسلی دینے کی کوشش کی۔

''انکل! میں سحر سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں تو مل لو۔''

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اسے اِدھر بلالوں؟''

''ہاں ہاں، مائنڈ کرنے کی کیا بات ہے؟''

''تھینک یو انکل!'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

اگلے دن اس نے سحر کو فون کیا۔ فون بجتا رہا مگر کسی نے نہ اٹھایا۔ وہ رات گئے تک فون کرتی رہی مگر کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ اسے سخت تشویش ہو رہی تھی۔ حیدر صبح سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اچانک فون کی بیل بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا۔

''ہیلو کون؟''

''حیدر! انکل کہاں ہیں؟''

''آپ کون؟''

''میں ولیم بات کر رہا ہوں۔ مما کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ انھیں اسپتال لے کر جانا ہے۔ ان کا موبائل آف ہے اسی لیے گھر فون کیا ہے۔''

''مگر وہ تو گھر پر نہیں۔ شہر سے باہر کسی ضروری کام کے سلسلے میں گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، جب وہ آئیں تو انھیں میرا میسج ضرور دے دیں۔ اس وقت بہت ایمرجنسی ہے۔'' اس نے فون رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈرائیور ذوالفقار کا فون آ گیا۔ ''بی بی جی! شاہ جی کہاں ہیں؟''

''وہ تو گھر پر نہیں، آپ کون؟''

''میں ذوالفقار ڈرائیور بول رہا ہوں۔ بہت ضروری بات تھی۔ ان کا موبائل بھی بند ہے اور بات بہت ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ پیغام دے دیں، میں ان کو دے دوں گی۔''

''آپ جی! ان کو بتا دیں کہ آصف کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا پتا چل گیا ہے۔''

''کیا مطلب! کیا ہوا آصف کو؟'' وہ چیختے ہوئے بولی۔

''جی! اس کو کسی نے دو تین دن پہلے قتل کر دیا تھا۔''

''اوہ نو! یہ نہیں ہو سکتا۔'' اس سے بولنا مشکل ہو گیا تھا اس نے فون رکھ دیا۔ فون

بند کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ پہلے سہیل اور اب آصف بھی اور اسے علم بھی نہیں ہوا۔ دو بے گناہ انسان اور ان کا خون اس کی گردن پر تھا۔ پہلے وہ سہیل کی وجہ سے شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھی اور اب آصف بھی۔ سہیل مرتے دم تک اسے آصف کے بارے میں اصرار کرتا رہا اور وہ اس کے لیے یہ کام بھی نہیں کر سکی تھی۔ اس شخص کے لیے جس نے اپنی زندگی اس کے لیے داؤ پر لگا دی تھی۔ اُف خدایا! میں اس قدر ذلیل ہو سکتی ہوں۔ میری وجہ سے دو بے گناہ انسان موت کے منہ میں چلے گئے اور میں زندہ ہوں۔ مجھے تو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ شدید ذہنی اضطراب میں تھی۔ ہر طرف سے صدمات نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ دبے قدموں حیدر کے کمرے میں گئی اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں، شیلف کے اندرونی خانوں اور بیڈ کی سائڈ ٹیبلز کی درازوں میں کچھ ڈھونڈتی رہی۔ کوئی ایسی چیز، کوئی ایسا ہتھیار، کچھ بھی سہی۔

اسے ایک دراز میں سے کچھ گولیاں ملیں۔ اس نے ساری کھا لیں۔ شاید وہ حیدر شدید ڈپریشن میں لیتا تھا۔ وہ گولیاں کھا کر اِدھر ہی بیڈ پر لیٹ گئی۔ باہر مسلسل گیٹ بیل بج رہی تھی۔ شیر شاہ کسی کام سے باہر گیا تھا۔ خانساماں نے بہت دیر بعد اپنے کوارٹر سے آ کر گیٹ کھولا تھا۔ شہلا اسد اپنے شوہر کے ساتھ بہت دنوں کے بعد آئی تھی۔

''کیا بات ہے بابا! پاپا کہاں ہیں؟'' شہلا نے خانساماں سے پوچھا۔

''وہ جی کسی کام سے شہر سے باہر گئے ہیں۔''

''آج کل کہاں ہوتے ہیں۔ نہ موبائل پر ملتے ہیں اور نہ گھر پر۔''

''معلوم نہیں جی، گھر پر ہی نہیں ہوتے۔ بی بی جی بھی گاؤں سے آئی ہوئی ہیں۔''

''کون بی بی؟'' شہلا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسد گاڑی میں ہی تھا۔

''شفق بی بی!''

''کہاں ہے وہ؟'' نہ جانے کیوں وہ جاتے جاتے رک گئی تھی۔

''اندر ہی ہیں۔''

''اچھا'' شہلا کے اندر پھر ایک دم نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ نادانستہ اندر چلی گئی۔ خاموشی سے سارے کمروں کا جائزہ لیتی رہی۔ پاپا کے بیڈروم تک جاتے جاتے اس کے قدم اچانک لرزنے لگے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ شفق ان کے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ شہلا کا خون کھولنے لگا۔ اس کی اتنی جرأت...... اور پاپا کیا وہ پھر...... وہ ایک دم صرف چند لمحوں میں یقین کی وادی سے شکوک وشبہات کی خاردار جھاڑیوں میں الجھ چکی

تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ تھپڑ مار مار کر اس لڑکی کے ناپاک جسم کو پاپا کے مصفا بستر سے کہیں دور پھینک دے۔ وہ بہت دنوں کے بعد اپنے آپ کو کمپوز کر کے آئی تھی اور اب صرف چند لمحوں میں جنونی ہو چکی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی۔ اس کا خیال تھا کہ لائٹ آن کرنے پر وہ اٹھ جائے گی مگر وہ بے سدھ پڑی تھی۔

''تمہاری یہ جرأت کہ پاپا کے بیڈ روم میں گھسی ہو اور ان کے بیڈ پر......'' وہ چلائی مگر جواب ندارد! ''اٹھو یہاں سے اور باہر دفع ہو جاؤ۔'' اس نے ہاتھ سے اسے جھٹکا دیا تو اس کا ہاتھ اور سر ایک طرف کو لٹک گئے۔ ادھ کھلی آنکھیں کچھ اور ہی کہانی بتا رہی تھیں۔ وہ خود بھی ایک لمحے کو چونکی۔ اس کا ڈھیلا، بے جان جسم...... اس نے جلدی سے نبض چیک کی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے اردگرد دیکھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر گولیوں کی کھلی شیشی نظر آ گئی۔

''مائی گاڈ!'' وہ کہتے ہوئے باہر بھاگی۔

''اسد...... اسد! جلدی سے اندر آئیں...... وہ...... اس لڑکی نے شاید خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''کون شہلا...... کون لڑکی؟'' اسد نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہ اندر ہے شفق!'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی اور دونوں اندر بھاگے۔

''اس کی حالت تو بہت سیریس لگ رہی ہے۔'' اسد نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کو جلدی سے اسپتال لے چلتے ہیں۔'' وہ خود ہی بولی۔

''ہاں، بابا کو بلاؤ۔ اسے گاڑی میں ڈالیں۔'' تینوں نے مل کر اسے بڑی مشکل سے گاڑی میں ڈالا اور ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے گئے۔ ڈاکٹروں نے جلدی سے اس کا معدہ واش کیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

''اگر آپ صرف چند منٹ اور لیٹ کر دیتے تو ان کا بچنا بہت مشکل تھا۔'' ایک ڈاکٹر نے دونوں سے کہا تو وہ خاموش ہو گئے اور خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شہلا مسلسل پاپا سے رابطہ کیے ہوئے تھی۔ رات کے دو بجے موبائل سے رسپانس ملا۔

''ہیلو شہلا تم اس وقت! خیریت تو ہے؟''

''ہاں پاپا! آپ کہاں ہیں؟''

''میں صبح فیصل آباد گیا تھا۔ ابھی واپس آ رہا ہوں۔ راستے میں ہی ہوں مگر تم نے اس وقت فون کیوں کیا ہے؟''

''پاپا! وہ میں اسپتال سے بول رہی ہوں۔''

''کیوں، خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں، وہ دراصل شفق نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ میں اچانک گھر گئی تو اسے اسپتال لے کر آئی۔''

''کیا...... کیا کہہ رہی ہو؟'' حیدر کے ماتھے پر ایک دم پسینہ آ گیا۔

''ہاں مگر اب وہ ٹھیک ہے۔ میں اور اسد اسپتال میں ہی ہیں۔''

''او مائی گاڈ! یہ اس نے کیا کیا۔ میں اسپتال ہی آ تا ہوں۔'' حیدر نے ایڈریس نوٹ کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ وہ خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اس لیے ڈرائیو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ لڑکی اس قدر جنونی بھی ہو سکتی ہے۔ اسے سخت افسوس ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ولیم کا فون آ گیا۔ ''انکل! آپ کہاں ہیں، مما کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں اسپتال سے بول رہا ہوں اور آپ کو مسلسل فون کر رہا ہوں۔ میں اور نور بہت مشکل سے انھیں اسپتال لائے ہیں۔ انکل آپ آ رہے ہیں نا؟'' ولیم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''آج ان کو خون کی الٹی ہوئی ہے۔''

''اوہ نو!'' حیدر پریشانی سے بولا۔

''انکل! وہ ہوش میں بھی نہیں۔''

''بیٹا آپ گھبراؤ نہیں۔ میں آ رہا ہوں۔ ایک گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔'' حیدر نے موبائل آف کیا۔ وہ سخت شش و پنج میں تھا۔ دونوں زندگیاں خطرے میں تھیں، دونوں کو بچانا ضروری تھا اور وہ تنہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف جائے۔ نادانستہ اس نے گاڑی کا رخ شوکت خانم کی طرف موڑ دیا۔ ولیم سر جھکائے پریشان بیٹھا تھا۔ نور کو زبردستی اس نے بڑے چچا کے ساتھ بھیج دیا تھا جو اس کو لینے خود ہی اسپتال پہنچ گئے تھے۔

''شہلا کیسی ہے اب؟''

''معلوم نہیں۔'' ولیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''اچھا میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔'' وہ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے ملنے چلا گیا۔

''فکر کی بات نہیں۔ کچھ کلاٹنگ ہو گئی تھی اس لیے الٹی ہوئی ہے۔'' ایک دم موبائل

بجنے لگا۔

''ہاں شہلا! بولو کیا بات ہے؟'' اچانک حیدر کے منہ سے نکلا۔ ولیم نے پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں گہرا استفہام تھا۔ ''میں ابھی تھوڑی دیر تک پہنچتا ہوں۔'' اس نے موبائل بند کر کے ولیم کی طرف دیکھا۔

''میری بیٹی کا فون تھا مجھے اسپتال جانا ہوگا۔'' ولیم کہیں کھو سا گیا تھا اور خاموشی سے حیدر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کوئی چیز کہیں اٹک سی گئی تھی۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر اسے اس کا کوئی حق نہیں تھا اور ہمت بھی......

''میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جلدی آ جاؤں۔ کل تک تو اسپتال میں رہنا پڑے گا اور اگر میں نہ آ سکا تو مجھے فون کر دینا۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا اور ہاں میں نے بلز کی پے منٹ کر دی ہے اور یہ اے ٹی ایم کارڈ ہے۔ اس کا یہ پاس ورڈ ہے۔ اگر میں نہ ہوں تو اس سے پیسے نکلوا لینا۔'' حیدر نے اسے اے ٹی ایم کارڈ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ولیم خاموشی سے اس فرشتہ صفت انسان کی طرف دیکھتا رہا جس کے بارے میں وہ کچھ کچھ مشکوک بھی تھا اور معترف بھی۔ وہ اس کے مرتبے کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ وہ شخص اس کے دل کے کسی گوشے میں براجمان ہو چکا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، جیسا بھی تھا اس کی عزت کرنے کو دل چاہتا تھا۔ اس کی کسی بات کو رد کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

حیدر اسپتال پہنچا تو وہ بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ شہلا اس کے پاس ہی تھی اور اسد گھر جا چکا تھا۔ ساری رات دونوں اسپتال میں ہی رہے تھے۔

''پاپا! آپ کہاں رہ گئے تھے؟'' شہلا نے بے صبری سے پوچھا۔

''مجھے اچانک شوکت خانم جانا پڑا۔ ایک مریض بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''معدہ واش کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر تک ہوش میں آ جائے گی مگر پاپا یہ آپ کے بیڈروم میں اور ٹیبلٹس بھی اس نے آپ کے روم سے لی تھیں۔ آپ نے اسے اتنی لبرٹی دے رکھی ہے۔'' شہلا آہستہ مگر قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ وہ اس کی زندگی سے زیادہ اس کی حیدر کے گھر میں موجودگی سے پریشان تھی۔

''شہلا! تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ جو بھی تمہارے دل میں ہے صاف صاف کہو۔ ذو معنی جملے اور لہجہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ حیدر کا اندر باہر ہمیشہ صاف رہا ہے اور رہے گا اور

اسے اپنی کسی بھی بات پر کوئی شرمندگی نہیں۔'' حیدر مضبوط لہجے میں بولا۔

''آئی ایم سوری! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' حیدر نے بھرپور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد شفق نے آنکھیں کھولیں۔ حیدر سامنے نظر آیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''انکل! میں کیوں زندہ ہوں۔ مجھے کیوں بچایا؟''

''تم نے کتنی بری حرکت کی ہے۔ کیا تمھیں اس کا اندازہ ہے؟''

''انکل! میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میری وجہ سے دو انسان مارے گئے۔ سہیل بھی اور اب آصف بھی۔ میں اپنے آپ کو کیسے معاف کروں گی۔'' وہ سسکنے لگی۔ حیدر نے شہلا کی طرف دیکھا۔ وہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

''تمھیں کس نے بتایا؟'' حیدر نے اس سے پوچھا۔

''ذوالفقار ڈرائیور نے اور آپ نے مجھے بالکل بھی نہیں بتایا۔ میں بہت بری ہوں انکل! بہت بری، میں اب کیا کروں گی۔'' وہ مسلسل رو رہی تھی اور آنسو تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

''ہمت کرو بیٹا! ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔'' حیدر نے اسے حوصلہ دینا چاہا۔

''میری وجہ سے، میں اس کی وجہ بنی۔''

''اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ قسمت کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا۔'' وہ خاموش ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں مگر بند آنکھوں سے بھی آنسو مسلسل بہتے رہے۔

.......✡.......

ولیم بے حد مضطرب تھا۔ مما کے اس انکشاف کے بعد اس موضوع پر دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر اس نے آج حیدر انکل اور مما کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ بار بار انھیں اصرار کر رہی تھی کہ ولیم کو ایک دفعہ ان کی زندگی میں کلمہ پڑھا کر مسلمان کر دیں اور حیدر انکل بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ جبر سے نہیں بلکہ جب ولیم کا اپنا دل چاہے گا تب وہ ایسا کریں گے۔ اس کی باتیں سننے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ موسم بہت سرد ہو رہا تھا مگر نہ تو اسے موسم کی شدت کا احساس ہو رہا تھا نہ رگ و پے میں سرایت کرتی ٹھنڈ کا۔ اس کا اندر تو مسلسل جل رہا تھا۔ یہ سب کیسے ممکن ہو گا؟

اوہ کرائسٹ، اوہ گاڈ! آئی ایم رئیلی سک آف لائف! اسے کوئی راستہ اور کوئی

منزل کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے قدم نادانستہ فادر کی طرف اٹھ گئے۔ وہ کسی جائے پناہ کی تلاش میں ان کی طرف چلتا گیا۔ امید کی کرن روشن تھی۔ فادر کو وہ کیسے ساری صورتِ حال بتائے گا اور وہ کس طرح اس پر یقین کریں گے۔ وہ فادر کے گھر پہنچا تو کچھ گاڑیاں باہر کھڑی تھیں۔ اسے باہر برآمدے میں ہی بیٹھنا پڑا۔ باہر شدید ٹھنڈ ہو رہی تھی۔ نوکر نے بس اسے یہی بتایا تھا کہ کوئی فارن ڈیلیکیشن آیا ہے اور فادر ان کے ساتھ مصروف ہیں۔ کب فارغ ہوں گے وہ نہیں جانتا تھا۔

''آپ ان کو بتا دیں کہ ولیم آیا ہے۔'' اس نے پُر امید لہجے میں کہا۔

''وہ تو میں نے ان کو کب کا بتا دیا ہے۔''

''تو پھر؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

''آپ ایک دفعہ اور......''

''ان کا کہنا ہے کہ انھیں بار بار ڈسٹرب نہ کیا جائے۔'' نوکر نے کہا اور اندر چلا گیا۔ اسے سخت مایوسی ہو رہی تھی۔ فادر اسے نہ جانے کیوں اتنا نظر انداز کر رہے تھے۔ اس کا قصور اتنا بڑا تو نہیں تھا۔ اس کا دل کٹنے لگا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ایسی بے اعتنائی اور بے رخی پر وہ مایوسی سے اٹھا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ہوا میں قدرے خنکی بڑھ گئی تھی اور اس نے ایک بلیو کلر کا پتلا سا سوئٹر پہن رکھا تھا۔ اس نے جھرجھری سی لی۔ اسے ایک دم شدید سردی محسوس ہونے لگی۔ سارا جسم کپکپاہٹ کا شکار ہو گیا ہو۔ نہ جانے اندر کیسی تبدیلی آئی تھی کہ سارا وجود لرزنے لگا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بوجھل قدم اٹھاتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ اچانک ایک گاڑی چلتے چلتے رک گئی۔

''ہیلو ینگ مین!'' گاڑی سے نور کے بڑے چچا باہر نکلے۔

''ہیلو سر!''

''کیا آج سڑکیں ناپنے نکلے ہو؟'' انکل نے خوش انداز میں پوچھا۔

''ن......نہیں......بس یونہی ادھر آیا تھا مگر طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

''کیا ہوا؟'' انھوں نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اوہو! تمھیں تو بخار ہو رہا ہے۔ چلو میں تمھیں گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔ سنا ہے تم نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب کہاں رہتے ہو؟''

''گلبرگ میں۔''

''ٹھیک ہے، مجھے راستہ بتاتے جاؤ۔ میں تمھیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔''

''نہیں انکل! میں ٹیکسی کر لیتا ہوں۔''

''ارے بھئی، میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جب اس کے بتائے ہوئے ایڈریس پر انھوں نے گاڑی روکی تو وہ گھر دیکھ کر چونکے۔

''تم میرا مطلب ہے آج کل کس کے ہاں مہمان ہو؟''

''حیدر انکل کے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''کون حیدر؟''

''وہی جو منسٹر بھی ہیں۔''

''سید ضرار حیدر کے؟'' انور چچا اپنی سیٹ سے اچھلتے ہوئے بولے۔

''ہاں شاید۔''

''وہ تمھارے کیا لگتے ہیں؟''

''معلوم نہیں، مما کے کوئی کزن ہیں۔'' وہ اکتاہٹ سے بولا۔

''مگر وہ تو سیّد ہیں۔''

''میں نہیں جانتا۔'' وہ بے زاری سے گاڑی سے اترتے ہوئے بولا اور اندر چلا گیا مگر چچا کافی دیر وہیں گاڑی میں بیٹھے۔ الٹی سیدھی کڑیاں ملاتے رہے۔ مما اس کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' انھوں نے نقاہت سے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا جو بخار سے تپ رہی تھی۔

''فادر کی طرف گیا تھا مگر......''

''مگر کیا؟''

''وہ مجھ سے ناراض ہیں اس لیے انھوں نے مجھ سے ملاقات نہیں کی۔''

''تم کیوں ان کی طرف بار بار جاتے ہو؟''

''میں بہت پریشان ہوں اور آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ مما! جو باتیں آپ کو اب پریشان کر رہی ہیں۔ میرے بچپن میں ہی آپ نے اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچا تھا اور اب مجھے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔'' وہ قدرے خفگی سے بولا۔

''ہاں نہ جانے کیوں مجھ سے ہمیشہ غلطیاں ہی ہوتی رہی ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ تم میری وجہ سے ذہنی اذیت میں مبتلا ہو مگر میں کیا کروں۔ میں کبھی بھی دوراندیش نہیں رہی۔ وقتی مصلحتوں کے ہاتھوں خاموشی سے سرینڈر کرتی رہی اور غلطیاں اور گناہ مجھ سے سرزد ہوتے رہے۔ میں انسانوں کے ہجوم میں کھڑی ایک بے حد کمزور مخلوق ہوں۔ جس طرف سے ریلا آیا اسی طرف بہہ گئی اور گناہ کرتی رہی۔''

''کیسے گناہ؟'' اس کا چہرہ بخار سے تپ رہا تھا اور دل انجانے خدشوں سے کہ مما کہیں کچھ اور انکشاف نہ کر دیں۔

''تمہارا باپ پیٹر کرسچن تھا اور میں مسلم۔ وہ تمہارا وجود نہیں چاہتا تھا مگر تم میری زندگی تھے۔ جس نے تمہاری وجہ سے مجھے طلاق دی۔ میں نے اسے ہی تمھیں نام دینے کو کہا۔ کیسی بڑی غلطی تھی۔'' اس کے چہرے پر ابھری ہڈیوں پر آنسو تھمنے لگے۔ ولیم نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔

''مما آپ......!'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''تمہارا نام صرف اسی کا دیا ہوا ہے اور کچھ بھی نہیں۔''

''تو آپ نے مجھے کیا دیا؟'' وہ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔

''میں نے...... میں نے......'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے ولیم کا سوال بڑا انوکھا لگا۔ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمھیں میں نے مر کر جنم دیا اور پھر جیسے پالا سب تمھارے سامنے ہے مگر میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کوئی بھی ماں اولاد پر احسان نہیں کرتی۔''

''کاش آپ مجھ پر یہ احسان نہ کرتیں۔ آپ نے مجھے ادھوری زندگی دی ہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں نہ تو میرا کوئی نام ہے، نہ وجود، نہ کوئی شناخت اور نہ ہی کوئی پہچان، میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ میرا ماضی کیا تھا؟ میرا حال کیا ہے اور میرا مستقبل کیا ہوگا؟ آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ نہ جانے اس کہانی میں بھی سچائی ہے کہ نہیں۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''ولیم! خدا کے لیے یوں نہ کہو۔ میں نے تمھیں کچھ نہیں دیا۔ میں جانتی ہوں مگر میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' اس کی آنکھوں میں بلا کا کرب تھا اور لہجے میں بے حد بے بسی!

''مما! آپ نے بہت ظلم کیا ہے۔''

''اور مجھ پر جو کچھ ہوا؟'' وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ ولیم وہیں صوفے پر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ ولیم کی باتوں پر اس کا دل کٹنے لگا۔

وہ بھی تو اپنی شناخت ڈھونڈنے نکلی تھی۔ شناسائی کے سفر پر اس نے بھی تو قدم رکھے تھے مگر اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ جو اس کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس کی اولاد سہہ رہی تھی۔ ولیم کے اندر بھی ویسا ہی کرب تھا۔ ویسا ہی الاؤ تھا اور ویسا ہی آتش فشاں...... ادھورے اور بکھرے وجود کا۔ ٹوٹی پھوٹی شخصیت کا، بے حقیقت انسان کا۔ کہیں وہ بھی ایسی غلطیاں نہ کرتا جائے جو اس سے سرزد ہوئی تھیں۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

کوٹھی میں صرف ایک نوکر تھا افضل جو ککنگ بھی کرتا تھا اور گھر کے دوسرے کام بھی کرتا تھا۔ شام سے اس کی طبیعت بھی خراب تھی اور گھر پر کوئی بھی نہیں تھا کہ کوئی انھیں پانی کا گلاس ہی پوچھتا۔ ولیم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ تو گھر سے صرف ناشتا کر کے نکلا تھا اور مسلسل گھومنے پھرنے کے بعد بخار میں تپتا ہوا لوٹا تھا۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ کوئی اٹھ کر ٹیبل سے اسے اٹھانے والا نہیں تھا۔ شہلا بڑی مشکل سے اٹھ کر گئیں۔ دوسری طرف نور بول رہی تھی۔

''آنٹی! کیا بات ہے۔ فون کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ چچا بتا رہے تھے کہ ولیم کو بہت بخار ہے۔ اب کہاں ہے؟''

''ہاں، سو رہا ہے۔ بیٹی تم تھوڑی دیر کے لیے آ کیوں نہیں جاتیں۔''

''کیوں، خیریت تو ہے؟''

''ہاں ٹھیک ہے، ولیم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ کک بھی بیمار ہے اور مجھ میں بھی ہمت نہیں۔ اگر تم برا نہ مناؤ تو آ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے آنٹی، میں آ جاتی ہوں۔'' اس نے فون رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئی۔ ولیم کا بخار اور تیز ہو گیا تھا۔ اس نے آ کر اسے دودھ گرم کر کے دیا اور دوائی کھلائی۔ مما کے لیے جوس بنایا۔ ولیم کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لٹایا اور مما کے پاس آ گئی۔

''نور! ولیم بہت پریشان ہے۔''

''کیوں آنٹی؟''

''تم بھی حقیقت جانتی ہو مگر وہ حقیقت ماننے کو تیار نہیں۔ کوشش کرو کہ اسے واپس لاؤ حقیقت کی طرف، سچائی کی طرف۔ میں اپنی زندگی میں اسے مسلمان دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''آنٹی! وہ بہت ڈسٹرب ہو چکا ہے اور کسی بھی موضوع اور خاص طور پر اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔''

''ہاں میں جانتی ہوں مگر پلیز کوشش تو کرو تا کہ میں آرام سے مر تو سکوں۔''

''آنٹی! آپ ٹھیک ہو جائیں گی اور ولیم بھی۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''جا کر دیکھو اس کا بخار کم ہوا ہے کہ نہیں ورنہ کچھ پٹیاں بھی رکھ دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اٹھ کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اس نے اپنا سرد ہاتھ اس کے گرم ماتھے پر رکھا۔ اس نے پھر بھی آنکھیں نہ کھولیں۔ اس نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنی شروع کیں۔ کافی دیر وہ پٹیاں رکھتی رہی۔ بخار کی حدت کچھ کم ہوئی تو اسے بھی نیند آنے لگی۔ وہ مما کے کمرے میں آ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ تھکاوٹ سے اسے سخت نیند آ رہی تھی۔

صبح جب بیدار ہوئی تو ولیم نہ جانے کب سے اٹھ کر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چونکا۔

''نورا! تم کب آئی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم سناؤ کیسے ہو؟''

''ہاں اب کافی بہتر ہوں مگر تم کب آئی؟''

''یہ بھی خوب رہی، ساری رات تمہاری خدمت کرتی رہی۔ ٹھنڈی پٹیاں رکھتی رہی اور جناب کیسے انجان بن رہے ہیں۔''

''ریئلی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں نے فون کیا تو آنٹی نے آنے کو کہا، میں آ گئی۔ کک بھی بیمار ہے۔ ہاں اب جلدی سے بتاؤ ناشتا کیا کرو گے۔'' وہ جلدی جلدی بولی اور وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''نورا!'' وہ اس کے قریب آ گیا۔

''ہوں!''

''تھینک یو!'' اس کی آنکھوں میں تشکر سے پانی بھر آیا۔

''کوئی اپنے آپ کو بھی تھینک یو بولتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

''اب بخار تو نہیں۔'' اس نے اس کی کلائی پر اپنا ٹھنڈا نازک ہاتھ رکھا۔''اب کوئی خاص تو نہیں۔'' وہ خود ہی بولی اور ولیم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''نور! میں ٹوٹ گیا ہوں۔ اکیلا رہ گیا ہوں اس دنیا میں۔'' وہ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے جکڑ کر شدید دکھ سے بولا۔

''ولیم! میں نے تم سے ہزار دفعہ کہا ہے مجھے روتے اور منمناتے ہوئے لوگ قطعی پسند نہیں۔'' وہ قدرے غصے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔

''مگر اس وقت میں بہت ٹوٹ چکا ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''تو ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ پہلے بتاؤ ناشتا کیا کرو گے۔ پھر میں تم سے بات کرتی ہوں۔''

''کچھ نہیں۔''

''کچھ کیوں نہیں۔ میرا خیال ہے پورج بناتی ہوں۔''

''نہیں، میں نے نہیں کھانا۔'' وہ بچوں کی طرح منہ بنا کر بولا۔

''اچھا تو پھر کارن فلیکس تو کھالو گے نا؟''

''ہاں۔''

''تم بیٹھو میں ابھی لاتی ہوں۔'' وہ منہ دھو کر کچن میں چلی گئی۔ آنٹی کے لیے بھی ناشتا بنایا، اپنے لیے اور اس کے لیے بھی۔ دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔

''ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟'' وہ نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

''نور! میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ایسا کبھی کسی کے ساتھ ہوا ہے؟'' وہ روہانسے لہجے میں بولا۔

''پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔'' وہ انجان بنتے ہوئے بولی۔

''تم سب کچھ جانتی ہو اور انجان بن رہی ہو۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''تم خواہ مخواہ الجھ رہے ہو۔''

''کیا تمھارے نزدیک کوئی بات بھی اہم نہیں؟''

''مثلاً کیا اہم ہونی چاہیے؟''

''شاید تم بات سننے کے موڈ میں نہیں۔''

''نہیں، تمھیں کس نے کہا؟''

''پلیز!'' وہ پھر جھنجلا کر بولا۔

''اچھا بھئی کھل کر بات کرو تو میں کچھ سمجھوں نا......''

''میرا ماضی، میرے حال کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ میں ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں جہاں میرا وجود، میری شناخت سب کچھ ادھورا ہے۔ میں تو شاید......؟ اور مما اب مجھے سب کچھ چھوڑنے کو کہہ رہی ہیں۔ یہ سب کس طرح ممکن ہے۔ میں تو بہت کنفیوز ہو رہا ہوں۔''

''اس میں کنفیوزن کی کیا بات ہے۔ تثلیث سے وحدانیت کی طرف کیوں نہیں آ جاتے؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا۔

''جو خدا تنہا ہے اس کے ساتھ کیوں بہت سوں کو شریک کرتے ہو۔'' وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم دن رات لگا کر ایک شاہکار پینٹنگ بناتے ہو۔ کیا تم یہ بات سننا پسند کرو گے کہ میں نے یا تمہاری مما نے اس میں برابر کا کام کیا۔ کیا تم ان کو کچھ کریڈٹ دو گے جبکہ انھوں نے یا میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''کبھی نہیں۔'' وہ قدرے سختی سے بولا۔

''تو پھر پوری دنیا کو تخلیق کرنے والا کس طرح پسند کرے گا کہ اس کی خدائی میں کسی کو شریک کیا جائے اور ان کو جنھیں اس نے خود بنایا ہو یا جسے انسان نے بنایا ہو۔ انسان کے اندر عقل ہے اور عقل میں ایک پیمانہ ہے جسے منطق کہتے ہیں اور جو سچائی اور حقیقت پر خود بخود کلک کرتا ہے۔ اسلام تو محض وحدانیت، محمدیت ﷺ، عبدیت اور انسانیت پر قائم ہے۔ ہم خدا کی وحدانیت کو مانتے ہیں کہ ہماری عقل میں موجود سچائی کا پیمانہ اس پر کلک کرتا ہے اور محمد ﷺ کی عبدیت پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ منطق اس کو بھی مانتی ہے۔ ہمارا راستہ تو شکوک و شبہات سے پاک سیدھا راستہ ہے جس میں کہیں کوئی جھول نہیں۔ ہمیں اپنے پاپ دھونے کے لیے نہ تو گنگا میں اشنان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی فادر کے سامنے کنفیشن کی۔ ہم تو سیدھے اس کے پاس جاتے ہیں۔ تن تنہا بغیر کسی سفارش یا وسیلے کے اور سرگوشیوں میں اپنے

دل کا حال اسے سنا دیتے ہیں۔ وہ جو ہمارے دلوں کے اندر رہتا ہے۔ جو شہ رگ سے قریب ہے جو انسان اور بندے کے تعلّق کو سمجھتا ہے اور اس تعلق کی نزاکتوں کو بھی، بندے کی مجبوریوں، لاچاریوں کو بھی اور اس کی سرکشیوں کو بھی۔ ہمارے دین میں جبر نہیں۔ سب کے لیے راستے کھلے ہیں۔'' نور کی اس بات پر اس نے چونک کر دیکھا۔ حیدر انکل کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔

''اس کا کیا مطلب ہے کہ ہمارے دین میں جبر نہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی خدا نے انسان کو عقل دی، قوتیں دیں۔ اسے جانچنے کے پیمانے دیے اور پھر راستے بتا دیے اور اس سے کہہ دیا جو چاہے منتخب کرو۔ ہادی بھی آ گیا اور ہدایت بھی۔ اب جو دونوں کو قبول کرے تو فلاح میں ہے، نہ قبول کرے تو نقصان میں ہے۔ یہ تو دلوں کے معاملے ہیں۔ جس پر دل لبیک کہے وہی حقیقت ہے۔ اسلام زبردستی کا قائل نہیں۔ دراصل تم حقیقت سے نا آشنا ہو۔ تمھیں نہ اسلام کا علم ہے نہ خدا سے شناسائی کا۔''

''کیا تمھیں یہ سب ہے؟'' ولیم نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں شکر ہے۔ تھوڑا بہت مگر زیادہ نہیں۔''

''تمھیں یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟''

''کسی نے نہیں، میں نے سب کچھ خود پڑھا ہے۔ اس پر سوچا ہے اور پھر میرے دل و دماغ نے اس پر لبیک کہا ہے اور پھر میں نے سب کچھ مان لیا۔ جب میں نے دل سے مان لیا تو وہ میرا ایمان بن گیا۔ ولیم! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' اس نے ایک دم بات کا رخ موڑا۔

''کیوں؟''

''یونہی پوچھ رہی ہوں۔''

''کیا یہ بات پوچھنے کی ضرورت ہے۔ کیا تم نہیں جانتیں؟''

''نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''کیا تم واقعی نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔''

''نہیں، مجھے کیا معلوم؟''

''نور بنو مت!''

''کیا تم نے مجھے کبھی بتایا؟''

''تو کیا تم واقعی نہیں جانتیں؟'' اس کی حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''جو تم نے کبھی مجھ سے کہا ہی نہیں اسے میں کیسے جان سکتی ہوں۔''

''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میرے لیے زندگی میں صرف دو لوگ اہم ہیں مما اور تم۔''

''ہاں لیکن اس میں محبت کی مقدار اور پیمائش کو تو نہیں بتایا نا۔'' وہ مسکراتی ہوئی بے پروائی سے اسے چڑانے کے انداز میں بولی۔

''محبت کو جانچنے کا دنیا میں کوئی پیمانہ نہیں۔ جب کوئی پیمانہ ہی نہیں تو میں کیسے بتاؤں؟''

''تو اس دنیا کے خالق کو تثلیث کے پیمانے میں ناپتے ہو۔ بڑی حیرت ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ایک دم بھونچکا رہ گیا۔

''تم محبت کو جانچ نہیں سکتے تو خدائی کو کیسے جانچ سکتے ہو ولیم! سیدھا راستہ تمہارا منتظر ہے۔ بس تمھیں قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ہم تمھیں فورس نہیں کریں گے۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ تمہارا اندر تمھیں بتائے گا سچ کیا ہے۔ جو سچ ہے بس اس کو مان لو اور جس کو مان لو اس پر ایمان لے آؤ۔ بس اس کے بعد اس موضوع پر میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ہاں بس دعا کروں گی۔''

''کیسی دعا؟''

''یہ خدا اور میرے درمیان راز ہے۔ جب تم کسی راز کو پا لو گے تو پھر تمھیں بھی بتا دوں گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے اب تم ٹھیک ہو، میں گھر جاؤں۔'' وہ ڈائننگ ٹیبل سے سب برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

''ہاں، تمہاری مرضی ہے۔''

''اچھا میں تمھارے لیے اور آنٹی کے لیے کچھ بنا کر کچن میں رکھ جاتی ہوں۔ چچا بھی گھر میں منتظر ہوں گے۔'' وہ بول رہی تھی اور ولیم کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔

نور جا چکی تھی اور وہ وہیں بیٹھا تھا گہری سوچوں میں گم، دوراہے پر، قدم بڑھائے تو کیسے اور کس طرح، بنا سوچے، سمجھے، جانچے اور آزمائے۔ اتنا بڑا فیصلہ جو ساری زندگی کو تبدیل کر دے محض چند لمحوں میں تو نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جس نہج پر چل نکلا تھا جس کی تعلیمات پر اس نے غور و فکر کیا تھا۔ جس مشن پر وہ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا سب کچھ کیسے بدل دے۔

او مائی گاڈ! وہ بار بار اپنے سر کے بالوں کو کھینچ رہا تھا۔ کنپٹیوں کو دبا رہا تھا۔ بخار کی حدت پھر سے اسے محسوس ہونے لگی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی چیز پھر دباؤ ڈال رہی تھی۔ آتش فشاں شاید لاوا اکٹھا کر رہا تھا۔ اس کی سفید رنگت سیب کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ نہ کوئی راہ فرار ہے اور نہ ہی جائے پناہ...... کہاں جاؤں؟

......✡......

''آفاق! تم مجھے اپنے گھر کیوں نہیں لے کر جاتے۔ ہم کب تک اس فلیٹ میں رہیں گے۔'' مہ رخ کراچی میں اپنی خالہ کے گھر تین ماہ سے رہ رہی تھی۔ آفاق سے شادی کرنے کے بعد وہ سوئٹزرلینڈ، ہانگ کانگ گھومنے کے بعد اب تین ماہ سے خالہ کے گھر مقیم تھی۔ خالہ خود تو ڈیفنس میں رہتی تھیں اس لیے ان کا کینٹ میں فلیٹ خالی تھا۔ آفاق سے وہ بار بار لاہور جانے کو کہتی مگر وہ سنی اَن سنی کر دیتا۔ مہ رخ اس سے عمر میں چھ سال بڑی تھی۔ وہ تو ملک منصور کو پھنسانے نکلی تھی مگر آفاق شکنجے میں آ گیا۔ آفاق ابھی اتنا گھاگ نہیں ہوا تھا۔ زمانے کی اونچ نیچ اور بدلتے رنگوں کا اسے شعور نہیں تھا۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی کہ اس نے سحر سے شادی کر لی۔ وہ سحر کے ساتھ جس طرح کی زندگی گزارتا آ رہا تھا، مہ رخ کے ساتھ اسے بہت محتاط ہونا پڑتا تھا۔ وہ اپنا غصہ برتنوں اور چیزوں پر نکالتا۔ مہ رخ کو اسے سنبھالنا آتا تھا۔ وہ جب انتہائی غصے میں ہوتا تو وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل جاتی اور اس وقت تک نہ لوٹتی جب تک وہ نارمل نہ ہو جاتا۔

''آفاق! تم میری بات کا جواب نہیں دے رہے؟'' مہ رخ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش تھا۔ سحر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

''تم بے شک مہ رخ سے شادی کر لو۔ جو کچھ مرضی کرو مگر اسے گھر مت لانا۔'' وہ جانتا تھا کہ سحر کے ساتھ اس نے بڑی زیادتیاں کی تھیں۔ ہر رات کو اس کے لیے قیامت بنایا تھا اور اس کے وجود سے اس کی زرخیزی تک چھین لی تھی۔ اس بنجر زمین میں وہ مزید تھوہر کے پیڑ نہیں اُگانا چاہتا تھا۔

''آفاق! تم بولتے کیوں نہیں۔ میں تمھارے گھر جانا چاہتی ہوں جو تمھارا ہے اور میرا ہے۔'' مہ رخ محبت سے بولی۔

''نہیں مہ رخ! نہ میرا کوئی گھر ہے اور نہ تمھارا۔ وہ ملک منصور کا گھر ہے اور ہم وہاں نہیں رہ سکتے۔''

''لیکن سحر بھی تو وہیں رہتی ہے۔'' مہ رخ نے گہری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں وہ وہاں شفق کی وجہ سے ہے۔'' آفاق نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''اچھا اگر شفق اس کو، اس فقیرنی کو قبول کر سکتی ہے تو کیا مجھے قبول نہیں کرے گی؟'' مہ رخ قدرے نخوت سے بولی۔

''نہیں، میں نے کہہ دیا نا ہم وہاں نہیں جا سکتے۔''

''مگر میں وہاں جاؤں گی!''

''میں نے کہا نا ہرگز نہیں۔''

''اور میں دیکھوں گی مجھے کون روکے گا۔'' وہ غصّے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آفاق ایک دم طیش میں آ گیا اور اسی طرح اس پر مکوں اور گھونسوں کی برسات شروع کی جیسے وہ سحر پر کرتا تھا۔ مہ رخ نے ایک دم زناٹے دار تھپڑ اسے مارا۔ آفاق کا تو سر گھوم گیا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ مہ رخ یوں ری ایکٹ کرے گی۔

''تم ہوش میں ہو، مجھے تو تم بالکل ابنارمل لگ رہے ہو۔'' مہ رخ نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا اور آفاق جیسے کسی روبوٹ کی طرح اپنے اعضا ڈھیلے چھوڑ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ مہ رخ اس کے کندھے دبانے لگی۔

''کیا تم جانتے ہو تمھیں دورہ پڑتا ہے؟'' آفاق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ نیا انکشاف اس کے لیے قدرے حیران کن تھا۔ وہ اسے جھٹلانا چاہتا تھا مگر کچھ نہ بول سکا۔

''اپنے آپ کو نارمل رکھو ورنہ پاگل کہلاؤ گے۔ میں تمھیں ٹھیک کروں گی۔ تم بہت امیچور ہو، سمجھے تم! جو میں کہوں گی بس اس پر عمل کیا کرو ورنہ تم اپنے آپ کو کھو دو گے۔'' وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں کے انداز میں اس کے کان کے پاس یوں بول رہی تھی جیسے اسے ہپناٹائز کر رہی ہو۔ وہ اس کی باتوں کو سن بھی رہا تھا۔ سمجھ بھی رہا تھا اور ان پر عمل کرنے کا تہیہ بھی کر رہا تھا جیسے اس کی نبض مہ رخ کے ہاتھ میں تھی۔ مہ رخ اس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی کلائیوں، بازوؤں اور پٹھوں کو اپنی مخروطی انگلیوں کی پوروں سے دباتے ہوئے اس کی گردن کے پیچھے مسلز کو پوروں سے دبانے لگی اور وہ جیسے مدہوش ہو رہا تھا۔ اس کو سکون مل رہا تھا جس طرح آکوپنکچر میں نیڈلز کو مخصوص جگہوں پر رکھا جاتا ہے اسی طرح وہ اپنی پوروں سے مخصوص جگہوں کو دبا رہی تھی۔ یہ فن اس نے یوگا کلب میں ایک پارسی لڑکی سے سیکھا

تھا۔ اس نے مہ رخ کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جیسے زندگی میں پہلی دفعہ کسی نے اسے سمجھا ہو۔ کوئی تو ہے پوری دنیا میں۔ سحر کہیں دور چلی گئی تھی۔ اب صرف مہ رخ تھی صرف مہ رخ اور اس سے بڑھ کر دنیا میں اب اسے کوئی عزیز نہ تھا۔

''ہاں، میں تمھیں لے چلوں گا۔ بہت جلد ہم لاہور چلے جائیں گے۔ میں تمھارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم ہی میری زندگی ہو۔'' وہ اس کے ساتھ یوں لپٹ رہا تھا جیسے بچہ ماں کے ساتھ ضد منوانے کے لیے لپٹتا ہے اور مہ رخ اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھی۔

ملک منصور نے موبائل پر نمبر دیکھا اور مسکرا دیا۔ آئیکت کا نمبر دیکھ کر اس نے گہری سانس لی۔ وہ عورتوں کی نفسیات اور ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کا ماہر فنکار تھا۔ فون بار بار بج رہا تھا۔ بالآخر اس نے فون اٹھایا۔

''ہیلو آئیکت کیا بات ہے؟'' وہ بڑی ادا سے بولا۔ وہ رو رہی تھی۔ سسکیاں بھر رہی تھی اور کچھ بھی نہیں بول رہی تھی۔

''ڈیئر کیا مسئلہ ہے، میں ہوں نا!'' اس نے لاڈ سے کہا۔

''منصور! مائی مم اِز نو مور..... شی از ایکسپائرڈ۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''اوہ نو!'' وہ ایک دم چونکا۔

''یس!''

''لیکن کب اور کیسے ہوا؟''

''آج صبح، میں کب سے فون کر رہی ہوں مگر آپ فون ہی اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔''

''ہاں میں بزی تھا لیکن میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے اپنی پجیرو کی رفتار مزید بڑھا دی۔ وہ جلد سے جلد پی سی پہنچا۔ آئیکت کا رو رو کر برا حال تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اس دیارِ غیر میں صرف ایک ہی ہمدرد انسان اسے نظر آیا تھا۔ جس پر وہ اندھا اعتماد کر سکتی تھی۔

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری! اب تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں ابھی واپس جانا چاہتی ہوں۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''اچھا میں ابھی سیٹیں کنفرم کرواتا ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ آئیکت نے حیرت

سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں اَن گنت سوال تھے۔

''تمھاری حالت ایسی نہیں کہ تم اکیلی جاؤ اس لیے میں خود تمھارے ساتھ جاؤں گا کیونکہ تم مجھے بہت عزیز ہو، آئی نیڈیو!'' ملک منصور کی آنکھوں سے محبّت جھلک رہی تھی اور لہجے سے مٹھاس۔ وہ ہمیشہ سے ایسے لمحوں کا منتظر رہتا تھا جب عورت خود کو تنہا اور بے بس محسوس کرتی ہو۔ جب اسے مضبوط سہارے کی ضرورت ہو۔ جب اسے تحفظ چاہیے ہو جب وہ اپنے آپ کو اندر سے ٹوٹا پھوٹا محسوس کر رہی ہو اور جب کسی ایک پر اعتماد کرنے کو طبیعت مچل رہی ہو۔ آئیکت اس کے ساتھ لگ کر اونچی آواز میں رونے لگی اور وہ اس کے خوبصورت شولڈر کٹ بالوں میں محبّت سے انگلیاں پھیرنے لگا۔ آئیکت آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکی تھی اور بہت بولڈ سمجھی جاتی تھی۔ وہ اپنے پروفیشن میں بہت ماہر تھی۔ بڑی بڑی شخصیات سے تیکھے تیکھے سوالات کر کے ان کو زچ کرنے کی عادی تھی۔ اس کی بولڈنیس کو لوگ بہت انجوائے کرتے تھے اور اب وہ بے بسی کی تصویر بنی ملک منصور کے ہاتھوں میں ایک کھلونا سی بنی تھی۔ ملک منصور کے لیے یہ نیا تجربہ نہیں تھا۔ وہ ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانا خوب جانتا تھا۔ اس نے تہران کے لیے دو ایمرجنسی سیٹیں لیں اور فوراً تہران کے لیے روانہ ہو گئے۔ آئیکت سارا راستہ روتی رہی اور ملک منصور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور اسے ساتھ لگائے تسلیاں دیتا رہا۔

آئیکت کا بھائی اسمی شیرازی انھیں ایئر پورٹ پر لینے آیا تھا۔ آئیکت اس کے گلے لگ کر روتی رہی۔ آئیکت کی مما کی میت بس دفنانے کے مراحل میں تھی۔ وہ لوگ سیدھے قبرستان پہنچے۔ آئیکت مما کی میت کے ساتھ لپٹ کر روتی رہی۔ اس کی ایک بڑی بہن ہادیہ ناصر اور بھائی اسے تسلیاں دیتے رہے۔ جنازے کے بعد وہ ان کے گھر آیا تو ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ آئیکت کے سر میں شدید درد تھا۔ وہ سلیپنگ پلز لے کر سو گئی۔

آئیکت کے بہن بھائی اور چند عزیز ملک منصور پر فدا ہو رہے تھے۔ اس کی اتنی محبّت اور ہمدردیوں کا بار بار شکریہ ادا کر رہے تھے اور ملک منصور کا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا۔ اس نے اسی وقت پاکستانی سفارت خانے میں فون ملایا اور وہاں پاکستان کے سفیر سے بات کی اور ذاتی طور پر ایک تعزیتی محفل منعقد کرنے کو کہا کیونکہ سفیر اس کا گہرا دوست تھا۔ وہ لوگ اس کے اس قدم کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کی توقعات سے بڑھ کر ان کے لیے سب کچھ کر رہا تھا۔

وہ دو دن وہاں رہا اور یہ دو دن ان سب کے لیے بہت مسرور کن تھے۔ گو کہ آئیکت بہت اداس تھی۔ اس نے بیس سال کی عمر میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا کیونکہ اس کے باپ کی اچانک ڈیتھ ہو گئی تھی اور مما کو بلڈ کینسر کا مرض لاحق ہو گیا۔ وہ دن رات محنت کرتی۔ در در خاک چھانتی رہی مما کے علاج کے لیے۔ کبھی کبھی بہت ایڈونچرس اور رسکی کام بھی کرنے پڑتے کیونکہ ان میں پیسے زیادہ ملنے کے امکانات ہوتے۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر سب کام کرتی کیونکہ مما کے علاج کے لیے اسے بہت پیسوں کی ضرورت تھی۔ بھائی ابھی چھوٹا تھا اور پڑھ رہا تھا لیکن اتنی تگ و دو بھی مما کو نہ بچا سکی۔ اس کی مما کے ساتھ بہت اٹیچمنٹ تھی مگر اسے زیادہ عرصہ گھر سے دور رہنا پڑا اور ماں کی جدائی سہنا پڑی لیکن اسے خوشی کا احساس تھا کہ وہ گھر سے دور رہ کر بھی مما کی خدمت کر رہی تھی لیکن اب تو جیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد، اس کی دن رات کی محنت کا سبب، اب وہ کس کے لیے سب کچھ کرے گی۔ سب کچھ بے معنی لگ رہا تھا۔ ملک منصور اسے بہت تسلیاں دیتا ہوا واپس آ گیا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے ایئر پورٹ گئی تھی۔

''آئیکت! اب رونا نہیں۔ کسی سے تمھارے یہ آنسو برداشت نہیں ہوتے اور سنو! پاکستان جلد واپس آ جانا۔ کوئی وہاں تمہارا بہت شدت سے منتظر ہوگا۔'' اس نے محبت سے کہا۔

آئیکت نے قدرے حیران کن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ملک منصور تمھیں تم سے بڑھ کر چاہتا ہے۔ تم اس کی زندگی بن چکی ہو اور تمہاری چاہت کے لیے وہ سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔'' وہ سرگوشی کے انداز میں اس کے کندھے پر بازو رکھتے ہوئے بولا۔

آئیکت اس کے لفظوں اور لہجے کے سحر میں گم ہو رہی تھی۔ اس کا اپنا وجود مٹ رہا تھا اور وہ ملک منصور کی ذات میں مدغم ہو رہی تھی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید وہ بھی اندر سے ایسا ہی چاہتی تھی۔ پاکستان میں ایک ماہ کے قیام کے دوران ملک منصور نے اس کی جس طرح پذیرائی کی تھی اور جتنی ہمت بڑھائی تھی اس کے لیے تو اپنی ہستی مٹا دینا بھی کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک پیدا ہوئی مگر شاید وہ جگہ اور وقت نامناسب تھے یا پھر یہ انکشاف اتنا اچانک اور حسین تھا کہ وہ اسٹنڈ ہو کر رہ گئی تھی۔

''تو کیا میں انتظار کروں؟'' ملک منصور نے خدا حافظ کہنے سے پہلے پوچھا۔ وہ گہری سوچوں میں گم تھی۔ فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کی سچویشن میں۔

''بولو آئیکت!'' آئیکت نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ خوش ہو گیا۔

''تھینک یو!'' وہ خوشی سے بولا۔ وہ خوش خوش لوٹ رہا تھا۔ کامیاب و کامران اپنے ہر مشن میں ہمیشہ کی طرف کامیاب...... کچھ لوگوں کی قسمت میں قدرت کامیابیاں و کامرانیاں ہی لکھ دیتی ہے۔ جس چیز میں ہاتھ ڈالتے ہیں وہ آپ ہی آپ سونا بن جاتی ہے ملک منصور نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے اپنا آپ آسمان پر اڑتا ہوا محسوس ہوا۔

......☆......

شزا اپنے آپ کو ہر وقت شمائل کے ساتھ مصروف رکھتی۔ اس کا بہت خیال رکھتی۔ دوائیں وقت پر دیتی۔ باہر گھمانے پھرانے کے لیے لے جاتی مگر وہ ہر وقت خاموش روبوٹ کی طرح گم صم بیٹھی رہتی۔ شزا کچھ پوچھتی تو الٹا پلٹا جواب دیتی۔ ایک بات کے جواب میں دس بے ربط جملے سناتی۔ کبھی عجیب وغریب آوازیں نکالتی تو کبھی عجیب وغریب الفاظ اور محاورے استعمال کرتی اور ان کو نان اسٹاپ دُہراتی رہتی۔ انگلیوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ وہ اپنے آپ سے بالکل لاتعلق ہوتی جا رہی تھی۔ شزا خود اسے کپڑے پہناتی۔ اس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی۔ کافی دنوں کی کیئر اور دواؤں کے بعد وہ اسے ایک دن کچھ بہتر محسوس ہوئی۔ جب اس نے خود کنگھی کی اور ناشتے کی ٹیبل پر مناسب انداز میں ناشتا کیا ورنہ روزانہ کبھی وہ فرائیڈ انڈے کو چائے میں ڈال دیتی تو جیم کو پلیٹ میں انڈے کی طرح پھیلا کر اوپر نمک چھڑکتی اور کانٹے سے کھانا شروع کر دیتی۔ شزا کو ناشتا بھی اسے خود ہی کروانا پڑتا تھا۔ آج وہ اسے دیکھ کر قدرے مطمئن ہوتی تھی۔ اس نے خود ہی سلائس پر جیم لگایا اور آرام سے کھا رہی تھی کہ ملک منصور اچانک آ گیا۔ وہ چار پانچ دن بعد گھر لوٹا تھا۔ شزا اسے یوں اچانک دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ ان دنوں اس نے نہ گھر فون کیا تھا نہ کسی اور طرح کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شزا کو اس پر سخت غصہ تھا۔ بیٹی اتنی بیمار اور اس شخص نے ایک دفعہ بھی اس کو فون کر کے نہیں پوچھا تھا۔

''ہائے ڈارلنگ! کیسی ہو؟'' اس نے شزا کو مخاطب کیا۔ دونوں خاموشی سے ناشتا کرتی رہیں۔ شزا نے کوئی جواب نہ دیا۔

''شمائل! کیسی ہو بیٹا؟''

''ٹھیک ہوں، آپ نے ٹرین کی آواز سنی ہے۔ وسل بج رہی ہے۔'' اس نے ایک دم اٹھ کر ٹرین کی طرح چھک چھک کرنا شروع کر دیا۔ شزا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے پہلے

اسے بالکل ٹھیک سمجھ رہی تھی۔ اب بالکل ابنارمل لگ رہی تھی۔

''اٹس ویری سیڈ!'' ملک منصور بولا۔

''آپ کو اس سے کیا۔ یہ آپ کی اولاد تھوڑی ہے۔'' شزا غصے سے بولی۔

''اچھا یہ انکشاف اب کر رہی ہو۔'' وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

''منصور! کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ آپ اس طرح بی ہیو کر رہے ہیں جیسے وہ آپ کی سوتیلی اولاد ہو۔''

''اوہ آئی سی! اس طرح کہو نا۔ شزا! کیوں ناراض ہو رہی ہو۔ میں مصروف ہی اتنا ہوں کہ میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ اچانک مجھے ایران جانا پڑا۔ وہ پاکستان کے سفیر احمد علی شیروانی کی قریبی رشتے دار کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ مراسم اتنے اچھے تھے کہ اچانک جانا پڑا۔ گھر فون کیا مگر تم مصروف تھیں۔ ظاہر ہے پھر دو دن رہنا پڑا۔ تعزیتی اجلاس ہوا۔ دعائے مغفرت کرانے کے بعد رات کو تو لوٹا ہوں اور اب گھر آ رہا ہوں۔ تم نے اخبارات میں پڑھا تو ہوگا۔'' ملک منصور نے بات توڑ مروڑ کر بتائی۔

''نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''تم کنفرم کر سکتی ہو اگر مجھ پر یقین نہیں۔ بھئی ایسی مصروفیات سے اب انکار بھی نہیں کیا جا سکتا نا۔ اتنی ساکھ بنا کر آپ پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''اور آئیکت بھی آپ کے ساتھ تھی؟'' شزا نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''کون آئیکت؟''

''وہی جس کے اعزاز میں پارٹی دی گئی تھی۔''

''یہ کیا خرافات بک رہی ہو۔''

''مسز زبیر نے فون کر کے مجھے نئے میچ پر مبارکباد دی تھی۔''

''اوہ......شی از اے......!'' وہ بڑبڑایا۔

''خدا کے لیے منصور! کچھ تو شرم کریں۔ کس دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں۔ چھوڑ دیں عورتوں کو ٹریپ کرنا۔ یہ دیکھیں سامنے دیکھیں، خدا کیا کیا آپ کو دکھا رہا ہے۔'' اس نے ہنٹ چھک کی آوازیں نکالتی شائل کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ کی ساری اولاد ایسی ہے...... کب تک ایسی اولادیں پیدا کرتے رہیں گے اور کتنی عورتوں کو اندر ہی اندر تباہ و برباد کریں گے۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''شزا! فضول بکواس کی ضرورت نہیں۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ میں نے جو لبرٹی تمھیں دی ہے اس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ، اپنی حیثیت پہچانو۔ تم کیا تھیں اور کیا ہو؟'' وہ الفاظ چبا چبا کر بولا۔

''میں اپنی حیثیت اچھی طرح پہچانتی ہوں اور اب اس وقت کو کوستی ہوں جب تم سے ملی تھی۔ تم نے میرا اندر چھلنی کر دیا ہے۔ تم نے تو میری دوزخ کا سامان کر دیا ہے کاش...... '' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا مصیبت ہے، گھر آتے ہی چخ چخ۔'' اس نے ہاتھ مار کر سارے برتن ٹیبل سے نیچے پھینک دیے۔ برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سن کر شمائل خوفزدہ ہو گئی اور چیخیں مارتی ہوئی اندر کمرے کی طرف بھاگی اور دروازے کو لاک لگا لیا۔ شزا زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔ ملک منصور دونوں کو چھوڑ کر بیڈروم میں جا چکا تھا۔ شزا رو رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ اس کی آوازیں سن کر سحر کمرے سے باہر نکلی تو شزا اسے دیکھ کر چونک گئی۔ اس کے بال اڑے ہوئے تھے۔ بے حد کمزور اور کالی رنگت۔ نشہ کر کر کے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گہرے ہو گئے تھے۔ اس کا تو کافی دنوں سے اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ جیسے سکتے میں آ گئی۔

''ت...... تم...... تمھیں کیا ہوا ہے؟'' شزا شمائل کو بھول کر اس کی طرف لگ گئی۔

''کچھ نہیں، آپ کیوں شور کر رہی ہیں۔ کیا کوئی مر گیا ہے؟'' وہ نقاہت سے بولی۔

''شمائل نے دروازے کو لاک کر دیا ہے۔''

''تو پھر کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تو سونے دیں۔ اتنا شور، میں تو ڈر ہی گئی۔'' وہ گرتی پڑتی پھر اپنے کمرے میں لوٹ گئی شزا شدید سکتے میں آ گئی۔ اسے قطعی علم نہ تھا کہ سحر کیا کرتی تھی۔ وہ تو ہمیشہ یہی سمجھتی آ رہی تھی کہ وہ ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر یا اس کی آواز سن کر اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی مگر یہاں تو معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ پھر شمائل کو آوازیں دینے لگی۔ اسے باہر کھڑی ہو کر سمجھاتی رہی۔ بہت دیر کے بعد آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ شزا جلدی سے اندر داخل ہوئی۔ شمائل کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ نیچے کانچ کا گلدان ٹوٹا پڑا تھا۔ اس نے مشتعل ہو کر گلدان اپنے سر پہ مار لیا تھا۔ شزا تو سر پیٹ کر رہ گئی۔ جلدی سے اس کا سر دیکھا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں آیا تھا اور کوئی کرچی بھی سر میں نہیں چبھی تھی۔ وہ جلدی سے اس کے سر پر بینڈج لگا کر ایک پرائیویٹ کلینک میں لے گئی۔ وہ سخت پریشان تھی۔ اسے ڈریسنگ کروانے کے بعد وہ گھر لے آئی۔ ملک منصور لائٹ آف کیے پرسکون سو رہا تھا۔ شمائل

کو میڈیسنز کھلا کر اس نے اسے سلا دیا تھا۔ ذادانستہ اس کے قدم سحر کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر جھانکا۔ وہ کارپٹ پر بے ہوش پڑی تھی اور پاس رکھے ایش ٹرے اور اس کے اردگرد سگریٹوں کے ادھ جلے ٹکڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔

اُف خدایا! یہ گھر ہے یا پاگل خانہ...... وہ شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو گئی تھی۔

......✡......

شفق گھر آ چکی تھی اور حیدر اسے بیٹھا سمجھا رہا تھا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے بارے میں اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے آمادہ کر رہا تھا۔ شہلا بھی اس کے ساتھ گھر جا چکی تھی۔

''انکل! میں کیا کروں۔ میں اتنے گناہوں کے بوجھ تلے کیسے جی پاؤں گی۔ میں اپنے ذہن سے سب کچھ جھٹکنا چاہتی ہوں مگر سب کچھ جوں کا توں رہتا ہے۔ میں بہت کمزور اور بے بس ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ آپ ہی بتایئے میرے گناہوں کا کیا کفارہ ہونا چاہیے۔ سہیل اور آصف کے ناحق خون میری گردن پر ہیں جو مجھے ایک پل بھی چین نہیں لینے دے رہے۔'' وہ شدید ذہنی اذیت میں تھی اور جھنجلاتے ہوئے سب کچھ بول رہی تھی۔

''کیا تم نے خود اپنے ہاتھوں سے انھیں قتل کیا ہے؟''

''لیکن وجہ تو میں ہی بنی ہوں۔''

''بہت سی باتوں کی بہت سی وجوہات بنتی ہیں مگر زمانہ اور عقل اسے تسلیم نہیں کرتے ہیں جو حقیقت ہو اور حقیقت کو جو بھی عملی جامہ پہنائے وہی قصوروار ٹھہرتا ہے۔''

''تو بہت سے ایسے گناہ جن کا تعلق صرف اور صرف انسان اور خدا سے ہو جنھیں بندہ اور خدا جانتا ہو تو کیا ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ کیا قدرت انھیں معاف کر دیتی ہے؟''

''تم بھی ٹھیک کہتی ہو لیکن اب تم کیا کر سکتی ہو۔ کیا اپنے آپ کو قتل کر کے تم کسی ایک شخص کو بھی زندہ لا سکتی ہو یا پھر اس طرح کوئی کفارہ ادا کر سکتی ہو تو میں تمھیں ضرور ایسا کرنے کو کہتا لیکن یہ سب بے معنی ہے۔''

''میں اس اذیت سے کیسے اپنے آپ کو نجات دلاؤں جو میں لمحہ بہ لمحہ سہہ رہی ہوں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے میں کس قدر کرب میں ہوں۔''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ ان پچھتاوؤں کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے اگر اس اذیت سے نجات چاہتی ہو تو ان کے خاندانوں کے لیے کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔ یہی ایک طریقہ ہے اور یہی راستہ ہے۔'' حیدر نے کہا تو وہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی جیسے اس کے ذہن کی سوئی کہیں اٹک گئی ہو۔

''ہاں بیٹا، یہی ایک راستہ ہے۔ اپنے آپ کو ان کے لیے وقف کر دو۔ ان کی تکلیفیں کم کرنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ تمھیں معاف کر دیں۔'' حیدر کے سمجھانے پر وہ کچھ سمجھ گئی تھی اسی لیے خاموش ہو گئی۔

''انکل! میں کچھ دن ادھر ہی شہر میں رہنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں ہاں بیٹا، یہ گھر آپ کا اپنا ہے۔ جہاں چاہو رہ سکتی ہو۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

''تھینک یو انکل!'' وہ آہستہ سے بولی اور وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

⁂

ولیم ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا بری طرح کراہ رہا تھا۔ اسے سخت بخار تھا۔ سارے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ باہر شدید ٹھنڈ اور دھند تھی۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک فقیرنی اس کے پاس بیٹھی تھی۔

''اٹھ گیا رے پت! اکھیں تو کھول۔ شکر کر مولا نے تیری جان بخشی کی۔ منے تو سمجھی تو اللہ کو بس پیارا ہی ہو گیا۔ تیری حیاتی تو بس مولا کا کرم ہے۔ ساری رات ٹھنڈے پانی میں ٹانگیں پڑی رہیں، تنے کچھ مالوم ہے۔'' بوڑھی فقیرنی بول رہی تھی اور اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''تو کدھر کو رہے ہے؟'' وہ اس سے پوچھ رہی تھی اور موٹی سی گندی سی رضائی سے اس کی ٹانگیں ڈھانپ رہی تھی۔

''میں کہاں ہوں؟'' وہ آہستہ سے کراہتا ہوا بولا۔

''پت تو فکر نہ کر! تو بس نام پتا بتا دے۔ منے خود تنے گھر سے کسی کو بلاؤں ہوں۔''

''ایک کاغذ پنسل دو۔'' اس نے بمشکل کہا۔ وہ عورت جھگی سے باہر نکل گئی۔ نہ جانے کہاں سے کاغذ کا ٹکڑا اور چھوٹی سی پینسل ڈھونڈ کر لائی اور اسے پکڑائی۔ اس نے بمشکل گھر کا ایڈریس لکھ کر دیا۔

''تو بس لیٹے رہیو۔ میں ابھی آؤں ہوں۔'' وہ کاغذ سنبھال کر باہر نکل گئی۔

''ولیم کل شام سے گھر سے نکلا تھا اور رات بھر گھر نہیں آیا۔ اور اگلے دن کی دوپہر ہو چکی تھی اور اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ شہلا بہت پریشان تھی۔ اس کی طبیعت بھی بہت خراب تھی۔ اس نے حیدر کو فون کر کے بلایا اور وہ ہر جگہ اسے اس کے ایک دو دوستوں کے گھر ہاسٹل ہر جگہ تلاش کر رہا تھا۔ نور بھی فون سن کر پہنچ چکی تھی۔ سب کو حیرت تھی کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ وہ تو مما کی دوائیاں لینے گیا تھا اور خانساماں کی موٹر سائیکل پر گیا تھا البتہ اے ٹی ایم کارڈ اس کے پاس تھا مگر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ شہلا بار بار اپنے آپ سے پوچھتی۔ حیدر اسے تسلیاں دیتا مگر وہ خود بھی اندر ہی اندر پریشان تھا۔ کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔

''انکل! اگر آپ کہیں تو میں اپنے بڑے چچا سے بات کروں۔ وہ پولیس میں ہیں۔'' نور نے مشورہ دیا۔

''نہیں، ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے تھوڑا سا انتظار کر لینے دو۔''

''مگر حیدر! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ وہ تو کبھی بھی کہیں نہیں گیا۔ اسے تو یہاں کے راستوں کا بھی علم نہیں۔ وہ کہاں جا سکتا ہے۔'' شہلا بے صبری سے بستر پر تڑپ رہی تھی۔

''پلیز شہلا! حوصلہ کرو۔ وہ آ جائے گا۔ میرا دل کہتا ہے وہ آ جائے گا۔'' حیدر نے اسے تسلی دی اور کہیں فون ملانے لگا۔ ''میں ابھی اپر لیول پر بات نہیں کر رہا۔ پہلے خود تلاش کر لوں تو پھر۔'' وہ باہر جانے لگا تو شہلا نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اسے کہاں ڈھونڈو گے؟''

''میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ وہ فقیرنی کاغذ کا ٹکڑا لیے گیٹ پر کھڑی تھی۔ وہ اسے بھکارن سمجھ کر جیب سے پیسے نکالنے لگا۔

''نہ صاحب جی! میں تو تیرے پت کی خبر لاؤں ہوں۔ وہ سویرے سے امارے پاس ہے۔ مولا نے کرم کیا وہ بچ گیا۔ وہ تو امارے سائیں نے اسے چھپڑ میں دیکھ لیا۔''

''چھپڑ میں؟'' حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

''آں...... آں...... ساری رات نمانے کی ٹانگیں ٹھنڈے برف پانی میں ڈبی رئیں۔ اس کو گھر لے آؤ۔ مولا جانے چل بھی سکے ہے کہ نئیں۔''

''کیا مطلب؟'' حیدر چونک گیا۔

''خود ای چل کے دیکھو، امیں تو کچھ نہیں مالوم۔''

''اچھا گاڑی میں بیٹھو۔'' حیدر نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ نور بھی باہر آ چکی تھی۔

''انکل! کیا کچھ معلوم ہوا؟'' وہ فقیرنی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں اور شاید وہ ٹھیک نہیں۔''

''انکل میں آؤں؟''

''نہیں، تم شہلا کے پاس رہو۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ اکیلی بھی ہے۔ اس کو بتاؤ کہ میں ولیم کو لینے جا رہا ہوں۔'' حیدر نے کہا تو وہ خاموشی سے اندر چلی گئی۔ اس نے شہلا کو بتایا تو اسے قدرے سکون ملا۔

وہ فقیرنی حیدر کو اندر جھگی میں لے گئی۔ ولیم کو اس حالت میں دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور اس فقیرنی نے اس کے سر پر ملگجا سا کپڑا باندھا تھا۔

''ولیم بیٹا! کیا ہوا؟'' حیدر نے پیار سے کہا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''انکل! میں کہاں ہوں؟''

''اٹھو بیٹا! میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ گھر چلو۔ تمہاری مما بہت پریشان ہیں، ہمت کرو۔'' حیدر نے رضائی پیچھے کی اور اسے سہارا دے کر اٹھانا چاہا مگر اس کی دونوں ٹانگیں تو جیسے سن ہو گئی تھیں۔ ان میں بالکل حرکت باقی نہیں تھی۔ حیدر کو شدید شاک لگا۔ اس نے خود اس کے پاؤں زمین پر رکھے اور اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر اگلے ہی لمحے وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ حیدر جیسے صحت مند توانا شخص سے بھی اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

''اماں! کوئی بندے باہر ہیں تو ان کو بلاؤ۔ اسے گاڑی تک لے جائیں۔'' حیدر نے فقیرنی سے کہا۔

''جی صاحب جی!'' وہ باہر نکل گئی اور دو تین جوان لڑکوں کو باہر سے بلا لائی جنھوں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ ولیم قد کاٹھ میں سب سے لمبا تھا۔ اگرچہ دبلا پتلا تھا مگر پھر بھی اسے اٹھانا قدرے مشکل ہو رہا تھا۔ حیدر نے فقیرنی کو کچھ پیسے دیے اور اس کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔ اس نے گاڑی کا رخ ایک پرائیویٹ اسپتال کی طرف موڑا۔ ڈاکٹروں نے فوراً اس کو ایڈمٹ کر لیا۔ اس کے ٹیسٹ لیے جا رہے تھے۔ بخار کم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس نے گھر فون کر کے نور کو صورتِ حال بتائی کہ ولیم کو بخار ہے اس لیے وہ اسے اسپتال لے آیا ہے۔ اسے خود ایک اہم میٹنگ کے لیے بھی جانا تھا۔ اس نے اپنے پی اے کو وہاں بلا لیا اور خود میٹنگ اٹینڈ کرنے چلا گیا۔ رات گئے وہ وہاں سے لوٹا تو ولیم ابھی تک بے ہوش تھا۔ حیدر نے سرجن سے ملاقات کی اور اس کی ٹانگوں کے بارے میں پوچھا۔

''حیدر صاحب! آئی ایم سوری...... رپورٹس کچھ ہوپ فل نہیں۔ شاید ساری رات شدید ٹھنڈ اور ٹھنڈے پانی میں رہنے کی وجہ سے ان میں حرکت باقی نہیں رہی۔ وہ سن ہو چکی ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا مگر فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔ سچویشن کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں چھپی مایوسی کو اس نے محسوس کر لیا۔ اسے سخت افسوس ہو رہا تھا کہ وہ شہلا کو کیسے سب کچھ بتائے گا جبکہ وہ خود انتہائی سیریس حالت میں بستر پر ہے۔

''ٹھیک ہے، آپ علاج جاری رکھیے۔ کیا فزیوتھراپی سے کچھ ممکن نہیں؟''

''میں نے کہا نا ہم ہر ممکن طریقے سے کوشش کریں گے کہ وہ نارمل ہو جائے لیکن اس کے لیے وقت درکار ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

اس نے اگلی صبح فون کر کے نور کو اسپتال بلایا اور اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی بے حد پریشان ہو گئی۔ اس کے لیے بھی یہ ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسی اُفتاد اس پر آ پڑے گی۔

''انکل! لیکن یہ سب کیسے ہوا؟''

''معلوم نہیں، میں نے تو اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ شدید بخار میں تھا۔ اب پوچھتے ہیں مگر جو بھی ہوا بہت برا ہوا ہے۔'' حیدر کے چہرے پر بھی افسردگی اور مایوسی چھائی تھی۔ ولیم آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہا تھا۔

''ولیم کیسے ہو؟'' نور اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لا کر بولی۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''لیکن بیٹا! تم کہاں گئے تھے اور یہ سب کیا ہوا؟''

''انکل! میں اے ٹی ایم کارڈ سے پیسے لینے کیبن میں گیا تو وہاں پہلے ہی ایک شخص موجود تھا۔ میں نے خیال نہ کیا اور پیسے نکالنے لگا۔ اس نے شاید اماؤنٹ دیکھ لیا یا پھر کیا ہوا مجھے سمجھ نہیں آیا۔ اس نے مجھ سے کارڈ چھیننے کی کوشش کی۔ میں باہر بھاگا اور موٹر سائیکل تیزی سے چلانے لگا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کے کتنے ساتھی میرا پیچھا کر رہے تھے۔ ایک دم پورا گینگ میرے پیچھے پڑ گیا۔ میں اندھا دھند موٹر سائیکل دوڑاتا رہا کہ ایک لڑکا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کارڈ چھینا اور پھر کسی نے میرے سر پر کچھ مارا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ آنکھیں کھلیں تو اس فقیرنی کی جھونپڑی میں تھا اور وہی بتا رہی تھی کہ کسی جوہڑ

کے ٹھنڈے یخ پانی میں میری ٹانگیں ساری رات پڑی رہی تھیں۔ جسم باہر تھا۔ انکل! میری ٹانگیں حرکت نہیں کر رہیں۔ کیا اب......؟'' اس نے استفہامیہ نگاہوں سے حیدر کی طرف دیکھا۔

''نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں۔ میری ابھی سرجن سے بات ہوئی ہے اور وہ بھی یہی کہہ رہے کہ یہ وقتی پرابلم ہے۔ تم اپنی وِل پاور سے جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس کوشش کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' حیدر نے اسے تسلی دی مگر نور کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے شدید صدمہ ہو رہا تھا۔ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا مگر وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ تو خود اسے ہمیشہ تسلی دیتی آ رہی تھی اب کیسے اس کے سامنے حوصلہ ہار دیتی۔

دو تین دن بعد ولیم کو وھیل چیئر پر بٹھا کر گھر لے جایا گیا۔ اسے اپنی اس بے بس حالت پر شدید دکھ ہو رہا تھا۔ شہلا اسے یوں دیکھ کر جیسے سکتے میں آ گئی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی ولیم کی طرف دیکھتیں تو کبھی وھیل چیئر کی طرف......سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش رہیں۔ کبھی نور کی طرف دیکھتیں، کبھی حیدر کی طرف تو کبھی ولیم کی طرف۔

''ولیم بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں نے بہت تسلی دی ہے۔ بس چند ہفتوں کی بات ہے۔'' حیدر قدرے اونچی آواز میں بولے۔

''انکل! چند ہفتے......تو کیا میں ایسے ہی رہوں گا؟'' ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا، مجبوری ہے۔'' حیدر سمجھانے کے انداز میں بولے۔

''مگر پھر بھی کب تک؟'' ولیم جاننے پر مصر تھا۔

''یہی دو تین ہفتے۔'' حیدر نے اس سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

اس کے لیے یہ بے بسی اور صدمہ برداشت کرنا قطعی مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تو بچپن سے اپنے آپ کو فضاؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کرتا آیا تھا۔ جہازوں کو اُڑاتا ہوا، پرندوں کے سنگ پرواز کرتا ہوا اور جب فادر نے روح کی پرواز کی بات کی تو اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اتنی اُڑانیں بھرنے والا، زندگی اور انسانوں کو بہت اونچائی سے دیکھنے والا یکدم زمین پر رینگتے کیڑے کے مانند آ گرا تھا۔ اتنی بے بسی کہ دو قدم چلنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ دوسروں کا سہارا بننے کا خواب دیکھنے والا خود بے آسرا ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو وہ آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ کھولتا تو آنسو اشک بن کے بہہ نکلتے۔ وہ جن شدید جذبات سے دوچار ہو رہا تھا اس نے اس کو اندر سے بے حد کمزور اور کھوکھلا کر دیا تھا۔ کاش وہ زندہ نہ بچتا۔

ایسی بے بسی کی زندگی سے تو موت بہتر تھی۔ وہ بارہا اپنے دل میں دعا کرتا۔ کیسی بے چارگی تھی۔ ماں بسترِ مرگ پر تھی اور وہ اپاہج بنا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ زندگی کی سانسیں دونوں کے لیے مشکل ہو رہی تھیں مگر اس گاڑی کو دونوں کھینچ رہے تھے۔

اگر نور اور حیدر انکل نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ وہ اکثر ان دونوں کی تیمارداری سے متاثر ہو کر سوچتا۔ وہ شخص پہلے مما کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اب وہ اسے بھی ہاسپٹل لے کر جاتا تھا۔ ایک مستقل اٹینڈنٹ کریم خان انھوں نے اس کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ وہ ہر روز اس کی ٹانگوں کی مالش کرتا۔ اس کو ایکسرسائز کرواتا اور فزیوتھراپی کے لیے وہی اب اسے ہاسپٹل لے کر جاتا۔ نور ہر روز اس کا حال پوچھنے آتی۔ اس کے لیے اور مما کے لیے کھانے بناتی۔ اس کے تھرڈ ایئر کے ایگزامز بھی ہونے والے تھے مگر وہ ان دنوں بھی روزانہ چکر لگاتی۔ اسے حوصلہ دیتی مگر اب اس سے ناراض نہیں ہوتی تھی۔

پانچ ہفتے گزر گئے تھے نہ فزیوتھراپی کا اثر ہو رہا تھا اور نہ دوائیوں کا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، ولیم کا ڈپریشن بڑھتا جا رہا تھا۔ مما اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔ بستر پر لیٹی اندر ہی اندر نہ جانے کیا کچھ سہتیں۔ وہ کیموتھراپی کے چار کورس کروا چکی تھیں اور اب ان کا دل مزید اس کے بارے میں سوچ کر گھبرانا شروع ہو جاتا تھا۔ اتنی اذیت سہتے سہتے وہ نڈھال ہو گئی تھیں۔ پورے جسم کی جلد جیسے جل چکی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رگوں میں دوڑنے والا خون بھی جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔ سر پر بال تھے نہ آنکھوں اور بھوؤں پر۔ انھیں دیکھ کر خوف سا آتا تھا اور ولیم کو دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔

ولیم اب بہت جھنجلانے لگا تھا۔ شہلا کے ساتھ بھی بدتمیزی سے بات کرتا اور کریم خان کو تو اکثر مارنے کو لپکتا اور اکثر غصے میں کوئی نہ کوئی چیز اپنے آپ کو مار لیتا۔ حیدر اس کی وجہ سے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ نور امتحانات کے بعد فارغ ہو کر اِدھر ہی آ گئی تھی۔ انور چچا اس پر بہت برسے تھے مگر وہ کسی کی پروا کب کرتی تھی۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتی تھی، کر کے رہتی تھی اور ایسا کرنے کو حیدر انکل نے کہا تھا کیونکہ ولیم کی حالت روز بروز بگڑ رہی تھی اور حیدر انکل کو منسٹر ہونے کے ناتے ایک میٹنگ کے سلسلے میں پیرس جانا تھا۔ ان کا وہاں قیام دس روزہ تھا اس لیے انھوں نے نور کو وہاں رہنے کو کہا۔ شیر شاہ کو بھی انھوں نے وہاں ان کی دیکھ بھال کے لیے بھیج دیا۔ وہ ہر روز دن میں دو تین دفعہ فون کرتے۔ ولیم اور شہلا کی خیریت پوچھتے۔ کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ بتا دیتی۔

ولیم زیادہ تر اندھیرے کمرے میں بند رہتا۔ اس نے اب فزیوتھراپی کے لیے بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ کریم خان کو بھی کمرے میں نہیں آنے دیتا تھا۔ نہ وھیل چیئر پر بیٹھتا، نہ مما کے پاس جاتا اور نور سے بھی اکھڑا اکھڑا رہتا۔ نور اس کے لیے سوپ بنا کر لائی تھی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی تو وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نور کو دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''ولیم اٹھو! سوپ پی لو۔'' نور نے اس کے بیڈ کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہا۔

''ولیم اٹھو نا!'' اس نے اس کا بازو آہستہ سے پیچھے کیا۔

''مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔'' وہ غصّے سے چلایا تو وہ چونک گئی بلکہ قدرے ڈر بھی گئی۔ وہ تو ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا۔ وہ ضدی تو ہو رہا تھا مگر اتنا زیادہ، اسے قطعی توقع نہیں تھی۔

''ولیم! میں کہہ رہی ہوں اٹھو۔'' وہ بھی اپنی بات پر بضد تھی اس نے اس کا بازو مضبوطی سے پیچھے ہٹایا۔

''ہاں دیکھ لو میری بے بسی، مجھ اپاہج، لولے، لنگڑے کو دیکھ لو۔ بار بار اٹھنے کو کہہ رہی ہو، کیسے اٹھوں؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گیا۔

''ولیم! تم اس قدر جلدی ہمت ہار جاؤ گے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''کیا ابھی بھی جلدی ہے، مجھے دو ماہ ہو گئے ہیں اس طرح بستر پر ایڑیاں رگڑتے، اس جسم کو گھسیٹتے گھسیٹتے۔ نور! تم مجھے شوٹ کیوں نہیں کر دیتی۔ پلیز مجھ پر احسان کرو۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا! نور تمھیں شوٹ کر دے۔ نور جو تم سے محبت کرتی ہے۔ دن رات تمہاری صحت کے لیے دعائیں کرتی ہے۔ وہ خود تمھیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دے۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''کیا تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، پہلے سے بھی زیادہ۔''

''نہیں، تم محبت نہیں ہمدردی کر رہی ہو۔''

''ٹھیک ہے، ہمدردی بھی ان کے ساتھ کی جاتی ہے جن کے لیے دل میں محبت ہو

اور میں تم سے محبت بھی کرتی ہوں اور ہمدردی بھی، سمجھے تم!''

''کیا ابھی بھی مجھ جیسے اپاہج انسان کے ساتھ؟''

''ہاں، تم میری محبت کو کسی بھی شے میں نہ تول سکتے ہو نہ ناپ سکتے ہو اور میں تمھیں اپاہج نہیں صرف اور صرف ایک اچھا انسان سمجھتی ہوں۔ ایسا جس کو میں نے سب سے بڑھ کر چاہا ہے اور چاہتی رہوں گی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''تم کب تک ایسا کرتی رہو گی؟''

''جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے اور اپنے پاؤں پر نہیں چلتے۔''

''میں اب کبھی بھی نہیں چل پاؤں گا۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ یہی حقیقت ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''لیکن میں کہتی ہوں تم جلد چل پاؤ گے اور مجھے نہ صرف یقین ہے بلکہ یہ میرا ایمان بھی ہے۔'' وہ مصمم ارادے سے بولی۔

''تم حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کرتیں؟''

''میں صرف خدا پر ایمان رکھتی ہوں۔ ساری سچائیاں، ساری کرامتیں اور معجزے اس کی ذات سے وابستہ ہیں۔''

''تمہارا خدا مجھے کبھی ٹھیک نہیں کرے گا۔''

''کیوں، اس کی تم سے کیا دشمنی ہے؟'' وہ مسکرا کر بولی۔

''کیونکہ میرا نہ اس پر ایمان ہے اور نہ اپنے خدا پر۔''

''تو پھر کس پر ہے؟''

''کسی پر نہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں بحث نہیں کرتی۔ مجھے تو جس پر پورا یقین اور اعتماد ہے اس تک تو رسائی کرنے دو پھر دیکھتے ہیں کون کس کو چھوڑتا ہے۔'' وہ پُر یقین لہجے میں بولی۔

''تم کیا کرو گی؟''

''ابھی تو تم سوپ پیو گے۔ آج سے میں ایک وظیفہ پڑھوں گی اور پھر تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' وہ پُر اُمید ہو کر بولی۔

''ہونہہ! یہ کہنا کس قدر آسان ہے۔''

''اس کے لیے کرنا اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔ وہ صرف ''کن'' کہتا ہے اور زندگی وجود میں آ جاتی ہے۔ گارے کے کھنکتے ہوئے وجودوں میں روحیں پھونکتا ہے اور پھر ان روحوں کو قبض بھی وہی کرتا ہے۔'' وہ بول رہی تھی اور وہ محو ہو کر سن رہا تھا۔

''اب جلدی سے سوپ پیو۔ بس ایگریسو ہونا چھوڑ دو میرے لیے، کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔'' نور نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر محبت سے کہا۔

''تمھارے لیے...... تمھارے لیے۔'' وہ خاموش ہو گیا اور اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر سسکنے لگا۔

''میں تمھیں یوں سسکتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ صرف میری خاطر ناراض ہونا اور مایوس ہونا چھوڑ دو۔ کوئی بھی شکوہ، کوئی بھی دکھ اور ناراضی تمھاری باتوں اور لہجے سے نہ چھلکے۔ وعدہ کرو تم آئندہ ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ تم تنہا نہیں ہو۔ میں زندگی کی آخری سانسوں تک تمھارے ساتھ ہوں۔ اگر تم اپاہج بھی رہے تو تمھاری بیساکھی بنوں گی اور جب تم چلنا شروع کرو گے تو تمھارے ہر قدم کے ساتھ میرا قدم اٹھے گا۔ معذور انسان کو یہی مایوسی ہوتی ہے نا کہ وہ زندگی میں تنہا رہ جائے گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے تم کبھی بھی زندگی میں تنہا نہیں رہو گے اور نور جو بات کہتی ہے وہ کرتی بھی ہے بشرطیکہ......'' وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''بشرطیکہ کیا؟''

''اگر خدا بھی ایسا چاہے۔ جب وہ نہیں چاہتا تو انسان شدید جذبوں اور خواہشوں سمیت بھی کچھ نہیں کر پاتا۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ وہ نور کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے بہت پُرامید ہوا تھا اور دوسری بات سن کر ایک دم پھر تاریکی کی طرف جانے لگا۔ مایوسی کا سایہ اس کے چہرے پر لہرانے لگا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''تم...... تم مجھ سے جدا نہ ہونا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔''

''ڈونٹ بی سلی! ہم دونوں دنیا میں تنہا آئے تھے اور تنہا ہی جانا ہے۔ تم حقیقت پسند بنو۔''

''تم مجھے الجھاتی ہو۔ جب میں حقیقت پسند ہو کر سوچتا ہوں تو تم مجھے خواب دکھاتی

ہو اور جب میں خوابوں میں کھونا چاہتا ہوں تو تم تلخ حقیقت کی باتیں کرتی ہو۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ ایسا کیوں کرتی ہو؟''

''کیونکہ میں ایسی ہی ہوں۔ میں نے زندگی کے دونوں رُخ دیکھے ہیں اس لیے میری سوچ بھی ایسی ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''اب تم سوپ پی لو۔'' نور نے باؤل اس کے آگے کیا اور وہ خاموشی سے سوپ پینے لگا۔

''تم پڑھائی کیوں نہیں شروع کرتے۔ وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟'' نور برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

''بہت مشکل ہے۔ اب میرا ذہن کمپوزڈ نہیں رہا۔''

''یہ کوئی لاجک نہیں۔ کل سے پڑھائی شروع کرو۔ وقت بہت قیمتی ہے۔ انسان کو وقت کی قدر کرنی چاہیے۔'' وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور ولیم اس کی باتوں کو ذہن میں دُہرانے لگا۔ نور بہت پازیٹو ہے۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا۔

رات گئے وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اس کے کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری، چھوٹی سی عربی میں کتاب تھی اور ایک گلاس پانی کا تھا۔ ولیم بہت دنوں کے بعد ایک کتاب کھول کر بیٹھا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ولیم نے اسے مخاطب کرنا چاہا مگر اس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور چھوٹی کتاب سے پڑھنا شروع ہو گئی۔ ڈائری سے جیسے وہ ہدایات لے رہی تھی اور پھر پانی پر پھونک مارتی پھر اس کی ٹانگوں پر پھونکیں مارتی۔ ولیم حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انہماک، اس کا سراپا، سفید چادر میں ملبوس، ملکوتی حسن لیے، عقیدت سے آنکھیں بند کیے وہ اسے اس وقت بہت مختلف لگ رہی تھی۔ اس نے تین دفعہ یہ عمل دُہرایا اور پھر پھونک مار کر پانی اسے پینے کو کہا۔

''اس میں کیا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''میرا ایمان اور تمہاری صحت کی دعا۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' وہ بے اعتبار سے لہجے میں بولا۔

''کوئی فضول بات نہیں ہوگی۔ بس تم اسے پیو گے۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولی اور اسے پانی پینا پڑا۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

ولیم اس کی محبت اور لگن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے ایک دم شدت سے احساس ہونے لگا کہ وہ واقعی تنہا نہیں تھا۔ اتنی محبت، اتنی چاہت، اتنا خلوص...... اس لڑکی نے تو اپنا گھر بار اس کے لیے اور اس کی مما کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہ جذبوں کو سمجھتی تھی۔ چاہتیں نچھاور کرنا جانتی تھی۔ ہر ایک کا درد اپنے دل میں محسوس کرتی تھی، وہ کس قدر محترم ہے۔ کس قدر پیاری ہے۔ ولیم کے دل میں اس کی چاہت کے لیے ایک نیا در وا ہوا۔ اس سے قبل وہ اس کو چاہتا تھا مگر اس کو احساس تھا کہ چرچ جوائن کرنے کے بعد وہ اسے چھوڑ دے گا۔ جدائی کی سوچ اس نے ہمیشہ ذہن میں رکھی تھی اس لیے وہ کوئی بھی قدم بڑھانے سے گریزاں تھا لیکن جب سے اس نے زندگی کی مایوسیوں میں قدم رکھا تھا...... اس کا کیریئر، مستقبل سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے وجود کی شناخت مبہم تھی۔ نور اس موڑ پر اسے اپنے قریب، بہت قریب محسوس ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ پہلے وہ اس سے صرف محبت کا دعویدار تھا اور اب پوزیسو محبت کا علمبردار بنتا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اس سے دور ہو، یہ سوچنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ جب کبھی وہ گھر جانے کا کہتی تو وہ بار بار یہی پوچھتا۔ ''کب آؤ گی؟'' اور وہ مسکرا دیتی۔ وہ اس کی ضرورت بنتی جا رہی تھی۔ محرم راز یا پھر کچھ اور...... وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ہر جذبہ ابھی پروسیس میں تھا۔

نور نے کتابوں کا ڈھیر لا کر انھیں کین کے ریک میں لگا دیا تھا اور ہر چیز اس کے بیڈ کی سائیڈ پر ترتیب دے دی تھی۔ ایک بیل بھی پاس رکھ دی تاکہ جب وہ کمرے سے باہر ہو وہ اسے بیل بجا کر بلا لے۔ اس نے کمپیوٹر، ٹی وی، ڈی وی ڈی، ہر چیز اس کے کمرے میں اور اس کی پہنچ میں قرینے سے رکھی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت مما کے پاس رہتی اور گاہے بگاہے اس کے پاس آتی۔ اسے پڑھتا ہوا یا مصروف دیکھ کر وہ کمرے سے باہر نکل جاتی۔ اس نے واقعی پڑھنا شروع کر دیا تھا اور جب سے پڑھنا شروع کیا تھا ڈپریشن بھی کم ہو گیا تھا۔ وہ ہر رات مخصوص وقت پر کمرے میں آتی۔ کچھ پڑھ کر پھونکتی۔ اسے پانی پلاتی اور چلی جاتی۔ ہر پھونک کے ساتھ اس کے دل میں اس کے لیے محبت کا نیا جذبہ بیدار ہوتا اور وہ جذبہ مزید تقویت پکڑتا۔

حیدر دس دن کے بعد آ گئے تھے اور وہ دیکھ کر کافی خوش ہوئے تھے کہ ولیم میں کافی پازیٹو چینج آیا ہے۔ وہ جس طرح سوچ کر آئے تھے اس کے برعکس وہ انھیں مسکراتا ہوا ملا مگر شہلا کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے تھے۔ وہ بس چراغِ سحری لگ رہی تھی۔

''نور بیٹا تھینک یو! آپ نے ان لوگوں کو بہت سنبھالا ورنہ میں پریشان ہو رہا تھا

اور ہاں تمھیں ایک خوشخبری سنانی تھی۔'' حیدر نے پُر امید ہو کر بتایا۔

''جی انکل!''

''میں ولیم کا کیس جرمنی میں بھی ڈسکس کر کے آیا ہوں۔ انھوں نے ففٹی پرسنٹ امید دلائی ہے۔ آگے دیکھو جو خدا کی مرضی۔ یہاں تو ایک پرسنٹ کی امید بھی نہیں تھی اور دیکھو اتفاقاً مجھے پیرس سے جرمنی جانا پڑا۔''

''واقعی انکل!'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''ہاں مگر ابھی تم ولیم سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ ایسی بات سن کر انسان کی امید بندھ جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ کچھ اور ہو جائے تو پھر ڈپریشن سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' حیدر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے انکل!''

''اب تم گھر جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ تمھارے گھر والے کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔''

''ہاں، انور چچا کا موڈ کچھ آف تھا لیکن میں رات کو چکر لگایا کروں گی۔ وہ دراصل میں نے ولیم کے لیے ایک وظیفہ شروع کیا ہے۔ اس کے لیے مجھے آنا پڑے گا۔'' وہ اپنی ہی لے میں بولی تو حیدر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے اور پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیلی۔

''بہت محبت کرتی ہو اس سے؟'' حیدر نے پوچھا۔ وہ جواباً خاموش رہی اور سر جھکا لیا۔

''خدا کرے جس کو تم چاہتی ہو وہ تمہارا ہی بنے۔ اگر انسان سمجھے تو دنیا میں یہ خدا کی طرف سے بہت بڑی عطا ہے۔'' حیدر کی آواز بھرا گئی اور انھوں نے بمشکل تھوک نگلا۔ نور کو کچھ کچھ اندازہ تھا مگر آج حیدر کی زبان سے ایسی باتیں سن کر وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

''انکل میں جاؤں؟'' وہ اب مزید وہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔

''ہاں بیٹا شکریہ!'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ وہ جا چکی تھی۔ گھر سونا سونا لگ رہا تھا۔ سب اس کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ اس کے وجود کی خوشبو ہر طرف رچ بس گئی تھی۔

⁂

آئیکت کے لیے اب گھر میں رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ بھائی جاب پر چلا جاتا۔ بہن اپنے گھر جا چکی تھی۔ وہ گھر میں تنہا بیٹھی مما کو بہت مس کرتی۔ ہر روز ملک منصور کے فون کا وہ شدت سے انتظار کرتی۔ وہ صبح سویرے اسے ضرور فون کرتا پھر رات کو۔ وہ اس کی باتوں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے لہجے کی مٹھاس میں وہ اپنا پور پور معطر محسوس کرتی۔ ملک منصور

اسے پاکستان آنے کے لیے کہہ رہا تھا ہمیشہ کے لیے اور اس ہمیشگی پر وہ بار بار سوچ رہی تھی۔ وہ دوراہے پر کھڑی تھی۔ اس نے بھائی بہن سے مشورہ کیا تو دونوں نے ملک منصور کے حق میں ووٹ دے دیا۔ وہ ملک منصور سے مل چکے تھے اور اس سے بہت متاثر تھے مگر آئیکت گہری سوچ میں تھی۔ اس نے پاکستان میں رہ کر سیاست پر جتنی ریسرچ کی تھی اس نے اس کے ذہن میں بہت سے شبہات پیدا کر دیے تھے۔ اس کی پاکستان کی سیاست پر گہری نظر تھی اور یہاں کے سیاستدانوں سے بھی اچھی طرح واقف تھی اس لیے وہ ملک منصور کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنا اس کے لیے نہ جانے کیوں مشکل ہو رہا تھا۔

وہ ملک منصور کی ہر ہر بات، لہجے اور الفاظ کو ذہن میں دُہراتی۔ انھیں جانچنے کی کوشش کرتی۔ اسے کہیں بھی ملک منصور میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ وہ شخص واقعی اس قابل ہے کہ اس پر اعتبار کیا جائے لیکن اس کی ذاتی زندگی...... نہیں جو جذبوں کو سمجھنے والا ہو، محبت کی زبان تک جسے رسائی ہو اور جو پذیرائی کے فن سے بھی شناسا ہو وہ کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ سوچ کر خود ہی مسکرا دی۔ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اس نے بالآخر فیصلہ کر لیا تھا۔

اس نے موبائل پر نمبر ملایا۔ ملک منصور اس وقت باتھ روم میں تھا اور ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ ورنہ وہ اکثر موبائل باتھ روم میں ساتھ لے جاتا تھا۔ نہ جانے آج کیسے بھول گیا تھا۔ شزا بیڈ روم میں داخل ہوئی تو موبائل بج رہا تھا۔ اس نے اٹھایا تو آئیکت بول رہی تھی۔

''ہیلو! میں آئیکت بول رہی ہوں۔ ملک منصور کہاں ہیں؟'' اس نے شستہ انگریزی میں پوچھا۔

''وہ مصروف ہیں۔''

''اچھا انھیں بتا دیجیے کہ میں آج شام کی فلائٹ سے پاکستان آ رہی ہوں۔'' اس نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ شزا نے جلدی سے اپنے موبائل پر اس کا نمبر ایڈ کیا اور موبائل رکھ دیا اور باہر نکل گئی۔ ملک منصور باتھ روم سے نکلا تو نمبر دیکھنے لگا اور فوراً اس کا نمبر ملایا۔

''ہیلو ڈارلنگ! سوری میں بزی تھا۔'' وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''ہاں، مجھے معلوم ہے اسی لیے اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ میں آج شام کو پاکستان آ رہی ہوں۔'' وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

''رئیلی! تھینک یو سوئیٹ ہارٹ...... ویلکم ویلکم! کب سے یہ آنکھیں تمہاری منتظر ہیں۔ آئی لو یو سو مچ!'' وہ مسکراتے ہوئے بولا اسی لمحے شزا کمرے میں داخل ہوئی تو ملک منصور نے اپنا لہجہ بدلا اور گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے شیروانی صاحب! میں ایئرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔ ہاں ہاں بھائی، آپ میرے ہی مہمان ہیں۔ آپ کو لینے میں خود آؤں گا۔'' اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ شزا نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ ملک منصور! تم اور تمہاری مکاریاں، کیسے کیسے دھوکے دیتے ہو۔ وہ بے وقوف لڑکی بھی اب اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلی ہے۔ تم بہت مکار انسان ہو۔

''کون آ رہا ہے؟'' شزا دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''وہ میں نے بتایا تھا نا، ایران میں جو میرے دوست ہیں شیروانی صاحب، وہ کچھ روز کے لیے یہاں آ رہے ہیں۔''

''اچھا تو کیا یہاں میرا مطلب ہے گھر میں ٹھہریں گے؟''

''یہاں...... یہاں؟ کم آن شزا! اس گھر میں یہ تو فقیروں اور سر پھروں کا ٹھکانا ہے۔ یہاں تو کوئی دو دن نہیں رہ سکتا۔''

''رئیلی منصور! یہ آپ کہہ رہے ہیں۔ شکر ہے آپ کو آج اندازہ تو ہوا کہ یہ کن کن لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ اس میں مزید اضافہ کر لیں۔ یہ اب پاگلوں اور نشئیوں کا بھی ٹھکانا ہے۔''

''کون؟'' ملک منصور ایک دم چونکا۔

''آپ کی بہو صاحبہ ایڈکٹڈ ہیں۔''

''اوہ نو! اس غلاظت نے یہ کام بھی شروع کر لیے۔ شزا! بس اس کو یہاں سے نکالو۔ میرے گھر کو گندگی کا ڈھیر بنا دیا ہے اس نے۔''

''نہیں...... میں یہ نہیں کر سکتی۔'' وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ آفاق کی بیوی ہے اور میں کسی کے ساتھ بھی کوئی ٹسل نہیں چاہتی۔''

''اچھا، مجھے جلدی جانا ہے۔ تم ناشتا لگواؤ۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور ایٹرنٹی کا بھرپور اسپرے اپنے اوپر کیا۔ وہ اس کی بات سن کر دل مسوس کر رہ گئی۔ ملک منصور! اُف تمہاری مکاریاں اور چالاکیاں...... اس نے دل میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ملک منصور، آئیکت کو ریسیو کرنے کے لیے آدھا گھنٹا پہلے ہی ایئر پورٹ پہنچ گیا تھا۔ اس نے گاڑی میں ہر طرف پھولوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ ایسی پذیرائی تو اس نے آج تک کسی اور کی نہیں کی تھی۔ وہ خود بھی حیران تھا۔ جب شزا اس کی زندگی میں آئی تھی تو اس نے سوچا تھا اب اور کوئی نہیں۔ اس کے بعد کتنی لڑکیوں سے مراسم بڑھے مگر شادی کے لیے صرف آئیکت پسند آئی۔ وہ بلیک اور آف وائٹ اسکرٹ اور کوٹ میں بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس کے بلونڈ شارٹ ہیئر اور فیس کٹ بہت حد تک لیڈی ڈیانا سے ملتے تھے۔ کوئی ایک دفعہ دیکھتا تو چونک کر دوبارہ ضرور دیکھتا۔ ملک منصور سگار سلگائے بھاپ اڑاتی یخ رات میں بھی اپنے اندر ایک حرارت اور مہک سی محسوس کر رہا تھا۔ آج کل اسے نہ سیاست کی فکر تھی اور نہ ہی کوئی اور سوائے آئیکت کے۔

''ویلکم ڈارلنگ!'' اس نے اسے آہستہ سے کہا کیونکہ اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے اور ملک منصور ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ وہ پریس سے نہیں ڈرتا تھا بلکہ پریس اس سے ڈرتا تھا۔ کوئی بھی ایسی خبر جو ملک منصور کو ناراض کرتی تو پھر اس کے بعد اس اخبار کے ایڈیٹر سمیت کسی کی بھی خیر نہ ہوتی۔ وہ اس گندی مچھلی کی طرف کنڈی ڈالنے سے پہلے ہزار دفعہ سوچتے لیکن پھر بھی وہ محتاط رہتا۔

ملک منصور نے جیسے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا تو مدہوش کرنے والی پھولوں کی خوشبو نے آئیکت کا بھرپور استقبال کیا۔ وہ چونک گئی۔ گاڑی میں ہر طرف رنگ برنگے پھولوں کے گلدستے بڑے قرینے سے رکھے تھے۔ گاڑی کے فرش اور سیٹوں پر گلاب کی پتیوں کا ڈھیر تھا۔ ایسی پذیرائی، ایسی محبت...... اس نے محبت اور حیرت سے ملک منصور کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ اور آنکھوں سے جھلکتی مستی نے اسے اور مسرور کر دیا۔

''اتنا سب کچھ......؟'' وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی اور گاڑی کی سیٹ سے پتیاں صاف کرتے ہوئے بیٹھی۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں آئیکت! اس دن کا سوچو جب تم مسز منصور بن کر ملک منصور کے دل کے تاروں کو چھیڑو گی اور پھر اس دھرتی پر تم اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرو گی۔ ہر شے تمھارے قدموں میں ہوگی۔ تم نے مجھے بہت خوش کیا ہے۔'' وہ گاڑی کا ٹرن لیتے ہوئے ایئر پورٹ سے نکلتے ہوئے بولا اور اس کے کندھے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا۔

''کیا میں واقعی...... آئی مین آئی ڈونٹ بلیوات!'' وہ جھینپتے ہوئے بولی۔

''میں نے تمھیں کہا نا، تم اپنے آپ کو اس دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھو اور ہاں تم لاہور میں نہیں رہو گی۔''

''تو پھر کہاں؟''

''اسلام آباد میں...... بلیو ایریا میں، میں نے تمھارے لیے ایک ویل فرنشڈ گھر خریدا ہے اور جانتی ہو اس میں ہر چیز تمہاری چوائس کی ہے۔''

''مثلاً؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

''اس کے کرٹنز، کارپٹس، کراکری، فرنیچر، پینٹنگز، سارا ڈیکورم، کلرز سے لے کر آ بجکٹس تک صرف اور صرف تمہاری پسند کا خیال رکھا ہے۔''

''آپ کو میرا ٹیسٹ کیسے معلوم ہوا؟''

''ایک ایرانی انٹریئر ڈیکوریٹر نے اسے ڈیکوریٹ کیا ہے اور وہ بریفنگ تمہاری بہن اور بھائی سے لیتا رہا ہے۔ یہ ایک سرپرائز تھا جو میں تمھیں دینا چاہتا تھا۔''

''لیکن میں نے تو یہاں آنے کا فیصلہ کل کیا تھا۔''

''مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔'' وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''آپ کو کیسے معلوم تھا؟'' آئیکت کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

''مجھے اپنی محبت پر اعتماد تھا اور ویسے بھی محبت میں اتنی تڑپ ہوتی ہے کہ کسی کو مزاحمت کرنے کا موقع نہیں دیتی۔''

''آپ بہت کونفیڈنٹ ہیں۔''

''ہاں وہ تو میں ہوں۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ''آج تم ریسٹ کرنا۔ کل ہم اسلام آباد چلیں گے۔ پہلے تمہارا گھر تمھیں دکھاؤں گا پھر اس گھر میں تمھیں بٹھاؤں گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں میری ایک دو کمٹمنٹس بھی ہیں۔''

''کیسی کمٹمنٹس؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''جو الیکشن ہوئے ہیں اس کی پالیسیوں کے سلسلے میں ایک رپورٹ تیار کرنی ہے۔ رات کو ہی مجھے بی بی سی کی طرف سے فیکس موصول ہوا ہے۔ بہت اہم اور سیکرٹ ہے۔''

''نہیں، نہیں...... اب تم مزید ان کاموں میں دلچسپی نہ لو۔ ہم اپنی زندگی شروع کرنے والے ہیں اور ایسی مصروفیات بلکہ تم جاب ہی چھوڑ دو۔''

''نہیں منصور! اب یہ محض جاب نہیں بلکہ میرے لیے ایک پیشن بن چکا ہے۔ کیا

آپ میری جاب کے خلاف ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں نہیں، ہرگز نہیں...... میں تو لبرل ورکنگ ویمن کو پسند کرتا ہوں۔ زندگی میں تھرل تو انہی عورتوں کی وجہ سے ہے اور مجھے زندگی میں تھرل بہت پسند ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''تو پھر کب شادی کا پروگرام ہے؟'' وہ بات کا رُخ موڑتے ہوئے بولا۔

''دس پندرہ دن کے بعد، پہلے میں وہ کام مکمل کرلوں پھر۔''

''ٹھیک ہے ڈیئر ایز یو وش! تم میرے پاس ہو یہ احساس ہی میرے لیے بہت خوش کن ہے۔'' اس نے گاڑی آواری میں داخل کرتے ہوئے کہا۔ دونوں نے پہلے ڈنر کیا اور پھر ملک منصور نے اسے اس کا کمرا دکھایا۔ اس نے اپنے لیے ایک دوسرا کمرا بک کروایا تھا اور آئیکت کو اس کی یہ ادا بہت پسند آئی تھی۔ اس کی شرافت پر اور یقین آ گیا تھا۔ اس کا انتخاب بہت بہتر تھا۔ وہ مطمئن ہوگئی اور سپنے بننے لگی۔

اگلے دن وہ اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ملک منصور نے گاڑی خود ڈرائیو کرنے کا پروگرام بنایا۔ بائے ایئر جانے سے سفر کا لطف نہیں آتا اور وہ اس کی رفاقت اور سفر کی طوالت دونوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ آئیکت بھی اندر ہی اندر بہت خوش تھی۔ اپنا گھر دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ اس قدر خوبصورت، ہر چیز اور ہر کلر واقعی اس کی چوائس کا تھا۔ سب اس کی سوچوں سے بڑھ کر حسین تھا۔

''پسند آیا؟'' ملک منصور نے اس کی آنکھوں سے چھلکتی مسرت دیکھ کر پوچھا۔

''واؤ! اٹس رئیلی امیزنگ...... ونڈرفل!'' وہ حیرانی سے بولی۔

''نہیں، یہ امیزنگ تب لگے گا جب تم اس میں چلتی پھرتی نظر آؤ گی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''کیا آپ واقعی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اگر کہتی ہو تو اپنا دل کھول کر دکھا دوں۔'' اس نے اسے بازوؤں کے حصار میں مضبوطی سے جکڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں، مجھے آپ پر پورا یقین ہے۔'' وہ بھی مسکرا کر بولی۔ اسی لمحے آئیکت کا موبائل بجنے لگا۔

''افوہ! یہ کون ہے؟ کہاں سے آ ٹپکا؟'' ملک منصور نے ہی اس کا موبائل پکڑتے ہوئے جھنجلاتے ہوئے کہا اور نمبر دیکھا۔

''آئیکت! یہ نمبر کس کا ہے؟ بہت عجیب سا ہے۔'' اس نے موبائل پر نمبر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں، آپ نے بات نہیں کی۔''

''نہیں، میری آواز سن کر شاید کسی نے بند کر دیا ہے۔''

''شاید آفس سے کسی کا ہو۔''

''نہیں، ہے تو پاکستان سے کال مگر نمبر کچھ مختلف ہے۔ بہرحال چھوڑو اس بات کو، گھر تمھیں پسند آیا نا؟''

''ہاں، بہت زیادہ۔''

''ٹھیک ہے، اب میریٹ میں تمہارا اسٹے ہے۔ کیا تم اسلام آباد میں کچھ روز رکنا چاہتی ہو؟''

''ہاں، ایک دو روز۔''

''ٹھیک ہے، میں کل صبح واپس لاہور چلا جاؤں گا۔ آج ایک دوست کے ہاں پارٹی کی اہم میٹنگ کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ آؤ اب میں تمھیں ہوٹل ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ باہر موسم بہت ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر گاڑی میں ہر طرف حرارت تھی۔ ملک منصور کی قربت کی اور اس کے سگار کی بھینی بھینی مہک، اس کے کلون کی اور اس کی باتوں کی خوشبو ہر طرف ایک خوشگوار سا احساس تھا۔

''تمھارے لیے ایک اور سرپرائز ہے۔'' ملک منصور نے کہا۔

''کیا؟'' وہ چونکی۔

''تمھیں پرفیومز، اٹالین جیولری اور وائٹ گولڈ ود ڈائمنڈ بہت پسند ہیں نا۔ میں نے یہ سب امریکا اور فرانس سے منگوائے ہیں۔ ایک دو روز میں سب کچھ یہاں پہنچ جائے گا۔''

''رئیلی!'' وہ پھر حیرت سے بولی۔

''ہاں، میں نے کہا نا کہ تم......'' ایک مرتبہ پھر آئیکت کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چونک کر نمبر دیکھا۔ اب دوسرا نمبر تھا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتی رہی مگر فون بند ہو چکا تھا۔

''آئیکت! یہ کون ہو سکتا ہے جو اس طرح ڈسٹرب کر رہا ہے۔ تم اپنا موبائل چینج کر لو۔'' وہ قدرے خفگی سے بولا۔

''اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ بعض اوقات سگنلز ٹھیک طرح سے نہیں

جاتے۔ اگر رانگ کالز بھی ہوں تو ہمارا کیا جاتا ہے۔'' وہ بہت سکون سے بولی۔ ملک منصور کو اس کے لہجے کی سچائی پر یقین آ گیا۔

''اچھا اپنا خیال رکھنا اور کوئی مسئلہ ہو تو مجھے رنگ کر لینا۔''

''گڈ نائٹ!'' اس نے اسے ڈراپ کرتے ہوئے کہا۔

''گڈ نائٹ!'' وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی اور ہال میں داخل ہو گئی۔

مہ رخ بہت خوش تھی۔ اس کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ آفاق اسے لے کر گھر جا رہا تھا۔ اس نے اسے کتنی مشکل سے منایا تھا۔ کیسے کیسے حربے آزمائے تھے تب وہ کہیں جا کر مانا تھا۔ وہ بھی جیسے جیسے اس کے نروز پر کنٹرول کرنا سیکھ رہی تھی ویسے ہی وہ اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنتا جا رہا تھا۔ بعض اوقات تو وہ بالکل اس کے اشاروں پر یوں ناچتا جیسے روبوٹ ہو اور اس کا ریموٹ کنٹرول مہ رخ کے ہاتھوں میں ہو۔

''آفاق! ہم سیدھے گھر ہی جائیں گے نا؟'' مہ رخ نے جہاز میں اس سے پوچھا۔

''نہیں، پہلے ہوٹل میں اسٹے کریں گے۔ کل صبح گھر جائیں گے۔''

''آفاق! تم سوچ نہیں سکتے میں کس قدر خوش ہوں۔''

''اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے؟'' وہ بے دلی سے بولا۔

''تم نہیں سمجھ سکتے۔ ساری زندگی ایک گھر کی خواہش میں، میں نے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے اور اب خدا مجھے میرے اپنے گھر سے نوازنے لگا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں خوشی سے پانی بھر آیا۔ آفاق اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور گہری آہ بھری۔

اگلے دن دو بجے کے قریب جیسے ہی آفاق اور مہ رخ نے گھر میں قدم رکھا، ہر طرف چھائی یاسیت، مایوسی اور سناٹے نے ان کا استقبال کیا۔ اتنا بڑا گھر اور ہر طرف چھائی اُداسی...... زندگی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ آفاق نے لاؤنج کا دروازہ کھولا تو لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا تو کمرے میں پھیلے دھویں اور سگریٹ کی مخصوص بو نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ سحر کارپٹ پر بری حالت میں پڑی تھی۔ سگریٹ ایش ٹرے میں اَدھ جلا پڑا تھا۔ اس میں سے ہلکا ہلکا سا دھواں نکل رہا تھا۔ ہر طرف سگریٹ اور پڑیوں کے ٹکڑے اور راکھ بکھری پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دم آفاق کو دھچکا سا لگا۔ وہ جب اسے چھوڑ کر گیا تھا تو وہ ایسی نہیں تھی۔

''سحر...... سحر...... اٹھو...... یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟، آفاق اس کے اوپر جھکتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں اور ان کے گرد پھیلے سیاہ حلقے اس کی داستانِ فراق اور غم سنا رہے تھے۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

''کون آفاق...... آفاق تم آ گئے...... کب آئے......؟'' وہ اس کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ مہ رخ حقارت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہاں، میں آ گیا ہوں۔''

''تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''یہیں تھا، اب آ گیا ہوں۔ اب نہیں جاؤں گا مگر تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''جب سے تم مجھے چھوڑ کر گئے ہو...... میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم جانتے ہو نا!'' وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ مہ رخ کو اس کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا اور آفاق اس کی دل جوئی میں مصروف تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔

''آفاق! کیا تم نے مہ رخ سے شادی کر لی؟'' وہ آنکھیں بند کیے مدہوشی کے عالم میں بول رہی تھی۔ آفاق خاموش رہا اور ایک ٹک دروازے کے پاس کھڑی مہ رخ کو دیکھا۔

''تم بے شک شادی کر لو مگر اس کو گھر نہ لانا۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، کیا ہے نا۔'' وہ یکدم خاموش ہو گئی اور مہ رخ کو آفاق کے سارے بہانے اور گھر نہ لانے کی حیلہ بازیاں یاد آنے لگیں۔ ''تو یہ بات تھی۔'' اس نے دل میں دہرایا۔ وہ اسے بستر پر لٹا کر مہ رخ کے پاس آیا۔

''آؤ، میں تمھیں شفق کے کمرے میں لے چلتا ہوں۔ وہ بھی نظر نہیں آ رہی۔ شاید کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔'' آفاق قدرے خفت محسوس کر رہا تھا۔ مہ رخ خاموشی سے اس کے ساتھ باہر آ گئی تو شمائل لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں جوس اور پانی کا گلاس تھا۔ وہ ٹیبل پر رکھے جوس اور پانی کو ایک دوسرے میں انڈیل کر دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو شمائل! کیسی ہو؟'' آفاق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تم کون ہو اور یہ لڑکی...... ہمارے گھر میں چور کہاں سے گھس آئے۔ مما...... مما...... چور آ گئے...... چور...... چور......'' وہ اونچی آواز میں چیخنے لگی۔ شزا اپنے بیڈ روم سے بھاگتی ہوئی آئی تو سامنے آفاق اور مہ رخ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''اوہ! تو یہ تم ہو۔'' اس نے تیکھی نظروں سے مہ رخ کو دیکھ کر کہا۔ شمائل ابھی بھی چیخ رہی تھی۔

''چپ کرو شمائل! یہ چور نہیں بلکہ نئی دلہن کے روپ میں چور آئی ہے۔ واقعی تمہاری اندر کی آنکھ حقیقتوں کو دیکھنے لگی ہے۔'' وہ طنز سے چبھتے ہوئے لہجے میں بولی تو مہ رخ گڑبڑا گئی۔

''پلیز مسز منصور! ماضی کو دہرانے سے فائدہ۔'' وہ قدرے غصّے سے بولی۔

''ہاں بھئی، واقعی ماضی کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم لوگ تو اپنے مقصد میں ویسے بھی کامیاب ہو چکی ہو۔ تم اور تمہاری بہن...... ایک نے پانچ بچوں کے باپ کو پھنسا لیا اور ایک نے اتنے امیر باپ کے بیٹے کو...... واقعی کیا کہنا۔''

''ہاں تو بساط بھی تو آپ نے ہی بچھائی تھی۔ ہم تو بس مہرے تھے۔ ملک منصور کو پھنسانے کے لیے مجھے ہی بھیجا تھا نا۔ وہ تو آپ کا پول کھل گیا ورنہ......'' اس نے بھی وار کیا تو شزا تلملانے لگی۔

''آفاق! تم اسے اس گھر میں نہیں رکھ سکتے۔''

''کیوں، آپ کون ہوتی ہیں اسے روکنے والی؟''

''ایک گند تو سنبھالا نہیں جا رہا اور ایک اور لے آئے ہو۔ یہ گھر ہے کہ کوڑا دان۔''

''اس گھر میں ویسے بھی کوڑا ہی آتا رہا ہے۔ پھول تو کبھی نہیں سجے۔ جہاں اتنے ہیں وہاں یہ بھی سہی۔'' آفاق نے اس پر وار کیا تو اس نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور شمائل کا بازو پکڑتے ہوئے اندر چلی گئی۔ وہ اس کو لے کر شفق کے کمرے میں چلا گیا۔ ہر چیز پر گرد سی چھائی تھی اور چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا نہ جانے کب سے کمرا اس کے بغیر خالی پڑا ہو۔

''آفاق! اس گھر میں میرا کمرا کون سا ہے؟'' وہ جو کچھ سوچ کر آئی تھی سب کچھ اس کے برعکس تھا۔ وہ قدرے تلخی سے بولی۔

''جہاں سما سکتی ہو، سما جاؤ۔'' وہ بھی اکھڑ لہجے میں بولا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ گھر اس قدر......''

''میں اسی لیے تمھیں یہاں نہیں لانا چاہ رہا تھا۔''

''یہی وجہ تھی یا کچھ اور......؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''مجھے تو لگا جیسے کسی کی محبّت میں تم ایسا نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔''

''وہم پر بھی حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے جب حقیقت خود بخود سامنے آ جائے۔''

''جو مرضی چاہے سمجھو۔'' وہ غصّے سے بولا۔

''تم مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں؟''

''مجھے نہیں معلوم، جہاں جانا چاہتی ہو جاؤ۔ جہاں رہنا چاہتی ہو رہو۔ بس مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔'' وہ پھر اپنے حواس کھونے لگا اور وہ اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔ وقت اور عقل مندی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ خاموشی سے سچویشن کو ہینڈل کیا جائے۔

''تم ادھر لیٹ جاؤ۔'' اس نے بیڈ پر سے بکھرے کپڑے اٹھا کر اِدھر اُدھر کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے لیٹ گیا تو اس نے اس کے پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کی پوروں کو اپنی انگلیوں سے دبانا شروع کیا تو وہ جیسے پرُسکون ہونے لگا۔ اس کے پاؤں کو اپنی گود میں رکھے ہوئے وہ گہری سوچ میں تھی۔ یہاں سب کچھ بہت منتشر ہے اور یہاں گزارہ کیسے ہوگا اسی لیے آفاق ایسا ہے۔ انسان کی سوچ پر اس کے ماحول کا گہرا اور دیرپا اثر ہوتا ہے۔ گروڈمڈ پرسنالٹی کے پیچھے ہمیشہ گروڈمڈ ماحول ہوتا ہے۔ تمام بکھری اور اُدھوری شخصیات ہمیشہ منتشر ماحول اور خلا میں پروان چڑھتی ہیں اور یہی خلا ساری زندگی ایک کمی بن کر محسوس ہوتا رہتا ہے۔ ایسی شخصیات کبھی بھی نکھر کر سامنے نہیں آتیں۔ ہر طرف خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔ اکثر یوگا کلب میں پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کے حوالے سے یہی باتیں ڈسکس ہوتی تھیں۔ شمائل، آفاق اور سحر تینوں ایک ہی ماحول کے پروردہ نظر آ رہے تھے۔ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اب وہ پرُسکون ہو کر سو رہا تھا۔ وہ اٹھی اور کمرے میں چکر لگانے لگی۔

وہ عقلمند بھی تھی اور شاطر بھی۔ بچپن سے دونوں بہنیں کس کس طرح کے حالات کا سامنا کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھیں۔ ماں باپ کی وفات کے بعد خالہ کے گھر، خالہ کے گھر سے پھپھو کے گھر اور وہاں سے ورکنگ ویمن ہاسٹل اور پھر وہاں سے آشیانوں کی تلاش میں سرگرداں، کیسے کیسے مردوں کے ہاتھوں ذلیل ہوئیں جہاں قدم رکھتیں وہ ریت کے ٹیلے ثابت ہوتے۔ ویسے بھی گھروں کی بنیاد رشتے ہوتے ہیں اور رشتوں کی بنیاد محبّت، جذبے اور سچائیاں ہوتی ہیں اور یہاں سب کچھ مفقود تھا۔ جس گھر کی تمنا میں وہ تڑپتی ہوئی یہاں تک آئی تھی وہ تو سرائے بھی ثابت نہیں ہو رہا تھا جہاں سانس لینے کو انسان کچھ لمحے ہی پرُسکون ہو کر گزارے۔

شنزا، سحر، آفاق، شمائل اور سب سے بڑھ کر ملک منصور...... کوئی ایک رشتہ بھی مضبوط نہیں تھا۔ کسی ایک میں بھی نہ زندگی کی سچّائی تھی اور نہ ہی اصلی چمک...... آفاق بھی کردار کا بودا تھا۔ اس پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے ایک دم یہ گھر شیشے کا لگنے لگا۔ ٹوٹتا ہوا، بکھرتا ہوا، کرچی کرچی ہوتا ہوا اور وہ جیسے فگار انگلیوں کے ساتھ ان کرچیوں کو سمیٹنے میں مصروف تھی اور انگلیوں کے ساتھ ساتھ روح بھی زخمی ہوتی جا رہی تھی۔ محبّت کہیں نہیں۔ عورت دھوکے میں آ جاتی ہے۔ مرد کی خود ساختہ محبّت کے دام میں۔ اس کے سائے کو سایہ بریں سمجھتی ہے اور اپنی زندگی تیاگ دیتی ہے مگر ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ کبھی مجبُوریوں کے ہاتھوں تو کبھی جذبوں کے ہاتھوں۔ سب کچھ اکارت جاتا ہے۔ اب اسے کوئی راہِ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔

اگلے دن آفاق دیر سے اٹھا اور جیسے ہی باہر نکلا، سحر لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ وہ کل سے قدرے بہتر لگ رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی حواسوں میں، آفاق کو دیکھ کر اس کی طرف لپکی۔

''تم کہاں چلے گئے تھے اور شفق کے کمرے میں کیوں؟'' اس سے قبل کہ آفاق کچھ کہتا، مہ رخ اس کے پیچھے آ گئی۔

''یہ...... ک...... کک...... کون؟'' اس نے حیرت سے آفاق سے پوچھا۔

''میں مہ رخ ہوں۔'' وہ خود ہی بولی۔

''آفاق...... تم...... تم...... تم نے...... اور اسے گھر بھی لے آئے۔'' وہ بدحواس ہوتے ہوئے غصّے سے پھٹ پڑی۔

''ہاں، تو اس میں تمھیں کیا مسئلہ ہے؟'' مہ رخ نے غصّے سے کہا۔ آفاق شرمندگی سے دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔

''آفاق! میں تمھارے ساتھ کسی اور کی جھلک بھی اس گھر میں نہیں دیکھ سکتی۔ تم نے مجھے برباد کیا میں خاموش رہی۔ تم مجھے مارتے پیٹتے رہے میں چپ رہی۔ تم نے مجھ سے میرے وجود کی شناخت اور زندگی بھی چھین لی۔ میں تڑپتی رہی مگر خاموش رہی مگر میں نے تم سے صرف ایک بات کہی اور تم وہ بھی نہ کر سکے۔ آفاق! کاش...... کاش میں تمھارے لیے اتنی بددعائیں کر سکوں کہ تم زندگی کی ایک ایک سانس کے لیے اس طرح تڑپو جس طرح میں تڑپتی رہی ہوں۔ جیسے کبھی میں در در سے ایک ایک روپے کی بھیک مانگتی تھی تم بھی ایسے زندگی کی بھیک مانگو۔ کاش میں ایسا کر سکتی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آفاق کچھ نہ بولا اور بوجھل قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں واپس چلا گیا۔

''سنو! اب یہ تمہارا گھر نہیں۔ صرف اور صرف میرا گھر ہے اور میں اس گھر کو تمھارے گندے، تعفن زدہ وجود سے جلد از جلد پاک دیکھنا چاہتی ہوں۔ خود ہی یہاں سے نکلنے کی راہ لو ورنہ مجھے یہ کام خود کرنا پڑے گا۔'' مہ رخ اس کے قریب بیٹھ کر سرگوشیوں کے انداز میں اسے دھمکیاں دینے لگی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مہ رخ کی طرف دیکھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شنزا اور ملک منصور اس کے بہت خلاف تھے۔ اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے مگر آج تک کسی نے بھی اسے یوں گھر سے نکلنے کو نہیں کہا تھا اور وہ تو آتے ہی اس کے سر سے سائبان اور قدموں کے نیچے سے زمین چھیننے کی بات کر رہی تھی۔ اس کا وجود خطرے میں تھا۔ اسے ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں اور وہ خوفزدہ ہو گئی۔

''اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔''

ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ چاروں طرف دبیز پردے اور ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی سے پھیلی گھٹن میں وہ جیسے اپنے آپ کو کسی قبر میں محسوس کر رہا تھا۔ آیت کی آواز مسلسل اس کے دماغ میں گونج رہی تھی جیسے دماغ کے ہر خلیے سے چپک گئی تھی۔ اس نے صبح سویرے ٹی وی آن کیا تو یہ آیت سن کر اس کے اندر ایک دم کوئی لاوا سا جوش مارنے لگا۔ اس نے غصے میں جلدی سے چینل بدلا مگر وہ تو جیسے ایلفی کی طرح اس کے دماغ سے چپک گئی تھی۔ وہ بار بار ذہن سے جھٹکتا، اپنے آپ کو مختلف سوچوں میں الجھاتا۔ جھنجلا کر اپنے آپ کو کوستا کہ اس نے کیوں ٹی وی آن کیا۔ یہ مسلمانوں کا پروپیگنڈا...... اس کا دل اندر ہی اندر کتنا ہذیان بک رہا تھا مگر کسی طور اسے تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جتنا جھٹلاتا، جتنا ہذیان بکتا وہی الفاظ پھر نہ جانے کہاں سے اچانک آ کر اسے تہس نہس کر دیتے۔ سارا دن وہ اپنے آپ سے لڑ لڑ کر اور الجھ الجھ کر تھک گیا تھا اور جیسے ہی اس نے سونے کی کوشش کی پھر وہی آیت اس کو سونے نہیں دے رہی تھی۔

''اوہ گاڈ......!'' وہ بڑبڑایا۔ ''اوہ...... کرائسٹ......'' وہ کہتے کہتے نادانستہ رک گیا۔

''تثلیث سے وحدانیت کی طرف کیوں نہیں آتے۔'' نور بلا رہی تھی۔ ''میں الجھ گیا ہوں، کہاں پھنس گیا ہوں، میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں جاؤں؟'' وہ اپنے آپ کو بے حد شکستہ، جھنجلایا ہوا، کمزور و بے بس، مفلوج و ناکارہ انسان سمجھ رہا تھا جو صرف اور صرف اپنی ایک سوچ پر بھی قادر نہیں تھا۔ وہ اس سوچ کو جھٹلانا چاہتا تھا اور وہ نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ وہ محض اس

ایک آیت کو اپنے دماغ سے کھرچ نہیں سکتا تھا۔ ''ولیم! تم بے حد کمزور انسان ہو، بہت بودے......'' وہ سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہر طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ ایسی تاریکی جو کالے ناگ کی طرح پھن پھیلائے اسے لحہ بہ لحہ ڈس رہی تھی۔ وہ اتنا جھنجلا گیا کہ رونے لگا۔

''گاڈ! مجھے صرف ایک لمحے کی پرسکون نیند دو۔ آئی ریکوئسٹ یو......'' اس کا دماغ زور زور سے بج رہا تھا۔ جیسے بولتے بولتے اچانک ہانپنے لگا ہو۔ جیسے تیز تیز چلتے ہوئے رک جانے پر دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہو۔ دل کی دھڑکن کی طرح دماغ بھی مسلسل دھڑک رہا تھا۔ ٹک ٹک...... ٹک ٹک...... اور وہ اسے خاموش نہیں کر پا رہا تھا۔ ''چپ کر جاؤ...... خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔ میں پورا دن الجھا رہا ہوں۔ سو نہیں پایا۔'' اس نے اپنے سر کے بالوں کو کھینچنا شروع کر دیا۔ جتنی زیادہ وہ التجائیں کر رہا تھا اتنا ہی زیادہ الجھ رہا تھا۔ اس نے لیمپ کی روشنی میں ٹائم پیس کو دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر پیا مگر کوئی شے بھی اندر کی جھنجلاہٹ کو کم نہیں کر پا رہی تھی۔

''آئی ہیٹ مسلمز......'' وہ تسلی دینے کے لیے اپنے آپ سے بولا۔ ''آئی ہیٹ دیم آل...... آئی ہیٹ......'' وہ چلانے لگا اور جیسے ہی خاموش ہوا، اندر سے آواز ابھری۔ ''اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔''

''کیوں کیوں میں مسلم...... نہیں...... یہ کبھی نہیں ہوگا۔'' وہ چلا چلا کر جواب دینے لگا۔ اس کی چیخوں نے سکوت کے پردے کو تار تار کرنا شروع کیا۔ ہر طرف مرتعش آواز کی لہریں کائنات کے سکون کو درہم برہم کرنے لگیں۔ شہلا اس کی آواز سن کر ایک دم بیدار ہوگئی تھیں۔ ان کا دل لرزنے لگا۔ خدانخواستہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو رہا تھا۔ رات کے اس پہر اس کی چیخیں، اللہ نہ کرے یا اللہ اس پر کرم کر، اپنا رحم کر، اس طرح جس دلدل میں اور بھنور میں پھنسے انسانوں اور اپنی مخلوق پر کرتا آیا ہے۔ شہلا نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکیں۔ لیٹے لیٹے دونوں ہاتھ دعا کی صورت میں اوپر کی طرف بلند کیے۔

بہت عرصے کے بعد وہ اپنے خدا سے کچھ مانگ رہی تھی۔ بالکل اس طرح جب حیدر کے لیے وہ لیٹے لیٹے، اٹھتے بیٹھتے اچانک ہاتھ فضا میں بلند کر کے دعا کرتی تھی۔ حیدر نہ ملا تو اس نے دعائیں کرنا بھی چھوڑ دیں اور عبادت بھی۔ خدا سے سرگوشیاں بھی چھوڑ دیں اور مناجات بھی۔ آج جب اتنے عرصے کے بعد ولیم کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنسوؤں کی جھڑی

لگ گئی، نادانستہ یا دانستہ صرف دو ہستیوں کے لیے وہ دل کی گہرائی سے اپنے رب کو پکار رہی تھی۔ اس نے تو اپنے لیے بھی اس کو پکارنا چھوڑ دیا تھا جو کبھی اس کا بھی محرمِ راز تھا اور پھر وہ کیسے بدل گئی یا پھر زمانے نے اسے بدل دیا۔ وہ لمحہ اسے یاد آنے لگا جب وہ پیٹر کے ساتھ چرچ میں داخل ہو رہی تھی۔ پیٹر صرف نام کا کرسچن تھا اور وہ نام کی کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ ملک منصور نے اس سے اس کے وجود کی شناخت اور اہمیت چھینی تھی اور پیٹر نے اس کا مذہب......

وہ تو کھنکتے گارے کا خالی وجود رہ گئی تھی جو جہاں چاہے رکھ دے، جہاں چاہے پٹخ دے۔ جب چاہے توڑ دے اور جس وقت چاہے چھوڑ دے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اسے اس کے گناہ پر اس کا ضمیر سرزنش کرنے لگا۔ اس نے قرآن کے حکم کو ٹالا تھا۔ ''اور مسلمان عورتیں مشرک مردوں سے نکاح نہ کریں۔'' اس وقت تو وہ اندھی ہو رہی تھی۔ اپنی ذات کے نشے میں خود کو کھو دیا تھا۔ اس نے اپنے رب کا فرمان ٹالا تھا۔ اس کی حدوں کو پار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے قرآن پڑھا تھا مگر سب کچھ بھلا دیا تھا اور اس وقت ضمیر نے بھی اسے نہیں جھنجوڑا تھا جیسے اب جھنجوڑ رہا تھا۔ ولیم کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ بستر پر ایڑیاں رگڑتی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ وہ کتنی بے بس، کمزور اور نادان انسان تھی۔ کیا یہ سب میرے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ میں یوں سسک سسک کر مر رہی ہوں اور ولیم نہ جانے کس لیے تڑپ رہا ہے۔ وہ بھی بستر پر ایسے ہی ایڑیاں رگڑ رہا ہے جیسے میں موت مانگتی ہوں اور وہ زندگی مگر دونوں کو کچھ بھی نہیں مل رہا۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ اس کا دل چاہا کسی طرح اٹھے اور اپنے رب کے حضور ماتھا رگڑ رگڑ کر معافیاں مانگے مگر شاید اب اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ اسے اس کی توفیق نہیں ہو رہی تھی۔ معافی مانگنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس کے دربار میں جانے کے لیے ٹانگوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ اس کے سامنے کھڑے ہونے کا اذن نہیں مل رہا تھا۔ ''وہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔'' ایک آیت اس کے ذہن میں ابھری۔ آنکھیں پھر چشموں کی طرح اُبل پڑیں۔ ولیم اسے اپنا گناہ لگ رہا تھا۔ جس بات سے خدا نے روکا تھا وہ اس شجرِ ممنوعہ کا ثمر تھا۔ وہ اب کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس کے دل سے آواز آئی۔ نہیں...... یا اللہ ایسا نہ کرنا۔ تجھے تجھے تیرے محمد ﷺ کا واسطہ...... محمد ﷺ کا نام زبان پر آتے ہی وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''کیا تم اس قابل ہو کہ اس ہستی کا واسطہ دو جس کی عظمت، ذات، اخلاق اور معصومیت کی پروردگار قسمیں کھائے...... کائنات کا مالک...... ارض و سما کا خالق اپنی محبوب ہستی کو جھٹلانے والے پر غضب ناک ہوتا ہے۔ کیا تم ہو اس قابل......؟'' ایک اور آواز نے

سرزنش کی۔ وہ اور شدت سے رونا شروع ہوگئی اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگی۔ اپنے ہاتھ اٹھا اٹھا کر بستر پر مارنے لگی۔ ولیم کی چیخیں اب تھم گئی تھیں مگر اب اس کے اندر اس کا دل چیخ رہا تھا۔

''تم اس قابل نہیں......تم اس قابل نہیں......'' اسے لگ رہا تھا جیسے خدا اس سے بہت زیادہ ناراض ہے اور لحہ بہ لحہ دور ہو رہا ہے۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی گڑگڑا کر توبہ کرنا چاہتی تھی مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔

''ہاں، میں ہوں اس قابل......نہ تو میں نے تیری ذات میں کسی کو شریک ٹھہرایا اور نہ ہی محمد ﷺ کی عبدیت میں شک کیا تو پھر......تو مجھ سے کیونکر ناراض ہو گیا۔ میں مانتی ہوں میں نے گناہ کیا ہے مگر تو نے بھی تو اپنے آپ کو رحمٰن اور ان کو رحمت اللعالمین کہا ہے۔ انھوں نے تو کافروں سے بھی درگزر فرمایا۔ میں کافرہ تو نہیں۔ تو جانتا ہے میں کافرہ نہیں۔'' وہ بڑبڑانے لگی۔

''ہاں اور تو ایمان والی بھی نہیں۔'' کسی نے پھر ٹہوکا دیا۔ وہ پھر سسکنے لگی۔ اس کے پاس دلائل ختم ہونے لگے، وہ خاموش ہوگئی۔ اندر کی آواز کہیں گم ہوگئی۔ سکوت چھانے لگا اور وہ پریشاں و پشیماں سی تکیے کو بھگونے لگی۔ لحہ بہ لحہ پگھلتی شمع کے موم کے مانند آنسو پہ آنسو ٹپکانے لگی۔ موم پگھلتا رہا اور آنسو ٹپکتے رہے اور پھر شمع نہ جانے کب بجھ گئی۔

ولیم سلیپنگ پلز لے کر سو رہا تھا۔ چیختے چلاتے ہوئے اس نے دراز میں سے گولیاں نکال کر کھائی تھیں اور پھر وہ کب سو گیا اسے کچھ خبر نہ تھی۔ سارا دن وہ سوتا رہا اور وہ بار بار کک سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ نور بھی نہیں آئی تھی۔ وہ سو رہا تھا۔ کک نے اسے آوازیں بھی دیں مگر وہ گہری نیند میں سو رہا تھا۔

''اسے جھنجوڑ کر، ہلاؤ۔ کہیں وہ......'' وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے افضل سے کہا۔

''جی بی بی جی!'' وہ باہر نکل گیا۔

''اس کی سانسیں دیکھنا۔ وہ...... وہ زندہ تو ہے ناں۔'' اس نے پیچھے سے آہستہ سے آواز دی اور پھر ایک دم خاموش ہوگئی۔ ''خدا نہ کرے اسے کچھ ہو۔ جو بھی کیا میں نے کیا۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں۔'' وہ پھر بڑبڑائی۔

''جی وہ کہہ رہے ہیں تھوڑی دیر بعد اٹھیں گے۔'' افضل نے آ کر اطلاع دی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ شکر ہے وہ ابھی زندہ ہے۔ جیسے اسے اس کی زندگی کا پروانہ مل گیا ہو مگر

وہ رات کو چیخ کیوں رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ اس سے کیسے پوچھے۔ وہ تو اس سے تلخی سے بات کرنے لگا تھا۔ شام گہری ہونے لگی۔ نہ آج نور آئی تھی نہ ہی حیدر۔ تنہائی اور اداسی سے شدید ڈپریشن ہونے لگا۔ جب ایک دم حیدر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ اس کے کمرے میں آیا تو حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''آج نور نہیں آئی؟'' حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، کیوں؟'' اس نے بھی حیرانی سے پوچھا۔

''آج تم نے کپڑے نہیں بدلے۔ سمیل آ رہی ہے۔'' حیدر آہستہ سے بولا۔ نور روزانہ اسے کپڑے خود چینج کرواتی تھی۔

''حیدر! یہ میرے جسم کی نہیں، میرے گناہوں کی بدبو ہے۔ میرے گناہوں کے پھوڑے اب پھٹنے شروع ہو گئے ہیں۔'' وہ بے بسی سے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب! تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''حیدر! خدا مجھ سے ناراض ہے۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتا۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''حیدر! میرا گناہ واقعی ناقابل معافی ہے۔''

''شہلا! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟''

''بولو نا! پلیز بولو...... بتاؤ......؟''

''وہ رحمٰن ہے، انسان نہیں۔ وہ تو بس ہر ایک پر مہربان ہے۔'' حیدر نے آہستہ سے جواب دیا۔

''تو پھر وہ مجھے کیوں معاف نہیں کر دیتا۔ ہم جیسوں کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے؟''

''تم جیسے کیا مطلب؟'' حیدر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جو مسلم، نہ کافر، نہ منافق اور نہ ہی مرتد۔'' حیدر خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا۔ وہ اس کے جواب میں کون سی آیت کا حوالہ دے۔ کس دلیل کو پیش کرے۔ وہ سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔

''حیدر! قرآن کہتا ہے کہ اس نے اس واضح کتاب میں کسی خشک اور تر شے کا ذکر نہیں چھوڑا تو کیا اس نے ہم جیسوں کا ذکر نہیں کیا۔ ہمارا ذکر کرنا اس نے پسند نہیں کیا۔ حیدر! اس کے دربار میں واقعی ہماری کوئی جگہ نہیں۔ اس نے واقعی ہمارا ذکر کہیں نہیں کیا۔'' وہ

رونے لگی۔

''شہلا! تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ تم نے اور میں نے قرآن پاک کا ترجمہ رشید صاحب سے اکٹھے پڑھا تھا کیا تم بھول گئیں جب وہ کہتا ہے۔ ''وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے قصور معاف فرماتا ہے اور جو تم کرتے ہو، سب جانتا ہے۔'' حیدر نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے آبلہ پا سینے میں جیسے ٹھنڈی پھوار سی پڑ گئی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ حیدر بھی خاموش تھا۔

''مایوسی کفر ہے۔ انسان گناہگار ہے، بھٹک جاتا ہے مگر وہ رحمٰن ہے۔ وہ تنگ دل اور تنگ نظر نہیں۔ اس سے اچھی امید رکھو۔'' حیدر نے اس کی مضطرب حالت دیکھ کر اسے دلاسا دینا چاہا۔

''حیدر! کیا واقعی وہ مجھے معاف کر دے گا؟''

''یہ تو آنسوؤں کی شدت اور دلوں کی تڑپ میں مضمر ہے مگر مجھے یقین ہے جو ندامت سے اس کی طرف قدم بڑھاتا ہے وہ رحمت کے دروازے کبھی بھی اس پر بند نہیں کرتا۔''

''حیدر! کیا میرا گناہ معاف کیا جا سکتا ہے؟''

''شہلا! مجھے یہ آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ تم خدا اور اس کے احکامات سے نا آشنا تو نہ تھیں۔ سید صاحب نے تمھیں قرآن ترجمہ کے ساتھ پڑھوایا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم عبادت گزار بھی تھیں پھر تم نے فیصلہ کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا کہ خدا تم سے ناراض ہو جائے گا۔ تم اس کی کتنی بڑی حد کو توڑنے جا رہی تھیں۔ کیا واقعی تم نے کچھ نہ سوچا۔ ایک لاعلم شخص پر اتنی حیرت نہیں ہوتی جتنی اس پر جو علم بھی رکھتا ہو اور عقل بھی۔'' حیدر نے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال کر ڈالا۔ وہ حیدر کی طرف دیکھنے لگی اور پھر گہری آہ بھری۔

''اسی لیے تو میں اپنے آپ کو ناقابلِ معافی سمجھتی ہوں۔ حیدر! اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی ایک سوچ تھی کہ میں ایک انسان ہوں جس کے کچھ حقوق ہیں اور میں نے کسی بھی بات کے بارے میں نہ سوچا۔ سب کچھ پس پشت ڈال دیا۔ سب کچھ بھلا دیا کہ میں کون ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ کوئی تو مجھے انسان مانے اور مجھ سے انسانوں جیسا سلوک کرے۔ کوئی تو خوشبو جیسی محبت کرے جو ایک سچا انسان دوسرے سے کرتا ہے۔ کوئی تو ہو، کوئی ایک تو ہو۔'' اس کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

''کیا تمھارے لیے یہی کافی نہیں تھا کہ جس ''کوئی'' کو تم ڈھونڈنے نکلی ہو کیا وہ

حیدر نہیں؟ تم جانتی تھیں کہ میں تم سے کتنی محبّت کرتا تھا اور اسی کی وجہ سے شاید مجھ سے بھی گناہ سرزد ہو گیا۔ میں اپنی بیوی کو وہ محبّت نہ دے سکا جو شاید اس کا حق تھا۔''

''حیدر! تم نے ایسا کیوں کیا۔ حقدار کو اس کا حق کیوں نہ دیا؟''

''معلوم نہیں شہلا! شاید اس کے دل میں کوئی گرہ پڑ گئی تھی یا پھر میرے قدم ہی کسی نے جکڑ لیے تھے۔ ہم دونوں بس اپنی اپنی جگہ ساکت مجسمے تھے۔ بہت جذباتی، وہ مجھے معاف نہیں کرتی تھی اور میں بھی اسے وہ مقام نہ دے سکا۔ وہ روٹھی رہتی، میں بھی اسے نہ مناتا اور جب مناتا تو وہ نہ مانتی۔ بس زندگی کیسے گزر گئی سمجھ ہی نہیں آیا۔ شہلا ہماری محبّت کی نہیں جذباتیت کی پیداوار ہے اس لیے اس میں شعلہ فشانی ہے اور کبھی کبھی ایسی کڑواہٹ اگلتی ہے کہ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جس پودے کے بیج کو محبّت سے نہ بویا گیا ہو اس کے پھل سے مٹھاس اور سائے سے ٹھنڈک کی توقع ہی بے بنیاد ہے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔'' وہ آہ بھر کر بولا۔ شہلا اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی اور اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' حیدر نے بالآخر کافی دیر کے بعد سکوت توڑا۔

''سوچ رہی ہوں ہم کیسے بھٹک گئے۔ انسان کو بھٹکنے میں صرف چند لمحے لگتے ہیں اور وہ بھٹکتا جاتا ہے جیسے پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکتا پتھر گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ شاید انسان بھی اسفل ترین کھائیوں میں جا کر دم لیتا ہے پھر اسے معلوم ہوتا ہے کہ جس پھسلن پر اس نے قدم جمانے کی کوشش کی تھی اسے تو اس نے بہت ہموار زمین سمجھا تھا۔ اُف! یہ زندگی کس قدر مشکل ہے۔ حیدر! ہم بھٹک گئے۔ ہم کیوں نہ مطمئن ہو گئے۔ ہماری روحیں کیوں منتشر اور بے قرار رہیں اور یہ وہ انتشار تھا کہ ہم بھٹک گئے۔ ہم گنہگار بن گئے کاش......'' وہ ایک دم پھر خاموش ہو گئی۔

''شہلا! فرمانِ نبی ﷺ ہے۔ سارے کے سارے انسان خطا کار ہیں اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں اور میں تو دن رات اپنے رب سے معافی مانگتا رہتا ہوں۔ تم بھی توبہ کرو۔'' گویا حیدر بھی آج صاف گوئی سے اعتراف جرم کے موڈ میں تھا۔

''کیا ہمیں معافی مل جائے گی؟'' وہ پھر بے یقینی کے عالم میں بولی۔

''میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں؟''

''اس بسترِ مرگ پر انسان جس طرح امید و بیم کے درمیان سفر کر رہا ہوتا ہے وہ بہت تکلیف دہ ہے، کاش تم سمجھ سکو۔''

''تم مطمئن ہو جاؤ، اس کی رحمت انسان کے گناہوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔'' حیدر نے پھر اسے تسلی دینا چاہی اور اسی لمحے نور کمرے میں داخل ہوئی۔

''آئی ایم سوری! میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا۔''

''نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمھارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ آج کافی لیٹ آئی ہو۔'' حیدر نے اس سے پوچھا۔

''ہاں انکل! آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے لیٹ ہوگئی پھر یاد آیا کہ آنٹی کو چینج بھی کرانا ہوتا ہے اس لیے میڈیسنز کھا کر آئی ہوں۔''

''تھینک یو بیٹا! تم ہمارے لیے اتنا کچھ کر رہی ہو۔ خدا تمھیں اس کا اجر دے۔'' شہلا نے لیٹے لیٹے اسے دعا دی۔ حیدر نے بھی اس کی طرف پر ستائش نظروں سے دیکھا تو وہ باہر نکل گئی۔ شہلا کو چینج کرانے کے بعد وہ ولیم کے کمرے میں آئی تو وہ بیڈ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کی متورم آنکھیں اور چہرہ رات کی کہانی سنا رہے تھے۔ وہ ابھی تک اُلجھا اُلجھا سا لگ رہا تھا۔

''ولیم! کیا بات ہے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' نور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ کیا مسئلہ ہے؟''

''کچھ نہیں، کیا تم کل جلدی آ سکتی ہو؟''

''ہاں کیوں، کہیں جانا ہے کیا؟''

''ہاں، بہت دن ہوئے چرچ گئے ہوئے۔ میں چرچ جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر چور نگاہوں سے کہا جیسے وہ کسی قابل اعتراض جگہ کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ نور اس کی بات سن کر ایک دم چونکی۔ کوئی چیز چھنا کے سے اندر ہی اندر ٹوٹی۔ اس نے گہری سانس لی اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے، کتنے بجے آ جاؤں؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''صبح نو بجے کے قریب۔'' اس نے بھی بے دلی سے جواب دیا۔ نور اٹھ کر باہر آ

گئی۔ اسے سخت افسوس ہو رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ رفتہ رفتہ وہ اسے سچائی کی طرف لے آئے گی مگر وہ اپنی جگہ پر ہی کھڑا تھا اور وہ اپنے مقصد کی کامیابی کا تعین کر کے بیٹھی تھی۔ اسے سب کچھ سراب نظر آنے لگا۔ ساری محنت اکارت جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک انسان کے دل کو بدلنا بہت مشکل ہے۔ اس نے سوچا۔ دلوں کو صرف خدا ہی بدل سکتا ہے۔ وہ سنگین پتھروں سے چشمے بہا سکتا ہے تو کیا دل اس سے بھی زیادہ سخت ہو سکتے ہیں۔ یا اللہ! ولیم کے دل کو بدل دے آنٹی کے لیے اور میرے لیے۔ اس نے دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا کی اور خاموشی سے وظیفہ پڑھ کر اس کی ٹانگوں پر پھونک مارنے لگی۔ ولیم حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے امید تھی آج وہ ایسا نہیں کرے گی لیکن اس کی مستقل مزاجی دیکھ کر وہ ٹھٹک سا گیا اور زبان سے کچھ نہ بولا۔ وہ بھی خاموشی سے خدا حافظ کہہ کر نکل گئی۔

اس رات وہ سکون سے سویا۔ ذہن میں کسی چنگاری نے آگ نہ لگائی۔ کوئی طوفان نہ برپا ہوا۔ کسی بھی شے نے تلاطم اور تذبذب میں نہ جکڑا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ محض ذہن کا وقتی رجحان تھا اور یہ تو انسانی نفسیات ہے کہ کبھی کوئی بات ایسی ذہن میں اٹکتی ہے کہ ہزار بار کھرچو، صاف ہی نہیں ہوتی لیکن پھر ایسی غائب ہوتی ہے کہ دوبارہ بھول کر بھی یاد نہیں آتی۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے رات کو بھرپور اسٹڈی کی اور پھر سو گیا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے نور آ چکی تھی اور وہ بھی تیار ہو رہا تھا۔ افضل نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔

''نور! کیا بات ہے۔ تم کیوں خاموش ہو؟''

''میری طبیعت کل سے خراب ہے۔ ابھی بھی مجھے بخار ہے۔''

''تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' اس نے ایک دم حیرت سے پوچھا اور گیئر پر رکھے اس کے ہاتھ کو چھوا تو چونک گیا۔ ''واقعی تمھیں تو بہت تیز بخار ہے۔ تم آئیں کیوں؟''

''تمہاری خواہش کے لیے۔ تم جانتے ہو میں تمھیں کبھی بھی انکار نہیں کر سکتی۔''

''افوہ! یہ کیا حماقت ہے۔ تم بیمار ہو اور تم...... چلو واپس چلو۔''

''نہیں، اب تم چرچ سے ہو ہی آؤ تو بہتر ہے۔ تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے۔'' اس نے چرچ کے سامنے گاڑی روکی۔ اسے چرچ میں چھوڑ کر وہ خود گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹ گئی۔ باہر قدرے ٹھنڈ ہو رہی تھی۔ گو کہ موسم بدل رہا تھا مگر ابھی بھی فضا میں خنکی باقی تھی۔ اِکا دُکا لوگ چرچ آ رہے تھے۔ چرچ کے احاطے میں ہر طرف اونچی اونچی باڑوں اور لمبے لمبے

سفیدے کے درختوں نے چرچ کی سوگوار فضا میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ سردیوں کی تاریک رات جیسی گہری خاموشی ہر طرف چھائی تھی۔ وہ وھیل چیئر پر بیٹھا کرائسٹ اور مدر میری کے مجسمے کے سامنے سر جھکا کر، آنکھیں بند کیے، ہاتھ باندھے ہوئے آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔

''میں بہت پریشان ہوں۔ بہت بکھرا ہوا، مجھے سکون چاہیے۔ مجھے اپنی طرف لے آؤ۔ مجھے اپنی طرف لے آؤ ورنہ میں...... میں بکھر جاؤں گا۔'' وہ گہرے تاسف میں کھویا آہستہ آہستہ سر ہلا رہا تھا۔

''اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔'' پھر آیت نے پوری شدت سے نہ جانے کہاں سے آ کر اس پر حملہ کیا۔ اُف! یہ کہاں سے...... وہ تو اسے بھلا چکا تھا۔ اس کا اندر پھر جھنجلانے لگا۔ اس کی روح تڑپنے لگی۔ وہ تو مطمئن ہو چکا تھا اور اب پھر مضطرب ہونے لگا۔ یہ سب کیا ہونے لگا تھا۔ کرائسٹ کے سامنے بیٹھ کر وہ کیا سوچ رہا تھا۔ کاش کوئی مجسم شے اسے تنگ کرتی تو وہ اس کے پرخچے اُڑا دیتا اور اب اپنے اندر سے، کہاں سے اسے صاف کرے۔ یہ سب کیا تھا...... ''میں گناہ کر رہا ہوں...... اوہ گاڈ!'' وہ پھر سر کے بال نوچنے لگا۔ ''مجھے اپنی طرف لے آؤ...... اوہ گاڈ...... !'' وہ اب زور زور سے بڑبڑانے لگا۔

''یا اللہ! اس کی ہدایت کی طرف رہنمائی کر۔ اس کو اپنی طرف لے آ، سچائی کی طرف۔'' نور آنکھیں بند کیے سخت بخار میں مبتلا پورے خلوص کے ساتھ، دل کی گہرائیوں سے اس کے لیے دعا کر رہی تھی۔ ایسے خلوص اور سچائی کے ساتھ سچی دعا جو عرش تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچتی ہے۔

''کرائسٹ! مجھے معاف کر دو۔ مدر میری...... گاڈ......'' وہ بڑبڑا رہا تھا۔ التجائیں کر رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا۔ اس کا سر گھٹنوں کے ساتھ لگا ان کے حضور جھکا چلا جا رہا تھا۔

''اس کا اندر بدل دو۔ اسے اپنی طرف لے آؤ۔'' وہ بھی مسلسل دعائیں کر رہی تھی۔ نیم بے ہوشی میں بڑبڑا رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی۔ کراہتی آواز اور بیمار جسم کے ساتھ التجائیں کر رہی تھی پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ نہ جانے کتنی ہی دیر گزر گئی۔ باہر دھوپ کافی پھیل چکی تھی۔ کسی نے گاڑی کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ بوڑھا چوکیدار اسے اٹھا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

''ولیم صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔''

''اوہ آئی سی! میں تو بھول ہی گئی۔ بابا، آپ میرے ساتھ اندر آئیے۔ ہم اس کو اندر سے لے آتے ہیں۔'' وہ چوکیدار کو روکتے ہوئے بولی اور دونوں نے اسے لا کر گاڑی میں بٹھایا۔ اس نے وھیل چیئر کو فولڈ کر کے ڈگی میں رکھا اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگی۔ دونوں خاموش تھے۔ ولیم ونڈو سے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بہت اُلجھا ہوا لگ رہا تھا۔ مختلف تاثرات اس کے چہرے پر نمودار ہو رہے تھے جیسے کبھی کسی بات کو جھٹلا رہا ہو، تردید کر رہا ہو، مان رہا ہو، چونک رہا ہو۔ اُلجھ رہا ہو۔ وہ بھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے بدلے ہوئے رویے سے چونک رہی تھی۔ چرچ جانے سے پہلے وہ اس قدر خاموش اور اُلجھا ہوا نہیں تھا اور اب بہت پریشان لگ رہا تھا۔

''لگتا ہے تم چرچ جا کر کافی پُرسکون ہو گئے ہو۔'' نور نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''اوں...... ہاں...... ہاں......'' وہ پھر خاموش ہو گیا۔ نور کو اس کے جواب سے مزید تشویش ہونے لگی۔

''پھر فادر سے کونٹیکٹ نہیں ہوا؟''

''نہیں۔'' اس نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔ وہ بھی خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔ اسے کمرے میں چھوڑ کر وہ باہر نکلنے لگی تو رک گئی۔

''ولیم! میرے وظیفے کے چالیس دن پورے ہو گئے ہیں اور اب میں کل سے یہاں نہیں آیا کروں گی۔''

''کیوں کیا مطلب؟ کیا تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟'' وہ ایک دم بے صبری سے بولا۔

''نہیں، لیکن میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''اوہ اچھا! شکر ہے یہ بات ہے۔'' اس نے سکھ کا سانس لیا۔

''ولیم! کیا تمھیں اپنی تنہائی سے بہت ڈر لگتا ہے؟''

''ن...... نہیں تو...... مگر میں......'' وہ اس سے کچھ شیئر کرنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔

''میں دیکھ رہی ہوں تم اپنی سوچوں کو اب الفاظ دینے سے ڈرنے لگے ہو۔ تم کیوں اُلجھ رہے ہو۔ اگر اسی طرح الجھتے جاؤ گے تو تم جنونی ہو جاؤ گے۔ تم کیوں اس طرح کر رہے ہو۔'' وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو اس کی بے بسی اور اندر کے شدید کرب کی داستانیں سنا رہے

تھے۔ اس کی نیلی بلوریں آنکھیں جیسے سفید شیشے کے جار میں تیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ڈبڈباتی ہوئیں، ڈوبتی ہوئیں۔

''ٹھیک ہے اب میں چلتی ہوں۔ میں حیدر انکل کو بتا دوں گی۔ وہ ویسے بھی آنٹی کے لیے نرس کا انتظام کرنے کی بات کر رہے تھے۔ ضرورت ہوئی تو فون کر لینا۔'' وہ کہہ رہی تھی مگر وہ سن نہیں رہا تھا، کہیں کھویا ہوا تھا جیسے کسی بھنور میں کشتی لحہ بہ لحہ ڈوب رہی ہو۔ اس کی سوچیں گرداب میں پھنس رہی تھیں۔ لحہ بہ لحہ نیچے کو سفر کر رہی تھیں اور سارے جذبے جیسا فنا ہو رہے تھے۔ ختم ہو رہے تھے۔ وہ ڈوب رہا تھا۔ ساحل کہیں دور تھا۔ شاید اُفق کے پار...... نظروں سے دور...... ہر شے سراب تھی...... وہ جا چکی تھی اور وہ سر جھکائے کہیں گم ہو چکا تھا۔

وہ سہیل اور آصف کے گھر ہو کر آئی تھی۔ ان لوگوں کی مالی اور اخلاقی مدد کر کے آئی تھی۔ دونوں خاندان تو اسے مسیحا سمجھ کر اس کی پذیرائی کرتے رہے اور بہت سی دعائیں دے کر رخصت کیا۔ اسے گونہ اطمینان محسوس ہوا۔ اندر کی ملامتوں سے قدرے جان چھوٹی۔ وہ ناشتا کرنے کے بعد حسب عادت اخبار پھیلائے سامنے بیٹھی تھی کہ ایک دم چونکی۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ حلق خشک ہونے لگا۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ سارا جسم کانپنے لگا۔ وہ بار بار خبر پڑھ رہی تھی۔ وہ اونچی آواز میں چیخنا چلانا چاہتی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی مگر آواز جیسے کسی صحرا میں گم ہو گئی تھی جہاں ہر طرف ریت کے بگولے اسے اِدھر سے اُدھر اٹھا اٹھا کر پھینک رہے تھے۔ اس نے جلدی سے موبائل کا نمبر ملایا مگر وہ بزی تھا۔ اُف خدایا...... یہ سب کیا ہو گیا۔ وہ اخبار اٹھا کر پھر پڑھنے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی نظریں دھوکا کھا گئی ہوں۔ اس نے کوئی غلط خبر پڑھ لی ہو۔

''آفاق کیسے مر سکتا ہے اور مہ رخ بھی۔ سحر نے دونوں کو شوٹ کر دیا ہے۔ سحر نے...... سحر تو آفاق سے بہت محبت کرتی تھی۔'' وہ خود بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے پھر نمبر ملایا مگر وہ مسلسل انگیج جا رہا تھا۔ اس نے پھر اخبار اٹھا کر خبر پڑھی۔ سحر نے نشے میں وحشت دونوں کو شوٹ کر دیا تھا اور پھر اپنے آپ کو بھی گولی مار لی تھی مگر وہ زندہ تھی اور زخمی حالت میں اسپتال میں داخل تھی۔ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ آفاق اس کا بھائی، تنہائیوں اور تکلیفوں کا ساتھی، اسے اس سے کتنی محبت تھی اور وہ کیسے مر گیا۔ اتنی جلدی...... پہلے فلک اور اب آفاق، آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ آفاق! تم اس طرح نہیں جا سکتے۔ میں کیسے زندہ رہوں گی۔ تم بے

شک دور تھے مگر زندہ تو تھے۔تم نے تو زندگی میں تلخیاں ہی دیکھی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بھی پرسکون نہیں رہا تھا۔اس نے بہت منتشر زندگی گزاری تھی۔ایک ڈال سے دوسری ڈال پر، بے سود اڑانیں بھری تھیں۔ بے مقصد گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ نہ جانے کس کی تلاش میں...... اس نے پھر نمبر ملایا۔ وہ پھر بزی تھا۔اس نے گھر کا نمبر ملایا۔کسی اجنبی آواز نے ہیلو کہا۔اس نے کانپتی آواز میں جنازے کا وقت پوچھا۔

''شام کو مغرب کے بعد۔'' فون بند کر دیا گیا۔اس نے گھڑی دیکھی۔صبح کے گیارہ بج رہے تھے اور شہر پہنچنے میں دو تین گھنٹے تو ضرور لگیں گے۔ پہلے ڈرائیور اسے لینے آئے گا اور پھر اسے لے کر جائے گا۔ وہ بار بار حیدر کو فون ملاتی رہی مگر اس کا موبائل آف تھا۔اس نے ذوالفقار ڈرائیور کا موبائل نمبر ملایا اور اسے جلدی گاؤں آنے کو کہا۔

''بی بی جی! میں پانچ بجے پہنچ جاؤں گا۔''

''نہیں، جلدی آؤ۔ ایمرجنسی ہے اور تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں جی جہلم سے بات کر رہا ہوں۔ حیدر صاحب آگے منگلا گئے ہیں۔ کوئی سرکاری کام تھا۔ میں ان کو چھوڑ کر لاہور آ رہا ہوں۔ وہ رات کو خود آ جائیں گے۔''

''لیکن تم جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کرو۔''

''جی بی بی! میں بس آ رہا ہوں مگر ٹیم تو لگے گا نا۔ جہلم سے شیخوپورہ۔ ٹھیک ہے جی، آپ میرا انتظار کریں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

اس کے لیے ایک ایک لمحہ شدید کربناک ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ آفاق اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ سحر! تم نے کیوں ایسا کیا۔تم بھی تو اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ یہ محبت کرنے والوں کو اچانک کیا ہو جاتا ہے۔ اتنے سفاک، اتنے ظالم، اس قدر خوفناک وحشی درندے کیوں بن جاتے ہیں۔ جیسے ہی مہ رخ کی طرف خیال جاتا تو جیسے کچھ سمجھ آنے لگتا۔ وہ اپنی محبت میں شراکت داری برداشت نہیں کر سکی ہوگی۔ شاید اس لیے......شاید یہی وجہ تھی مگر آفاق......اس کے ساتھ کیوں ایسا کیا...... کیوں؟ وہ رو رو کر پاگل ہو رہی تھی۔

سحر کا بہت خون بہہ چکا تھا۔ وہ کس طرح ہاسپٹل پہنچائی گئی۔ کون لایا، کوئی نہیں جانتا تھا۔اس کے پاس اب کوئی بھی نہیں تھا۔ باہر پولیس کھڑی تھی اس کا بیان لینے کے لیے۔ شاید اس کی حالت بھی خطرے میں تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ ڈاکٹر بھی کوئی توجہ

نہیں دے رہے تھے۔ خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ نہ کوئی آپریشن کر کے گولی نکال رہا تھا اور نہ کوئی اسے پراپرلی چیک کر رہا تھا۔ بس کاٹن رکھ کر بینڈج کر دی گئی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! ملزمہ کا بیان لینا ہے۔'' ایک سپاہی نے سرجن سے پوچھا۔

''ہاں لے لو، کس نے روکا ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''کیا وہ بیان دینے کی حالت میں ہے؟''

''ہاں، ہاں جاؤ۔'' سرجن نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ وہ نرس کے ساتھ اندر گیا۔

''بی بی! آنکھیں کھولو۔'' نرس نے اسے جھنجوڑا۔

''اوں......''

''بیان دو۔'' سپاہی نے کہا۔

''ہاں، میں نے قتل کیے ہیں۔ گولیاں ماری ہیں۔ وہ سو گئے ہیں۔ وہ مجھے گھر سے نکال رہی تھی۔'' اور وہ پھر خاموش ہو گئی۔

''ٹھیک ہے، ادھر سائن کر دو۔'' مگر اس کے ہاتھوں میں جان ہی نہیں تھی۔ نرس نے پین کی سیاہی انگوٹھے پر لگا کر کاغذوں پر انگوٹھا لگا دیا۔ کارروائی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بے بس، بے آسرا پڑی تھی۔ ایک دم اس نے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا اور پھر کچھ یاد آنے لگا۔ مہ رخ اس سے کہہ رہی تھی۔ جلدی اس گھر سے نکلو۔ سڑکوں پر بھیک مانگو یا پھر کہیں اور جاؤ مگر یہ گھر خالی کر دو۔ اس نے اس کا سامان پیک کر کے لاؤنج میں رکھ دیا تھا۔

وہ اس وقت کتنی بے بس تھی جب وہ اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی شدت سے۔ کہاں جائے، کوئی بھی تو آسرا نہ تھا۔ شزا گھر پر نہیں تھی اور مہ رخ آفاق کو بتائے بغیر سب کچھ کر رہی تھی۔ آفاق سو رہا تھا اور وہ اسے دھکے دے رہی تھی، ذلیل کر رہی تھی۔ وہ لڑھکتی ہوئی راستے کے پتھر کی طرح ٹھوکریں کھاتی ہوئی گیٹ سے باہر پھینکی جا رہی تھی۔ وہ بھکارن جو تھی اس لیے اسے دھکے دیے جا رہے تھے۔ پیدائشی بھکارن جس کے نصیب میں پہلے دن سے ہی دھکے لکھے گئے تھے۔ دھکے، ٹھوکریں، گالیاں، جھڑکیاں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ کیا نصیب بھی بدل سکتا ہے۔ وہ ٹوٹ چکی تھی، بکھر چکی تھی۔ ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ مہ رخ بھری شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ رہی تھی۔ اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ مسلسل کچوکے لگا رہی تھی، دھتکار رہی تھی۔ اس نے آخری ٹھوکر مار کر اسے گیٹ سے باہر دھکا دے دیا تھا۔ وہ ویران سڑک پر بیٹھی تھی جیسے تھکی ہاری بھکارن سارا دن چلتے چلتے تھک ہار کر لب سڑک بیٹھ

جائے اور اس کا کاسہ بھی خالی ہو۔ اس کے اندر شدید انتقام کی چنگاریاں آہستہ آہستہ بھڑک رہی تھیں جوالا مکھی بننے کو تیار تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی چند قدم کے فاصلے پر پی سی او پر آئی اور ایک فون کرنے کی اجازت مانگی۔ پی سی او کے مالک نے اس کا حلیہ دیکھ کر اسے فون کرنے دیا۔ اس نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے مسز زبیر کا نمبر ملایا اور انھیں ساری بات بتائی۔

''تم...... تمھیں تو چاہیے کہ ان دونوں کو شوٹ کر دو۔'' مسز زبیر غصّے سے بولی۔ جوالا مکھی کو آگ بھری ہوا ملی۔

''مگر میرے پاس ریوالور نہیں۔''

''تم فکر کیوں کرتی ہو۔ تم کہاں ہو، میں تمھیں دوں گی۔ میرے پاس بہت سے بغیر لائسنس کے ریوالورز ہیں۔ میں ابھی لوڈ کر کے لاتی ہوں۔'' مسز زبیر نے فون بند کر دیا اور چند لمحوں میں وہ اس کے سامنے تھی۔ اسے گاڑی میں بٹھا کر انھوں نے گیٹ کے سامنے اتارا۔

''ذرا بھی نہ ڈرنا اور نہ گھبرانا۔ ایسے مردوں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہیے اور مہ رخ تو ویسے بھی بہت ذلیل ہے۔ میری اس کی پرانی دشمنی ہے۔ ملک منصور کے سامنے جب میں نے اس کا سارا پول کھولا تو بڑی تلملائی تھی۔ شزا نے اس کو ملک منصور کو پھانسنے کے لیے بھیجا تھا۔ خیر تم چھوڑو، دونوں میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑنا۔ دونوں اس قابل نہیں۔ آفاق نے تمھیں کس طرح بانجھ بنا دیا اور پھر خود دوسری شادی بھی کر لی۔ یہ مرد تو ہوتے ہی ہرجائی ہیں۔'' وہ مسلسل بول کر اس کے اندر انتقام کی آگ کو بھڑکا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ اندر ہی اندر جلتے بجھتے کوئلوں کی طرح دہک رہی تھی جیسے کسی پنکھے سے ہوا دینے سے وہ دہکتے ہیں اور پھر ایک دم آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے گیٹ کو دھکا دیا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اندر بھاگتی ہوئی گئی۔ مہ رخ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ اس کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس نے دو تین گولیاں اسے ماریں۔ اس نے وہیں بغیر اس کی طرف دیکھے ٹیبل پر سر رکھ دیا۔ آفاق گولیوں کی آواز سن کر جیسے ہی باہر آیا، اس نے اس پر بھی دو فائر کیے اور پھر اپنے پیٹ کی طرف رخ کر کے ریوالور چلا دیا۔ تینوں وجود خون میں لت پت تڑپ رہے تھے۔ خون بہہ رہا تھا، سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ زندگیاں ختم ہو رہی تھیں۔

تینوں لحہ بہ لحہ ساکت ہو رہے تھے۔ پھر کیا ہوا وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ آفاق مر گیا۔ اس کا آفاق مر گیا تھا۔ وہ چھت کو گھور رہی تھی۔ اسے چھت میں آفاق نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے بھی بلا رہا تھا اور وہ اس کی طرف جانا چاہتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے اس کے

وجود میں سمانا چاہتی تھی۔ میں آ رہی ہوں۔ تمھارے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔ میں تم سے محبّت کرتی ہوں۔ سچّی بالکل سچّی محبت، دنیا کی ہر شے سے زیادہ، تمھیں میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ ہم دونوں ہاں صرف ہم دونوں اور کوئی نہیں۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ ہمیشہ کے لیے آواز تھم گئی۔ کاٹن خون میں بھیگ گئی تھی اب قطرہ قطرہ رس رہا تھا جیسے کوئی زخم مسلسل رستا رہتا ہے۔ اسے لاوارث لاشوں کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا کیونکہ اس کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ وہ کسی کی بیٹی نہیں تھی۔ اس کی قیمت لے کر اس کا باپ نہ جانے کہاں جا چکا تھا کہ پھر اس نے کبھی بھی مڑ کر خبر نہ لی۔ وہ کسی کی بیوی نہیں تھی۔ اسے تو کبھی بھی بیوی کا درجہ نہیں ملا تھا۔ وہ تو بھکارن تھی اسی لیے لاوارثوں کی طرح مر گئی اور وہ کسی کی ماں بھی نہیں بن سکی تھی۔ مائیں تو شرف والیاں بنتی ہیں اور وہ تو دھتکاری ہوئی، درماندہ، بنجر زدہ، ویران کھیتی تھی جس پر پالا پڑا تھا اور اس کی زرخیزی کہیں گم ہو گئی تھی۔ اس کا نام ونشان باقی نہیں رہا تھا جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ نہ نقطہ رہا، نہ ذرہ اور نہ نام...... وہ تو صحرا کی ہوا میں کہیں گم ہو چکی تھی۔

شفق جنازے سے کچھ دیر پہلے گھر پہنچی تو لان میں دونوں لاشیں رکھی تھیں۔ میتوں کے پاس چند ناشناسا عورتیں بیٹھی تھیں۔ شزا بھی ایک کونے میں تھی۔ وہ نقاب والی چادر لیے اندر داخل ہوئی۔ نہ کوئی رو رہا تھا اور نہ ان کی بات کر رہا تھا۔ وہ آفاق کی میت کے پاس بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ شزا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے پاس کھسک آئی۔

''شفق...... تم...... تم انگلینڈ سے کب آئیں؟'' مگر وہ روتی رہی اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ملک منصور سفید اکڑے سوٹ میں ہشاش بشاش، چہرے پر مصنوعی افسردگی طاری کیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ تھے۔ وہ سب میتیں اٹھانے کے لیے آ رہے تھے۔ آفاق کی میت اٹھانے لگے تو وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ ملک منصور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور جیسے سکتے میں آ گیا ہو۔

''تم...... تم کہاں سے آئی ہو؟'' اس نے اردگرد دیکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں اس سے پوچھا۔

''ہاں، آپ نے تو مجھے مار ہی دیا تھا نا۔ آپ تو ہیں ہی قاتل، دنیا کے ظالم ترین انسان...... قاتل باپ...... پہلے فلک کو مارا پھر مجھے اور اب آفاق کو بھی آپ نے ہی مارا ہے۔''

''بکواس بند کرو، تمھیں تو میں بعد میں دیکھوں گا۔ خاموش ہو جاؤ۔''

''نہیں، میں چپ نہیں رہوں گی۔ ساری دنیا کو بتاؤں گی۔ آپ نے سہیل کو قتل کیا اور پھر آصف کو بھی۔''

''شٹ اپ!'' ملک منصور نے تڑاخ سے زوردار تھپڑ اسے مارا۔

''آج میں ساری دنیا کو بتاؤں گی۔ اس سفید سوٹ میں کتنا بڑا قاتل چھپا ہوا ہے، ہر ایک کا قاتل۔''

''میں کہہ رہا ہوں دفع ہو جاؤ اندر!'' وہ اس کا بازو کھینچ کر اندر لے جانے لگا۔ وہ اسے گھسیٹ رہا تھا اور وہ چلا رہی تھی۔ ہر کوئی حیرت اور خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے سب کے سب پتھر کے مجسمے بن گئے ہوں۔ اس نے ایک دم جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور بھاگتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ چادر وہیں آدھی گیٹ کے اندر اور آدھی باہر فرش پر پڑی تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو تیزی سے چلانے کو کہا۔ ملک منصور نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی کو اشارہ کیا اور ایک سفید کرولا ان کا پیچھا کرنے لگی۔

''بی بی جی، آپ گھبرائیں نہیں۔'' ڈرائیور نے تسلی دی۔

''حیدر انکل کہاں ہوں گے؟''

''اس وقت تو معلوم نہیں لیکن رات کو دس بجے انھوں نے گلبرگ والے گھر مجھے آنے کو کہا تھا۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

''بس وہیں مجھے لے چلو۔''

''ٹھیک ہے۔'' گاڑی مسلسل ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ ذوالفقار بھی ایکسپرٹ ڈرائیور تھا۔ وہ بھی ان کو ڈاج دے رہا تھا پھر اس نے ایک دم گاڑی گنجان آباد علاقے کی طرف موڑ دی۔ گلیوں اور بازاروں سے ہوتا ہوا وہ اب سنسان سڑک پر تھا۔ دور دور تک کوئی روشنی نہ تھی۔ اب کوئی گاڑی پیچھا نہیں کر رہی تھی۔

''آپ پُرسکون ہو جائیں، اب وہ لوگ ہمارا پیچھا نہیں کر سکتے۔ میں نے ان کو بہت ڈاج دیا ہے۔ ویسے یہ لوگ کون تھے؟''

''میرے باپ کے کارندے!'' وہ آہستہ سے بولی تو وہ چونک گیا مگر خاموش رہا اور گاڑی چلاتا رہا۔ اس نے گیٹ کے سامنے جا کر ہارن دیا۔ حیدر کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ افضل نے گیٹ کھولا۔

''حیدر انکل آ گئے ہیں؟'' اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''ہاں، وہ کمرے میں بی بی جی کے پاس ہیں۔'' افضل نے بتایا۔

''مجھے جلدی سے ان کے پاس لے چلو۔'' وہ بوکھلائی ہوئی بولی۔

''انکل! انکل! آپ کہاں چلے گئے تھے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ اس کا جسم مسلسل کانپ رہا تھا۔ وہ اردگرد دیکھے بغیر ان سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے سر پر نہ چادر تھی نہ دوپٹا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا جیسے موت کے منہ سے آئی ہو۔ حیدر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور ایک نظر بستر پر پڑی شہلا کی طرف...... اسے سچویشن بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ مسلسل پوچھ رہی تھی اور وہ حیرت میں ڈوبا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

انکل...... آپ کو معلوم ہے آفاق مر گیا ہے...... سحر نے آفاق کو گولی مار دی ہے اور...... اور اب پاپا کے لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں آفاق کو دیکھنے گئی تھی...... انکل سب کچھ ختم ہو گیا...... آفاق...... بھی مر گیا...... پہلے فلک مر گئی...... اور اب آفاق...... نہ جانے میں کب تک زندہ رہوں گی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی اور سانسیں بے ربط ہو رہی تھیں۔ وہ شدید صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ ایک دم وہ فرش پر گر گئی۔

شہلا تو سب کچھ سن کر سکتے میں آ گئی وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پتھر کی ہو گئی ہو۔ حیدر نے جلدی سے شفق کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اسے پانی پلایا اور اپنی گاڑی سے فرسٹ ایڈ باکس منگوا کر اس میں سے انجکشن نکال کر اسے لگائے۔ وہ خود اس سچویشن سے ایک دم بہت پریشان ہو رہے تھے۔ وہ تو شہلا سے ہر بات چھپاتے آ رہے تھے اور اب ہر ہر بات اس کے سامنے خود بخود آ گئی تھی۔ وہ یوں ساکت لیٹی تھی جیسے سانس بھی نہیں لے رہی ہو۔ بس آنسو دونوں آنکھوں سے بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

''شہلا ہمت کرو...... تم منصور کو اچھی طرح جانتی تو ہو...... اس انسان سے یہی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ بہت ظالم انسان ہے۔''

''اور میں اس سے بڑھ کر...... میرے گناہوں کے پھل کتنے کڑوے، کسیلے ہیں...... سب کچھ میرے سامنے آ گیا ہے...... سارے بکھرے ہوئے وجود یہ...... وہ شفق تو نہیں لگ رہی...... میری شفق ایسی نہیں تھی...... یہ تو بہت بکھری بکھری ہے...... اور فلک کب مر گئی...... مجھے پتا ہی نہیں چلا اور تم نے بھی مجھ سے چھپایا...... میں اپنے بچوں کی قاتل

ہوں...... میں ہی اپنے بچوں کی دشمن نکلی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا ایک فیصلہ ان کی زندگیوں کو کیسے تباہ و برباد کر دے گا۔ کسی ماں نے ایسے نہیں کیا ہوگا جو کچھ میں نے کیا...... میں نے جس طرح شفق کو روتے بلکتے چھوڑا...... وہ آج بھی ویسی ہی نظر آئی...... خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا...... اور اب مجھے معاف بھی نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ دونوں ہاتھ زور زور سے اپنے چہرے پر مارنے لگی۔

''شہلا یہ کیا حماقت ہے...... کیا کر رہی ہو؟'' حیدر نے زبردستی اس کے ہاتھ کو پکڑا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''میرا آفاق بھی مر گیا...... فلک بھی اور میں زندہ ہوں اب مجھے بھی مر جانا چاہیے۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس کی چیخیں بلند تر ہو رہی تھیں۔ ولیم ایک دم چونک گیا اور وھیل چیئر تیزی سے چلاتا ہوا ماں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ حیدر ان کے پاس بیٹھے ان کے ہاتھوں کو سختی سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے اور وہ رو رہی تھیں۔ ولیم کا خون ایک دم کھولنے لگا...... اسے سچویشن سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے حیدر پر غصہ آنے لگا...... نہ جانے وہ مما کے ساتھ...... کہ وہ چلا رہی تھیں۔ وہ سخت بوکھلا گیا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟'' وہ غصے سے حیدر کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کچھ نہیں......'' حیدر آہستہ سے بولے۔

''مگر مجھے تو کوئی اہم بات لگ رہی ہے......'' اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔ شہلا ابھی تک رو رہی تھی۔ حیدر نے حیرت سے ولیم کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' جواباً وہ خاموش رہا۔ شہلا پھر اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگی۔

''خود دیکھ لو...... اسے میں اس حرکت سے روک رہا تھا...... نہ جانے ہماری اولادیں لمحوں میں کیوں بدگمان ہو جاتی ہیں...... تم لوگوں کے دلوں میں ایمان اور اعتماد کتنا کم ہے...... کسی نتیجے تک پہنچنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگاتے اور ایک دم فیصلہ کر لیتے ہو۔ تم لوگ کتنے جذباتی ہو......'' حیدر کو بھی اب غصہ آ رہا تھا مگر وہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھے ہوئے تھے۔

''مما...... مما...... یہ آپ کیا کر رہی ہیں......؟'' اب ولیم نے اس کے ہاتھوں کو روکنا چاہا مگر وہ شدتِ جذبات وغم سے بالکل نڈھال ہو رہی تھی، رو رہی تھی، سسکیاں بھر رہی تھی۔

''آخر بات تو بتائیں، کیا ہوا ہے......؟'' اس نے انھیں جھنجوڑا۔

''کچھ نہیں...... بس تم سب یہاں سے جاؤ...... مجھے تنہا چھوڑ دو......'' اس نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، آپ کو بتانا ہوگا۔ آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں......؟'' وہ بھی بضد تھا۔

''تم جاؤ یہاں سے...... وہ شدید ڈپریشن میں ہے......'' حیدر نے آہستہ سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا اور باہر جانے لگا...... ایک دم مڑا...... اس کی طرف دیکھا۔

''آئی ایم سوری انکل......'' وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ حیدر خاموش رہے...... وہ کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

''اب رونے سے کیا فائدہ؟'' حیدر نے اسے سمجھایا۔

''تو میں کیا کروں...... تم ہی بتاؤ...... اپنے گناہوں اور ان کی تباہی پر روؤں بھی نہ تو کیا کروں...... حیدر میرا دل پھٹ رہا ہے...... خدا کے لیے مجھے کوئی ایسا انجکشن لگا دو...... کہ میں مزید کچھ سننے کے لیے زندہ نہ رہوں...... پلیز کچھ تو کرو...... خدا کے لیے......'' وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ التجائیں کر رہی تھی۔

''ہوش میں آؤ شہلا...... یہ کیا پاگل پن ہے......'' وہ قدرے خفگی سے اور ڈانٹتے ہوئے بولے اور اسے اس کی دواؤں میں سے ٹیبلٹ دی...... حیدر پریشان تھے، کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے گہری سوچ میں گم تھے اور وہ آہستہ آہستہ نیند کی وادی کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو رہی تھی۔

ولیم سخت نادم ہو رہا تھا انجانے میں اس سے کتنی غلط حرکت ہو گئی تھی۔ حیدر انکل بالکل بھی ایسے نہ تھے جیسے اس وقت اس نے سوچا۔ اس نے بلاواسطہ انداز میں ہر طرح سے ان کا جائزہ لیا تھا۔ ان کی اور مما کی باتوں سے اس نے یہ تو اندازہ لگا لیا تھا کہ دونوں کی ماضی میں کافی اٹیچمنٹ رہی تھی لیکن ان کے چہرے سے ٹپکتی شرافت اور عظمت کو وہ کبھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ عظمت اور شرافت کے پیمانے میں قطعی کم وزن نہیں رکھتے تھے۔ اس نے ان پر شک بھی کیا اور طنز بھی...... وہ سخت پریشان ہو رہا تھا اس سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے نور کو فون ملایا۔ وہ اس سے یہ بات جلد از جلد شیئر کرنا چاہتا تھا۔ بیل جا رہی تھی مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا بالآخر کافی بار ٹرائی کرنے کے بعد کسی خاتون نے فون اٹھایا۔ اس نے نور کا پوچھا۔

''وہ تو کراچی گئی ہے......'' خاتون نے بتایا۔

''کب؟'' حیرت سے ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا۔

''دو تین دن ہو گئے ہیں......''

''اور واپس کب آئے گی......؟''

''معلوم نہیں......'' دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا۔

یہ انکشاف اس کے لیے سخت حیران کن تھا۔ نور اسے کچھ بتائے بغیر اچانک کہاں چلی گئی تھی۔ ''نہیں...... وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اور یوں اچانک...... مجھے بتائے بغیر...... نو...... نو...... اٹس امپاسیبل...... نور ایسا نہیں کر سکتی...... وہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ بیمار ہے اس لیے نہیں آ سکے گی...... اس کا مطلب ہے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا...... لیکن اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور...... ویسے بھی اس نے آج تک مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے کیونکر یہ کیا...... آخر کیوں؟'' وہ الجھ رہا تھا۔

''دنیا میں کوئی رشتہ پائیدار نہیں...... ہم سب کو کبھی نہ کبھی...... کہیں نہ کہیں...... جلد یا بدیر...... بالآخر ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑتا ہے...... یہی زندگی ہے......'' ایک دن نور اسے سمجھا رہی تھی اور اب اس کے کہے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

''لیکن میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا...... تم جانتی ہو...... میں اپاہج اور معذور ہوں...... تمھارے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا...... تم مجھے یوں زندہ موت نہیں دے سکتی ہو...... میں کیسے سروائیو کروں گا۔''

وہ سخت ڈپریشن کا شکار ہو رہا تھا۔ پہلے ندامت تنگ کر رہی تھی اب تنہائی اور ڈپریشن......

حیدر یہیں رک گئے تھے۔ گھر کے سارے مکین اس وقت شدید ٹینشن میں تھے۔ شفق شدتِ غم سے نڈھال بالکل بے ہوش پڑی تھی۔ شہلا شدید احساسِ گناہ سے تڑپ رہی تھی اور ولیم شدتِ ندامت سے بے چین ہو رہا تھا حیدر کا یہاں ٹھہر جانا ہی مناسب تھا حیدر نے ایک نرس کو کال کیا تھا۔ نور انھیں بتا کر گئی تھی کہ وہ کراچی کسی اہم کام کے سلسلے میں جا رہی ہے اور چند دن اسے وہیں لگ جائیں گے۔ اس نے ولیم کو بھی رنگ کیا تھا مگر وہ سو رہا تھا اس لیے اس نے اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہا۔ حیدر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ذوالفقار ڈرائیور سے ساری بات سن رہے تھے اور گہری سوچ میں گم تھے۔

''یقیناً انھوں نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا......''

''معلوم نہیں سر...... اندھیرا ابھی اتنا گہرا نہیں تھا۔''

''ذوالفقار اب تم اس گھر کی طرف مت آنا اور اس گاڑی کو بھی استعمال نہ کرنا چند روز کے لیے فیکٹری کے گیراج میں کھڑی کر دو...... تم میری لینڈ کروزر استعمال کر لیا کرو...... اور میرے لیے بلیک وی ٹی آئی اور شیر شاہ کو بھیج دو......'' حیدر نے اسے ہدایات دیں۔

''ٹھیک ہے سر اب میں چلتا ہوں......'' ذوالفقار اٹھ کر چلا گیا تو وہ شہلا کے کمرے میں آ گئے اور وہاں پر موجود نرس سائرہ کو شہلا کے بارے میں مختلف ہدایات دینے لگے۔ وہ اس کی دوائیوں کے بارے میں سمجھا رہے تھے۔ جب شفق متورم آنکھوں اور چہرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی...... اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ انجکشنز کی وجہ سے اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ وہ پورا دن اور رات سوئی رہی تھی۔ شہلا اس کی طرف مسلسل دیکھ رہی تھی مگر اس نے ایک دفعہ بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا...... شہلا کا بیڈ کونے میں لگا تھا اور وسیع چوکور کمرے کے اس کونے میں روشنی بھی قدرے کم تھی۔ حیدر اس سے کافی فاصلے پر صوفے پر بیٹھے تھے...... ایک صوفہ کم بیڈ، شہلا کے بیڈ کے پاس تھا جبکہ دوسرا صوفہ...... ٹی وی ٹرالی اور ٹیبل اس سے کافی فاصلے پر بیڈ کی پائنتی کی جانب رکھے تھے...... حیدر دونوں کو آبزرو کر رہے تھے۔

''انکل...... اب میں کیا کروں گی...... کہاں جاؤں گی پاپا کے لوگ یہاں تک بھی آ سکتے ہیں۔'' وہ قدرے تشویش سے بولی۔

''گھبرانے کی بات نہیں...... اس گھر کا انھیں کبھی بھی علم نہیں ہوگا۔'' حیدر نے اسے تسلی دینا چاہی۔

''انکل آپ نے یہ گھر کب خریدا......؟ آپ نے بتایا بھی نہیں......''

''بس کچھ ماہ پہلے......''

''انکل...... سحر اسپتال میں ہے اور۔''

''نہیں...... وہ بھی اب زندہ نہیں رہی...... میں نے اسپتال فون کیا تھا۔''

''کب......؟'' وہ پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی۔

''کل رات کو......''

''اور...... اس کو کس نے دفنایا...... پاپا اس کی میت کو تو گھر نہیں لائے ہوں گے۔''

''ہاں...... اسے لاوارث قرار دے کر ایدھی ٹرسٹ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ مجھے

ساری بات کی خبر بہت بعد میں ملی...... ورنہ...... خیر...... اب تم پریشان نہ ہو۔"
ایک دم شہلا کو زور سے کھانسی ہوئی تو حیدر نادانستہ اٹھ کر اس کی طرف لپکے شفق نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور وہ بھی حیدر کے پیچھے گئی۔ ایک نیم مردہ...... ہڈیوں کا وجود...... گہری سیاہ رنگت کے ساتھ بستر پہ پڑا کھانس رہا تھا۔ نہ سر پر بال نہ جسم پر گوشت...... کوئی بھی اجنبی ایک دفعہ دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا۔

"انکل...... یہ کون ہیں؟" شفق نے حیرت سے پوچھا۔

"حیدر نے شہلا کی طرف دیکھا...... وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں نفی کا اشارہ کر رہی تھی...... اسے نہ بتانے پر اصرار کر رہی تھی۔ حیدر نے گہری سانس لی۔ شفق کے حیرت زدہ مشکوک چہرے کی طرف دیکھا۔

"شفق یہ تمہاری ماں ہے شہلا......" وہ آہستہ سے بولے۔ شفق نے حیرت سے منہ کھولا اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ن...... ن...... نہیں......" وہ بغیر کچھ کہے بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔
حیدر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"حیدر...... یہ کیا کیا......؟ وہ تو پہلے ہی شدید اذیت میں ہے اور اب......"

"حقیقت کو چھپانے سے بہت سی تلخیاں جنم لیتی ہیں اور ویسے بھی سچ نے ایک نہ ایک دن ظاہر تو ہونا ہی ہوتا ہے...... اسے سارے صدمے ایک ساتھ برداشت کر لینے دو......"

"اور اگر وہ حواس کھو بیٹھی تو......"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا...... اس نے زندگی میں بہت تلخیاں دیکھی ہیں۔ بہت اذیتیں سہی ہیں اور ایسے انسانوں کا اندر ایسی باتوں کا عادی ہو جاتا ہے...... اس لیے ایسے شاکس انھیں زیادہ ڈسٹرب نہیں کرتے۔"

"ہاں...... اس نے میری گود سے جدائی تک...... اور اب تک نہ جانے کتنے دکھ سہے ہیں۔ پلیز اسے جا کر دیکھو...... اسے سمجھاؤ...... کہ وہ روئے نہ...... وہ روتی ہے تو میرا دل تڑپنے لگتا ہے۔ میں گناہ کے احساس سے اور تلملانے لگتی ہوں...... پلیز حیدر جاؤ...... پلیز......" وہ اس سے التجا کر رہی تھی۔ حیدر اٹھ کر گئے تو وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹی سسکیاں بھر رہی تھی۔

"شفق...... شفق بیٹا...... اٹھو...... ایسے بی ہیو نہیں کرتے......" حیدر نے پیار سے

اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''انکل یہ سب کیا ہے...... اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے...... آخر میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے...... مما...... یہاں کیوں آئیں...... اور آپ نے انھیں کیوں اس گھر میں رکھا ہے جہاں میں آئی ہوں...... انھیں کیوں یہاں رکھا ہے؟''

''بیٹا وہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہے اور بیمار بھی...... تم نہیں جانتیں کہ وہ اب صرف چند دنوں یا پھر مہینوں کی مہمان ہے۔ اسے برین ٹیومر ہے۔ آپریشن تو ہوا...... مگر ٹیومر پھر پھیل رہا ہے...... وہ کہاں جاتی...... کب تک غیروں کے گھر میں پڑی رہتی۔ اس لیے میں اسے اس گھر میں لے آیا۔''

''انکل آپ کیوں لائے...... انھیں ان کے دوسرے شوہر کے پاس کیوں نہیں چھوڑ دیا۔ اب وہ کہاں ہے...... جس کے لیے مجھے، آفاق اور فلک کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔'' وہ غصے سے بول رہی تھی اور آنسو بہہ رہے تھے۔

''اس نے اسے بھی چھوڑ دیا......''

''اور اب جب کسی قابل نہیں رہیں تو یہاں آگئیں۔''

''وہ خود نہیں آئی...... میں اسے لایا ہوں۔''

''کیوں انکل؟''

''کیونکہ تایا ابا نے اسے بیٹیوں کی طرح پالا تھا اور انھوں نے مرتے ہوئے مجھے وصیّت کی تھی کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اسے تنہا نہ چھوڑوں وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے اور شاید جانتے بھی تھے کہ جتنی ٹھوکریں وہ کھا چکی ہے کہیں زندگی میں تنہا نہ رہ جائے...... میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی صرف تمھیں بتا رہا ہوں...... تم بھی اسے معاف کر دو۔''

''نہیں انکل...... میں انھیں معاف نہیں کر سکتی...... وہ ہماری زندگیوں کے ساتھ کھیلی ہیں...... کیا وہ رات میں بھول سکتی ہوں جب ہم بالکل تنہا تھے اور فلک تڑپ رہی تھی...... وہ کیسے مر گئی ہمیں پتا ہی نہ چلا...... میں اور آفاق...... پاگلوں کی طرح کمروں میں گھومتے رہے، روتے اور چلاتے رہے، مما...... مما پکارتے رہے مگر وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ تھیں...... اور پاپا شزا آنٹی کے ساتھ ہنی مون منانے گئے تھے انکل میں ان دونوں کو معاف نہیں کر سکتی...... آفاق...... اس کی تو کوئی زندگی ہی نہ تھی...... وہ آوارہ پتنگوں کی طرح سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا...... میں جانتی تھی اس کے اندر آگ تھی۔ ایک لاوا تھا جو ہر

وقت پھٹنے کو تیار رہتا تھا...... میں نے اس کے چہرے پر ایک دفعہ بھی مسکراہٹ اور قہقہہ نہیں دیکھا...... میرا بھائی خود اندر ہی اندر جلتا رہا...... اور پھر بجھ گیا......'' اس نے سسکیاں بھرنا شروع کر دیں ''اور میں خود...... کیسے بھٹک گئی میں نے کیسے کیسے گناہ کیے...... قتل بھی کیے اور...... ان سب باتوں کی صرف وہی ذمے دار ہیں۔ انکل میں یہاں نہیں رہوں گی...... ایک دن بھی نہیں رہوں گی۔ آپ مجھے گاؤں بھیج دیں۔ میں ان کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی......'' اس کے اندر شدید نفرت تھی جو وہ اگل رہی تھی۔

''شفق بیٹا...... پلیز کول ڈاؤن ہو جاؤ۔ اس وقت تمہاری مما کو تمہاری ضرورت ہے، کوئی بھی نہیں جو اسے سنبھال سکے۔ میں بہت مشکل سے وقت دے پاتا ہوں اور اسے فل ٹائم اٹینشن چاہیے......'' حیدر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہیں انکل...... میں اتنی وسیع القلب نہیں۔ کہتے ہیں ماں باپ کا دل بہت وسیع ہوتا ہے جس میں اولاد کی ہر خطا اور گناہ سما سکتا ہے مگر اولاد کا دل کبھی بھی اتنا بڑا نہیں ہو سکتا اور ماں تو اولاد کے لیے ہر قربانی دے سکتی ہے لیکن ہماری ماں نے تو ہمارے لیے کچھ بھی نہیں کیا...... اب وہ مجھ سے کچھ توقع نہ کریں...... میں ان کی کچھ نہیں لگتی۔'' وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

''شفق اگر ہر انسان یوں سوچنا شروع کر دے تو اس دنیا میں سانس لینا بھی دشوار ہو جائے۔ انسان کا وجود تو انسانیت سے ہے۔'' حیدر نے پیار سے سمجھانا چاہا۔

''انکل تو کیا ہم نے کبھی زندگی میں سکون کا سانس لیا...... ہم نے تو ایک دن کیا ایک لمحہ بھی اپنے آپ کو پرسکون محسوس نہیں کیا...... ہم تو ہر وقت دہکتے کوئلوں کی طرح اندر ہی اندر سلگتے رہے ہیں۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تو کیا تم اس حالت میں بھی اپنی ماں کو معاف نہیں کرو گی......؟'' حیدر نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

انکل پلیز اس موضوع پر بات مت کریں۔ میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں اب مزید کچھ نہیں سوچنا چاہتی ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میرے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں...... ہم نے تو ان کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔'' وہ قدرے تلخی سے بولی تو حیدر پریشان ہو کر باہر نکل گئے۔

''حیدر وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' شہلا اسے یوں افسردہ دیکھ کر بولی۔

''ہاں...... اب بہتر ہے۔''

''حیدر وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہے؟''

''کچھ نہیں......''

''تم کچھ چھپا رہے ہو......''

''جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو چھپانا کیسا......؟''

شہلا نے گہری سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

حیدر ولیم سے کچھ ناراض تھے۔ اس لیے وہ اس کے کمرے میں نہیں گئے۔ البتہ افضل اور نرس کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ دونوں کا ہر ممکن خیال رکھیں۔ شفق واش روم میں تھی وہ حیدر کے ساتھ گاؤں جا رہی تھی۔ حیدر لاؤنج میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے ولیم وھیل چیئر پر آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھا۔

''انکل...... آئی ایم سوری...... آپ مجھ سے ابھی تک ناراض ہیں......'' حیدر نے اس کی طرف بغور دیکھا اور خاموش رہے۔

''آئی ایکسٹریملی سوری...... نہ جانے مجھے کیا ہو گیا......''

''ولیم تم نوجوان لوگوں کی سوچ بہت چھوٹی اور دعوے بہت بڑے ہوتے ہیں...... سب کچھ لمحوں میں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے...... تم لوگوں کو نہ تو کسی پر اعتبار ہے اور نہ ہی خود پر اعتماد تم لوگ تو مٹی کے بھر بھرے وجود اور کھنکتے جسم ہو۔'' ان کے لہجے میں ٹھہراؤ مگر الفاظ میں قدرے کاٹ اور نظروں میں خفگی تھی۔ ولیم خاموش رہا۔

شفق ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکلی...... اور ولیم کو دیکھ کر ٹھٹکی...... ''مشرق و مغرب کا خوبصورت امتزاج......'' وہ چونکی۔

''حیرت انگیز حد تک مما کی شبیہہ......'' ولیم نے اسے حیرت سے دیکھ کر سوچا۔ شفق نے حیدر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا استفہام تھا۔

''شفق یہ تمہارا اسٹیپ برادر ہے۔ ''ولیم'' اور ولیم یہ تمہاری اسٹیپ سسٹر ہے ''شفق'' اور اگر تم دونوں اسٹیپ کا ورڈ نکال دو تو تم دونوں بہن بھائی ہو...... جو کہ ایک خوبصورت ترین رشتہ ہے۔'' حیدر نے قدرے اطمینان سے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔

''انکل چلیں......'' وہ اس کو ایک دم نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے...... میں اپنا بریف کیس لے آؤں......'' وہ اٹھ کر اوپر کمرے میں

چلے گئے...... جہاں وہ آرام کرتے تھے۔ شفق صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ مما سے بہت ملتی ہیں...... اور آپ کی آواز بھی۔'' ولیم نے بات بڑھانے کے انداز میں کہا۔

''نہیں، میں ان سے بالکل نہیں ملتی...... تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ غصّے سے بولی۔

''آپ مما سے ناراض لگتی ہیں...... کیا آپ ان سے ملی ہیں...... وہ بہت بیمار ہیں......''

''جو گناہ کرتا ہے وہ اسی طرح......'' وہ اچانک خاموش ہوگئی۔ ولیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ...... نیلی آنکھیں...... بھورے بال...... کراس والا لاکٹ۔

''کیا تم کرسچن ہو......؟'' شفق نے قدرے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ولیم اس کی بات سن کر بوکھلا سا گیا...... اور کچھ سوچنے لگا۔

''ہاں...... ہاں...... میں کرسچن ہوں......'' وہ آہستہ آواز میں بولا لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے شفق دنیا کی کسی حقیر ترین مخلوق سے مخاطب ہو۔

''تمہاری مما بھی کرسچن ہیں......'' اس کے لہجے میں پھر چبھن تھی۔

''معلوم نہیں، شاید نہیں۔''

''کیسی گندی زندگی مما نے گزاری ہے......؟'' وہ پھر حقارت سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

''گناہوں سے بھری دلدل میں...... تف ہے ایسی زندگی پر...... بچوں کے ساتھ ساتھ ایمان کو بھی داؤ پر لگا دیا کفر کی خاطر......'' وہ غصّے سے بولی۔

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟'' ولیم اس کی باتوں پر دکھی ہو رہا تھا۔

''ایک مسلمان عورت جب کفر کو جنم دے تو اس سے بڑھ کر اس کی بدنصیبی کیا ہوگی...... اور پھر چلتا پھرتا گناہ بھی ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے......'' اس کے اندر آتش فشاں پھٹ چکا تھا اور اب لاوا آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا وہ ہر ممکن اندر کا زہر اگلنا چاہ رہی تھی۔

''آپ مجھ پر طنز کیوں کر رہی ہیں......'' اس نے تو محبت سے اس کی طرف قدم بڑھانا چاہا تھا اور وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھا۔

''اس لیے کہ تمھارے باپ نے مما کو بہکایا......''

''مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا......''

''اب تو جان گئے ہونا......'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''میرا اس میں کیا قصور ہے......؟''

''تو ہمارا کیا قصور تھا...... جب ہم تینوں بہن بھائیوں کو چھوڑ کر مما تمھارے باپ کے ساتھ چلی گئیں......تم جانتے ہو......فلک سب سے چھوٹی صرف دو سال کی میری گود میں روتی رہی......آفاق چیختا رہا اور مما چلی گئیں......اب وہ دونوں مر گئے ہیں اور میں زندہ رہ گئی ہوں......میں ان کو اس حالت میں دیکھنے کے لیے زندہ رہ گئی ہوں۔ اب تم دونوں تڑپ تڑپ کر جیو گے......خدا کرے ایسا ہی ہو......جس طرح ہم تڑپے ہیں......روئے ہیں......تم اور مما بھی اسی طرح روؤ......جس طرح ہمارا رونا کوئی نہیں سنتا تھا......تم لوگ بھی روؤ، سسکو......اور کوئی بھی تمہاری مدد کو نہ آئے اور خدا تم لوگوں کے ساتھ یہی تو کر رہا ہے......مما کی کیسی خوفناک حالت ہے اور تم اس قدر محتاج......'' اس نے اس کی ٹانگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے......ولیم حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا......اس کی باتیں سن کر اس کا اندر کانپنے لگا...... وہ تو قطعی توقع نہیں کر رہا تھا کہ کوئی زندگی میں اسے یوں بددعا دے گا......اور وہ اس کے سامنے بیٹھ کر نہ صرف اسے کوس رہی تھی، بددعائیں بھی دے رہی تھی اور وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔

حیدر بریف کیس لے کر آئے......شفق کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ٹھٹکے......ولیم کی طرف دیکھا...... اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا...... وہ خاموشی سے دروازے کی طرف چل پڑے......وہ بھی بنا کچھ کہے اور دیکھے ان کے پیچھے باہر نکل گئی۔

ولیم کا وجود انگاروں پر لوٹ رہا تھا نہ جانے وہ انگاروں کی کیسی چادر بچھا گئی تھی جس میں وہ بری طرح جھلس رہا تھا اس کی باتیں اس کے کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح مسلسل نشتر چبھو رہی تھیں...... اتنی کڑواہٹ...... اتنا زہر...... اس کا حلق سوکھ رہا تھا...... اس میں مسلسل کانٹے چبھ رہے تھے......''چلتا پھرتا گناہ...... چلتا پھرتا گناہ......'' اس کی سخت توہین ہوئی تھی......اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے......اتنا روئے کہ اس کا دل پھٹ جائے۔ اس کا دماغ پھٹ جائے......کاش وہ یہ سب نہ سنتا۔ کاش وہ اس سے بات نہ کرتا۔ کاش وہ اس سے نہ ملتا...... ہر لمحہ تاسف و ملال سے پُر تھا......وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا......

اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا...... اور شاید شفق کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

شہلا کو سخت دکھ ہو رہا تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر چلی گئی تھی۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس کے دل میں ماں کے لیے کتنی نفرت تھی۔ اس کا مطلب ہے اس نے اسے معاف نہیں کیا تھا۔ حیدر بھی جا چکا تھا اور وہ بھی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اس نے نرس کے ذریعے ولیم کو بلایا۔

''ان کو بتا دو کہ میں نہیں آ سکتا۔ میری طبیعت خراب ہے......'' وہ تلخی سے بولا...... مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شفق کے کہے ہوئے الفاظ نے اس کی روح تک کو چھلنی کر دیا تھا۔ نرس نے یہی پیغام دیا تو وہ تڑپ اٹھی۔ ولیم بھی اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

''یا خدایا...... یہ سب کیا ہو رہا ہے...... میں کب تک...... آخر کب تک یونہی سب کے ہاتھوں ذلیل ہوتی رہوں گی...... کیا مجھے سمجھنے والا کوئی بھی نہیں ہے...... تو تو مجھے اور میری مجبوریوں کو سمجھتا ہے......''

''سائرہ...... مجھے سہارے سے اس کے کمرے میں لے چلو......'' اس نے نرس کو کہا۔

''میڈم...... آپ کیسے اٹھیں گی......''

''کوشش کرتی ہوں......''

''وہ اس کے سہارے بمشکل چلتی ہوئی ولیم کے کمرے میں گئی تو وہ بستر پر لیٹا تھا۔ آنکھوں پر بازو رکھے وہ آہستہ آہستہ سسک رہا تھا۔

''سائرہ تم جاؤ......'' اس نے نرس کو کہا تو وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کیا بات ہے ولیم...... بیٹا کیا تم مجھ سے ناراض ہو......؟'' وہ جیسے مجرم بنی اس سے سوال کر رہی تھی۔

وہ خاموش رہا۔

''کیا تم رو رہے ہو......؟'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو ہٹانے کی کوشش کی تو اس نے سختی سے بازو چھڑایا اور اس کے ہاتھ کو پرے دھکیلا۔

''آخر تم بتاؤ تو سہی کیوں ناراض ہو...... ولیم پلیز اس طرح مت کرو...... ورنہ میں مر جاؤں گی...... میں بہت مشکل سے تمھارے پاس آئی ہوں۔''

''مجھے جو آپ نے زندہ رسوائی کی قبر میں ڈال دیا ہے...... وہ کیا ہے...... مجھے آپ

کی وجہ سے کیا کچھ سننا پڑ رہا ہے۔''

''کیا سننا پڑ رہا ہے......اور کس نے کہا؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''آپ کی بیٹی نے؟''

''شفق نے......اس نے کیا کہا تم سے......؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''اس نے مجھے آپ کا ''چلتا پھرتا گناہ'' کہا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھے کون ذلیل کرے گا، مما......کاش آپ مجھے پیدا ہی نہ کرتیں اور اگر کیا تھا تو مجھے وہیں چھوڑ آتیں۔ میرا ملک اور میرا مذہب تو وہاں کا ہوتا جہاں کا میں ہوں۔ یہاں تو میں ایک تماشا بن گیا ہوں۔ آپ سب مسلمانوں کے درمیان ایک کافر......آپ کیسے مسلمان ہیں......مجھ سے یوں بی ہیو کرتے ہیں جیسے میں کوئی ناپاک انسان ہوں۔ آپ نے مجھے ایک نجاست بنا دیا ہے......آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ بلبلانے لگا۔

''ہاں......میں ہی سب کی گناہگار ہوں...... ہر کوئی مجھے ہی قصوروار سمجھتا ہے۔ میں مانتی ہوں مجھ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ کیا میرے اقرار کی سزا ہے کہ ہر کوئی مجھ پر حملہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اپنے گناہ کا اقرار خدا کے سامنے کرو تو وہ بھی معاف کر دیتا ہے مگر تم لوگوں نے تو مجھے اس کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے جہاں میرے لیے کوئی معافی نہیں......'' اس کی بھی آنکھیں برسنے لگیں۔

''آپ بتائیں میں کیا کروں......کہاں جاؤں......آپ......آپ مجھے واپس بھیج دیں میرے ڈیڈ کے پاس۔''

''کیا کہا......کیا کہا تم نے......اس کے پاس جس نے مجھے طلاق صرف تمہاری وجہ سے دی تھی جو کہتا تھا کہ اسے تمہارا وجود ہی نہیں چاہیے کل کو کہیں میں اسے تمہاری وجہ سے تنگ نہ کروں اور تمہاری زندگی کے بدلے میں نے طلاق لینا منظور کی......اس باپ کے پاس واپس بھیج دوں......'' اس کا جسم غصے سے تھرتھرانے لگا۔

''پھر آپ مجھے یہاں کیوں لائیں؟''

''تمہارے بہت سے کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں......تم جتنی سزا مجھے دینا چاہتے ہو......اس کا فیصلہ کر لو...... جہاں میں نے اتنا سہا ہے یہ بھی سہہ لوں گی......لیکن اس طرح میں مجرم بن کر اپنی زندگی کے دن پورے نہیں کر سکتی...... ہو سکتا ہے یہی میری زندگی کا آخری دن ہو......'' اس نے اردگرد دیکھتے ہوئے آہ بھر کر کہا۔

ولیم نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا...... اور اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے اس کے گھٹنے پر اپنا سر رکھ دیا وہ اس کے سر کو گود میں رکھ کر والہانہ چومنے لگی اس کے سارے وجود سے دوائیوں کی مہک آ رہی تھی مگر وہ تو ایسے بے قراری سے اس کے ساتھ چمٹا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ بہت دنوں کی جدائی کے بعد ماں کے سینے سے لپٹ کر اپنی اداسی دور کر رہا ہو۔

''شفق نے جو کچھ بھی کہا ہے اسے بھول جاؤ...... وہ بہت دکھی ہے اور وہ مجھ سے ناراض بھی ہے۔تم تو میرے پاس رہے اور میں جتنی محبت تمھیں دے سکتی تھی دی...... مگر وہ نہ تو باپ کی محبت کو پا سکی اور نہ ماں کی......'' اس نے اس کی پیشانی اپنے ہڈیوں والے ہاتھ میں لے کر ان پر پپڑی زدہ ہونٹ رکھ دیے...... وہ روتا رہا...... وہ اسے سہلاتی رہی...... اور اس کے اندر کی کدورت اور نفرت رفتہ رفتہ آنسوؤں کے ساتھ بہتی گئی۔

......۞......

جب سے شمائل نے تین خون آلود انسان تڑپتے، سسکتے دیکھے تھے اس واقعے نے اس کے ذہن پر گہرا اثر کیا تھا۔وہ چیختی چلاتی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس نے خوفزدہ ہو کر اپنا کمرا لاک کر لیا تھا۔شزا دروازہ ناک کر کے تھک چکی تھی مگر وہ کھولتی ہی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے وہ چوکیدار کی مدد سے کھڑکی کا شیشہ تڑوا کر اندر داخل ہوئی اور یہ دیکھ کر چونک گئی اس کے ہاتھوں اور سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش پڑی تھی۔اس کی سانس بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی...... باہر آفاق اور ماہ رخ کی میتیں پڑی تھیں شزا اسے ہوش میں لانے میں مصروف تھی۔اس نے ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا اس نے انجکشنز لگا کر اسے سلا دیا۔

شفق کی آمد سے ملک منصور کی بہت سبکی ہوئی تھی۔ ہر نظر میں استفہام تھا۔وہ باپ کو سرِ عام رسوا کر کے گئی تھی لیکن ملک منصور نے کمالِ ہوشیاری سے اس بات کو کور کرنے کی کوشش کی تھی اس نے سب کو بتا دیا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا اور وہ فونٹین ہاؤس میں ایڈمٹ تھی نہ جانے کیسے وہاں سے بھاگ آئی مگر کوئی بھی اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ وہ جس گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہوئی تھی وہ فونٹین ہاؤس کی نہیں بلکہ اس پر مخصوص گرین کلر کی نمبر پلیٹ تھی اور شفق بھی بظاہر نارمل لگ رہی تھی۔

ملک منصور اندر ہی اندر کھول رہا تھا بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا اور ان کی تدفین کی تھی۔اس کے بعد وہ اور اس کے کارندے مسلسل اس کی تلاش میں تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندہ کیسے بچ گئی اور اتنا عرصہ کہاں رہی...... کیا ایسا بھی ممکن تھا اور

سب سے بڑھ کر کہ اسے پناہ کس نے دی تھی..... کون ایسا ہو سکتا ہے جو ملک منصور سے دشمنی مول لے..... اس کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا..... اور ایک دم اس کے ذہن میں ''حیدر'' کا نام گونجنے لگا..... یقیناً وہ حیدر ہی ہوگا۔ حیدر کے علاوہ یہ کام اور جرأت اور کوئی نہیں کر سکتا تھا..... اس نے پی اے سے حیدر کا نمبر ملانے کو کہا۔ حیدر شفق کو چھوڑنے گاؤں جا رہا تھا۔

''ملک منصور بات کر رہا ہوں؟''

''ہوں.....'' حیدر نے گہری سانس بھر کر کہا۔

''شفق کو میرے حوالے کر دو.....''

''کون شفق.....؟''

''میرے ساتھ بحث مت کرو..... ورنہ..... میں.....''

''ملک منصور میں ایسا لہجہ سننے کا عادی نہیں ہوں..... اور نہ ہی کوئی عام انسان ہوں، جس کے ساتھ آپ جیسی چاہیں گفتگو کریں۔'' حیدر نے غصے سے موبائل آف کر دیا اور شیخوپورہ جانے کے بجائے اس نے رینالہ خورد جا کر گاڑی روکی۔ وہاں ان کے [redacted]دوست نجیب احمد رہتے تھے۔ وہ رات وہیں ٹھہرے اور ان سے کہا کہ وہ شفق کو جلد از جلد پشاور میں تبسم آپا کے ہاں پہنچا دے..... شفق حیران ہو رہی تھی کہ وہ اس کے لیے کتنی ٹینشن لے رہے تھے۔ پہلے دن کی ملاقات سے لے کر اب تک وہ اس کے لیے مضبوط ڈھال بنے ہوئے تھے۔ ایسے سائباں جس کے سائے تلے آ کر وہ اپنے آپ کو بہت محفوظ محسوس کرتی تھی۔ اس کا اندر ڈر رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کے لمبے ہاتھوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ تو پاتال سے بھی اپنے دشمنوں کو نکال لانے کا عادی تھا اور اب تو وہ اسے کبھی بھی نہیں چھوڑے گا مگر حیدر اسے بہت تسلیاں دے رہے تھے.....

''میں بہت جلد تمھیں پشاور میں آ کر ملوں گا..... تبسم آپا کے شوہر آرمی میں ہیں۔ وہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہوگی۔ گھبراؤ نہیں۔''

''انکل کیا ہم دوبارہ زندگی میں مل سکیں گے.....'' نہ جانے وہ کیوں بے یقینی کا شکار ہو گئی تھی۔

''ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں..... انشاء اللہ..... میں تم سے کونٹیکٹ رکھوں گا اور سنو زندگی میں اتنی جلدی ہمت نہیں ہارتے..... زندگی کا ہر لمحہ آزمائشوں سے پُر ہوتا ہے.....''

''کاش ہر کوئی آپ جیسا باہمت اور وسیع القلب ہو..... میں نے آپ کو بہت تنگ

کیا ہے۔آئی ایم سوری.....'' وہ مشکورانہ لہجے میں بولی۔

''اگر تمھارے دل میں میرے لیے کوئی اچھا جذبہ ہے تو اس کی خاطر اپنی مما کے بارے میں اپنا دل صاف کرنے کی کوشش کرو۔ وہ چراغِ سحری ہے کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔''

''انکل..... میں اپنی زندگی کے اتنے سالوں کی اذیتوں کو کیسے بھول جاؤں کاش میں آپ کو وہ لمحے بتا سکتی جب لندن میں ہم ان سے جدا ہو رہے تھے انھوں نے ہمیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا..... اس وقت ہم کتنا رو رہے تھے مگر مما نے ہماری خاطر بھی اپنا فیصلہ نہیں بدلا..... سوری میں سب کچھ نہیں بھول سکتی۔ نہ جانے کتنی تنہا راتیں ہم نے خوف میں گزاریں..... اور..... کتنے لمحے اذیت میں..... جب ہمیں مایوسیوں نے گھیرا تو کوئی ایک بھی دلاسا دینے کے لیے ہمارے پاس نہ تھا اور ہم..... بھٹکتے گئے..... بگڑتے گئے..... برباد ہوتے گئے۔ کسی نے نہ ہمیں سمجھایا اور نہ بچایا.....'' وہ پھر سسکنے لگی۔ اس کی بات سن کر حیدر خاموش ہو گئے۔

''ٹھیک ہے..... میں جا رہا ہوں..... اپنا خیال رکھنا'' خدا حافظ کہتے ہوئے اور نجیب احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔

موبائل آن کیا تو ملک منصور کی کال ان کی منتظر تھی۔

''حیدر..... مجھے سیدھی طرح بتا دو..... شفق کہاں ہے.....؟'' ملک منصور غصے سے بولا۔

''حیرت ہے..... بیٹی تمہاری ہے اور پوچھ مجھ سے رہے ہو.....'' حیدر پرسکون لہجے میں بولے۔

''مجھے معلوم نہیں تھا وہ بھی اپنی ماں پر گئی ہے جو اس کی طرح پچھلے تعلقات نہ بھلا سکی.....'' ملک منصور کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

''تم تو پھر بہت کمزور شخص ہو جو دونوں کو نہ بدل سکے.....''

''جسٹ شٹ اپ..... اور اسے میرے حوالے کر دو.....'' ملک منصور غصے سے دہاڑا۔

''تمہاری بیٹی ہے خود ڈھونڈو اور آئندہ مجھے فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں بدکردار اور بداخلاق لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا.....'' حیدر نے فون غصے سے بند کر دیا۔ ملک منصور نے موبائل غصے سے پرے پھینکا۔ شزا اس کی باتیں سن رہی تھی وہ شمائل کی وجہ سے بے حد پریشان تھی اور ملک منصور شفق کی وجہ سے۔

''منصور..... شمائل بہت بیمار ہے..... ڈاکٹر کہہ رہا تھا اس نے اس واقعے کا شدید

اثر لیا ہے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' شزا بول رہی تھی مگر وہ سن نہیں رہا تھا۔ وہ تو کہیں گم تھا۔ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا شزا اس کی عدم دلچسپی دیکھ کر بھڑک اٹھی۔

''میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔'' وہ غصے سے بولی۔

''لیکن میں اس وقت کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔'' وہ بھی غصے سے بولا۔

''تم کب تک یوں فریب کی زندگی گزارتے رہو گے۔ تنکا تنکا تمہارا گھر بکھر چکا ہے اب اور کس بات کے منتظر ہو تم انسان نہیں...... کبھی نہ کبھی کسی انسان کے دل میں بھی کسی کے لیے درد جاگ اٹھتا ہے مگر تمہارا دل تو جیسے پتھر کا ہے...... شمائل کس قدر بیمار ہے تمھیں اندازہ ہے۔ کس کی خاطر اتنی گہری چالیں چل رہے ہو......'' شزا چلاتے ہوئے بولی۔

''میری باتوں میں دخل دینے کی کوشش مت کیا کرو...... تمھیں شمائل کی زیادہ فکر ہے تو جاؤ اسے پاگل خانے چھوڑ آؤ...... اور سنو...... اگر تم اس گھر میں ہو تو میرا احسان مانو...... ورنہ تم جیسی عورتوں کو تو میں دو دن میں فارغ کر دیتا ہوں......'' وہ اس پر دہاڑتے ہوئے بولا۔

''کیا کہا...... مجھ جیسی عورتوں کو...... اور...... تم...... تم کس قماش کے انسان ہو۔ جانتے ہو...... گھٹیا...... بدکردار...... رذیل ترین...... دھوکے باز جس سے شیطان بھی پناہ مانگے۔'' شزا بھی غصے سے پھٹ پڑی ملک منصور نے دو تین تھپڑ اسے مارے...... شزا چلانے لگی۔ اتنے شور وغل سے ایک دم شمائل کی آنکھ کھل گئی وہ جلدی سے باہر آئی اور باپ کو یوں مارتے ہوئے دیکھ کر بدحواس ہوگئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے...... ہونٹ نیلے پڑنے لگے...... آنکھیں جیسے پتھرا سی گئیں، وہ وہیں گر گئی۔

شزا سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس کی طرف بھاگی...... اور اس کا سر گود میں رکھ کر چیخیں مارنے لگی کسی کو مدد کے لیے پکارنے لگی...... مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ ملک منصور جا چکا تھا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور وہ خود اسے گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئی۔ وہ شدید صدمے سے دوچار تھی۔ شمائل نیم مردہ حالت میں بستر پر پڑی تھی۔ وہ گیلی آنکھیں کھولتی کبھی بند کرتی کبھی ہنستی، کبھی خاموش ہو جاتی۔

''اس کو الیکٹرک شاکس دینے پڑیں گے......'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''کیوں......؟''

''آخری کوشش ہے، شدید پرسنالٹی ڈس آرڈر اسے اس اسٹیج پر لے آئی ہے۔'' ڈاکٹر کہہ رہا تھا اور وہ ہونقوں کی طرح سن رہی تھی۔

''پرسنالٹی ڈس آرڈر......'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔ جیسے کچھ نہیں سن رہی تھی کچھ بھی کہیں ذہن میں اٹک گیا تھا...... وہ الجھ گئی تھی، پھنس گئی تھی کسی بھنور میں...... کسی گرداب میں...... گہرے پانی میں غوطہ زن زندگی کی چند سانسوں کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر سب کچھ ناممکن نظر آ رہا تھا...... وہ شدید کرائسس میں تھی...... شدید ذہنی بحران میں......شاید پرسنالٹی ڈس آرڈر اسے بھی آہستہ آہستہ اندر ہی اندر تباہ کر رہا تھا۔

......✡......

آئیکت، ملک منصور کی باتوں پر حیران ہو رہی تھی۔ وہ آج اسے بہت کمزور...... مضمحل...... اور قدرے عمر رسیدہ لگ رہا تھا...... وہ ایسا تو نہیں تھا وہ تو ہمیشہ اس کی صاف ستھری، اجلی اجلی شخصیت دیکھنے کی عادی تھی...... اس کی خوبصورت باتیں اس کو تقویت بخشتی تھیں...... اس کا نرم گرم لب ولہجہ، خوشبوؤں سے معطر سانسیں، مدہوش کرتی نظریں...... اور اب وہ ٹوٹا پھوٹا لگ رہا تھا...... ملک منصور ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ زندگی سے ہار ماننے والا تو نہیں تھا۔ کیا وہ ہار مان گیا تھا...... وہ اس سے ملنے رات کے دو بجے اسلام آباد چلا آیا تھا...... وہ ہوٹل میں مقیم تھی اور اس نے فون کر کے اسے اطلاع دی تھی۔ وہ حیران تھی کہ وہ کافی دنوں کے بعد آیا تھا۔ اس دوران اس نے اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا تھا اور اب اچانک...... رات کے اس پہر......

''آپ اس وقت...... اور بہت پریشان لگ رہے ہیں؟'' آئیکت نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں...... میں بہت ڈپریشن میں ہوں اس لیے تمھارے پاس آیا ہوں۔ آئیکت مجھے سکون چاہیے۔ صرف چند لمحوں کے لیے...... میں...... میں...... بہت الجھ چکا ہوں......'' وہ آئیکت کا نرم و نازک ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

''لیکن بات کیا ہے، میں آپ کو یوں اس طرح کبھی سوچ بھی نہیں سکتی......'' آئیکت حیران ہو رہی تھی۔

''میں تم سے جلد از جلد شادی کرنا چاہتا ہوں ورنہ میں بکھر جاؤں گا۔ میں انتظار نہیں کرسکتا......'' وہ قدرے بے صبری سے بولا۔

''آپ کو کیا ہو گیا ہے...... ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے...... میں آپ کو ٹیبلٹ دیتی ہوں...... آپ سو جائیے...... میں صبح آپ سے بات کروں گی......''

''نہیں...... مجھے تمہاری ضرورت ہے......'' وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

''نہیں...... آپ کو آرام کی اور سکون کی ضرورت ہے......'' آئیکت نے محبت بھرے لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ جیسے مطمئن ہو گیا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر آئیکت کے رحم و کرم پر تھا...... آئیکت نے ٹیبلٹ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سے نکال کر اسے پانی کا گلاس دیا۔ اس نے خاموشی سے گلاس لیا اور ٹیبلٹ کھا کر اس کے بستر پر لیٹ گیا...... آئیکت صوفے پر بیٹھی گہری سوچ میں گم تھی۔ یہ شخص اسے اب الجھا رہا تھا...... اس نے جو فیصلہ بہت دن پہلے کیا تھا اب اس پر سوچنے کا ایک اور موقع مل گیا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ سو چکا تھا پورا کمرا اس کے خراٹوں سے گونج رہا تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ ملک منصور کے ساتھ گزرا ایک ایک لمحہ اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا اور وہ اس میں سے اب سچ تلاش کرنے کی کوشش میں تھی۔ فیصلہ بہت مشکل تھا مگر اسے کرنا تھا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو وہ آفس کے کام کے سلسلے میں جا چکی تھی ایک میسج لکھ کر وہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ گئی تھی۔ اس نے اسے موبائل پر کال کی مگر وہ جلدی میں اپنا موبائل ادھر ہی چھوڑ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی آ گئی۔ ملک منصور اب قدرے بہتر لگ رہا تھا۔ نہا دھو کر شیو کر کے، اسکن شرٹ اور براؤن پینٹ میں ملبوس وہ پھر پہلے جیسا لگ رہا تھا آئیکت نیوی بلیو جینز کے ساتھ ڈینم کی ہی واسکٹ اور اسکائے بلیو شرٹ پہنے ہوئے تھی...... اس کے بال قدرے بڑھ چکے تھے اور جسم بھی قدرے کمزوری کی طرف مائل تھا...... البتہ اس کے چہرے پر پھیلی یاسیت نے اس کے چہرے کی دلکشی کو بہت حد تک ماند کر دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''کیا بات ہے...... تم کچھ بیمار لگ رہی ہو...... اور بہت مختلف بھی......'' ملک منصور نے اس کے گرد بازوؤں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، پچھلے دنوں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی......'' وہ آہستہ سے اپنے آپ کو اس کے شکنجے سے آزاد کراتے ہوئے بولی۔

''اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں......'' وہ قدرے بے صبری سے بولا۔

''ایسی خاص بیمار نہیں تھی۔ بس بخار تھا...... مگر اب تو میں ٹھیک ہوں۔''

''نہیں...... تم اب بھی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہو...... چلو میں ابھی تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں...... سنو...... مجھے پہلے والی آئیکت چاہیے...... خوبصورت...... مرمریں...... نرم و نازک...... گل بدن......'' وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

''اور اگر وہ نہ مل سکی تو......''

''تو......تو...... میں اسے کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا...... چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی گہرے سمندر میں کودنا پڑے یا پھر آسمان پر سفر کرنا پڑے۔'' وہ مسکرا کر بولا اور اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھنا چاہے آئیکت فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ ملک منصور نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا وہ ہر طرح سے اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش میں تھی اس کا رویہ ملک منصور کے لیے بہت حیران کن تھا۔

''کیا بات ہے......تم کچھ پریشان اور بیزار سی لگ رہی ہو؟''

''نہیں......آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے......''

''سنو......میری آئیکت کہاں ہے......؟'' وہ پھر اس کی طرف محبت پاش نظروں سے بڑھا۔

''وہ......وہ شاید کہیں گم ہو چکی ہے۔'' آئیکت اس کی طرف پشت کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں......ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ملک منصور بازی جیت کر کبھی ہار نہیں سکتا اس نے ہارنا سیکھا ہی نہیں اور جس دن اس نے اپنی ہار کو قبول کر لیا وہ شاید اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا لیکن مجھے یقین ہے وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔

آئیکت خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی وہ شدید الجھن کا شکار لگ رہی تھی۔

''آئیکت تمھیں کیا ہو گیا ہے......ڈارلنگ تم اس طرح بی ہیو کر رہی ہو آخر تم سمجھ کیوں نہیں رہی کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں اور اس وقت مجھے تمہاری اشد ضرورت ہے مگر تم بہت بدلی بدلی لگ رہی ہو کیا تمھیں مجھ سے محبت نہیں رہی......؟'' ملک منصور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر بولا۔ وہ خاموش تھی۔ شاید مناسب الفاظ کی تلاش میں...... یا پھر مناسب موقع کی۔

''بولو...... ڈارلنگ......تمھارے دل میں جو کچھ ہے بول دو...... میں نے تم سے محبت کی ہے اور تمہاری ہر پریشانی میری پریشانی ہے۔ میں تمہارا ہر دکھ ہر پریشانی اور ہر الجھن شیئر کرنا چاہتا ہوں......پلیز بولو تو سہی......''

ملک منصور نے اس کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے پیار سے چمکارتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ وہ خاموش رہی۔

''بولو نا......کیا بات ہے......؟'' اگر میری کوئی بات تمھیں بری لگی ہے تو کہہ دو میں

تمہاری کسی بات کا برا نہیں مناؤں گا۔ تم مجھے دنیا کی ہر ہستی سے زیادہ عزیز ہو اور تمہاری آنکھوں میں تیرتے ان آنسوؤں کے بدلے میں دنیا کی قیمتی سے قیمتی شے قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا کیا تم میری محبّت کی آزمائش کرنا چاہتی ہو...... یا پھر مجھ سے دور جانا چاہتی ہو......'' ملک منصور نے اسے اعتماد بخشتے ہوئے کہا۔

''بولو...... ڈارلنگ...... میں تمھارے دل کی آواز سننا چاہتا ہوں۔'' وہ بہت محبت سے نرم لہجے میں بولا۔

''میں...... آپ سے شادی نہیں کرسکتی......'' وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ ملک منصور نے گہری سانس لی...... پُرمشاہدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور صوفے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ آئیکت اس کے جواب کی منتظر تھی۔

''کیا تم شادی نہیں کرسکتیں یا پھر کرنا نہیں چاہتیں؟''

''اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔

''تم الجھن میں مت پڑو...... اگر تم نہیں کرسکتیں تو اس میں یقیناً کوئی مصلحت یا پھر تمہاری کوئی مجبوری ہوگی اور اگر کرنا نہیں چاہتیں تو پھر تمھارے دل میں میرے لیے نفرت یا پھر بے یقینی ہے۔ اب بتاؤ ان دونوں میں سے تم کس الجھن کا شکار ہو کیونکہ اگر اب تمہارے دل میں میرے لیے بدگمانی ہے تو یقیناً تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو...... اور میں وہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں......'' وہ آہستہ آہستہ اسے لفظوں کے جال میں الجھا رہا تھا اور وہ مزید الجھ گئی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے...... سچ کہے یا جھوٹ۔

''بولو...... آئیکت......'' وہ آہستہ سے اس کے قریب آ کر بولا۔

''میری کچھ مجبوریاں ہیں اس لیے...... اس لیے میں شادی نہیں کرسکتی۔'' اس نے جلدی سے کہہ دیا۔ وہ اس سچویشن سے جلد از جلد فرار چاہتی تھی...... وہ اس کی قربت اور رفاقت سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔

''کیا وہ مجھ سے شیئر نہیں کروگی؟'' اس نے پھر کہا۔

''نہیں......'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''آئیکت تم مجھے وجہ بتائے بغیر چھوڑ سکتی ہو لیکن میں تمھیں وجہ جانے بغیر کیسے چھوڑ دوں؟ کچھ تو بتاؤ...... کچھ تو کہو...... ورنہ...... میں......''

آئیکت نے خاموش مگر استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم سوچ بھی

نہیں سکتیں میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میرا نہ تو سیاست میں دل لگ رہا ہے نہ بزنس میں سوائے تمھارے۔''

''خدا کے لیے...... بس کریں...... محبّت...... محبت...... یہ سب جھوٹ ہے...... فراڈ ہے...... آپ جیسا شخص زندگی میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ آپ کو صرف اور صرف اپنے آپ سے محبت ہے۔ اپنی دولت سے اور اپنے اسٹیٹس سے...... آپ نے تو مجھے استعمال کرنا چاہا...... میں ہی بے وقوف نکلی...... جو آپ کی محبت اور ذات کے سحر میں کھوگئی۔'' آئیکت غصّے سے پھٹ پڑی اور شدتِ جذبات سے اس کا گلا رندھنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ملک منصور خاموشی سے صوفے پر پُرسکون ہو کر بیٹھ گیا اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اس کی بات پر بالکل نہ بھڑکا بلکہ آہستہ آہستہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلنے لگی۔

''بس...... کچھ اور...... میرا خیال ہے ابھی تمھارے دل میں بہت کچھ ہے اور ڈیئر میں وہ سب کچھ سن کر تمہارا کتھارسس کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا اور آئیکت اس کو پُرسکون دیکھ کر اور بھڑک اٹھی۔

''آپ کو اطلاع تھی کہ میں پاکستان کس مقصد کے لیے آ رہی ہوں اور آپ نے میرے لیے محبت کا سنہرا جال بچھایا۔ میں سوچ میں پڑ گئی اور خوش فہمی کا شکار ہوگئی کہ محبّت جیسے حسین اور نازک جذبے اور رشتے کو کوئی بھی شخص یوں کسی کو ایکسپلائٹ کرنے کے لیے استعمال نہیں کر سکتا میں نے زندگی میں کسی سے محبّت نہیں کی تھی۔ اس جذبے سے ناآشنا تھی اور...... بہک گئی یا پھر آپ نے مجھے بہکا لیا......'' وہ قدرے روہانسی ہو کر بولی۔

''یہ سب تمھیں کس نے بتایا......؟'' وہ بغیر گھبرائے اور پریشانی ظاہر کیے بولا۔

''یہ خدا نے مجھے بچانا چاہا اور اس لیے راستے پیدا کر دیے......؟''

''سنو آئیکت...... مجھے علم تھا کہ تم پاکستان کس مقصد کے لیے آ رہی ہو۔ ہماری حکومت کی پالیسیوں اور ہمارے بارے میں رپورٹس اکٹھی کرنے ہمارے فراڈ کیسز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے...... لیکن جب تم اپنے مشن پر آئی تھیں تو تمھیں کچھ علم نہیں تھا۔ اس کی فیڈ بیک تمھیں آہستہ آہستہ ملنی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب تم آئیں تو تب تک تمھیں فیکس موصول نہیں ہوئے تھے یہ سب کچھ تمھیں اب ملا ہے لیکن مجھے تم سے...... اور تمھارے مشن سے قطعی کوئی خطرہ نہیں تھا اس کو میں نے بہت لائٹلی لیا...... اس ملک کا بڑے سے بڑا طاقتور اور کرپٹ شخص اور ایجنسی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ملک منصور نے کبھی کچی گولیاں نہیں

کھیلیں اگر ہمارے خلاف ثبوت اکٹھے کیے جا رہے ہیں تو غافل ہم بھی نہیں...... میں نے بھی ہر ایک کے بارے میں ڈاکومینٹس اکٹھے کیے ہوئے ہیں اور میں نے ان چیزوں سے بالاتر سے محبّت کی ہے۔ مجھے دنیا میں کسی سے خطرہ نہیں...... ہر ایک کو اس کی اوقات کے مطابق ڈیل کرنے کا فن میں بخوبی جانتا ہوں......لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری ایک کمزوری ہے جو صرف تمھیں بتا رہا ہوں۔ میں حسن پرست ہوں......اور تمہارا آتشیں حسن مجھے کس کس طرح بہکاتا ہے اور بھڑکاتا ہے......تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔'' وہ بہت سلجھے ہوئے انداز میں الفاظ پر زور دے کر بولا۔

''بس کریں...... منصور...... کس حسن کی بات کر رہے ہیں، ہر بات کی لمٹس ہونی چاہئیں۔ ایک بیوی کو طلاق دی...... دوسری ویسے **Suffer** کر رہی ہے......اور آپ کی فیملی کس قدر شیٹرڈ ہے...... مجھے سب علم ہے اور...... ابھی...... چند روز پہلے آپ کی بہو اور بیٹا قتل ہوئے ہیں۔ یہ سب کیا ہے...... آپ نے تو مجھے ڈسٹرب کر کے رکھ دیا ہے۔''

''اوہ......تو تمھیں سب خبریں ہیں۔''

''ہاں...... آپ کب تک مجھ سے جھوٹ بولتے رہیں گے۔''

''میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا...... بتاؤ میں نے کب جھوٹ بولا......تم نے میری فیملی کے بارے میں کب پوچھا اور میں نے تمھیں کب جھوٹ بتایا......رہی بات بیوی کو طلاق دینے کی تو طلاق اس نے خود لی اس کا کیریکٹر اچھا نہیں تھا اور یہی بات اس کے بچوں کے لیے ڈسٹربنس کا باعث بنی میں نے تو انھیں ہر آسائش دی مگر وہ شیٹرڈ ہی رہے اور میں جانتا ہوں یہ سب باتیں تمھیں شزا نے بتائی ہیں۔'' وہ زیرِ لب مسکرا کر بولا۔

اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اگر تمھیں یاد ہو تو آج تم اپنا موبائل ادھر ہی بھول گئی تھیں......اور اتفاق سے میں نے سارے نمبر ٹریس آؤٹ کروا لیے ہیں جہاں جہاں سے وہ فون کرتی تھی شزا نے بہت کوشش کی کہ اپنے آپ کو چھپائے، ہر دفعہ مختلف نمبر استعمال کیے مگر تم عورتیں ہمیشہ کہیں نہ کہیں حماقت کر بیٹھتی ہو اور کوئی نہ کوئی کلیو چھوڑ دیتی ہو...... چھوڑو...... ڈارلنگ کن چکروں میں پڑ گئی ہو......صرف یہ سوچو کہ میں تم سے واقعی محبت کرتا ہوں......'' وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ آئیکت پوری بھڑاس نکالنے کے بعد اب خاموش بیٹھی تھی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شخص کتنا گھاگ نکلے گا...... وہ ہر ہر بات میں شاطر کھلاڑی کی طرح صاف بچ نکلا تھا...... الٹا وہ پکڑی گئی تھی۔

شنزا اور وہ۔ اس کے چہرے پر یاسیت کا رنگ نمایاں تھا۔

''سویٹ ہارٹ...... شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں...... ملک منصور کا دل بہت وسیع ہے...... اس میں تم اپنی ساری کمزوریوں اور خامیوں سمیت آسانی سے سما سکتی ہو...... کیا تم اپنے لیے میری اتنی محبت کو بھول بیٹھی ہو...... کس طرح میں شدت سے تمہاری آمد کا منتظر تھا...... اور تمہارے گھر کی آرائش...... آئیکت حسن پاکستان میں بھی بہت ہے...... جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھوں...... حسن مچلتا ہوا میرے پاس آ جاتا ہے مگر تمہیں تو میرے دل نے پسند کیا ہے...... اور میرا دل جسے پسند کر لے...... وہ شے میری نہ ہو یہ کبھی نہیں ہوا......'' وہ قطعیت سے مسکرا کر بولا۔

''مگر شنزا کو بھی تو آپ کے دل نے ہی پسند کیا تھا......''

''ہاں...... مگر وہ اس دل میں سما نہ سکی۔''

''شادی کے بعد تو اس سے آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ آپ کسی سے شادی نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی کی طرف دیکھیں گے...... تو پھر......'' وہ قدرے معصومیت سے سب کچھ اگلنے کو تیار تھی۔

''اچھا...... اور کیا کیا کچھ شنزا نے بتایا'' وہ بھرپور قہقہہ لگا کر بولا۔ آئیکت نے حیران کن نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر بشاشت اور سکون ہی سکون تھا۔

''بہت کچھ......'' وہ بھی پرسکون لہجے میں بولی۔

''اپنی اپنی آبزرویشن ہے...... تم صرف اتنا اس سے پوچھتیں کہ اگر ملک منصور اتنا برا ہے تو کیوں اس کے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ خود مختار ہے این جی او چلا رہی ہے پھر اس نام نہاد شادی کو کیوں نبھا رہی ہے۔ رہی میری بات تو مجھے اسے ساتھ رکھنے میں کسی قسم کا نہ فائدہ ہے اور نہ نقصان...... شی از نتھنگ ٹو می ایٹ آل...... اونلی یو آر...... ڈارلنگ...... اونلی یو آر......'' وہ اس کے قریب آ کر محبت بھرے لہجے میں بولا۔

آئیکت اب مزاحمت نہ کر سکی...... اور خاموشی سے سر جھکا لیا......

''آج تمہیں میرے دل کی دھڑکن سن کر یقین کرنا ہوگا اس میں صرف اور صرف میری کیوٹ آئیکت ہے......'' وہ اسے بھینچتے ہوئے بولا...... آئیکت جیسے آکٹوپس کے شکنجے میں بری طرح جکڑی جا چکی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے راستے دل کا غبار چھٹ رہا تھا۔ اس کی سانسوں میں اس کے کلون اور ایکسٹسی کی خوشبو رچ بس رہی

تھی...... وہ پہلے والی آئیکت نہیں رہی تھی...... ایک نیا وجود جنم لے رہا تھا...... یہ زندگی تھی یا سراب...... یہ سب سراب تھا...... یا پھر فریب...... وہ کچھ تعین نہ کر سکی۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھا اور واش روم میں چلا گیا۔ فریش ہو کر باہر نکلا تو آئیکت لیٹی ہوئے آنکھیں کھولے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں......؟''

''مجھے لاہور بہت ضروری کام سے جانا ہے...... رات تک آ جاؤں گا اور پھر ہم شادی کر لیں گے...... اور اپنے گھر میں رہیں گے...... اب تو تمھیں مجھ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا......'' وہ قہقہہ لگا کر بولا تو وہ بھی مسکرا دی۔

''ٹائم کیا ہوا ہے......'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''گیارہ بج رہے ہیں......''

''اوہ...... مجھے تو بہت ضروری کام تھا...... آفس جلدی پہنچنا تھا......''

وہ ایک دم اٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا اب بھی کام کی ضرورت ہے...... مجرم تو خود تمھارے کٹہرے میں دوزانو کھڑا ہے اب کس لیے کام کر رہی ہو...... سب چھوڑو...... لائف انجوائے کرو......'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ کچھ نہ کہہ سکی...... بس خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اچھا...... اپنا خیال رکھنا...... میں جلدی آ جاؤں گا...... اینڈ آئی ایم رئیلی سو گلیڈ......'' وہ اس کی پیشانی پر لب رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب تو تمھیں یقین آ گیا ہوگا...... میرے دل کی دھڑکن سن کر...... اور ہر طرف اپنا عکس دیکھ کر......'' وہ مسکراتے ہوئے بولا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا...... اور وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ گہری سوچ میں گم تھی یہ سب کیا ہو گیا تھا...... اس نے تو نہ جانے کتنی پلاننگ کی تھی...... ملک منصور کو دھتکارنے کی...... اسے اپنے سے دور رکھنے کی اور وہ کیسے اس کے شکنجے میں آ گئی...... اسے شزا کے الفاظ یاد آنے لگے......

''وہ ہر عورت کو آکٹوپس کی طرح شکنجے میں جکڑ لیتا ہے اور وہ پھر مزاحمت نہیں کر سکتی......'' شزا نے اس کو بہت وارن کیا تھا اس کی ہر ہر بات بتائی تھی۔ اس کی عادتیں، اس کی دلفریبیاں، اس کی مکارانہ چالیں...... سب کچھ اور وہ پھر بھی اس کی باتوں میں آ گئی اسے

شدید احساسِ زیاں ہو رہا تھا۔شدید غلطی اور گناہ کا احساس اسے رفتہ رفتہ اپنے حصار میں لے رہا تھا۔آنسو اس کے چہرے کو تر بتر کرنے لگے......اتنے میں اس کا موبائل بجنے لگا......اس نے نمبر اٹھا کر دیکھا اور ہیلو کہا......

''آئیکت......کیا تم آئیکت ہو؟''

''ہاں......''اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تمہاری آواز......کیا تم رو رہی ہو؟''وہ جواباً خاموش رہی۔

''کیا ملک منصور تمھارے پاس آیا تھا؟''

''ہاں......''وہ آہستہ سے بولی۔

''تو پھر......''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

''کیا تم اس کے ہاتھوں کھلونا بن گئیں......اور......وہ تم سے کھیل چکا۔''آئیکت سسکیاں بھرنے لگی۔

''آئیکت تم نے بہت خسارے کا سودا کیا۔میں نے ہر ہر بات سے تمھیں آگاہ کیا تھا وہ عورتوں کی مجبُوریوں سے ان کو ایکسپلائٹ کرنے کا فن اچھی طرح جانتا ہے اور تم پھر بھی......میرے ہر طرح سے سمجھانے کے باوجود اس کے شکنجے میں آ گئیں۔میں نے تمھیں بچانے کی بہت کوشش کی مگر تم بھی میری طرح کمزور نکلیں۔شاید ہر عورت اندر سے اتنی ہی کمزور ہوتی ہے۔مجھے بہت افسوس ہوا ہے......اب تمھارے پاس کوئی آپشن نہیں رہا......ساری زندگی تم سسکتی رہو گی اور وہ تمھیں ڈاج دیتا رہے گا......آئیکت تمھارے ہاتھ سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں رہ گیا......اور تم نے یقیناً اسے سب کچھ بتا دیا ہوگا......''اس نے پوچھا۔

''نہیں......وہ خود ہی جان گئے......''وہ روتے ہوئے بولی۔

''اس نے یقیناً یہ کہا ہوگا کہ شزا اگر اسے اتنا برا کہتی ہے تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی......''شزا نے پوچھا۔

''ہاں......''وہ آہستہ سے بولی۔

''آئیکت میں اپنی بیمار بیٹی کی خاطر اس سے کمپرومائز کرنے کی کوشش کرتی رہی۔وہ شیزوفرینیا کی پیشنٹ ہے۔اٹس گریٹ پرسنالٹی ڈس آرڈر......اور اب وہ رفتہ رفتہ میڈنس کی طرف جا رہی ہے......مگر شاید مجھے اب کچھ سوچنا ہوگا......وہ ہر ایک کو ذہنی اذیتیں دیتا

ہے۔ جسے وہ ماڈرن سوسائٹی کے فیشنز کہتا ہے۔ خدا کرے تم اس سے بچ سکو۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ تمھیں اس درندے سے بچاؤں مگر افسوس تم بھی نہ بچ سکیں۔ سب کچھ اکارت گیا......" اس نے اچانک فون بند کر دیا۔ آئیکت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اتنا الجھ چکی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خودکشی کر لے۔ وہ ان لمحوں کو کوس رہی تھی جب وہ ملک منصور سے ملی تھی اور اس نے کیسے کیسے اسے اپنے دام میں پھنسایا تھا اور وہ پھنستی گئی تھی...... ہر طرف دلدل تھی......اور وہ اس میں پوری کی پوری دھنس چکی تھی۔ اس سے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ دل میں جیسے آگ لگی تھی......اور وہ اس آگ میں ملک منصور کو بھی جلا کر بھسم کرنا چاہتی تھی۔

......✿......

نجیب احمد شفیق کو خود پشاور چھوڑ کر آئے تھے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حیدر نے تبسم آپا کو فون کر دیا تھا اس کی ہر ممکن حفاظت کرنے کو کہا تھا اور انھوں نے بھی اسے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت اور تپاک سے ملیں گو کہ وہ اس سے شہلا حیدر کی شادی پر مل چکی تھیں مگر تب رسماً ملاقات ہوئی تھی۔ نجیب احمد اسے چھوڑ کر چند گھنٹوں کے بعد چلے گئے تھے وہ اپنے آپ کو اس گھر میں بہت اجنبی محسوس کر رہی تھی۔

وہ جب سے ماں سے مل کر آئی تھی اس کے اندر ایک شدید چبھن تھی۔ ایک پھانس تھی۔ وہ ظاہراً تو انھیں بہت دکھ دے کر آئی تھی۔ بہت غصّے کا اظہار کر کے آئی تھی مگر دل بہت بے چین تھا۔ ماں کی اس حالت پر نہ جانے کیوں وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی جب بھی چہرہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا اس کی آنکھوں میں خود بخود نمی سی تیرنے لگتی...... وہ اس خیال کو بار بار جھٹکنا چاہتی تھی مگر نہ جانے کیوں دل وہاں اٹک سا گیا تھا...... وہ بہت پریشان اور افسردہ تھی۔ جب سے وہ آئی تھی وہ بہت خاموش تھی۔

"بیٹا کیا بات ہے...... آپ کچھ بولتی نہیں، کیا باتیں کرنا نہیں آتیں؟" تبسم آپا نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

"نہیں......بس یونہی۔"

"یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ تم یہاں ہر طرح سے محفوظ ہو۔ حیدر بتا رہا تھا کہ تمھیں کوئی خطرہ ہے......کس سے خطرہ ہے......"

"پاپا سے......" نادانستہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

''کیا مطلب...... اپنے سگے باپ سے...... اور حیدر نے پچھلی دفعہ بتایا تھا کہ تمھارے پاپا تو امریکا گئے ہوئے ہیں اس لیے تمھیں ان کے پاس چھوڑ گئے ہیں۔ کیا وہ آ گئے......'' تبسم آ پا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''آں...... ہاں...... نہیں......'' وہ بوکھلا گئی۔

''لگتا ہے تم کافی خوفزدہ ہو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ آرمی ایریا ہے۔ اس میں تمھیں کوئی خطرہ نہیں...... آرام سے رہو...... ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مناؤ تو......''

''جی پوچھیے......'' اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''کیا تم شہلا اور منصور کی بیٹی ہو......؟'' تبسم آپا نے متجسسانہ لہجے میں پوچھا۔ وہ خاموش ہوگئی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''تو پھر...... تم تو میری اپنی بیٹی ہو...... میں تمہاری خالہ ہوں......'' تبسم آپا نے فرطِ جذبات سے اسے گلے لگاتے ہوئے اور چومتے ہوئے کہا۔ ایک اور نئے رشتے کی دریافت اور اس کا احساس اسے بہت اچھا لگا۔

''میں نے جب پہلی بار تمھیں دیکھا تھا تب ہی جان گئی تھی تم ہو بہو شہلا پر گئی ہو...... اور تمہاری آواز بھی اس سے ملتی ہے مگر حیدر کے انکار پر خاموش رہی...... اب یہ تمہارا اپنا گھر ہے...... تم نہیں جانتی میں نے شہلا کو اپنی گود میں کھلایا ہے...... وہ بہت پیاری اور اچھی ہے...... بس قسمت کے ہاتھوں مار کھا گئی۔'' وہ افسوس سے بولیں۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی اتنے میں بیٹ مین چائے لے کر آ گیا اور اس کے سامنے قرینے سے چائے رکھ رہا تھا۔

''بیگم صیب...... صیب آپ کو بلا رہی ہے......'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو شفق اس کی بات سن کر مسکرا دی۔

''سنو...... تم مسکراتی بھی اپنی ماں کی طرح ہی ہو...... میں ابھی تمھارے انکل کی بات سن کر آتی ہوں۔ تم چائے پیو......'' وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں تو وہ پھر کہیں کھو گئی۔

قسمت کیسے کیسے لوگوں سے ملا رہی تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ پشاور تبسم آپا کے ہاں آئے گی اور یہاں رہے گی۔

''اور ہاں تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری ماں اب کہاں ہے۔ یقین مانو اس سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔'' تبسم آپا نے واپس آ کر پھر وہیں سے بات شروع کی۔

''وہ...... بہت بیمار ہیں...... شاید آپ ملیں تو انھیں پہچان ہی نہ سکیں۔'' اس نے آہستہ سے بتایا۔

''خدا خیر کرے...... اسے کیا ہوا ہے؟''

''برین ٹیومر...... اور کیموتھراپی کے بعد تو وہ بس...... انکل حیدر بتا رہے تھے کہ شاید وہ چند دن کی مہمان ہیں......'' اس نے گہری سانس لے کر بتایا۔

''ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا اور حیدر نے مجھے بتایا ہی نہیں...... میں ابھی حیدر کو فون کرتی ہوں۔ وہ بیمار ہے اور میں یہاں ہوں......'' تبسم آپا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''آنٹی پلیز...... انکل کو فون مت کریں وہ خود آئیں گے۔''

''اور...... تم...... ماں کے پاس کیوں نہیں رہیں؟'' انھوں نے بغور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

''بولو بیٹا...... تمہاری ماں کی حالت اتنی خراب ہے اور تم یہاں ہو؟''

''میں ان کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی......'' اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''وہ ہم سے اس وقت ناتا توڑ گئیں جب ہم نے ڈھنگ سے چلنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ ہم نے زندگی کے اتنے تلخ رنگ دیکھے ہیں کہ اب تو ان سے نفرت سی ہو گئی ہے...... آنٹی آپ کو معلوم ہے نا...... مما نے ایک انگریز سے شادی کی تھی۔ ان سے ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔ ''ولیم'' انھوں نے اس کو اپنے پاس رکھا...... اور جو پہلا بیٹا تھا...... اس کو دھکے کھانے اور سسکنے کے لیے چھوڑ دیا...... میرا بھائی...... آفاق...... وہ بھی مر گیا اب ہم ان سے کس ناتے سے ملیں......'' وہ سسکیاں لینے لگی۔

''چپ ہو جاؤ بیٹا...... میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا...... رشتوں کی دیواروں میں دراڑیں ضرور پڑتی ہیں لیکن وہ کبھی زمین بوس نہیں ہو سکتیں...... دنیا میں جہاں بہت سی اٹل حقیقتیں ہیں۔ وہاں رشتے ناتے بھی قدرت کے بنائے ہوئے ہیں جو کبھی بھی مٹ نہیں سکتے اور ماں اور اولاد کا رشتہ تو کائنات میں سب سے حسین رشتہ ہے۔''

''ہمیں کیا معلوم کہ وہ حسین ہے یا نہیں...... ہم نے تو اس میں بھی تلخی اور بدصورتی دیکھی ہے...... ہم نے جس شے کو محسوس نہیں کیا اس کے بارے میں کیا جانیں؟'' وہ دکھ سے بولی۔

''تم بھی ٹھیک کہتی ہو...... لیکن کبھی نہ کبھی تو رویوں کو بدلنا ہی پڑتا ہے اور کہیں نہ

کہیں تو سرنڈر کرنا ہی پڑتا ہے۔تم کب تک یونہی سوچتی رہو گی۔اس طرح تو تم بھی بکھری بکھری اور پریشان رہو گی اور تمھاری ماں بھی...... بہتر ہے کہ تم اپنی سوچ کو بدلو......'' تبسم آپا نے سمجھایا۔

''لیکن جب دل ہی کسی طرف سے پلٹ جائے...... جب دلوں میں کسی کے لیے جگہ نہ رہے تو سوچ کیسی......؟'' وہ قطعیت سے بولی۔

''کیا تم اس کے مرنے پر بھی نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں......'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے...... میں تو کل ہی یہاں سے روانہ ہو رہی ہوں...... میں اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں نے تو اسے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔تمھارا دل سخت ہو سکتا ہے۔میرا نہیں...... بے شک اس نے اتنا عرصہ ہم سے رابطہ نہیں کیا لیکن دوریاں محبتوں کو کم نہیں کر سکتیں۔'' تبسم آپا نے کہا تو وہ خاموشی سے سننے لگی۔

اگلے دن وہ اٹھی تو تبسم آپا لاہور جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ ان کے شوہر اسپتال جا چکے تھے اور گھر میں صرف بیٹ مین تھا جس کے سر پر وہ سارا گھر چھوڑ کر جا رہی تھیں وہ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئیں۔تبسم آپا حیدر کو انفارم کیے بغیر لاہور آ گئی تھیں وہ اس کے ڈیفنس والے گھر گئیں تو وہاں حیدر موجود نہیں تھا انھوں نے شہلا اور اسد کو فون کر کے پوچھا تو وہ وہاں بھی نہیں تھا۔شہلا ان کی آمد کا سن کر خوش ہو گئی تھی اور وہ ان سے ملنے آ رہی تھی۔شہلا اور اسد دونوں بہت محبت سے انھیں ملے۔شہلا پہلے سے کافی صحت مند ہو چکی تھی اور اس کی جذباتیت بھی قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔

''پھپھو آپ اچانک لاہور کیسے آ گئی ہیں؟'' شہلا نے حیرت سے پوچھا۔

''دراصل شفق میرے پاس گئی تھی...... شفق شہلا کی بیٹی ہے...... اس نے بتایا کہ شہلا کی حالت بہت خراب ہے اسے برین ٹیومر ہے...... سچ مانو مجھ سے رہا نہیں گیا۔بس صبح سویرے ہی کوچ میں بیٹھ گئی۔تمھارے انکل بہت روکتے رہے کہنے لگے ویک اینڈ پر اکٹھے چلیں گے مگر میرا دل نہیں مانا...... بس چلی آئی......'' تبسم آپا نے بتایا تو شہلا اسد نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''کیا واقعی وہ بہت بیمار ہیں......''

''پھپھو...... شفق آپ کے پاس کیوں گئی ہے؟''

''بس اس کا ایک مسئلہ ہے......اس کا باپ اس کی جان کے پیچھے پڑا ہے اس لیے حیدر نے اسے میرے پاس بھیج دیا......وہاں وہ محفوظ ہے۔''

''اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

''میں تو جلد از جلد شہلا سے ملنا چاہتی ہوں......''

''اسد آپ کو ضروری کام تھا نا۔ آپ چلے جایئے......میں خود ہی رات کو آ جاؤں گی......'' شہلا کچھ سوچتے ہوئے اسد سے مخاطب ہوئی۔

''ٹھیک ہے......میں جا رہا ہوں......تم آ جانا......'' اسد ان سے اجازت لیتے ہوئے بولا۔ شہلا نے ذوالفقار ڈرائیور کا نمبر ملایا اور اسے گھر آنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ پہنچ گیا۔

''پاپا کہاں ہیں......؟'' اس نے آتے ہی پوچھا۔

''آج صبح انھیں اسلام آباد جانا پڑا......ان کی ایک اہم میٹنگ تھی......میں انھیں ایئرپورٹ چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''ذوالفقار......ہمیں اس گھر لے چلو جہاں کوئی بیمار عورت رہتی ہے۔'' تبسم آپا نے کہا۔

''گلبرگ میں......'' ذوالفقار نے پوچھا۔

''ہاں وہیں۔''

''ٹھیک ہے بیگم صاحب......آپ گاڑی میں بیٹھو۔'' ذوالفقار چابیاں اٹھاتے ہوئے بولا اور دونوں اس کے ساتھ چلی گئیں۔

''شہلا......کیا تم نے اس کے بارے میں ساری بدگمانیاں ختم کر دی ہیں۔'' تبسم آپا نے پوچھا۔

''ہاں......پھپھو......شاید میں غلطی پر تھی......میں ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔''

''اچھی بات ہے......کاش وہ بھی مان جائے۔''

''کون......؟''

''شفق......وہ بھی ماں سے ناراض ہے......اسی لیے نہیں آئی......میں نے بہت سمجھایا مگر وہ کچھ سننے کو تیار نہیں اس کے دل میں اس کے لیے بہت نفرت ہے......'' وہ تاسف سے بولیں تو شہلا حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ دونوں نے کمرے میں قدم رکھا تو اس نے

چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''آ......آپ......تبسم آپا......'' شہلا نے حیرانی سے کہا۔

''شہلا......کیا یہ تم ہو......'' وہ لپک کر آگے بڑھیں اور اسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ''یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ شہلا تم ایسی تو نہ تھیں......تم......تو وہ نہیں'' تبسم آپا اس کے بازوؤں، ہاتھوں اور چہرے پر ہاتھ لگا کر بول رہی تھیں اور وہ روتی جا رہی تھیں۔ شہلا اسد بھی خاموش مجرمانہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ کو کیسے پتا چلا......کیا حیدر نے بتایا......؟''

''نہیں......شفق نے......''

''کیا وہ آپ کے پاس ہے؟''

''ہاں......پشاور میں......''

''وہ نہیں آئی......'' اس نے ارد گرد متلاشی نگاہوں سے دیکھا۔

''نہیں۔'' آپا نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں......وہ کیسے آ سکتی ہے......وہ تو مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔'' اس نے آہ بھر کر کہا۔

''لیکن یہ سب کیسے ہوا......؟'' تبسم آپا روتے ہوئے بولیں۔

''میرے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ شفق بھی تو یہی کہتی ہے......'' وہ تاسف سے بولی۔

''وہ جھوٹ کہتی ہے......تم ایسی تو نہ تھیں......''

''مگر ہو گئی......نہ چاہتے ہوئے گناہ پر گناہ کرتی گئی اور آج میں ہر ایک کی مجرم بنی کٹہرے میں کھڑی ہوں......اور آپا مجھے تو کوئی معاف کرنے کو بھی تیار نہیں۔'' وہ ان کے گلے لگ کر سسکنے لگی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آ گئی ہوں نا......میں تمھارے پاس رہوں گی۔'' وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

''شکریہ آپا......'' اس کی آنکھیں محبت سے چمکنے لگیں۔ ''سسٹر......افضل سے کہو چائے بنا لے......آپا آپ فریش ہو جائیں تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔'' اس نے سسٹر سائرہ سے اور پھر آپا سے کہا۔

''اچھا...... میں ذرا واش روم سے ہو آؤں۔'' آپا اٹھتے ہوئے بولیں۔ سسٹر سائرہ بھی جا چکی تھی۔ شہلا اسد ابھی تک خاموش تھی۔ موقع بہتر تھا وہ دونوں تنہا تھیں وہ آرام سے اپنے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس ان کے بستر پر بیٹھ گئی۔

''آنٹی آئی ایم سوری...... مجھ سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں...... کبھی میں آپ کو غلط سمجھتی رہی اور کبھی پاپا کو...... میں بہت کنفیوژ رہی...... میں آپ کے رشتے کی نوعیت کو ہی نہ سمجھ پائی اور آپ دونوں سے بہت تلخی سے باتیں کرتی رہی...... لیکن اب جبکہ میں خود محبّت کے رشتے سے بندھ چکی ہوں اور مرد اور عورت کے رشتے سے مانوس ہوئی ہوں تو بہت غلط محسوس کرتی ہوں اب میں نے اس حقیقت کو جانا ہے خدا نے پہلے عورت اور مرد کو کیوں تخلیق کیا۔ ان کے درمیان پہلے محبّت کا رشتہ پیدا کیا اور پھر اس محبّت سے قربت نے جنم لیا اور اس قربت نے قرابت داری کو جنم دیا۔ اولاد، ماں باپ، بہن بھائی تو اس محبّت کی پیداوار ہیں اور میں بالکل سمجھ ہی نہ سکی...... اور آپ دونوں کے بارے میں بدگمان رہی...... مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی...... یا پھر گناہ کہ میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ میرا باپ مضبوط کردار کا انسان ہے ان کے بارے میں بدگمان ہوگئی۔ میں تو گنہگار ہوگئی اور...... آپ سے بھی میں نے بہت بدتمیزی کی...... آئی ایم سوری...... یقین مانیے۔ جب سے میری شادی ہوئی ہے میں ہر لمحہ اپنے آپ کو نادم محسوس کرتی ہوں اور دکھی رہتی ہوں...... خدا سے بہت دعا کرتی رہی کہ وہ مجھے موقع فراہم کرے اور میں آپ سے معافی مانگ لوں...... شکر ہے آج اس نے مجھے یہ موقع دے دیا اور پھپھو آ گئی...... آپ پلیز مجھے معاف کر دیں......'' وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں...... یہ تو نیچرل ہے...... اور تم بھی تو میری شفق کی طرح ہو اور مجھے بہت عزیز ہو...... حیدر میں اور مجھ میں محبّت انجانے میں پروان چڑھی لیکن ہم نے اپنے بزرگوں کی روایات کی پاسداری کی اور باغی نہ ہوئے۔ بڑوں کے ہر فیصلے پر سر جھکایا لیکن دلوں کا کیا کیا جائے...... جہاں ماضی دفن تو ہو جاتا ہے مٹتا نہیں۔ ہزار دفعہ بھی کھرچو کچھ صاف نہیں ہوتا...... نہ یہ کمبخت بھولتا ہے نہ انسان چھٹکارا پا سکتا ہے اور آج اگر حیدر میرا خیال رکھ رہا ہے تو اس لیے بھی کہ سید صاحب کی سگی نہ سہی مگر بیٹی تو تھی...... میں نے نہ تب کسی کا حق چھیننے کی کوشش کی تھی نہ بعد میں...... میں تو راستے سے ہی ہٹ گئی۔ اس لیے دور چلی گئی تاکہ پھر کبھی یہاں نہ آؤں مگر قسمت سے کون لڑ سکتا ہے...... انسان جس شے سے جتنا بھاگتا ہے وہ اتنا ہی

اسے گھیرتی ہے۔ میں تو ریزہ ریزہ ہوگئی ہوں۔ٹوٹ چکی ہوں...... میرا وجود تو ختم ہو چکا ہے۔ اب چند سانسیں باقی ہیں وہ بھی نہ جانے کس وقت......'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''آنٹی آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' اس نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

''نہیں بیٹا...... اب دعا کرو...... کہ میں زندگی کے اس قفس سے جلدی نجات پا لوں......اب تو ہر پل اذیت اور آزمائشوں سے پُر ہے......'' وہ دکھ سے بولی۔

تبسم آپا فریش ہو کر آ گئیں اور تھوڑی دیر بعد افضل چائے کی ٹرالی بھی لے آیا۔

''ولیم اٹھ گیا ہے۔اسے کہو وہ بھی ادھر آ جائے۔'' اس نے افضل سے کہا۔

''جی اچھا......'' وہ چائے ان کو سرو کر کے باہر چلا گیا۔

''چند لمحوں بعد ولیم وھیل چیئر پر کمرے میں داخل ہوا تو دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپا...... یہ میرا بیٹا ہے......'' اس نے متعارف کرایا۔

آپا نے اٹھ کر اسے چوما اور گلے لگایا۔شہلا نے بھی محبت سے اس کو ہیلو کہا۔

''کیا نام ہے بیٹا......؟ میں تمہاری خالہ ہوں۔'' تبسم آپا نے محبت سے پوچھا۔

''ولیم......'' وہ آہستہ سے بولا۔

تبسم آپا اور شہلا نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ ولیم کے لیے ان نظروں میں استفہام اجنبی نہیں تھا مگر اب وہ اس سب سے شدید الرجک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب ایسی نظروں سے شدید چبھن محسوس کرتا تھا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی اجنبی دیس میں ہو یا پھر بالکل تنہا وجو...... اسی لیے ہر نگاہ اس کے بارے میں مشکوک تھی اور اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے...... اس کے لیے وہاں رکنا محال ہو گیا وہ آہستہ سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا...... دروازہ بند کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا...... اسے اپنا وجود بہت حقیر لگنے لگا تھا۔ ان سب کے درمیان وہ اپنے آپ کو نجس اور ناپاک محسوس کرنے لگا تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے وہ آیت اس کو ذہن نشین ہوئی تھی اس نے ہر بات کو اور اپنی ذات کو مختلف انداز میں آبزرو کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اندر ہی اندر اپنے بارے میں شدید بداعتمادی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ بھی ریت کے گھروندے کے مانند بکھر چکا تھا...... وہ اتنا ٹچی ہو گیا تھا کہ معمولی سی بات، لہجے اور نگاہوں میں چھپے مفہوم کو خود ہی اخذ کر کے رونے لگتا۔ نور کے جانے کے بعد تو وہ اور ہی زیادہ بکھر چکا تھا۔ اس لمحے

بھی وہ شدید اجنبیت، تنہائی اور ڈپریشن محسوس کر رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سے بات کرے...... اس نے آنسو پونچھتے ہوئے فادر کا نمبر ملایا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''کون......؟'' فادر کی بارعب آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''فادر میں ولیم ہوں۔'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اوہ......تم......'' فادر نے لہجے میں کرختگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''فادر...... آئی ایم آل الون...... فادر میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور میں اب چل بھی نہیں سکتا......'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ تو ہونا ہی تھا...... مائی سن...... یو آر کرسڈ جو لوگ کرائسٹ سے بے وفائی کرتے ہیں۔ گاڈ ان کو ایسے ہی سزا دیتا ہے۔ تم نے گاڈ سے اور کرائسٹ دونوں سے اپنا پرامس توڑا ہے وہ تمھیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اب تم ساری زندگی یونہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گے۔ وہ بس ایک دفعہ آزماتا ہے پھر سرکشوں کو ایسی سزائیں دیتا ہے کہ وہ ساری زندگی تمہاری طرح تڑپتے رہتے ہیں۔''

''فادر پلیز ایسا مت کہیں...... میں بہت شیٹرڈ ہو چکا ہوں۔'' وہ روہانسا ہو کر بولا۔

''تمھارے ساتھ اس سے بھی برا ہو گا...... میں تو تمھیں بقا کی طرف لا رہا تھا۔ امورٹل بنانا چاہ رہا تھا۔ تمہاری سول کو کرائسٹ سے ملانا چاہ رہا تھا مگر تم بھٹک گئے تم بہت کمزور انسان نکلے...... اور گاڈ اپنے لیے کمزور انسان بالکل پسند نہیں کرتا۔ تم خود ہی دیکھو اس نے تمھیں لولا، لنگڑا، اپاہج بنا دیا ہے، اب وہ تمھیں کبھی معاف نہیں کرے گا...... نیور......ایور...... اور خداوند یسوع مسیح بھی تم سے بہت ناراض ہیں...... دس ورڈ از ہیل فار یو......'' فادر نے غصّے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ اور شدت سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا...... اس نے بہت پُر امید ہو کر فون کیا تھا اور فادر نے اس کی رہی سہی امید اور حوصلہ سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا تھا...... اس نے بہت مشکل سے شفق کے الفاظ کو بھلانے کی کوشش کی تھی رات کے جس پہر اس کی آنکھ کھلتی تھی۔ شفق کے الفاظ ''چلتا پھرتا گناہ'' اس کے اندر کو جھنجوڑ کر رکھ دیتے...... اور اب فادر نے جب گاڈ اور کرائسٹ کی ناراضی کا بتایا۔ تو وہ شیٹرڈ ہو گیا...... گاڈ اس سے ناراض تھا اور کرائسٹ بھی...... ''یو آر کرسڈ، یو آر پنشڈ، کرسڈ اینڈ پنشڈ...... پنشڈ اینڈ کرسڈ......'' یہ الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے اور اس کے اندر کو تہ و بالا کر رہے تھے۔ وہ اتنی شدت

سے رو رہا تھا کہ آنسو تھم ہی نہیں رہے تھے...... اس لمحے وہ شدید تنہائی محسوس کر رہا تھا......

''گاڈ......اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تو...... پلیز نور کو کہو...... مجھے فون کرے...... میں بہت تھک گیا ہوں۔ بہت پریشان ہوں...... آئی ایم شیٹرڈ......'' وہ دل ہی دل میں گڑ گڑا کر دعائیں کرنے لگا......اس نے رو رو کر اور گلے میں کرائسٹ کے لاکٹ کو ہاتھ میں پکڑ پکڑ کر دعائیں کیں...... وہ رو رو کر تھک چکا تھا اور آنکھیں سوج چکی تھیں......شام گہری ہو رہی تھی۔

وہ بستر پر لیٹا ہی تھا کہ موبائل کی بیل بجنے لگی......اس نے اٹھایا تو نور بول رہی تھی۔

''ہیلو ولیم کیسے ہو......؟'' وہ بشاش لہجے میں بولی۔

''نور......تم کہاں ہو......اور تمھیں کس نے فون کرنے کو کہا۔'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''بھئی کہنا کس نے ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا اور بہت دنوں سے کوشش بھی کر رہی تھی مگر وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ ولیم میں یہاں بہت بزی ہوں۔ میں یہاں اپنا گارمنٹس کا بزنس سیٹ کر رہی ہوں......تم سناؤ ٹھیک ہونا......''

''نور تم کب واپس آؤ گی......؟ اس نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔

''کیوں بھئی، کیا ہو گیا ہے؟''

''میں بہت اپ سیٹ ہوں۔''

''فار گاڈ سیک......اب تو سدھر جاؤ...... نہ جانے کب سمجھو گے...... میں بھی تمھیں سمجھا سمجھا کر تھک چکی ہوں مگر تم......اب تم نے ایسا کیا نا میں تم سے بات نہیں کروں گی۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''پلیز نور......سنو...... ناراض مت ہو......اور تم مجھے بتائے بغیر کیوں چلی گئیں۔''

''بھئی میں نے فون کیا تھا تم سو رہے تھے میں نے حیدر انکل کو بتا دیا تھا۔ مجھے اچانک آنا پڑا......اور میں نے کئی بار تمھیں فون کیا......حیدر انکل نے تمھیں نہیں بتایا۔''

''نہیں......وہ مصروف تھے شاید۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''اب بولو...... کیوں پریشان ہو؟''

''میں نے فادر کو فون کیا تھا۔''

''پھر......'' وہ خاموش رہا۔

''انھوں نے تمھیں ڈانٹا ہو گا۔''

”ہاں...... کہنے لگے یو آر کرسڈ اینڈ پنشڈ بائے گاڈ۔“

”دہاٹ نان سینس...... ویلیم آئی ایم سک آف یو...... کب تک تم Puppet بنے رہو گے......تم کب اپنا ذہن استعمال کرو گے...... خدا کے لیے اب تو سوچو سمجھو۔ چھوڑ دو یہ سب کمزور سہارے......“

”میں کیا کروں......؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ وہ بول رہا تھا کہ ایک دم فون ڈس کنیکٹ ہو گیا۔ اسے شدید رنج ہونے لگا۔

شہلا واپس جا چکی تھی اور تبسم آپا وہیں رک گئی تھیں۔ رات کو حیدر آیا تو انھیں وہاں دیکھ کر چونک گیا۔

”آپا...... آپ...... یہاں...... کیسے...... اور کب آئیں؟“ حیدر بے حد حیران ہو رہا تھا۔

”جیسے ہی شفق نے بتایا کہ شہلا بیمار ہے مجھ سے رہا نہ گیا اور چلی آئی بلکہ شہلا بھی یہاں آئی تھی۔“

”وہ...... یہاں...... کیسے......؟“ حیدر نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ بہت شرمندہ ہے اور شاید اس نے شہلا سے معافی بھی مانگی ہے۔“ تبسم آپا نے کہا تو وہ حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”اور شفق...... وہیں پر ہے۔“

”ہاں...... میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر ماں کے بارے میں وہ بہت بدگمان ہے لیکن میں نے تمھارے بھائی کو کہا ہے کہ وہ اسے ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کریں اور تم فکر نہیں کرو...... وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ ہے۔“ تبسم آپا نے اسے بتایا۔

”اسی لیے تو ادھر بھیجا ہے......“

”مگر منصور کیوں اس کی جان کے پیچھے ہے......“

”جب انسان کا دل ہوس اور لالچ سے بھر جائے تو وہ ہر رشتے کو مفادات کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ منصور نے ہمیشہ اپنی ذات اور مفاد کو اہم جانا...... نہ رشتوں...... کی پروا کی نہ جذبوں کی...... اور اب تو وہ ایسی گندی مچھلی بن چکا ہے جو ہر جل کو گندا کر دیتی ہے۔ آپا...... میں تو حیران ہوتا ہوں کہ جس شخص کا گھر تنکا تنکا بکھر چکا ہو...... نہ اولاد باقی رہے...... نہ رشتے اور جذبے باقی رہیں تو وہ کیسے سروائیو کر سکتا ہے مگر وہ کس قدر مطمئن اور خوش ہے......

نہ جانے کیسی زندگی وہ گزار رہا ہے......؟''

''ہاں...... وہ شروع سے ہی ایسا تھا یہ تو شہلا کے نصیب ہی برے تھے کہ وہ اس کا نصیب بن گیا...... اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو شاید آج شہلا کے یہ حالات نہ ہوتے......'' وہ تاسف سے بولیں۔

''آپ نے اچھا کیا کہ آپ یہاں آ گئی ہیں...... شہلا کی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ کسی بھی وقت شاید......'' وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔

''حیدر...... کیا اس بیماری کا کوئی علاج نہیں......''

''جتنا ممکن ہو سکا میں نے کروایا ہے...... مگر اب کہیں بھی کچھ بھی ممکن نہیں۔ نہ یہاں نہ بیرون ملک......''

''حیدر...... کیا شہلا کا بیٹا کرسچن ہے......؟'' آپا نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... وہ کچھ بھی نہیں...... نہ کرسچن نہ مسلم...... اس بیچارے کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ شہلا نے بہت حماقتیں کیں ہیں اور یہ اس کی سنگین غلطی ہے...... وہ بچہ ذہنی طور پر منتشر ہو چکا ہے...... اس کو راہ نہیں مل رہی۔ آپا آپ نے جس طرح ہماری تربیت کی اسی طرح اس کا ذہن بھی ہموار کرنے کی کوشش کریں...... اگر سید صاحب زندہ ہوتے تو شاید اتنا مسئلہ نہ ہوتا اور مجھے تو سیاست اور بزنس نے اس قدر کھپا کر رکھ دیا ہے کہ میں تو اپنے پروفیشن سے بھی دور ہو گیا ہوں...... کبھی کبھی سوچتا ہوں جس گدی نشینی کے لیے سید صاحب نے سب کچھ کیا۔ میں تو ایک دن بھی اس کا حق ادا نہ کر سکا۔ سب کچھ بے معنی ہی رہ گیا...... نہ میں وہ بن سکا جو وہ چاہتے تھے اور نہ وہ بن سکا جو میری خواہش تھی......'' وہ تبسم آپا کے سامنے اپنا دل کھول رہا تھا۔

''ہاں...... کبھی کبھی انسان کو خود بھی کچھ سمجھ نہیں آتا اور سب فیصلے بالا ہی بال ہو جاتے ہیں بہرحال میں کوشش کروں گی...... تم فکر نہیں کرو...... اور اب کچھ آرام کر لو...... بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔''

''ہاں...... میں واقعی بہت تھک چکا ہوں...... اوپر جا کر کچھ دیر آرام کر لیتا ہوں۔''
وہ شہلا کو دیکھے اور ملے بغیر لاؤنج سے ہی اوپر چلا گیا۔

......✡......

آئیکت کا پورا جسم جیسے آگ میں جھلس رہا تھا...... وہ آگ کے گڑھے میں کھڑی

تھی ہر طرف آگ کی دیواریں تھیں اور اس پر شدید سنگباری ہو رہی تھی...... وہ گنہگار تھی اس نے گناہ کیا تھا...... بہت بڑا گناہ اس کا اندر باہر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ کہیں راہِ فرار نہیں تھی۔ خوبصورت بال...... نیلی آنکھیں...... آتشیں حسن...... سب کچھ ست رنگی آگ کی نذر ہو رہا تھا...... وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی...... اس کا سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ وہ دو دنوں سے یہی خواب دیکھ رہی تھی۔ شدید احساسِ گناہ نے اس کی سوچوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کو شدید بخار ہو رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی بستر سے نہیں اٹھ سکی تھی۔ اس کو بہت رونا آ رہا تھا۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ اس نے تو زندگی کے ہر موڑ پر سوچ سمجھ کر قدم رکھا تھا۔ اس نے تو اپنی طرف اٹھنے والی ہر بری نگاہ کو ایسا نشتر چبھویا تھا کہ وہ دوبارہ نہ اٹھ سکی۔ وہ کس قدر اپنی ذات کے۔

وہ کس قدر اپنی ذات کے زعم میں مبتلا تھی۔ اسے ہمیشہ فخر رہا تھا کہ اس نے صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گزاری ہے۔ اگرچہ وہ ماڈرن سوسائٹی کی اہم رکن تھی۔ اس کا گیٹ اپ اور لائف اسٹائل سب کچھ ماڈرن تھا مگر زندگی کی ترجیحات، قدامت پسندی اور روایت کے حصار میں جکڑی ہوئی تھیں۔ وہ اتنی مذہبی تو نہ تھی مگر خدا تو ہر جگہ موجود تھا۔ یہ سوچ اور گناہ وسزا کا احساس سچے جذبے کی طرح خون میں رواں دواں تھا۔ اس کا گھرانا اوسط درجے کا مذہبی گھرانا تھا جہاں مذہبی تعلیمات ہر دن، ہر وقت دُہرائی تو جاتی تھیں، عمل شاذ و نادر ہوتا تھا۔ مذہب دل کے کسی گوشے میں محفوظ تھا مگر مفقود نہیں تھا اور اب تو جیسے سب کچھ عود کر آ رہا تھا۔ اسے خدا کے تصور سے ہی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جب عورت اپنا سب کچھ گنوا دیتی ہے تو پھر خدا سے کیسے نظریں ملا سکتی ہے کیونکہ وہ ایسی بے باک نظروں کو پسند نہیں کرتا جن میں سے حیا ختم ہو جائے۔ یہ سب کچھ کیا ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا زور زور سے سینہ کوبی کرے، خوب روئے۔ اتنا روئے کہ آنکھوں کی بینائی ختم ہو جائے اور وہ ملک منصور کے مکروہ چہرے کو دوبارہ نہ دیکھ سکے۔ وہ نرم و گداز بستر پر لیٹی تڑپ رہی تھی، اندر ہی اندر چلا رہی تھی۔ ہر کروٹ پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے آگ کی سلاخوں سے داغا جا رہا ہو۔

زمانے کی قسم! انسان خسارے میں ہے۔

''ہاں، بہت بڑے خسارے میں، ہر طرف سے، اندر سے، باہر سے۔ یا الٰہی! میں کس کو پکاروں، میں کیا کروں۔ کاش میں اسی وقت مر جاتی۔'' وہ بڑبڑا رہی تھی، پچھتا رہی تھی، سسک رہی تھی مگر سب کچھ بے کار تھا۔ وہ بری طرح جکڑی جا چکی تھی۔

ملک منصور رات کو آنے کا کہہ کر گیا تھا اور دو دن ہو گئے تھے وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ وہ اس کی آمد کی اتنی منتظر نہیں تھی جتنی یہ جاننے کی کہ اس نے شزا کے ساتھ کیوں ایسا کیا تھا۔ شزا کے الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں نشتر کی طرح چبھ رہے تھے۔

''آئیکت! ملک منصور نے مجھے بہت مارا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اس نے مجھے اس شدت سے مارا ہے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے جو گناہ کیے ہیں، میری بددعا ہے کہ خدا تمھیں کبھی معاف نہ کرے۔ میں نے بہت خلوص سے تمھیں بچانا چاہا تھا اور تم نے مجھے ہی اُجاڑ دیا۔ ملک منصور نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ میرا نام نہاد گھر بھی اُجاڑ دیا۔ خدا کرے تمہارا ہر ہر لمحہ اذیت میں گزرے اور تم کبھی سکون سے نہ رہو۔'' شزا نے غصّے سے روتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ گنگ سی سنتی رہی اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اتنا بھی نہ بتا سکی کہ اس نے تو ملک منصور کو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ تو خود ہی اتنا شاطر نکلا۔ کیسے کیسے اس نے وہ سارے نمبرز ٹریس آؤٹ کیے اور پی ٹی سی ایل سے سارے نمبرز کنفرم کیے۔ خدا جانتا تھا کہ اس نے کچھ بھی ایسا نہیں کیا تھا اور وہ کیسے شکنجے میں آ گئی تھی۔ اس شخص نے کیسے اسے اپنے سنہری جال میں پھنسایا تھا۔ شزا کے فون کے بعد تو اس کی اذیت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اگلے دن رات گئے وہ لوٹا۔ وہ میرون اور آف وہائٹ کومبینیشن میں پہلے سے بھی زیادہ ڈیشنگ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو اس کے پیچھے تین چار ویٹرز بڑے بڑے ڈبے اٹھا کر لا رہے تھے۔

''ہاں، اِدھر رکھ دو اور تم لوگ جاؤ!'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اس نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''ہیلو ڈارلنگ! سویٹ ہارٹ کیسی ہو؟'' وہ خاموش رہی اور نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا ابھی تک بستر میں ہو، سوری میں کل نہیں آ سکا اسی لیے ناراض لگ رہی ہو۔ آئی ایم سوری......'' اس نے تکیے پر رکھے اس کے ہاتھ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ ''اوہ گاڈ! تمھیں تو بہت تیز بخار ہے۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ ٹھہرو میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔'' اس نے جلدی سے ڈاکٹر کا نمبر ملایا۔ ''وہ ابھی آ رہا ہے۔ تم کچھ بولتی کیوں نہیں اور تمہاری آنکھوں میں اتنی اُداسی کیوں ہے؟'' اس نے محبت سے اس کے بلونڈ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی اور خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر

آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں سے آنسو گر کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔

''یہ کیا...... یہ اتنے سارے آنسو کہاں سے آگئے۔ ڈونٹ یو وری ڈیئر! ابھی ڈاکٹر آرہا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اس کے گرم، تپتے ہوئے ماتھے پر اپنا یخ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور میڈیسنز وغیرہ دے کر چلا گیا۔ وہ میڈیسنز کھا کر سو رہی تھی اور وہ کیا کرتا رہا، اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ صبح جب بیدار ہوئی تو اس کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ کمرے میں ہر شے قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر تھی۔ وہ واش روم سے فارغ ہو کر باہر نکلی تو فون کی بیل بجنے لگی۔ آفس سے کال تھی۔ انھیں وہ ڈاکومنٹس چاہیے تھے جو اس کی سیکرٹ فائل کا حصہ تھے۔ اس کا کولیگ وبسٹر ڈاکومنٹس لینے آ رہا تھا۔ وہ دروازہ لاک کر کے اپنے چھوٹے سے سیکرٹ ہینڈ بیگ سے وہ پیپرز نکالنے لگی۔

ایک کے بعد دوسری...... پیپرز اس نے ہر ہر جگہ تلاش کیے مگر ڈاکومنٹس غائب تھے۔ وہ پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے تو بیگ انتہائی احتیاط کے ساتھ سائیڈ ٹیبل کے خفیہ خانے میں رکھا تھا پھر کیسے اور کہاں غائب ہو گیا۔ وہ پریشان اور حیران ہو رہی تھی۔ اس کا دھیان بار بار ملک منصور کی طرف جا رہا تھا مگر اسے بیگ مل نہیں سکتا تھا کیونکہ اس نے بہت احتیاط سے اسے چھپایا تھا۔ اس نے بیگ بار بار چیک کیا اور پھر اسے الٹایا تو ملک منصور کا ایک لاکٹ چمکتا ہوا فرش پر لڑھکنے لگا۔ اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا تھا۔ وہ تو کہتا تھا اسے نہ کسی شخص کی پروا ہے اور نہ ہی ڈاکومنٹس کی اور وہ ڈاکومنٹس موجودہ حکومت کے لیے کس قدر خطرناک تھے وہ بھی جانتا تھا۔ نہ جانے اس کام کے اس نے کتنے ڈالر کمائے تھے۔ اسے شدید دکھ ہونے لگا۔ آفس والوں نے اسے ایماندار سمجھ کر اس پر ٹرسٹ کیا تھا اور وہ خود ہی دھوکا کھا گئی تھی۔ ان لوگوں کو کیا جواب دے گی۔ وبسٹر ہوٹل پہنچ چکا تھا اور تھوڑی دیر میں اس تک پہنچنے والا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہے۔ وبسٹر اس کے سامنے بیٹھا اس سے پیپرز مانگ رہا تھا اور وہ جیسے گنگ سی بنی کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔

''میری طبیعت بہت خراب ہے اور فائل میں نے کہاں رکھی ہے، مجھے یاد نہیں آ رہا۔ میں شام کو فائل لے کر خود آؤں گی۔ مجھے تلاش کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔'' اس نے وبسٹر سے کہا تو وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کہنے لگا تو وہ خود ہی بول پڑی۔

''ہاں، میں جانتی ہوں وہ بہت اہم ہے۔ میں نے کہا نا شام کو پہنچا دوں گی۔''

ویسٹر بنا کچھ کہے حیرت سے ''اوکے'' کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کا سر غم و غصّے سے پھٹ رہا تھا۔ اس شخص نے اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا تھا۔ اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا اور اس کے پروفیشن کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ پہلے ہر لمحہ گناہ کے احساس کی وجہ سے اذیت سے پُر تھا اور اب دھوکا دہی کے ڈپریشن سے۔

''آئیکت! تم نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ محبّت کے خوبصورت لفظ سے دھوکا کھا گئی ہو۔ اس کی دلکش شخصیت، اس کے خوبصورت الفاظ، سب کچھ فریب تھا۔ وہ تو خود سراپا فریب ہے۔'' کوئی اندر ہی اندر کچوکے لگا رہا تھا۔ اسے اپنے سارے جسم پر چیونٹیاں رینگتی ہوئی اور ڈنک مارتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ گناہ اور فریب، سنگساری یا قتل؟ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا تو مسکرا رہا تھا۔ وہ صوفے پر انجان بنی بیٹھی رہی اور ایک میگزین دیکھتی رہی۔

''اب کیسی ہو؟ لگ رہا ہے کہ بہتر ہو۔'' وہ اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔

''آج باہر چلیں۔'' آئیکت ایک دم بولی۔

''کہاں؟''

''اپنے گھر...... میرا دل بہت چاہ رہا ہے وہاں جانے کو۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ تمہارا گھر ہے۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے اور سنو! تم نے تو وہ جیولری اور پرفیومز دیکھے ہی نہیں۔ کل تمہاری طبیعت خراب تھی اس لیے دکھا نہ سکا۔ ڈارلنگ! کھول کر تو دیکھو۔ تمھارے ہوش اُڑ جائیں گے۔'' اس نے ڈبے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''بعد میں دیکھ لوں گی۔'' وہ بے دلی سے بولی۔

''نہیں نہیں، ابھی دیکھو۔'' وہ ڈبے کھولنے لگا۔ ایک کے بعد ایک خوبصورت وائٹ گولڈ اور ڈائمنڈ کا سیٹ تھا۔ ہوشربا پرفیومز خوبصورت، دلکش پیکنگز میں۔ وہ لڈ ہٹا کر سائفن کو اس کے سامنے کر کے دباتا۔ خوش کن، سوندھی سوندھی خوشبوئیں روح تک کو معطر کرنے لگیں۔

''کیسا لگا سب کچھ؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اچھا ہے۔''

''لیکن تم سے اچھا نہیں۔'' وہ اس کے آگے جھکتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے چلیں۔''

''ہاں، لیکن تم فریش تو ہو کر آؤ۔ چینج کرو اور ان میں سے سب سے خوبصورت ترین سیٹ پہنو۔ آج وہاں صرف ہم تم اور خوشبوئیں ہوں گی۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ آئیکت خاموشی سے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی اور شاور کھول کر شدت سے رونے لگی۔ اس کا دل پھٹ رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ اس شخص نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس کی زندگی، عزت، اس کا مستقبل اور شاید عاقبت بھی۔

وہ واش روم سے نکلی تو ملک منصور جیسے آنکھیں جھپکنا ہی بھول گیا۔ اس نے ریڈ کلر کا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا اور شاید پہلی دفعہ ریڈ کلر کی ڈارک لپ اسٹک لگائی تھی۔ اس کا دل بھی خون ہو رہا تھا۔

''واؤ...... اٹس ونڈرفل! تم ہر روز مجھے حیران کرتی ہو۔'' وہ باز کی طرح اس پر جھپٹ کر اسے اپنے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔

''ٹائم کم ہے، چلیں۔'' وہ اسے آہستہ سے اپنے علیحدہ کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں، ٹائم تو واقعی کم ہے اور ہمارے لیے تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ گاڑی میں بھی اس سے محبت بھری باتیں کرتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ گاگلز کے پیچھے آنسو اس کی آنکھوں میں جیسے تھم سے گئے تھے۔ اسے دل کسی آرے سے کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کس قدر مطمئن اور خوش لگ رہا تھا۔

''وہ یونہی ہر عورت کو تباہ کرتا ہے۔ پہلے اسے اتنا مجبور کرتا ہے کہ راہ فرار نظر نہیں آتی اور پھر رفتہ رفتہ اسے تباہ و برباد کر کے چھوڑتا ہے۔'' اسے شزا کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ وہ ایسی نہ تھی۔ وہ کیسے کھلونا بن گئی اور ٹوٹ گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

''خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ نیلگوں آسمان پر سفید بادلوں کی ٹکڑیاں اِدھر اُدھر بکھری تھیں۔ چمکدار، شفاف، روشن صبح اب آہستہ آہستہ زوال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سائے دگنے ہو رہے تھے۔ سورج کی روشنی بھی زوال پذیر ہو رہی تھی۔ اردگرد سفیدے کے لمبے درخت تھے سیاہ کول تار کی سڑک سے ہوتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ بلیو ایریا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ملک منصور نے محل نما گھر کے سامنے جا کر گاڑی روکی اور اپنے بریف کیس میں سے چابیاں نکال کر گیٹ کھولا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ کسی ایک شے کے نہ ٹکرانے کی آواز تھی، نہ سانس لینے کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر چیز اپنی

اپنی جگہ پر ساکت و جامد ہوگئی ہو اور مجسم تماشا ہو۔ ہر شے بے جان اور مردہ لگ رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوا۔ دونوں نے بھرپور نگاہوں سے اردگرد دیکھا۔ ہر شے قرینے سے اپنی جگہ پر رکھی خوبصورت لگ رہی تھی۔

''آؤ، اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔'' وہ محبت سے بولا اور وہ خاموش روبوٹ کے مانند اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے اپنا کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکا اور شوز اتار کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''آج میں بہت تھک گیا ہوں۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں بولا۔

''کیوں؟''

''بس کبھی کبھی اچانک ہی تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔''

''کافی لاؤں، کہ کولڈ ڈرنک؟''

''کافی لے آؤ اور سنو جلدی آنا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کافی لے کر آ گئی۔ خوبصورت چائنیز کافی سیٹ سے قرینے سے سجی ٹرے کو اس نے ٹیبل پر رکھا اور کافی بنانے لگی۔ وہ کریم کافی بنا کر لائی تھی، کافی بنا کر اسے دی۔

''تم نہیں پیو گی؟''

''میں بلیک پیوں گی۔ آپ جانتے تو ہیں۔''

''اوہ آئی سی!'' دونوں کافی کے سپ لینے لگے۔ آئیکت حیران تھی کہ اب وہ شادی کا ذکر بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے خود ہی بات چھیڑی۔

''منصور! ہم شادی کب کریں گے؟''

''بہت جلد......'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''کیا تم ابھی چاہتی ہو؟''

''نہیں، میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔''

''بے فکر رہو ڈارلنگ! میں ریلیشن کے لیے شادی ضرور کرتا ہوں ورنہ میری اپنی ساکھ کو بھی خطرہ ہوتا ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی پولیٹیکل اسٹیٹس کو ورنہ لوگ ہمیں جلسوں میں ہی نہ چھوڑیں۔ شادیاں کرنا ہماری مجبوری بن جاتا ہے۔ تم لوگوں کی بھی اور ہماری بھی۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا تو وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

''واقعی آج تو میں بہت تھک گیا ہوں، نیند بھی آنے لگی۔'' وہ ٹائی کی ناٹ لوز

کرتے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں تھوڑا سا ریسٹ کرلوں پھر باہر چلیں گے۔'' وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ آہستہ آہستہ گہری نیند کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اس نے ہیٹر کا گیس پوائنٹ آن کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ لان میں چکر لگا رہی تھی۔ شام کا ملگجا سایہ آہستہ آہستہ دوپہر کی مدھم، بے جان دھوپ اور اس کی روشنی کو اپنے وجود میں سمونے لگا تھا۔ وہ گہری سوچوں میں گم تھی اور ننگے پاؤں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا آنسو، جھڑی سی رواں ہوگئی۔ انسان کے بھٹکنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ بس ایک پتھر کا فاصلہ......لڑھکتے، غیر متوازن پتھر پر قدم رکھتے ہی انسان اسفل السافلین کے گہرے کھڈ میں جا گرتا ہے اور پھر ساری زندگی پاتال کے اندھیروں اور گرداب میں پھنسا رہتا ہے۔ وہ احساسِ ندامت کا شکار ہو رہی تھی۔

''یا خدایا! مجھے معاف کردے۔ مجھ سے گناہ ہوگیا ہے۔ ایسا گناہ جو بہت کریہہ اور رسوا کردینے والا ہے۔ کیا تو مجھے معاف کرے گا۔'' وہ گھاس پر دوزانو بیٹھ کر آسمان کی طرف تر چہرہ اٹھا کر دعا کرنے لگی۔ ''یہ زندگی کیسے گزر پائے گی؟ میرا گناہ اور اس کا احساس مجھے کہیں بھی چین نہیں لینے دے گا۔ ایسی اذیت، ایسا کرب اور ایسی چبھن تو میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کی۔ میرا اندر تو جیسے الاؤ بن چکا ہے۔ ہر طرف آگ ہی آگ ہے جھلسا دینے والی، بھسم کردینے والی۔

شام کا اندھیرا اب تاریکی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پورے گھر میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ تاریکی، گہرا سکوت اور گناہوں سے لتھڑے وجود، تعفن زدہ مکروہ چہرے...... اس نے سوچا اور اندر کی طرف گئی۔ اسے وہ کرنا تھا جس کی وہ پلاننگ کرکے آئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر لاؤنج کی لائٹ آن کی اور کچن میں گئی۔ کینڈلز اور لائٹر لے کر وہ بیڈ روم کی طرف گئی۔ اندر گہری خاموشی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو معطر کن خوشبوؤں کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ چونک سی گئی۔ وہ تو گیس کا پوائنٹ آن کرکے گئی تھی اور اب ہر طرف خوشبوئیں ہی خوشبوئیں تھیں۔ اسے سب کچھ سمجھ آنے لگا۔ وہ جاگ رہا تھا اور شاید اسے آبزرو بھی کر رہا تھا۔

''میں کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔'' اسے منصور کے کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے۔ وہ ہی بے وقوف تھی جو اسے یوں ڈاج دینے نکلی تھی۔ وہ تو عورت کی رگ رگ اور اس کی سرشت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ان کے کمزور لمحوں کی ڈیمانڈز، ان کے انتقامی لمحوں کی سوچوں اور ان کے ری ایکشن سے شناسا تھا۔ جس شخص نے ساری زندگی اس کھلونے سے

اچھی طرح جی بہلایا ہو۔ اس کو جی بھر کر توڑا ہو۔ اس کو کئی بار مسلا ہو، کئی بار جوڑا ہو۔ ریزہ ریزہ کر کے پھر اس کو نیا وجود دیا ہو۔ اس میں اپنی سانسوں سے روح پھونکی ہو اور اسے ہر بار نیا روپ دیا ہو کیا وہ اس کی نفسیات سے واقف نہ ہو گا۔ وہ کس قدر بے وقوف تھی۔ اس نے آہ بھری اور اپنی پلاننگ پر خود ہی لعن طعن کرنے لگی۔

''تم کبھی بھی اس کی سوچ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ وہ مگرمچھ ہے اور تم جیسی رنگ برنگی مچھلیوں کو اس کا تر نوالہ بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ آئیکت! اس کے لیے بڑا جال بچھانا پڑے گا۔ آگ کا کھیل کھیلنا ہو گا اور شاید خود بھی اس میں کودنا ہو گا'' وہ تاریکی میں کھڑی سوچتی رہی اور لائٹر آن کیا۔ ملک منصور نے ایک دم اسے پیچھے سے آ کر اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

''سویٹ ہارٹ! ابھی تم بہت ناتجربہ کار ہو۔'' وہ اسے مضبوطی سے جکڑتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''بھئی اس گھر کی چیزوں سے واقفیت حاصل کرنے میں ابھی تھوڑا سا وقت تو لگے گا نا۔ تم شاید ہیٹر کا پوائنٹ کھلا چھوڑ گئی تھیں۔'' اس نے چھت سے لٹکتے خوبصورت شینڈیلئر کو آن کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ، آئی ایم سوری! لائٹر نہیں مل رہا تھا۔ شاید بھول گئی۔ بس طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے میں بھول ہی گئی۔''

''کوئی بات نہیں، وہ تو ایک دم اسمیل آئی تو پھر میں نے بند کیا۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ کبھی کبھی ایسی ناتجربہ کاری زندگی کو بھی شعلوں کی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا اور وہ خجل سی کینڈلز جلانے لگی۔

''کیا کوئی خاص بات ہے؟'' اس نے کینڈلز روشن کرتی آئیکت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''بس یونہی دل چاہ رہا تھا اس تنہائی میں ان کی روشنی میں چند لمحے بیٹھنے کو۔''

''واؤ گریٹ! آج تو تم بہت غیر معمولی چیزوں کے بارے میں سوچ رہی ہو۔''

اس کے لہجے میں چھپے شک اور طنز کو وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''کھانا کھانے باہر نہ چلیں۔'' ملک منصور نے رائے مانگی۔

''نہیں، اتنے دن ہو گئے ہوٹلز میں کھاتے ہوئے۔ آج گھر میں کھانا کھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے پھر باہر سے لے آتے ہیں اور اِدھر ہی کھا لیتے ہیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

''چلو پھر چلتے ہیں۔''

''او کے!'' وہ کینڈلز پر پھونک مارتے ہوئے بولی۔ کھانا پیک کروا کے وہ واپس آئے تو اس نے شیشے کی وسیع وعریض ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چن دیا، کینڈلز جلائیں۔ ملک منصور نے ڈائننگ روم کی ایک پینٹنگ کے نیچے لگا بٹن آن کیا۔ پینٹنگ خود بخود پیچھے ہٹ گئی اور اس کے پیچھے سے ایک شیلف نمودار ہوئی جس میں رنگ برنگی، خوبصورت مختلف انواع واقسام کی شیشے کی بوتلیں قرینے سے سجی تھیں۔ آئیکت نے حیرانی سے دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شیمپئن نکالی اور گلاس میں ڈال کر بٹن کو پھر دبایا پینٹنگ اپنی جگہ پر آ گئی۔

''یہ کیا؟'' آئیکت نے حیرانی سے تصدیق کرنا چاہی۔

''بھئی شیمپئن ہے اور کیا ہے، کیا تم لوگی؟'' وہ نارمل لہجے میں بولا۔

''نہیں۔'' اس نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے شیمپئن پی۔ اس کی آنکھوں میں اور لہجے میں سرور اور مستی چھانے لگی۔ وہ مدہوش ہو رہا تھا اور وہ بے ہوش ہونے والی تھی۔ اسے اس شخص سے خوف آنے لگا تھا۔ اس کا ایک اور روپ سامنے آ رہا تھا۔ ایک غاصب لٹیرے کا۔

''آئیکت! جلدی کمرے میں آؤ۔ میں تمہارا منتظر ہوں۔'' وہ قدرے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ آئیکت نے دیکھا وہ مضبوط اعصاب کا آدمی تھا۔ نہ وہ لڑکھڑا رہا تھا، نہ بہک رہا تھا۔ آئیکت نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ وہ جا چکا تھا۔ آنسو شیشے کی ٹیبل پر ٹپ ٹپ گر کر اِدھر اُدھر پھسلنے لگے اور مخصوص زاویے بنانے لگے۔ اس نے ٹیبل میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کا چہرہ دگنا لگ رہا تھا، بگڑا ہوا، مسخ شدہ، پھٹکار زدہ اور ملعون زدہ۔ وہ کتنی ہی دیر اُدھر بیٹھی سوچتی رہی۔ اٹھ کر واش روم میں چلی گئی اور وارڈ روب سے شلوار قمیض اور چادر نکالی۔ ملک منصور بیڈ پر بیٹھا سگار پینے میں مصروف تھا اور ساتھ ساتھ موبائل پر کسی سے بات بھی کر رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے سوٹ کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا اور وائٹ فرلز والی مہین سی نائٹی کی طرف اشارہ کیا۔ آئیکت نے اشارے سے کچھ سمجھایا اور دونوں ڈریسز لے کر باہر نکل گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے سوٹ پہنا اور جانماز پر بیٹھ کر سجدے میں سر رکھ کر رونے لگی۔ اتنا روئی کہ شاید یہ رونے کا آخری دن تھا۔ آنکھیں اور دل پھٹنے کو تھے۔ وہ کوئی دعا نہیں کر رہی تھی۔ اسے زندگی میں اب کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔ سب کچھ حاصل ہو کر اب لا

حاصل میں بدل چکا تھا۔ ہر شے اپنا مفہوم کھو چکی تھی۔ بس وہ رو رہی تھی، گڑ گڑا رہی تھی۔

''بس تو مجھے معاف کر دے اور کچھ نہیں چاہیے۔ مجھ سے ناراض نہ ہونا، میں بہک گئی اور راہ سے بھٹک گئی تھی۔ اب میرے پاس کوئی راستہ نہیں رہا۔ میری مدد کر، بس ایک دفعہ، آخری بار اس کے بعد میں تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔'' اس نے روتے ہوئے آنسو پونچھے اور جانماز قرینے سے تہ کر کے کرسی پر رکھی اور نائٹی پہن لی۔ اس سوٹ کو گتھم گتھا لپیٹ کر اس میں ایک بوتل رکھی اور کمرے میں چلی گئی۔

''کہاں رہ گئی تھیں، میں تو پریشان ہو رہا تھا۔'' اس نے موبائل بند کرتے ہوئے کہا۔ ''اوہ، فریش ہو رہی تھیں۔'' اس نے اسے نائٹی میں ملبوس دیکھ کر کہا۔ آئیکت نے خاموشی سے گتھم گتھا سوٹ شاپنگ بیگ میں ڈال کر سائیڈ ٹیبل کے ساتھ بے خیالی میں رکھنا چاہا تا کہ اسے شک نہ ہو اور اس کے پاس آ گئی۔

''اس کو اِدھر کیوں رکھ دیا؟'' ملک منصور نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''وہ تھوڑا سا گندا ہو گیا ہے۔''

''تو واش روم میں رکھ دیتیں۔''

''اوہ، آئی ایم سوری!'' وہ اٹھ کر جانے لگی۔

''چلو رہنے دو، صبح اٹھا لینا۔'' اس نے کہا۔

''منصور! کیا آپ نے شزا کو بتا دیا کہ ہم شادی کر رہے ہیں؟'' وہ کسی نہ کسی طرح شزا کے بارے میں جاننے کی خواہاں تھی۔

''ہاں، ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' اس نے بغور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یونہی میرے ذہن میں خیال آ رہا تھا۔''

''اس وقت کچھ مت سوچو۔ صرف اپنے اور میرے بارے میں سوچو۔ اس کے علاوہ ہر سوچ کو ذہن سے مٹا دو۔ اس خوبصورت ماحول میں صرف ہم دونوں ہیں۔ کسی تیسرے کو دستک بھی نہیں دینی چاہیے۔'' وہ رفتہ رفتہ اسے اپنے حصار میں لینے لگا اور وہ ہر آن گم ہوتی گئی۔ اندر ہی اندر روتی رہی اور سسکتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ریت بھر گئی تھی۔ وہ شدید چبھن محسوس کر رہی تھی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ نیند کی وادی میں کھو رہا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا۔ وہ سانس روکے لیٹی رہی۔ کافی دیر بعد اس نے چیک کیا وہ سو چکا تھا۔ اس نے لیمپ آف کیا اور بیڈ سے اٹھ کر اندازے سے ہیٹر کی

طرف گئی اور اس کا پوائنٹ پوری قوت سے کھول دیا۔ گربہ پائی سے ٹٹولتی ہوئی وہ اس کی سائیڈ پر آئی اور اس کے اوپر بوتل اُنڈیل دی۔ وہ تڑپنے لگا، چیخنے چلانے لگا، ہذیان بکنے لگا۔ اس نے جلدی سے لائٹر آن کیا اور اس کی روشنی میں اس کو تڑپتے ہوئے دیکھا۔

''ملک منصور! تم ہمیشہ عورتوں کے ساتھ کھیلتے آئے ہو اور تم نے مجھے بھی تباہ کرنا چاہا۔ آج میں تمھیں تڑپتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اب تمہارا مسخ شدہ چہرہ دیکھ کر کوئی بھی نہیں پہچانے گا کہ یہ تم ہو۔'' تیزاب کی بوتل نیچے کارپٹ پر اوندھے منہ پڑی تھی اور قطرہ قطرہ تیزاب کارپٹ میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ مدد کو پکار رہا تھا۔ اس کو گالیاں بک رہا تھا مگر ہر طرف گہرا سکوت تھا جیسے وہ قبر میں چلا رہا ہو، کوئی بھی اس کی آواز نہیں سن رہا تھا۔ اس کا گھر باہر سے پُرسکون لگ رہا تھا۔ چاند اور ستاروں کی روشنی میں جگمگاتا خوبصورت محل......

ملک منصور نے لپک کر اس پر حملہ کرنا چاہا ایک دم جلتا لائٹر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے پڑی تیزاب کی بوتل پر گرا۔ گیس کی اسمیل نے بھی سارے خلا کو پُر کر رکھا تھا۔ لائٹر گرا اور ایک دم آگ بھڑکی۔ ہر طرف شعلے ہی شعلے تھے۔ آئیکت نے بھاگنا چاہا مگر ملک منصور نے اس کی نائٹی کا کونا پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور دونوں کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کمرے میں ویلوٹ کے خوبصورت دبیز پردے آگ کے لمبے لمبے ستون بن گئے تھے۔ ہر شے آگ میں بھڑک رہی تھی۔ انسان، ہڈیاں، لوہا، تانبا، لکڑی، پتھر سب اس دوزخ کا حصہ بن گئے۔ دونوں چلا رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ چاروں طرف آگ پھیلی تھی، اوپر بھی نیچے بھی اور اردگرد بھی۔ ان کے چیختے چنگھاڑتے وجود لحہ لحہ خاکستر ہو رہے تھے۔

اس کے خوبصورت بلونڈ بال، نازک مرمریں بدن، آتشیں حسن، ذہانت، فطانت، لطافت سب کچھ آگ کی نذر ہو رہا تھا اور وہ ڈیشنگ، ہینڈسم وجود، شاطر، فطین الذہن اپنی ساری مکارانہ چالوں اور پلاننگ سمیت آگ میں جل کر خاک ہو رہا تھا۔ سالوں کی پلاننگ اور منصوبے بنانے والا چند ثانیوں میں راکھ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف اونچی اونچی دیواروں سے حطمہ جیسی آگ لپٹ رہی تھی۔

خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ کی طرح جو دلوں پر جا لپٹے گی اور وہ اس میں بند کر دیے جائیں گے یعنی آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں...... انھیں آگ کے لباس پہنا دیے گئے تھے اور آگ کی زنجیریں۔ ان کے چہرے جھلس رہے تھے۔ دل خاکستر ہو رہے تھے۔ بدن تڑپ رہے تھے اور روحیں جیسے آگ کی تپش سے راہِ فرار چاہ رہی تھیں اور اس قفس سے پرواز کو بے

تاب تھیں۔ وہ چیختے رہے، تڑپتے رہے اور راکھ ہو گئے۔ کب آگ ٹھنڈی ہوئی۔ کب کسی نے پولیس کو بلایا، خوبصورت محل راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ بلیک وی ٹی آئی سے صرف چند جلے ہوئے کاغذ ملے تھے جن سے بڑی مشکل سے مکینوں کی شناخت ہوئی تھی۔ نہ وجود رہے تھے نہ آثار، نہ شناخت باقی رہی تھی نہ پہچان۔ راکھ کے ذرے ہوا میں بکھر چکے تھے۔ نہ نمازِ جنازہ ہوئی نہ کسی نے دعا پڑھی۔ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ نہ کوئی لب دعا کے لیے ہل سکے نہ کوئی ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ سکے۔ ان کی پہچان ہی مشکوک تھی۔ کوئی تصدیق کیا کرتا۔

شزا نے خبر اخبار میں پڑھی تو جیسے سکون کا گہرا سانس لیا۔ اس شخص سے جدائی کا اسے نہ دکھ ہوا تھا نہ ملال۔ اسے تو اس کے پروردگار نے پکڑا تھا جس کی پکڑ بڑی شدید ہے اور جب وہ اچانک پکڑتا ہے تو انسان بوکھلا جاتا ہے۔ اسے کس نے اٹھایا۔ وہ تو گہری نیند میں تھی۔ شمائل تو بے خبر تھی۔ اسے رشتوں کی ضرورت نہ رہی تھی اور نہ ہی کسی کے جانے کا افسوس! اس کے لیے باپ کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ اس سے بے خبر رہی۔

شفق اخبار پڑھ کر بہت روئی تھی مگر اس نے بھی کوئی دعا نہ کی اسے بچپن یاد آنے لگا جب وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ پھر کسی اور سے کرنے لگا تو انھیں بھولتا گیا اور رفتہ رفتہ اس کی جان کا دشمن بن گیا۔ اس کی گھات میں بیٹھا رہا۔ اب اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ آزاد ہو گئی تھی ہر خوف سے، ہر خطرے سے۔

حیدر نے اخبار پڑھا تو گہری سانس لی اور اخبار آپا کی طرف بڑھا دیا۔ آپا نے خبر پڑھی اور چپ ہو گئیں۔

سمیر نے فون کیا۔ وہ بہت رو رہا تھا۔ جلد از جلد گھر آنا چاہ رہا تھا اور شزا اسے لینے جا رہی تھی۔

آئیکت کے گھر والوں کو اطلاع دے دی گئی تھی مگر ابھی تک وہ امید و بیم کی کشتی میں سوار تھے۔ وہ یقین نہیں کر رہے تھے البتہ اس کی چند چیزیں جائے وقوعہ سے ملی تھیں۔ اس کی مما کا میٹل کا لاکٹ جس پر آئیکت لکھا تھا جو انھوں نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ اس کی آگ میں جھلسی ہوئی سیاہ انگوٹھی مگر راکھ نہ تو تابوت میں سما سکی نہ قبر کا حصہ بن سکی۔ نہ جانے ہوا اسے کہاں لے اُڑی اور کس کس کے قدموں تلے روندی گئی۔

"بے شک تو مجھے روند ڈال، خاک کر دے، میرے تن بدن کو جلا دے مگر مجھے معاف کر دے۔" آہیں بھرتی ہوا سسکتی راکھ کو اِدھر سے اُدھر اُڑا رہی تھی۔ اس کا بھائی آیا اور

ناکام لوٹ رہا تھا۔ نہ وجود ہاتھ آیا تھا نہ آثار...... وہ بہتے اشکوں اور دعا گولیوں کے ساتھ اس کی مغفرت کی دعا کرتے ہوئے واپس لوٹ گیا۔

''تمہاری دنیا کی زندگی تو بس ایک دن کی تھی۔ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا تھی۔'' کھیل ختم ہو چکا تھا اور دنیا محو تماشا تھی۔ کردار جا چکے تھے اور دنیا کا اسٹیج خالی تھا۔ منتظر نگاہیں پہلے کرداروں کو رفتہ رفتہ بھلا رہی تھیں۔ وہ ذہن سے محو ہو رہے تھے۔ ماضی کا تاریک حصہ بن رہے تھے۔ زمانے کا فرعون وقت کے عمیق سمندر میں قصہ پارینہ بننے کے لیے غوطہ زن تھا۔

......✡......

''یہ ولیم کا گلاس ہے اور مجھے اس کے گلاس میں پانی مت دیا کرو۔'' سسٹر سائرہ لاؤنج میں بیٹھی افضل پر برس رہی تھی۔ ولیم اپنے کمرے سے وھیل چیئر پر نکل رہا تھا۔ یہ الفاظ اس کی سماعتوں سے ٹکرائے تو وہ وہیں رک گیا۔ دکھ کا شدید احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

''میڈم! یہ ان کا گلاس نہیں۔ ان کے برتن تو علیحدہ ہیں۔'' افضل نے صفائی دی۔

''نہیں، یہ دیکھو۔ میں نے مارکر سے اس کے گلاس اور دوسرے برتنوں پر نشان لگا دیے ہیں۔ وہ مسلمان نہیں اس لیے اس کے برتن علیحدہ رکھا کرو۔'' وہ خفگی سے بولی۔ اس کا دل کرچی کرچی ہو رہا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ اسے بارہا ایسے رویوں اور نظروں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مشکوک لہجے، متجسانہ استفہامیہ نگاہیں، معترضہ جملے، سب کچھ اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ اندر ہی اندر بہت زیادہ بکھر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنے آپ کو نجس اور ناپاک تصور کر رہا تھا۔

''بھئی ہم تو نماز پڑھنے والے لوگ ہیں، اس طرح کی ناپاکیوں سے ہمیں بچاؤ۔'' سسٹر سائرہ زبان کی بہت تلخ عورت تھی۔ وہ افضل کو ڈانٹ رہی تھی جو گلاس ٹرے میں رکھ کر واپس جا رہا تھا۔ اسی لمحے تبسم آپا کمرے سے باہر آئیں۔ انھوں نے بھی اس کی باتیں سن لی تھیں۔ ولیم دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔

''کیا بات ہے بھئی، کس بات پر ناراض ہو رہی ہو؟'' آپا نے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے جی! افضل، ولیم صاحب کے برتنوں میں مجھے کھانے پینے کو دے تو میں ناراض نہیں ہوں گی تو کیا ہوگا؟'' وہ بگڑ کر بولی۔

''کیوں، اس کے برتنوں کو کیا ہوا ہے؟''

''جیسے آپ کو تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کرسچن ہے۔''

''اور کرسچینز کے ساتھ کھانا پینا جائز ہے، یہ قرآن کا فیصلہ ہے۔'' آپا نے بات کاٹ کر کہا۔

''لیکن احتیاط تو کرنی چاہیے۔ ہم لوگ نماز، روزے والے لوگ ہیں۔ ایسی ناپاک باتیں برداشت نہیں کر سکتے۔''

''خدا کے لیے اتنی تنگ نظر مت بنیں۔ آپ تو پڑھی لکھی ہیں اور ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ ہم کیا اور ہماری نمازیں کیا...... ہم جیسے لوگوں نے تو مذہب کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے اسی لیے ایک مشہور مسلم ادیب نے خود ہمارے بارے میں ہی لکھا ہے کہ اسلام دنیا کا بہترین مذہب ہے مگر اس کے ماننے والے بدترین لوگ ہیں۔'' آپا خفگی سے بولیں۔

''اب ایسی بھی بات نہیں، اسلام طہارت اور پاکیزگی کا حکم دیتا ہے۔''

''لیکن دلوں کو توڑنے کا نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا ایک تلخ جملہ دوسروں کے لیے کس قدر ذہنی اذیت کا باعث بن سکتا ہے اور خدا تو کہتا ہے کہ وہ تمہاری صورتوں کو نہیں، تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ آپ ایسی گفتگو سے پرہیز کیا کریں اور...... خیر چھوڑیں۔'' آپا نے ناراضی سے کہا۔

''ٹھیک ہے جی، میں یہ نوکری ہی چھوڑ دیتی ہوں۔ میں کافروں کے گھر نوکری نہیں کر سکتی۔ نہ پاکی کا پتا نہ پلیدی کا۔'' وہ پھر تلخی سے بولی۔

''خدا کے لیے آپ ایسی گفتگو سے کیا چاہتی ہیں۔ آپ اپنی سوچ کو نہیں بدلیں گی مگر نوکری چھوڑ دیں گی۔ کیا آپ کے اس عمل سے خدا خوش ہوگا اور آپ کا تو شعبہ ہی انسانیت کی خدمت ہے۔ آپ تو مذہب اور رنگ کی قیود سے آزاد ہو کر انسانیت کی خدمت کے لیے میدان میں آئی ہیں۔'' آپا نے ملائمت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہیں جی، مجھے کوئی انسانیت کی خدمت کا شوق نہیں۔ یہ میری مجبوری ہے۔ میرا شوہر نشئی ہے اور مجھے اپنے بچے پالنے ہیں۔ اللہ مالک ہے ایک در بند، سو در کھلے اور خدا خوش ہو نہ ہو، میرا دل تو مطمئن ہوگا۔'' وہ غصے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ بیٹھیے اور سکون سے میری بات سنیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسجد نبوی ﷺ کی اسلام میں کیا اہمیّت ہے؟''

''ہاں، کیوں نہیں، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کالی کملی والے ﷺ کے بعد اس سبز گنبد کے سوا ہمارا اور ہے کون؟'' وہ قدرے عقیدت سے بولی۔

''اگر آپ کو ان سے اتنی محبت ہے تو آپ جانتی ہیں کہ ایک دفعہ کچھ عیسائی مباحثے کے لیے مسجد نبوی ﷺ میں آئے۔ جب ان کی عبادت کا وقت ہوا تو انھوں نے اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے اسی مسجد میں عبادت کی اور جب ہماری نماز کا وقت ہوا تو ہمارے نبی ﷺ نے اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ انھوں نے تو یہ نہیں فرمایا کہ نکلو یہاں سے۔ تمھارے وجود سے ہماری مسجد ناپاک ہوتی ہے۔ ایسے نبی ﷺ کے ماننے والوں کی ایسی چھوٹی سوچ نہیں ہونی چاہیے۔ وہ تو کسی کی طرف غصّے کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔'' آپا نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ جی بڑے دل اور عظمتوں والے لوگ تھے۔ ہم گنہگار اس قابل کہاں۔ ہم تو ان کے قدموں کی خاک ٹھہرے۔ بس میرا دل ہی نہیں مانتا اس گھر میں کام کرنے کے لیے آپ کسی کرسچن نرس کا بندوبست کر لیں۔ بڑی مل جاتی ہیں، میں جا رہی ہوں اور حیدر صاحب کو کہہ دیجیے گا میرا حساب کر دیں خدا حافظ، کہا سنا معاف کر دیں۔'' وہ پرس اٹھاتی باہر نکل گئی اور آپا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ولیم کا دل ٹوٹ چکا تھا مگر آپا کی باتوں سے نہ جانے اسے کیا تقویت ملی تھی کہ وہ ان کی طرف آ گیا۔ آپا نے اسے دیکھا تو پیار سے مسکرائیں اور محبت سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''آنٹی! مجھے ہاتھ لگانے سے آپ ناپاک تو نہیں ہوئیں؟'' اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''نہیں بیٹا! ایسا سوچتے بھی نہیں۔ جو لوگ ایسا سوچتے ہیں وہ بہت چھوٹے ذہن کے لوگ ہوتے ہیں اور چھوٹے ذہن کے لوگ تو ہر جگہ، ہر ملک اور ہر مذہب میں ہوتے ہیں۔ یہ لو مجھے کیا ہوا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو پیار نہ کروں؟'' انھوں نے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما اور محبت سے ساتھ لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''بے وقوف! تم دل کیوں چھوٹا کر رہے ہو۔ ہم سب کو تم بہت عزیز ہو۔'' آپا نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ہر کوئی مجھے کیوں ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ ہر ایک کا پہلا سوال یہی کیوں ہوتا ہے کہ کیا میں کرسچن ہوں، کیا کرسچن خدا کے

بندے نہیں؟''

''ہیں کیوں نہیں بلکہ ہمارے قرآن میں تو ان کا ذکر بڑی محبت سے آیا ہے کہ دوسرے لوگوں کی نسبت یہ ہمارے زیادہ قریب ہیں۔ یہ تو ہم لوگ ہیں جو خود ہی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں پڑ جاتے ہیں۔ رہی تمھارے بارے میں جاننے کی بات تو جب تم سے ایسا پوچھا جاتا ہے تو حیرانی تم پر نہیں تمہاری ماں پر ہوتی ہے کہ اس نے کیا کیا۔ تم سوال نہیں بنتے بلکہ سوال تو تمہاری ماں بنتی ہے۔ تم یونہی پریشان نہ ہو۔''

''آنٹی! شفق نے مجھے چلتا پھرتا گناہ کہا تھا۔'' اسے بہت دنوں بعد کوئی محرمِ راز ملا تھا اور اب وہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ رہا تھا۔

''اچھا، اس نے ایسا کہا۔ اصل میں وہ تمہاری مما سے بہت ناراض ہے اس لیے ایسا کہا ہوگا اور بہت غلط کہا ہے۔ میں ضرور اسے ڈانٹوں گی۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''نہیں رہنے دیں۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''اور یہ تمہاری ٹانگوں کو کیا ہوا ہے؟''

''ایکسیڈنٹ......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''اوہ آئی ایم سوری! اللہ آرام دے گا۔''

''لیکن فادر تو کہتے ہیں کہ جب خدا کسی سے ناراض ہوتا ہے تو ایسے ہی سزا دیتا ہے۔'' وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔

''بہت بری بات ہے، نہ جانے انھوں نے ایسا کیوں کہا ہے۔ دیکھو اللہ کو سب سے پیارے نبی ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ تکلیفیں بھی انہی کو دی گئیں اور جس کو ایک تکلیف پہنچتی ہے اللہ اس کی دس برائیاں معاف فرماتا ہے۔ وہ تو اپنے بندوں سے بہت بہت پیار کرنے والا ہے۔ اتنی محبّت کہ کوئی کسی سے نہیں کر سکتا۔ اب تم اپنے فادر کو دیکھو اور سسٹر سائرہ کو۔ ان کی سوچوں میں کیا فرق ہے اور یہ دونوں کتنے اہم شعبوں سے وابستہ ہیں۔ ایک روحانی مسیحا اور ایک جسمانی......خدا کو وہی پاتا ہے جو اس سے سچّی محبت کرتا ہے چاہے وہ کوئی فقیر ہو یا ان پڑھ مزدور یا پھر کوئی عالم، پیدا تو سب کو اسی نے کیا ہے۔'' تبسم آپا نے اتنی محبّت سے اس کو سمجھایا کہ ایک دم اس کے اندر سے دکھ اور غم کے بادل چھٹنے لگے۔ اسے ایک روحانی خوشی سی ملنے لگی۔ اتنے دنوں سے اس کا اندر شدید انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔ اب منہدم عمارت اپنی واضح شکل میں پھر سے نمودار ہونے لگی۔ اس کے دل سے بوجھ کم ہونے لگا۔ وہ خدا جو

بہت دنوں سے اس سے دور جا چکا تھا، ایک دم اسے اپنے بہت قریب محسوس ہوا۔

''آنٹی! کیا گاڈ واقعی مجھ سے ناراض نہیں؟'' وہ تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔

''نہیں بیٹا، بالکل نہیں۔ وہ کیوں اپنے بندوں سے ناراض ہوگا اور تم نے کیا گناہ کیا ہے جو تم یوں پوچھ رہے ہو۔''

''میں چرچ جوائن کرنے والا تھا کہ مما کی طبیعت خراب ہوگئی اور ان دنوں مجھے ایک...... ورکشاپ اٹینڈ کرنا تھی جو میں نہ کر سکا۔ فادر مجھ سے ناراض ہو گئے۔ وہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور پھر میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا اس لیے انھوں نے ایسا کہا۔''

''تم اپنے ذہن کو بالکل صاف رکھو۔ خدا ان باتوں سے بالکل ناراض نہیں ہوتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ زمین و آسمان تمھارے گناہوں سے بھرے ہوں، توبہ کر کے میری طرف لوٹو تو میں سب کچھ معاف کر دوں گا۔''

''کیا واقعی آنٹی؟'' اس کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔

''ہاں، کیوں نہیں، ہماری کتاب میں تو بار بار یہی ذکر ہے کہ وہ بہت معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ تم ایسی بات سوچنا بھی مت۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے اور تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے انشاء اللہ اور یہ تکلیفیں تو انسان کی آزمائشیں ہوتی ہیں۔''

''تو کیا مما کی بھی یہی آزمائش ہے؟''

''ہاں بالکل! وہ شاید اس کی ساری تکلیفیں اسی دنیا میں ختم کر دینا چاہتا ہے۔''

''آنٹی! کیا مما نے زندگی میں بہت گناہ کیے ہیں؟''

''یہ تمھیں کس نے کہا؟'' آپا کو اس کا یہ سوال قدرے برا لگا۔

''میں نے مما سے سنا تھا اور شفق بھی کچھ ایسا ذکر کر رہی تھی۔''

''وہ بہت نان سینس ہے۔ ہاں اس نے نان مسلم سے شادی کر کے گناہ کیا ہے۔ ہمارے مذہب میں یہ جائز نہیں۔''

''کیوں جائز نہیں۔ ایک عورت کسی مرد کو پسند کرے تو وہ اس سے شادی کیوں نہیں کر سکتی۔ شادی کرنے کا حق تو ہر ایک کو ہے کہ وہ اپنی پسند سے شادی کرے۔ اس میں کیا برائی ہے جب دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہوں۔'' اس کی نظروں کے سامنے نور گھوم گئی جو ایک دوسرے سے محبت تو کرتے تھے مگر شادی کا ذکر کبھی نہیں چھیڑا تھا۔ وہ خود تو چرچ جوائن کرنے کی وجہ سے خاموش تھا مگر حالات بدلنے کے بعد بھی نور نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا

تھا اور یہ بات اکثر اسے حیران بھی کرتی تھی۔ شادی کا مقصد نسل انسانی کی بقا ہے اس لیے فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔

''اسلام جذباتی فیصلوں کے حق میں نہیں۔ یہ محبّت کی شادیاں وقتی طور پر تو بہت اچھی لگتی ہیں لیکن یہ آئندہ نسلوں کے لیے بہت خطرناک ہوتی ہیں جیسے اب تم منتشر رہتے ہو۔ پریشان سوچوں میں گم کہ تمہارا افیوچر ریلجن کیا ہوگا۔ باپ، اولاد اور بیوی دونوں کا کفیل ہوتا ہے۔ وہ دونوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اس کے مذہب یا اصولوں پر رہیں اس لیے ہمارے مذہب میں مردوں کو حق ہے کہ وہ اہل کتاب عورتوں سے شادی کر لیں لیکن پھر بھی بہتر یہی ہے کہ وہ ہم مذہب میں کریں جبکہ عورت کو اس لیے منع کیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلم شوہر کی وجہ سے مجبور ہوگی اور اپنی اولاد کو اپنے عقیدے کے مطابق نہیں پال سکے گی اور ویسے بھی آج کل کے دور میں جہاں ڈپریشن بہت بڑھ رہا ہے، ایسے تصادم بچوں کے ذہنوں کو شدید مضطرب کر دیتے ہیں اور وہ اکثر نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔ ہر مذہب کی اپنی آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ جو ہمارے ہاں حلال ہے ان کے ہاں حرام ہے۔ ایسے تصادم اذہان کو شدید زِک پہنچاتے ہیں اس لیے اللہ نے آغاز میں ہی ایسا کرنے سے منع کیا ہے اور اللہ کا کام تو انسان کو بچانا ہے۔ پورے قرآن کا موضوع ہی انسان ہے۔ وہ انسان کی مجبوریوں اور نفس کی خواہشوں کو سمجھتا ہے، پھر سمجھاتا ہے، کہیں محبت سے، کہیں ڈانٹ کر، ڈرا کر۔'' آپا نے اسے محبت سے سمجھایا۔

''ڈانٹ کر کیوں؟''

''کیوں، مما کبھی نہیں ڈانٹتیں جب غصّے میں آتی ہیں۔ کیا ان کی ڈانٹ بری لگتی ہے۔''

''نہیں، وہ محبّت بھی تو بہت کرتی ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اللہ مما سے بھی کہیں زیادہ محبّت کرتا ہے۔''

''آنٹی! سب لوگ آپ جیسے کیوں نہیں؟'' وہ محبّت بھرے لہجے میں بولا۔

''اچھا کیونکہ سارے بیٹے ولیم جیسے کیوٹ بھی تو نہیں۔'' انھوں نے محبّت سے اس کے سر پر چپت ماری۔

''تھینک یو آنٹی!''

''کس بات کا تھینک یو، اچھا بتاؤ کیا کھاؤ گے۔ میں اپنے بیٹے کے لیے خود پکاؤں گی۔''

''سینڈوچز اور فرنچ فرائز۔''

''وائے ناٹ شیور!'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''آنٹی! آپ اپنے بچوں سے بھی ایسے ہی پیار کرتی ہیں۔''

''ہاں بہت زیادہ، تمھارے جتنا۔''

''اور وہ؟''

''وہ بھی بہت زیادہ، میری بیٹی اینا اسلام آباد میں ڈاکٹر ہے۔ اطہر آرمی میں کیپٹن ہے اور ضیغم ابھی ایف ایس سی میں ہے اور پنڈی میں پڑھتا ہے۔ سب لوگ ہم دونوں کو مجھے اور تمھارے انکل کو بہت بہت مس کرتے ہیں۔ ہم سب لوگ فرینڈز کی طرح رہتے ہیں۔ جب وہ گھر آتے ہیں نا تو کبھی سب کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ کبھی چیس (Chess)، کبھی کیرم، کبھی آؤٹنگ اور تمھیں بتاؤں اینا نے ایک دفعہ گڑیا کی شادی کی۔ تینوں باپ بیٹا براتی بن کر آئے اور ہم ماں بیٹی نے گڈی کو رخصت کیا۔'' تبسم آپا کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں اور وہ بھی ان کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

''آنٹی! آپ بہت اچھے لوگ ہیں۔''

''ٹھیک ہے، مان لیتی ہوں اگر تم کہتے ہو۔ ویسے تمھارے انکل تو ہر وقت مذاق ہی اُڑاتے رہتے ہیں کہ ہم بہت جھگڑالو لوگ ہیں۔''

''نہیں، وہ مذاق کرتے ہیں۔'' وہ ایک دم ہنستے ہوئے بولا۔

''ہنستے رہا کرو۔ بہت پیارے لگتے ہو۔ میرا ضیغم تمہاری طرح ہی ہنستا ہے۔ میں تمھیں ان لوگوں سے ملواؤں گی تو تم بہت خوش ہو گے، وہ واقعی بہت کیوٹ ہیں۔''

''آنٹی کب؟''

''جب وہ آئیں گے۔ اب میں کچن میں جاتی ہوں۔ تم مما کے پاس چلو۔ آؤ میں ہی لے چلتی ہوں۔'' وہ اس کی وھیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے شہلا کے پاس لے گئیں۔ وہ سو رہی تھی اس لیے وہ اسے واپس اپنے کمرے میں لے آئیں۔

وہ تبسم آنٹی کے آنے سے بے حد خوش ہو گیا تھا۔ جیسے ہر طرف پھیلی تاریکی میں جگنو کے مانند کہیں سے اُڑتی ہوئی روشنی آ گئی ہو اور اس نے سارے گھر کو پُرنور کر دیا ہو۔ آنٹی خوبصورت، دراز قد، باپردہ درمیانی عمر کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھیں۔ ساری زندگی آرمی سیٹ اپ میں گزاری تھی اس لیے ہر بات اور کام بہت منظم طریقے سے کرنے کی عادی تھیں۔ ان کا محبت بھرا شفیق لب و لہجہ، ہر مشکل کو لائٹلی لینا اور کسی کو بھی ٹینس نہ ہونے دینا اس کے لیے باعث رحمت بن گیا تھا۔ شہلا بھی ان کے آ جانے سے بہت بہتر محسوس کر رہی تھیں۔

وہ کبھی اسے محبت سے سمجھاتیں، کبھی قرآن پڑھ کر سناتیں تو کبھی اس کی دلجوئی کرتیں۔ حیدر سے وہ ہر صبح یوں محبت سے ملتی تھیں جیسے پھول، خوشبو کا استقبال کرتا ہے۔ وہ سراپا محبت تھیں اور اس کے لیے رحمت بنتی جا رہی تھیں۔

وہ چند دنوں میں ہی ان کا اتنا عادی ہوتا جا رہا تھا کہ اپنے دل کی ہر بات ان سے کرنے لگا تھا۔ وہ اپنی ہر سوچ ان سے شیئر کرنے لگا تھا۔ ان سے گفتگو کر کے اسے تسلی ہوتی اور مسرت بھی محسوس ہوتی جو روحانی احساس اور ارتقا کا عمل ایک سال پہلے شروع ہوا تھا، اچانک رک جانے کی وجہ سے وہ شدید ہیجان اور اضطراب کا شکار ہوا تھا اب پھر عود کر آ رہا تھا مگر اب اس کا زاویہ بدل رہا تھا۔ وہ جو ہمیشہ گاڈ اور کرائسٹ کا ذکر کرنا باعث افتخار سمجھتا تھا، عقیدت سے اس کا دل پسیج جاتا تھا۔ اب اکثر باتوں میں اللہ اور اس کے پرافٹ کا ذکر کرنے لگا۔ گو کہ حضرت محمد ﷺ کہتے ہوئے وہ ہمیشہ تذبذب کا شکار ہوتا لیکن پرافٹ کہنے میں کبھی عار محسوس نہ کرتا۔ صرف بائبل کو ہمیشہ مقدس اور روحانی کتاب سمجھنے والا اب قرآن کے بارے میں بھی تجسس سے سوال کرتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا سے محبت کا تصور اس کی ذات کو رفتہ رفتہ اعتماد بخش رہا تھا۔ پہلے وہ ہر بات میں خدا سے بہت خوف محسوس کرتا تھا۔ کرائسٹ سے محبت اور خدا سے خوف، انہی دو خطوط تک اس کی سوچیں محدود تھیں، اب خوف کم اور محبت نے جگہ لے لی تھی۔ اس احساس نے اس کی روح میں ایک در وا کیا تھا۔ ایسا در جس کے اندر نور و طمانیت تھی اور جس نے اس کے وجود کو خوشی اور اطمینان سے بھر دیا تھا۔

''محبت ہر رنگ میں خوبصورت ہے۔ ایک حسین احساس کا نام جو دلوں سے کدورتیں اور نفرتیں مٹاتی ہیں۔ خدا کی طرف سے ایک مرہم...... زہر آلود دلوں کے لیے تریاق کا کام دیتی ہے۔'' تبسم آنٹی نے محبت کا ایسا ہی حسین احساس اس کے اندر جگایا تھا۔ نور کی محبت تو دل کے ایک گوشے تک محدود تھی جس سے روح سیراب ہوتی تھی۔ اب ایسی محبت پیدا ہو رہی تھی جو عام تھی اور جو وجود کے ساتھ ساتھ پورے ماحول کو بھی معطر کر رہی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ نور کی غیر موجودگی کو قبول کر رہا تھا۔ پہلے جس طرح مضطرب اور پریشان رہتا، اب صرف منتظر رہتا۔ ہر خوبصورت انسان اپنی ذات میں بند موتی کی طرح ہے۔ ہر ایک کے لیے مخصوص چمک اور دلکشی لیے ہوئے۔ وہ نور کو سب کچھ بتانے کے لیے شدت سے منتظر تھا۔

......۞......

شزا، سمیر کو گھر لے کر آئی تو بے چین ہو گئی۔ وہ باپ کے بارے میں بہت عجیب و

غریب سوالات کرتا۔ کبھی شمائل کے بارے میں پوچھتا رہتا۔ شمائل کی حالت روز بروز بگڑ رہی تھی۔ اتنے شاکس کے بعد بھی وہ ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے ٹھیک ہونے کے بارے چانسز ختم ہو چکے تھے۔ شزا اس کو دیکھ کر ہر وقت آہیں بھرتی رہتی۔ اتنی خوبصورت، نرم و نازک، حسین و جواں کانچ کی گڑیا کے مانند کرچی کرچی بکھر چکی تھی اور اب اس کی کرچیاں بھی سمیٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ شزا کی انگلیاں فگار اور روح چھلنی ہو گئی تھی۔ اس کی ساری کوششیں رائیگاں گئی تھیں۔

''اس کا یہی حل ہے کہ اسے فونٹین ہاؤس بھیج دیں۔'' ڈاکٹر نے مشورہ دیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کاش وہ مر جائے تو مجھے سکون مل جائے۔ اس طرح کیسے اسے زندہ در گور کر آؤں۔'' اس نے کہا۔

''ہمت نہ ہاریں، حرفِ آخر خدا ہے جو بے جان سے جاندار تخلیق کرتا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ پُرامید رہیں اور اس سے دعا کریں۔'' ڈاکٹر نے تسلی دی۔ وہ جانتی تھی یہ محض تسلی ہے۔ اس کا دل کہیں نہیں ٹھہر رہا تھا کیونکہ اس کی ریکوری کے تمام چانسز وہ خود لوز کر چکی تھی یا پھر حالات نے اسے مواقع فراہم نہیں کیے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب! میں خود کیسے اسے چھوڑنے جاؤں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔'' وہ روتے ہوئے ''ٹھیک ہے مسز منصور! میں آپ کی مدد کروں گا اور اسے فونٹین ہاؤس چھوڑ آؤں گا۔''

''نہیں۔'' وہ ایک دم بڑبڑانے لگی۔

''ٹھیک ہے، آپ فیصلہ کر لیں اور پھر مجھے بتا دیجئے گا۔'' وہ بے دلی سے اٹھ کر آ گئی۔ وہ سمیر کو لے کر شمائل سے ملنے گئی۔ وہ خاموشی سے لیٹی تھی۔ ان کو دیکھتی رہی پھر اٹھی اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''یہ بندر کہاں سے آ گیا؟''

''میں بندر نہیں ہوں۔'' سمیر غصے سے بولا۔

''سمیر! خاموش ہو جاؤ، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' شزا نے اسے سمجھایا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سب پاگل ہیں۔ گندے لوگ، ہر وقت لڑتے رہتے ہیں اور یہ مکی ماؤس...... منکی، یہ بھی پاگل ہے۔'' وہ اس کا منہ چڑاتے ہوئے بولی۔

''شٹ اپ!'' سمیر ایک دم غصّے سے بولا۔

''کس کو شٹ اپ کہا، کس کو؟'' وہ غصّے سے سمیر کو زور زور سے تھپڑ مارنے لگی۔ شزا بچانے کی کوشش کرنے لگی تو اس نے اسے بھی زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑی مگر وہ سمیر کو مسلسل مارتی رہی۔ کسی طرح رک ہی نہیں رہی تھی۔

''سمیر! تم کمرے سے بھاگو اور نرس کو بلاؤ۔'' شزا نے دونوں کے درمیان آتے ہوئے سمیر سے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے علیحدہ ہوا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ شزا بھی جلدی سے باہر نکلی اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ ابھی اسے فونٹین ہاؤس ہی چھوڑ آئیں۔ یہ بہت نا قابل برداشت ہو رہی ہے۔'' اس نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر سے کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ کل آ جائیے۔ ابھی تو میں کچھ مصروف ہوں، کل چلیں گے۔'' وہ افسردہ سی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''مما! شائل کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ تو بالکل پاگل لگتی ہے۔'' سمیر نے حیرانی سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور گاگلز پہن لیے۔

''مما! بتائیں نا اسے کیا ہو گیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''تو وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ کہیں وہ ایکٹنگ تو نہیں کر رہی۔''

''نہیں۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

''مما، اس کو اب گھر نہ لانا ورنہ وہ مجھے مارے گی۔ خیر، مجھے کیا ہے۔ میں تو واپس مری چلا جاؤں گا۔''

''نہیں سمیر! اب تم واپس نہیں جاؤ گے۔ میرے پاس رہو گے۔''

''نہیں، مجھے واپس جانا ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا۔''

''کیوں؟'' شزا کو سخت دھچکا لگا۔

''آپ بہت بور لوگ ہیں۔ ہر وقت بزی، گھر سے اچھا تو ہاسٹل ہے۔ وہاں میرے دوست ہیں۔ ہم سب مل کر کھیلتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ یہاں پر کیا ہے، کچھ بھی نہیں، مجھے آپ کے پاس نہیں رہنا۔''

''پلیز بیٹا! میں آپ کے لیے اب کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''نو مما! آئی ڈونٹ ٹرسٹ یو!'' شزا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ کس قدر صاف گوئی سے اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کا منہ دیکھنے لگی اور کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس وقت اس سے بحث کرنا اسے مناسب نہ لگا۔

ملک منصور کے بعد اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس نحوست زدہ گھر سے جلد از جلد دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا اور وہ سمیر کے ساتھ وہاں شفٹ ہو جانا چاہتی تھی۔ صرف سمیر ہی اس کے پاس باقی بچا تھا اور وہ اسے کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ آنے والے دنوں کی تنہائی سے خوفزدہ تھی۔ شمائل پہلے ہی جدا ہو رہی تھی اور اب سمیر بھی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ زندگی کا حاصل کیا تھا؟ سب کچھ رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔

اگلے دن وہ سمیر کو گھر چھوڑ کر ڈاکٹر کے ساتھ شمائل کو فونٹین ہاؤس چھوڑنے گئی تو سارا وقت روتی رہی۔ شمائل پہلے تو خاموشی سے ماں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی پھر ڈاکٹر کو دیکھ کر ایک دم چلانے لگی۔

''میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ مجھے مارتا ہے، بہت مارتا ہے۔'' اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کار ڈرائیو کرتے ہوئے ڈاکٹر پر حملہ کر دیا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ میری گاڑی میں آ جائیے۔ میں اس کو لے کر جاتی ہوں۔'' شزا نے اپنی گاڑی کی چابی پرس میں سے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ وہ گاڑی سے باہر نکل گیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اب وہ ایسے مطمئن بیٹھی تھی جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ سیٹ کے ساتھ سر ٹکا کر باہر دیکھ رہی تھی۔ شزا آنکھوں سے مسلسل بہتے اشکوں کو بھی نہیں پونچھ رہی تھی۔ اس لمحے وہ اسے نارمل لگ رہی تھی جیسے موت سے پہلے ہر مریض صحت یاب لگتا ہے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوئی اور ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگی۔ وہ تھوڑی دیر بعد پہنچ گیا اور انچارج سے ساری بات کی۔ اس کی رپورٹس دکھائیں اور اسے عملے کے حوالے کیا۔ شزا باہر نکلنے کو تھی کہ وہ تیزی سے اس کی طرف بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے ساتھ چمٹ گئی۔

''میں یہاں نہیں رہوں گی، میں آپ کے ساتھ گھر جاؤں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ پلیز مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔'' وہ سہم کر چڑیا کی مانند اس کے ساتھ چمٹ رہی تھی اور اس کا دل لہولہان ہو رہا تھا۔ شزا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''حوصلہ کریں مسز منصور!'' ڈاکٹر نے تسلی دینا چاہی۔ ایک نرس اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ شائل نے زور سے اسے تھپڑ مارا۔ وہ تیورا کر گر پڑی۔ دو تین لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور اسے زبردستی اندر لے کر جانے لگے۔ وہ رو رہی تھی، چلا رہی تھی، چیخ رہی تھی، سسک رہی تھی مگر کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ سب محو تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک پاگل کردار دنیا کے اسٹیج پر پرفارم کر چکا تھا اور تماشائی حیرت سے انسانوں کے اس جم غفیر میں ایک ابنارمل کردار کو دیکھ کر تاسف کر رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک اور اسٹیج ایک اور کردار نہ ادا کر سکے وہ دنیا کے لیے مر جاتا ہے اور دنیا کو ایسے کرداروں کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کا خوبصورت مگر بے کار وجود ایک حقیر تنکے کے مانند حالات کے بہاؤ میں بہہ چکا تھا۔ اب کوئی اس کا منتظر نہیں تھا۔ اس کا وجود رفتہ رفتہ زوال پذیر تھا۔ اونچی اونچی دیواروں میں قید، ہراساں، پریشاں حال، منتشر وجود جیسے خزاں رسیدہ درخت کا سوکھا، پھڑپھڑاتا، شکستہ حال، اِدھر اُدھر سرگرداں پتا۔

......❂......

مغیث انکل فون پر اپنی بیٹی اینا سے بات کر رہے تھے اور وہ صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ مغیث انکل کا اندازِ گفتگو بہت محبت بھرا تھا۔ وہ اینا کے فون کا سن کر ہی کھل اٹھے تھے۔ اس سے ہر ہر بات پوچھ رہے تھے۔ اس کی صحت، روٹین، کھانے، مریضوں، موسم غرضیکہ وہ کوئی موضوع نہیں چھوڑ رہے تھے۔ دونوں نے گھنٹا بھر باتیں کیں اور وہ حیرت سے پاس بیٹھی سنتی رہی۔ دونوں کی محبت کو قدرے رشک بھری نگاہ سے دیکھتی رہی۔ جس شے سے انسان محروم ہو وہ ہمیشہ اسے چبھتی رہتی ہے۔ اس کے نہ ہونے کا احساس ہمیشہ انسان کو اندر ہی اندر دکھی کرتا رہتا ہے۔ پہلے وہ حیدر انکل اور شہلا کی محبت کو حسد بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی اور اب مغیث انکل اور اینا کو۔

''کیا ہر باپ اپنی بیٹی سے ایسی ہی محبت کرتا ہے؟'' وہ بار بار اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ ''ہر باپ نہیں صرف کوئی کوئی یا پھر شاید سب ہی سوائے میرے باپ کے۔'' اس نے سختی سے ہونٹ چبائے اور آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔ مغیث انکل کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ باہر لان میں آ گئی اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ کافی دیر وہ اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی پھر بیٹ مین بلانے آ گیا۔

''باجی! کرنل صیب کھانے کے لیے بلا رہی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو وہ اندر آ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹا! آپ کچھ اداس لگ رہی ہیں۔'' انکل مغیث بھی تبسم آنٹی کی طرح بہت شفیق اور مہربان تھے۔ انسانوں کے ہجوم میں......خوبصورت وجود، پیکر محبت......

''نہیں یونہی، آپ کسی سے بات کر رہے تھے اس لیے میں باہر چلی گئی۔''

''بھئی، وہ میری اینا کا فون تھا۔ دیکھو میں آج ہی اسے مس کر رہا تھا اور اس کا فون آ گیا۔ کہہ رہی تھی کہ وہ بھی آج مجھے بہت یاد کر رہی تھی۔'' وہ فرطِ جذبات سے مسکراتے ہوئے بولے۔

''اینا سے آپ بہت محبت کرتے ہیں؟''

''ہاں، یقیناً ہر باپ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا ہے۔''

''کیوں ہر باپ کیوں اپنی بیٹی سے محبت کرتا ہے؟'' اس نے سوال دُہرایا۔

''فرائڈ تو اسے الیکٹرا کمپلیکس کہتا ہے۔ جنس مخالف کی محبت لیکن ہمارے مذہب میں تو اسے انمول رشتے کے طور پر لیا جاتا ہے۔ باپ اپنی ذات کا عکس اس میں دیکھتا ہے اور شاید یہ قدرتی امر بھی ہے کہ باپ کو قدرتی طور پر بیٹیاں بہت عزیز ہوتی ہیں۔''

''لیکن ہر باپ کو نہیں۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''ہاں یہ بھی ممکن ہے لیکن ایسے باپوں کو صرف بیٹیاں نہیں بیٹے بھی عزیز نہیں ہوتے۔ ان کے اندر خود غرض خواہش ہوتی ہے۔ ایک نارمل باپ دونوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ ابھی تم دیکھنا ضیغم کا بھی فون آئے گا کیونکہ میں آج اسے بھی بہت مس کر رہا ہوں۔ تم کھانا کھاؤ۔ یوں باتوں میں نہ کھو جایا کرو ورنہ تمہاری آنٹی مجھ سے بہت ناراض ہوں گی۔ معلوم ہے جاتے ہوئے بھی اور ہر روز فون کر کے بس یہی کہتی ہیں مغیث! شفق کا بہت خیال رکھنا۔ بھئی تم مجھے ان کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لینا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''انکل! کیا آپ آنٹی سے بہت محبت کرتے ہیں؟''

''ہاں بھئی، یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ شی از ویری نائس لیڈی! انھوں نے میرا اور میرے بچوں کا بہت خیال رکھا ہے۔''

''تو کیا صرف آپ اس وجہ سے ان سے محبت کرتے ہیں کہ انھوں نے آپ کا اور آپ کے بچوں کا خیال رکھا۔'' اس نے معنی خیز انداز میں سوال کیا تو وہ چونک گئے اور اس کی طرف قدرے حیرت سے دیکھنے لگے۔

''آپ کیوں ایسا پوچھ رہی ہیں؟''

''کیا ایک مرد صرف عورت سے اس لیے محبّت کرتا ہے کہ وہ اس کا اور اس کے بچوں کا خیال رکھتی ہے، ان کی خدمت کرتی ہے۔ ساری زندگی اسی میں صرف کر دیتی ہے۔ پھر وہ اسے محبّت کرتا ہے۔''

''نہیں، وہ اس لیے بھی اس سے محبت کرتا ہے کہ اس کے وجود سے اسے خوشی بھی ملتی ہے۔ مسرت اور اطمینان کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے تب وہ باعث رحمت تصور کی جاتی ہے۔'' وہ ذرا سنجیدہ ہو کر بولے اور پانی پیا۔

''اور جو عورت یہ سارے کام نہ کر سکے تو اسے زندگی سے نکال دینا چاہیے۔ اس کی تو پھر زندگی میں کوئی اہمیّت نہیں ہوتی نا۔ وہ تو ایک بے کار وجود ہوتی ہے جسے پھینک دینا چاہیے، دھتکار دینا چاہیے۔''

''بیٹا، آپ کیوں اتنا منفی ہو کر سوچتی ہیں؟''

''انکل! شاید میری مما بھی ایسی تھیں اس لیے انھیں زندگی میں کسی سے بھی محبّت نہ مل سکی اور میں بھی ایسی ہی ہوں۔ میرے دل میں کسی کے لیے بھی محبت نہیں۔ کسی ایک انسان کے لیے بھی نہیں۔ شاید میں پوری زندگی کسی سے بھی محبت نہیں کر سکوں گی۔'' وہ بے یقینی کے انداز میں بولی۔

''انسان کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ اگلے لمحے وہ کیا کرے گا اسے خود بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ انسان اس دنیا کی سب سے زیادہ...... ناقابل یقین مخلوق ہے۔ جس کے سارے دعوے کھوکھلے اور بے معنی ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت تغیر و تبدل کا شکار رہتا ہے اس لیے ایسا سوچنا بھی خام خیالی ہے۔ ہم کس سے، کب کہاں اور کیسے ایک دم محبت کرنے لگتے ہیں، ہمیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی محبتوں اور نفرتوں کا سرچشمہ تو دل ہوتا ہے اور دل کب بدل جائے، کسے معلوم؟'' وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔ اتنے میں فون کی بیل بجنے لگی۔ بیٹ مین نے فون اٹھایا۔

''صیب! ضیغم بابا کا فون ہے۔'' وہ اونچی آواز میں بولا۔

''دیکھا، میں نے کیا کہا تھا۔ مجھے یقین تھا اس کا فون ضرور آئے گا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے اور وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ضیغم سے بھی اپنا کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چہرے سے بے حد ملائمت اور اطمینان جھلک رہا تھا اور وہ انھیں دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ رشتے کتنے انمول ہوتے ہیں جب محبتوں کی شیرینی سے

گندھے ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ قیمتی اور نایاب......

نور کے فون نے اسے چونکا دیا۔ اس نے صرف چند منٹوں کی کال کی تھی، وہ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنے باپ کا پیسا ایک گارمنٹس فیکٹری میں انویسٹ کر رہی تھی۔ انور چچا اور وہ کراچی میں ایگریمنٹ پر سائن کرنے کے لیے رک گئے تھے۔ امریکا میں ان کے پارٹنر نے ڈیڈی کی پراپرٹی سیل کر کے انھیں سارا پیسا بھجوایا تھا اور اب چچا اسے اپنے ایک دیرینہ دوست کے بیٹے شرجیل کے ساتھ بزنس کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ وہ تو اس بات سے بالکل بے خبر تھی۔ چچا اس کے گارڈین تھے۔ اس کے گھر، بینک بیلنس اور امریکا والی پراپرٹی اور اس سے متعلقہ سارے معاملات وہی دیکھتے تھے۔ اس نے کبھی بھی اس سلسلے میں ان سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس اچانک بزنس ڈیل پر وہ بوکھلا گئی، انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ تعلیم کے بعد وہ بزنس کرے گی مگر وہ کسی طور مان ہی نہیں رہے تھے اور اچھی طرح کنوینس کرنے لگے کہ تعلیم مکمل ہونے تک اس کا بزنس بالکل سیٹ ہو چکا ہوگا۔ وہ تعلیم بھی جاری رکھے اور بزنس بھی دیکھے۔ وہ مان گئی۔ شرجیل سے ملاقات کے بعد تو وہ واقعی مطمئن ہوگئی۔ اس کی ایک گھی کی مل تھی اور ایک گارمنٹس فیکٹری۔ اس نے بی اے کر رکھا تھا لیکن بزنس میں وہ بہت گھاگ تھا۔ اس کے والد راحیل ایک اعلیٰ ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے انھوں نے اپنی زمینیں بیچ کر سارا پیسا شرجیل کے بزنس میں لگایا تھا اور اب اس کی ترقی دیکھ کر وہ بزنس مزید پھیلانا چاہتے تھے۔ شرجیل کے ساتھ ساتھ راحیل کو بھی بزنس کا کریز ہو گیا تھا بلکہ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران ہی انور چچا کے ساتھ بزنس شروع کر دیا تھا اور دونوں نے تین سال پہلے چیچو کی ملیا...... میں کوئی فیکٹری لگائی۔ بزنس میں نقصان ہوا تو وہ سب کچھ بیچ کر کراچی چلے گئے جہاں بزنس دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ چچا نے نہ جانے کب ان سے ساری بات چیت مکمل کر لی تھی اور اب ایگریمنٹ سائن ہونے والا تھا جب نور نے فون کر کے اسے تفصیلات بتائیں۔

''نور! کیا تم بزنس کرو گی؟'' ولیم نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھئی، کیوں نہیں۔ مجھ میں اتنے گٹس ہیں کہ میں ایک بہت اچھا بزنس چلا سکتی ہوں۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''لیکن بزنس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم یونہی......''

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں۔''

''بتاؤ نا۔''

''کچھ بھی تو نہیں۔''

''اچھا میں تمھیں بعد میں فون کروں گی۔ ہم لوگ کل آ رہے ہیں پھر بہت سی باتیں ہوں گی۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ وہ کہیں کھو سا گیا تھا۔ وہ سارا وقت افسردہ رہا۔ اندر ہی اندر اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا جیسے رفتہ رفتہ نور اس سے دور جا رہی تھی اور وہ اپنا وجود بھی کھوتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے بغیر ادھورا تھا...... بہت ادھورا۔ وہ تو سانسیں بھی اس کے ساتھ لینے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ چند روز کے لیے دور گئی ہے اور جلد لوٹ آئے گی مگر اب کراچی بزنس کرنے سے وہ اس سے بہت دور چلی جائے گی۔ اسے شدید رنج ہونے لگا۔

''کیا بات ہے بیٹا! آپ کچھ اداس لگ رہے ہو؟'' تبسم آنٹی نے اسے سوچوں میں گم اور پریشان سا دیکھ کر پوچھا۔

''یونہی، کوئی خاص بات نہیں۔''

''کچھ تو ہے، کچھ الجھے الجھے لگ رہے ہو۔''

''نہیں۔'' اسی لمحے شہلا اور اسد گھر میں داخل ہوئے۔ تبسم آنٹی خوشی سے ان کی طرف لپکیں اور وہ مایوسی سے اندر لوٹ آیا۔ شہلا و راسد کافی دیر شہلا کے پاس بیٹھے رہے اور پھر واپس چلے گئے۔ جانے سے پہلے حیدر کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں کو وہاں دیکھ کر چونکے۔

''السلام علیکم پاپا!'' شہلا آگے بڑھ کر سر جھکاتے ہوئے بولی۔

''وعلیکم السلام! کیسی ہو اور اسد بیٹا تم؟''

''ٹھیک ہوں انکل!'' وہ بھی تپاک سے ملا۔

''آج اِدھر کیسے آنا ہوا؟'' حیدر نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہم لوگ آنٹی کو دیکھنے آئے تھے۔'' شہلا نے بستر پر لیٹی شہلا کی طرف دیکھ کر کہا تو حیدر مزید حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ دونوں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے تو حیدر نے حیرت سے تبسم آپا اور شہلا کی طرف دیکھا۔

''اٹس اے پلیزنٹ چینج! شہلا بہت بدل گئی ہے۔'' حیدر مسکرا کر بولے۔

''وقت انسان کو بہت بدل دیتا ہے اور جب انسان کو خود کسی بات کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ خود بخود بدل جاتا ہے۔'' تبسم آپا نے کہا۔

''آپا! شفق کے لیے بھی دعا کریں۔ خدا اسے بھی بدل دے۔ اس کے دل میں میرے لیے بہت نفرت ہے۔ حیدر! اس کو فون کرو کہ مجھے صرف ایک دفعہ آ کر مل جائے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ معلوم نہیں وہ آتی بھی ہے کہ نہیں۔'' شہلا مایوس کن لہجے میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔

''وہ کیوں نہیں آئے گی، میں خود اس سے بات کروں گی بلکہ مغیث کو کہوں گی کہ اسے لے کر آئیں۔'' تبسم آپا نے انھیں تسلی دی۔

''حیدر! تم اسے فون کرو۔ تمہاری وہ ہر بات مانتی ہے۔ حیدر سنو! میں مر گئی نا تو ولیم اور شفق کو تم اپنے پاس رکھنا۔ ان کو کبھی جدا نہ ہونے دینا۔ انھیں میری طرح خارِ خزاں نہ بننے دینا ورنہ دونوں میری طرح بکھر جائیں گے۔ نہ ان کا حال رہے گا نہ مستقبل۔ پلیز حیدر وعدہ کرو۔'' وہ ایک دم بے چینی سے بولیں تو حیدر حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ انھیں قطعی یقین نہیں تھا کہ وہ یوں اچانک باتیں کرتے ہوئے کس طرف جا نکلیں گی۔

''شہلا! تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''نہیں حیدر، وعدہ کرو...... پلیز یہ وعدہ نبھا دینا۔ اس میں تو کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوگی نا۔''

''وہ پہلے بھی تو میرے پاس ہیں نا۔ کیا تمھیں مجھ پر شک ہے۔ کیا میں ان کی دیکھ بھال نہیں کر رہا اور تم جانتی تو ہو میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں؟'' حیدر نے قدرے سنجیدگی سے کہا اور استفہامیہ نگاہوں سے شہلا کی طرف دیکھا۔

''تبسم آپا گواہ ہیں تایا ابا مرتے دم تک تمھیں یاد کرتے رہے اور مجھ سے یہی وعدہ لیتے رہے کہ میں زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارا خیال رکھوں۔ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ تم لوٹ آؤ گی۔ شاید وہ وجدان کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے جب تم تھک کر لوٹو گی تو تمھارے اپنے ہی تمھیں سنبھالیں گے۔''

''ہاں شہلا! آخری لمحوں تک سید صاحب کی زبان پر تمہارا نام تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ تم سے کتنی محبت کرتے تھے۔''

''واقعی...... اور آپ لوگوں نے مجھے بتایا ہی نہیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''شہلا! ہم تو رشتوں کی محبت کو ایک وقتی جذبہ سمجھ کر انھیں بھلانے اور ان کے آثار بھی ختم کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ وہ تو اٹل حقیقتوں کے مانند ہمارے دلوں میں اور روحوں میں اچھی طرح حلول ہوتے ہیں۔ وقت کی لو انھیں مدھم تو کر سکتی ہے، ختم نہیں کر سکتی۔'' حیدر نے کہا تو وہ ان کی طرف خاموش نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اتنے میں لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجی تو آپا اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

''حیدر! کون کہتا ہے کہ میں نے تمھیں اور سید صاحب کو بھی بھلایا۔ تم تو اس وقت بھی میرے ساتھ تھے جب میں منصور اور پیٹر کی بیوی تھی۔ شاید میں بھی ان رشتوں سے انصاف نہیں کر پائی۔ میں جس طرف قدم بڑھاتی، تم نہ جانے کہاں سے درمیان میں آ جاتے۔ تمھارے ساتھ تو میں نے ہر لمحہ، ہر آن سفر کیا ہے۔ تم تو میری روح کا حصہ تھے، ہم تم جدا ہو گئے تو میری روح بھی مضطرب اور منتشر ہو گئی۔ نہ محبت ختم ہوئی اور نہ آثار مٹ سکے۔ میں تو کسی بھی بات میں کامیاب نہیں ہوئی۔ ساری زندگی سرگرداں رہی۔ ناکامیوں کا سفر طے کرتی رہی، بھٹکتی رہی اور ٹوٹتی رہی۔'' وہ چھت پر لٹکتے فانوس کو دیکھ کر بولیں۔

''اور یہی کچھ میرے ساتھ ہوتا رہا۔ شہلا! ہم کیسا سفر طے کرتے رہے ہیں۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔''

''اور میں خارِ خزاں بنتی گئی۔'' وہ افسردگی سے بولیں۔

''میں ایسا بے ثمر، ہوا کا جھونکا جو کسی کو بار آور نہ کر سکا۔'' وہ بھی آہ بھر کر بولے۔

''زندگی یونہی رائیگاں چلی گئی۔'' شہلا تاسف سے بولیں۔

''شاید یہی لاحاصل کی جستجو اور اس کا ثمر ہے۔'' حیدر بولے۔

''مغیث اسے لے کر ویک اینڈ پر آئیں گے۔'' تبسم آپا مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ شفق کے بارے میں بتایا اور دونوں کو خاموش اور آنکھوں میں نمی کی دبیز تہوں کو دیکھ کر چونک سی گئیں۔

''یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔ پھر ماضی میں کھو گئے تھے؟''

''ہاں شاید!'' حیدر بولے۔

''وہ محبت ہی کیا جس میں جدائی کا درد نہ ہو اور اس کی معراج ہی کیا جس میں لاحاصل کی تمنا اور تڑپ نہ ہو۔'' آپا نے کہا تو شہلا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''چاہے لاحاصل کی تمنا انسان کو ریزہ ریزہ کر دے۔'' شہلا بولیں۔

''ہاں اور معراج تو ہے ہی فنا اور فنا کے سفر میں انسان کے پاس باقی رہتا ہی کیا ہے اور محبت جب عشق کا روپ دھارتی ہے تو اصل میں فنا کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔'' آپا نے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا تو دونوں خاموش ہو گئے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ ہر طرف ایک ایسی خاموشی تھی جو اپنی زبان میں ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ مفہوم سمجھا رہی تھی اور تینوں محو ہو کر سن رہے تھے، سمجھ رہے تھے مگر کچھ بول نہیں رہے تھے۔

......۞......

نور کو ایئر پورٹ چھوڑنے سے پہلے شرجیل نے اسے پرپوز کیا تو وہ چونک گئی۔ اس کے تو وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ وہ تو خالصتاً بزنس کی نیت سے وہاں آئی تھی۔ اس نے حیرت سے شرجیل کی طرف دیکھا۔

''اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ ہمارے بزرگ بھی تو یہ چاہتے ہیں۔'' شرجیل نے اس کو اس قدر متحیر دیکھ کر کہا۔

''کون؟''

''میرے ڈیڈی اور آپ کے انکل۔''

''او آئی سی! تو اس لیے چچا نے یہ سارا جال بنا تھا۔'' وہ بری طرح ان کے نرغے میں آئی تھی۔ ایگریمنٹ سائن ہو چکا تھا۔ وہ اور شرجیل ففٹی پرسنٹ شیئر کے بزنس پارٹنر تھے اور جانے سے پہلے انھوں نے اس سے کسی قسم کا ذکر کیے بغیر ہی اس کے رشتے کی بات شرجیل کے ڈیڈی سے کر دی تھی۔

''آپ اس قدر حیران کیوں ہو رہی ہیں؟'' شرجیل نے پھر پوچھا۔

''مجھے حیرانی آپ پر نہیں بلکہ اپنے چچا پر ہو رہی ہے۔ انھوں نے مجھے کس طرح ٹریپ کرنا چاہا ہے۔''

''انھوں نے کوئی جال تو نہیں بچھایا؟''

''بچھایا ہے نظر نہ آنے والا۔ بہر حال اگر میں اس رشتے سے انکار کر دوں تو کیا آپ بزنس میں میری مدد نہیں کریں گے۔''

''کیوں نہیں، بزنس تو ہم کسی سے بھی کر سکتے ہیں۔ دیکھئے آئے نور! میرے لیے بے شمار پرپوزلز ہیں۔ میں کسی بھی لڑکی کی ہر ڈیمانڈ پوری کر سکتا ہوں لیکن مجھے آپ بے حد پسند آئی ہیں۔''

''تھینک یو! لیکن جہاں آپ کے بے شمار پروپوزلز ہیں، میرا ایک بھی نہیں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''تو پھر انکار کی وجہ؟''

''میری کسی سے کمٹمنٹ ہے...... اگر آپ کی کسی سے کمٹمنٹ ہو تو کیا آپ اسے میرے لیے چھوڑنا پسند کریں گے۔'' آئے نور نے اس سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔''

''بس میرا بھی یہی مسئلہ ہے۔ میں کس طرح اسے چھوڑ دوں جس سے میں نے آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا ہے۔ آئی ہوپ! یو ڈونٹ مائنڈ اٹ!''

''نیور ایٹ آل! اچھی بات ہے آپ نے حقیقت بتا دی لیکن بزنس کے لیے مجھ سے ان ٹچ رہیے۔ ہم اچھے پارٹنرز کی طرح ایک دوسرے کو اسسٹ کرتے رہیں گے بلکہ جب آپ لاہور میں اپنی گارمنٹس فیکٹری کا افتتاح کریں تو مجھے ضرور انوائیٹ کیجئے گا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''تھینک یو ویری مچ! پلیز ان تمام باتوں کا ذکر انکل سے نہ کریں۔ خود ہی اپنے ڈیڈی کو منع کر دیں۔''

''رائٹ، اب چلیں!''

انور چچا اور اس کے ڈیڈی لان میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان دونوں کو باہر نکلتا دیکھ کر ان کی طرف آئے۔

''اچھا بھئی راحیل! اب میں چلتا ہوں۔ مجھے اس بات کا جلدی جواب دینا۔'' چچا نے معنی خیز انداز میں شرجیل کے ڈیڈی سے کہا۔

''ہاں ہاں، تم بے فکر رہو۔ ہماری طرف سے ہاں ہی سمجھو۔'' وہ مطمئن لہجے میں بولے۔ نور اور شرجیل نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ لاہور آنے تک چچا اور اس میں کوئی بات نہ ہوئی البتہ چچا بہت خوش تھے اور اسے ان کی اس حرکت پر بے حد افسوس ہوا تھا۔

''کیا بات ہے نور بیٹا! تم خوش نہیں؟''

''کس بات پر؟''

''بھئی تم اپنا بزنس شروع کرنے جا رہی ہو اور سنو! شرجیل اچھا لڑکا ہے۔ میں نے

راحیل سے تمھارے سلسلے میں بات کی ہے۔ میرا خیال ہے شرجیل بھی تمھیں پسند کرنے لگا ہے۔"

"خدا کے لیے انکل! آپ کن باتوں میں پڑ گئے ہیں۔ ہم یہاں بزنس کے سلسلے میں آئے تھے کہ رشتے داریاں کرنے۔ ویسے بھی فی الحال میرا شادی کا کوئی موڈ نہیں۔ ابھی تو میری اسٹڈیز بھی کمپلیٹ نہیں ہوئی۔" وہ قدرے خفگی سے بولی۔

"لیکن مجھے تو اس انکار کے پیچھے کوئی اور بات لگ رہی ہے۔" وہ اپنے مخصوص جاسوسانہ اسٹائل میں بولے۔

"ایک تو آپ ہر وقت ہر بات کی جاسوسی نہ کرتے رہا کریں۔"

"لیکن جب بات ہی ایسی ہو تو جاسوسی کرنا پڑتی ہے اور سنو! تمھارے دماغ میں ولیم کا جو خیال ہے نا وہ نکال دو۔ ہم تمہاری شادی ہرگز کسی کرسچن سے نہیں ہونے دیں گے اور ویسے بھی نہ اس کے آگے کوئی ہے اور نہ پیچھے۔ نہ جانے کس کی اولاد ہے اور......"

"پلیز انکل! حد سے مت گزر جایا کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے لیے کیا بہتر ہے۔ میں نان سینس نہیں ہوں اور اپنی شادی کا فیصلہ بھی میں خود ہی کروں گی۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"لیکن ایسا بالکل نہیں ہوگا جو تم چاہتی ہو۔" وہ بھی غصے سے بولے جواباً وہ خاموش ہوگئی اور ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ گھر آ کر بھی وہ بہت خاموش تھی۔ چچی اسے مبارک باد دے رہی تھیں اور اسے قطعی کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ چچا بھی کوئی خاص ری ایکٹ نہیں کر رہے تھے۔

اگلے دن وہ ولیم سے ملنے گئی تو گھر کا بدلا بدلا پُرسکون ماحول دیکھ کر اسے قدرے حیرت ہوئی۔ ولیم بہت نارمل انداز میں مسکراتا ہوا ملا۔ اس کی مما بھی قدرے پُرسکون سی سو رہی تھیں۔ ان کے علاوہ گھر پر کوئی نہ تھا۔

"ولیم! میں آج کچھ خاص بات یہاں محسوس کر رہی ہوں۔"

"کیا؟" ولیم مسکرا کر بولا۔

"گھر کی فضا قدرے بہتر اور خوشگوار لگ رہی ہے اور تم بھی منہ پھلائے پھلائے نہیں پھر رہے۔ لگتا ہے یہاں کچھ چینج آیا ہے۔"

"میں تمھارے آنے سے بے حد خوش ہو رہا ہوں اس لیے تمھیں ایسا لگ رہا ہے۔"

"لیکن اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے۔ مجھے واپس تو آنا ہی تھا۔ بات کچھ اور

ہی ہے۔''

''کچھ بھی نہیں، تم سناؤ بزنس کا کیا بنا؟''

''ہاں، سب کچھ سیٹل ہو گیا ہے۔ بہت جلد ہم یہاں کام شروع کر دیں گے۔''

''ہم کون؟''

''میں اور شرجیل۔'' وہ قدرے بے خیالی میں بولی۔

''کون شرجیل؟''

''میرا بزنس پارٹنر۔''

''او آئی سی!'' وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

''افوہ! ایک تو تم لوگ بھی بڑے جیلس ہوتے ہو۔ جیسے ہی کسی دوسرے لڑکے کا ذکر کرو، اسی کونٹیکٹ میں دیکھنا شروع کر دیتے ہو۔ وہ صرف میرا بزنس پارٹنر ہے اور کچھ نہیں۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔

''آئی ایم سوری! تم نے ایسا محسوس کیا۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔''

''تمہارا جو بھی مطلب تھا وہ مجھے تمھارے لہجے سے ہی پتا چل گیا ہے۔ خیر، تم سناؤ کیسی طبیعت رہی اور انکل حیدر کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔''

''اور آنٹی کیسی ہیں۔ ابھی سو رہی ہیں اس لیے بات نہیں ہو سکی لیکن چہرے سے وہ بھی پرسکون لگ رہی ہیں۔''

''آخر تم جاننا کیا چاہتی ہو۔ ہم مطمئن اچھے نہیں لگ رہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''بہت اچھے لگ رہے ہو۔ اس راز کو جاننا چاہتی ہوں۔'' اسی لمحے تبسم آنٹی اور شہلا اسد لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ وہ مارکیٹ سے کچھ شاپنگ کر کے لوٹی تھیں اور دونوں کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔

''یہ باہر شور کیسا ہے؟'' نور نے جلدی سے ولیم کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھنا چاہا۔

''رہنے دو وہ ابھی اِدھر ہی آ جاتی ہیں۔''

''کم آن ولیم! کون ہیں یہ لوگ؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہیلو ولیم! کیسے ہو؟'' شہلا اسد مسکرا کر اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

''بیٹا! کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی۔'' تبسم آنٹی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، نور آ گئی تھی۔'' اس نے نور کی طرف اشارہ کیا۔

''نور! تم جو بات پوچھ رہی تھیں اس کی وجہ تبسم آنٹی ہیں۔ یہ شہلا باجی ہیں اور یہ نور ہے۔ میری کلاس فیلو اور فرینڈ بھی۔'' ولیم نے تعارف کروایا تو سب نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر مسکرانے لگے۔

''ہیلو بیٹا! کیسی ہیں آپ؟'' تبسم آنٹی نے اسے محبت سے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

نور کو ان کا یہ محبت بھرا انداز بہت اچھا لگا اور وہ مسکرا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''اچھا بھئی، تم لوگ باتیں کرو۔ ہم لوگ تمہاری مما کے پاس جا رہے ہیں اور افضل کو میں کہتی ہوں۔ تم لوگوں کو چائے اِدھر ہی پہنچا دے۔''

''نہیں آنٹی! ہم سب لوگ آج آنٹی کے پاس ہی چائے پئیں گے۔'' نور نے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

''وائے ناٹ شیور! میں پھر آپ لوگوں کو بلاتی ہوں ابھی آپ باتیں کرو۔'' دونوں مسکراتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

''ولیم! یہ کون ہیں۔ شی از سچ آ نائس لیڈی۔''

''یہ مما کی بہن اور میری آنٹی ہیں اور شہلا باجی حیدر انکل کی بیٹی ہیں۔''

''زبردست! یہ ایک متاثر کن شخصیت کی مالک ہیں۔''

''وہ بھی بہت اچھی ہیں مگر تبسم آنٹی سب سے اچھی ہیں۔ پشاور سے آئی ہیں۔ جب ان کو پتا چلا کہ مما بیمار ہیں، اسی دن آ گئیں۔''

''ان کو پہلے کسی نے نہیں بتایا تھا؟'' نور نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، یہ تو شفق نے جا کر بتایا تھا۔''

''کون شفق؟''

''میری اسٹیپ سسٹر۔''

''ولیم! یہ سب کیا ہے۔ میرے جانے کی دیر تھی...... اتنے زیادہ انکشافات ہو رہے ہیں۔ یہ تمہاری اسٹیپ سسٹر کہاں سے آ گئی؟''

''بس آ گئی ہے لیکن وہ ہر ایک سے ناراض ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔

''کیوں، کیا وہ بہت خشک مزاج ہیں؟''

''نہیں، وہ بہت پریشان ہے۔ چھوڑو اس بات کو۔ تم اچانک کیوں چلی گئی تھیں، تمھارے یوں اچانک چلے جانے کی وجہ سے میں بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔''

''ہاں میں جانتی تھی لیکن سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آیا۔ انکل نے بہت برا گیم کھیلا ہے۔''

''کون، وہی جاسوس انکل؟''

''ہاں۔''

''کیا کیا؟'' اسی لمحے افضل انھیں بلانے آ گیا اور وہ اس کی وھیل چیئر دھکیلتے ہوئے مما کے کمرے میں لے گئی۔ شہلا، نور کو یوں اچانک دیکھ کر کھل اٹھیں۔

''نور بیٹا! تم کب آئیں؟'' وہ اسے لپٹے لپٹے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

''کل رات کو اور آپ کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہوں۔ آپا! اس بچی نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ میں ہاسٹل سے اس کے گھر میں شفٹ ہوئی اور پھر یہی مجھے ولیم کے ساتھ اسپتال بھی لے کر جاتی تھی۔ میرا بہت خیال رکھتی رہی ہے۔ کپڑے چینج کرواتی، میڈیسنز کھلاتی۔'' وہ آہستہ آہستہ انھیں بتا رہی تھیں اور تبسم آپا معترف انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''تھینک یو بیٹا! آپ نے میری بہن کا اتنا خیال رکھا۔'' تبسم آنٹی نے محبت سے کہا تو وہ مسکرا دی اور اٹھ کر سب کے لیے چائے بنانے لگی۔

''مما! نور لاہور میں گارمنٹس فیکٹری شروع کرنے لگی ہے۔'' ولیم نے ماں کو بتایا۔

''واؤ، زبردست! ابھی تو آپ اسٹوڈنٹ لگتی ہیں۔ بزنس بھی شروع کر لیا۔'' اب کی بار شہلا اسد بولی۔

''ہاں، بس حالات ہی ایسے ہو گئے سب کچھ خود بخود ہو گیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ سب کو چائے دے کر فارغ ہوئی تھی کہ حیدر کی گاڑی بھی پورچ میں داخل ہوئی۔ اس کا ہارن سن کر وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

''حیدر انکل آ گئے۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی تو شہلا اسد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ حیدر کمرے میں آ چکے تھے۔ کمرے میں اتنی گہما گہمی دیکھ کر وہ مسکرا دیے۔

''ارے بھئی نور بیٹا! آپ کب آئیں۔ آپ نے تو ہمیں اداس کر دیا تھا۔'' وہ سامنے بیٹھی نور کو دیکھ کر بے ساختہ بولے۔

''انکل! میں بھی آپ کو بہت مس کرتی رہی۔'' وہ حیدر کے آگے سر جھکاتے ہوئے بولی انھوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ حیدر، شہلا کو نہیں دیکھ سکے۔ ایک دم شہلا کو یہ سب بہت برا لگا اگلے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''شہلا! تم کب آئیں۔ آج تو سب لوگ کسی خاص موڈ میں لگ رہے ہیں۔'' وہ شہلا کے قریب جا کر بولے اور اسے بھی پیار دیا۔

''میں نے تبسم پھپھو کے ساتھ مارکیٹ جانا تھا، ابھی آئی ہوں۔'' وہ اپنے لہجے میں چھپی خفگی کو چھپا نہ سکی۔

''نور! میری بیٹی سے ملی ہو۔''

''جی انکل! شی اِز لکنگ ویری نائس اینڈ گریس فل!'' وہ چہکتے ہوئے بولی تو شہلا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''شہلا! نور بہت اسٹرونگ لڑکی ہے۔ اس کے پیرنٹس نہیں ہیں لیکن بہت ہمت سے ہر کام کرتی ہے اور بہت ذہین بھی ہے۔'' ولیم سے زیادہ حیدر نے ہنستے ہوئے کہا تو ولیم کے منہ بنانے پر سب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

''شہلا، اسد نہیں آیا؟'' حیدر نے اس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

''وہ رات کو نو بجے لینے آئیں گے۔''

''حیدر! آج ویک اینڈ ہے۔ رات کو بارہ بجے مغیث کی فلائٹ بھی ہے۔ وہ اور شفق آ رہے ہیں۔ ان کو ایئرپورٹ لینے جانا ہے۔'' تبسم آنٹی نے حیدر انکل کو بتایا تو ولیم کا دل لرز سا گیا۔ اسے شفق کے نام سے ہی ڈر لگنے لگتا تھا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے تبسم آنٹی اور نور کی طرف اور پھر مما کی طرف دیکھا۔ صرف مما اس کی نگاہوں کا مطلب جان سکیں کیونکہ وہ بھی جانتی تھیں کہ شفق کے آنے کے بعد دونوں کو کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

''ٹھیک ہے لیکن کیا آپ نہیں چلیں گی؟'' حیدر نے تبسم آپا سے پوچھا۔

''شہلا اکیلی ہوگی۔'' آپا نے ان کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''نہیں، ولیم میرے پاس ہوگا۔ آپ چلی جایئے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' آپا نے کہا۔ ولیم وھیل چیئر کو آہستہ سے چلاتے ہوئے باہر جانے لگا تو نور جلدی سے آگے بڑھی اور اسے لے کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔

''ولیم! کیا بات ہے، تم ایک دم کیوں اپ سیٹ ہو گئے؟''

''نور! مجھے شفق کی غصہ بھری نگاہیں اور لہجہ یاد آتا ہے تو بہت ڈر لگنے لگتا ہے۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیوں اتنی خائف ہے؟'' ولیم کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

''تم اس قدر کیوں خوفزدہ ہو رہے ہو، کچھ نہیں ہوگا۔'' نور نے اسے تسلی دی۔

……⚙……

''انکل! میں مما کے پاس نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے ڈیفنس والے گھر…… چھوڑ دیں۔'' شفق گاڑی میں ہی حیدر سے ضد کر رہی تھی۔ تبسم آپا اور کرنل مغیث دونوں ہی اس کو مسلسل سمجھا رہے تھے مگر وہ کسی کی نہیں سن رہی تھی۔

''ٹھیک ہے حیدر بھائی! اس کو وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔'' مغیث انکل ایک دم بولے۔

''بیٹا! آپ کیوں ایسا کر رہی ہیں۔ سب بڑے سمجھا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ اپنی بات پر اڑی ہوئی ہیں۔'' حیدر نے اسے مزید سمجھانا چاہا۔

''انکل! میں جب بھی ان کے سامنے جاتی ہوں، بدتمیزی کرتی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت ان کی حالت بہت خراب ہے اور مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن میں اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رکھ سکتی۔'' وہ صاف گوئی سے بولی تو سب خاموش ہو گئے۔

''لیکن وہ اس وقت تمہاری منتظر ہے شفق بیٹا! ہم جا کر اسے کیا کہیں گے؟'' تبسم نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آنٹی! میں کچھ نہیں جانتی۔ جو حقیقت ہے میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ بس میں وہاں نہیں جاؤں گی۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ حیدر نے اسے گھر ڈراپ کیا اور باقی سب لوگ گلبرگ چلے گئے۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ شہلا ابھی تک منتظر نگاہوں سے اس کا شدت سے انتظار کر رہی تھیں لیکن ان سب کے ساتھ اسے نہ پا کر وہ پریشان سی ہو گئیں۔

''شفق کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آئی؟'' شہلا نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ ڈیفنس والے گھر میں ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ہم سامان رکھنے وہاں گئے تو وہ ادھر ہی رک گئی، کل آ جائے گی۔'' حیدر نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں، وہ نہیں آئے گی۔ وہ بڑی ضدی ہے۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔'' آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ کر تکیہ بھگونے لگے۔

''ہمت کرو شہلا! کیا ہو گیا ہے؟'' تبسم آپا نے سمجھانا چاہا۔

''مغیث بھائی سے تو ملو۔'' حیدر نے توجہ ہٹانے کے لیے کہا تو انھوں نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔

''کیسی ہیں آپ؟'' کرنل مغیث نے خوش کن لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں، بس آخری سانس کا انتظار کر رہی ہوں۔ نہ جانے وہ بھی کیوں نہیں آ رہی؟'' وہ مایوس کن انداز میں بولیں۔

''بری بات! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔'' کرنل مغیث نے کہا۔

''خدا کی رحمت میری دفعہ نہ جانے کہاں چلی جاتی ہے۔ مغیث بھائی! میں تو ہمیشہ اس کی رحمت کی منتظر ہی رہی اور وہ کبھی بھی میری چھت پر نہ برسی ساری زندگی میں ایک دفعہ بھی نہیں۔ مجھے تو بس سزائیں ہی ملی ہیں۔'' وہ بے حد شکستہ لہجے میں بولیں تو سب لوگ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''شہلا! پلیز دل چھوٹا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ذرا مغیث کو کھانا دے دوں پھر ہم سب ادھر ہی آتے ہیں۔ تمھیں کچھ چاہیے تو نہیں۔'' تبسم آپا نے صورتِ حال کے پیشِ نظر کہا۔

''نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولیں سب لوگ باہر نکل گئے۔

''مغیث! کیا آپ نے اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟'' تبسم نے کرنل مغیث کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔

''تبسم! اس کا ذہن بے حد متحرک ہے۔ وہ ایسے سوال کرتی ہے کہ بعض اوقات میں خود بھی دنگ رہ گیا اور جو شخص ذہنی طور پر اتنا مستعد ہو اس کو سمجھانا بے حد مشکل کام ہے بہ نسبت اس شخص کے جو اتنا باشعور نہ ہو اور تم جانتی ہو انسان جتنا زیادہ باشعور ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ سوچتا ہے اور جتنا زیادہ وہ سوچتا ہے اتنا ہی زیادہ ڈیپریسڈ رہتا ہے۔ اس کو کنوینس کرنا اور اسے اپنے موقف سے ہٹانا شاید دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ وہ واقعی ذہنی طور پر بہت پریشان ہے۔'' کرنل مغیث نے سالن پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''جن بچوں کی زندگی ایسے ماحول میں گزری ہو ان کی سوچ بھی تو ویسی ہی ہو گی۔ یقین کریں آپا میں نے اسے کبھی مسکراتے کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہر وقت پریشان رہتی ہے۔'' اب کی بار حیدر نے کہا تو کرنل مغیث نے بھی تائید کی۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن اب کیا کرنا چاہیے؟'' تبسم آپا فکر مندی سے بولیں۔

''میں خود پریشان ہو گیا ہوں۔ شہلا شدید پریشان ہے اور وہ کسی طور مانتی ہی نہیں۔ میں تو خود سخت اُلجھن میں ہوں۔'' حیدر بھی فکر مندی سے بولے۔'' آپا! کیا ولیم نے کھانا کھا لیا ہے؟'' حیدر نے ایک دم پوچھا۔

''ولیم کون؟'' کرنل مغیث نے گہری استفہامیہ نگاہوں سے پوچھا۔

''وہ شہلا کا بیٹا ہے۔ وہ بھی شدید ٹینشن میں تھا۔ شکر ہے میرے سمجھانے سے کچھ بہتر ہوا ہے۔ وہ لوگوں کے رویوں سے خائف تھا، اب بہتر ہے۔'' آپا نے بتایا۔

''شفق، آفاق کو نہیں بھولتی۔'' حیدر بولے۔

''اور باپ نے بھی تو ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس سارے جھگڑے میں تو اولاد ہی پستی ہے نا۔ زیادہ تو انھوں نے ہی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ شفق میں ابنارملٹی بہت بڑھ گئی ہے۔'' تبسم آپا تاسف سے بولیں۔

''اب میرے لیے کیا حکم ہے۔ میں کل شام کو واپس جا رہا ہوں۔'' کرنل مغیث نے کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ چلے جائیں۔ شہلا کی حالت خاصی خراب ہے۔ میں کچھ روز بعد آ جاؤں گی۔'' تبسم آپا نے کہا۔

''رائٹ! اب میں کچھ آرام کر لوں۔ مجھے کمرا دکھا دو۔'' کرنل مغیث ایک سائیڈ پر لگے واش بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے بولے۔

''آپا انھیں ولیم کے ساتھ والے کمرے میں لے گئیں اور حیدر اوپر کمرے میں چلے گئے۔ شہلا بے چین اور مضطرب سی بستر پر تڑپتی، سسکتی اور آہیں بھرتی رہیں مگر سب کچھ بے معنی لگ رہا تھا۔

نور سخت پریشان تھی۔ انور چچا نے اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ گو کہ وہ ان کے ایسے احکامات کو کم ہی خاطر میں لاتی تھی مگر اب کی بار تو وہ نہ جانے کیوں خاصے سخت ہو رہے تھے۔ ہر وقت اس کے کمرے کے باہر بیٹھ کر اخبار پڑھتے رہتے۔ گھر سے بھی کم نکلتے اور وہ ان سے کسی بھی قسم کی بحث میں پڑ کر گھر میں ٹینشن پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''راحیل مجھ سے رشتے کا پوچھ رہا ہے۔ بولو میں کیا جواب دوں۔ میں نے بس کل

تک کا وقت مانگا ہے۔'' وہ قدرے غصّے سے اس کے کمرے میں آ کر بولے تو وہ چونک گئی۔ اس سلسلے میں اس میں اور شرجیل میں کمٹمنٹ ہو چکی تھی اب وہ کیوں ایسا کہہ رہے تھے۔ وہ سخت اُلجھن میں تھی۔ اس نے شرجیل سے رابطہ کرنا چاہا تو اس سے بھی بات نہ ہو سکی۔ اس نے ولیم کا نمبر ملایا۔ وہ اس وقت سو رہا تھا۔ اس نے نیند میں ہی فون اٹھایا۔

''ہیلو نور! کیا بات ہے۔ پریشان لگ رہی ہو؟'' ولیم نے اسے قدرے گھبرائے ہوئے محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''ولیم! حیدر انکل کہاں ہیں، میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''مگر بتاؤ تو سہی، آخر کس لیے اور نور تم جیسی لڑکی پریشان ہو، میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' ولیم نے حیرانی سے کہا۔

''کیوں، میں انسان نہیں اور جب صورتِ حال ایسی ہو کہ قدموں تلے زمین بھی گردش میں آ جائے تو انسان بھاگ کر کہاں جائے۔ اس وقت میں بھی ایسی ہی سچویشن فیس کر رہی ہوں۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟''

''انور چچا خوامخواہ میں میرا رشتہ شرجیل کے ساتھ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونک سا گیا۔

''مجھے قطعی علم نہیں کہ ان کی اس بزنس ڈیل کے پیچھے کیا پلاننگ ہے۔ شرجیل اچھا انسان ہے اور اس سے میری اس سلسلے میں بات بھی ہوئی ہے لیکن شرجیل کے ڈیڈی اور انور چچا تو بس میری جان کو ہی آ گئے ہیں۔ ہر صورت میں یہ رشتہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ کاروبار کے ساتھ ساتھ رشتہ بھی ایسا مضبوط ہو کہ ٹوٹنے کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکے۔''

''اور نور، تم کیا چاہتی ہو؟'' وہ آہستہ سے بولا۔

''ظاہر ہے میرے انکار کی وجہ سے ہی وہ مجھ پر سختی کر رہے ہیں؟''

''تو تم وہ گھر ہی کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟''

''کم آن ولیم! دنیا میں صرف اور صرف یہی میرے رشتے دار ہیں۔ ان کے بغیر میں ادھوری ہوں۔ میری کہیں بھی کوئی پہچان نہیں اور نہ ہی کوئی اور مجھے قبول کرے گا۔ میں اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی۔''

''اور نور، دل کے رشتے کوئی اہمیّت نہیں رکھتے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''نہیں ولیم! دل کے رشتے انسان کو کوئی شناخت نہیں دے سکتے اور نہ ہی کسی کو سوشل کرائس سے بچا سکتے ہیں۔ یہ تو ایک شخص کے وجود اور اس کی روح تک محدود رہتے ہیں۔ دنیا کی نظر میں تو یہ بے نام رشتہ ہوتا ہے اور جس کا اپنا کوئی نام نہ ہو، دنیا اس سے ساری پہچان چھین لیتی ہے۔ یہ تو ادھورے رشتے ہوتے ہیں۔'' وہ بہت سنجیدگی سے بولی۔

''تو کیا تم اور میں؟''

''معلوم نہیں۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''نور! تم نے تو زندگی کی آخری سانس تک وعدہ نبھانے کو کہا ہے۔''

''ہاں اور میں یہ پورا کر کے رہوں گی بشرطیکہ......''

''بشرطیکہ کیا......؟''

''خدا ساتھ ہو، میں نے تم سے تب بھی کہا تھا۔ وہ اگر ساتھ نہ دے اور کائنات کی ساری قوتیں بھی مل کر میری مدد کریں تو میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔''

''نور! خدا کیوں ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ...... وہ تو ہم سب سے محبت کرتا ہے۔''

''لیکن ولیم خدا سے کچھ طلب کرنے کے لیے پہلے اپنا تعارف بھی تو کروانا پڑتا ہے نا۔''

''کیا مطلب......کیا میرا انسان ہونا کافی نہیں۔''

''نہیں، انسان تو اس نے بہت سے پیدا کیے ہیں مگر بہتوں پر غضب ناک بھی ہوتا ہے۔ کسی کی طرف تو دیکھتا بھی نہیں اور کسی پر اپنی محبتیں اور رحمتیں نچھاور کرتا جاتا ہے۔ ہمیں خود تو تعین کرنا چاہیے ہم کس کیٹیگری سے تعلق رکھتے ہیں۔'' وہ بلاواسطہ انداز میں سمجھا رہی تھی۔

''کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ مجھے بحیثیت کرسچن کہیں بھی قبول نہیں کیا جائے گا؟''

''ولیم! جو تم نہیں ہو وہ تم کیوں دنیا کے سامنے بن رہے ہو۔ تم تو کرسچن بھی نہیں۔''

''اور اگر کرسچن ہوتا تو باقی لوگوں کی طرح تمہارے گھر والے بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے۔'' اس کے لہجے میں شکستگی سی پیدا ہو گئی۔

''نفرت کی نہیں بلکہ حیرت کی نگاہ سے۔ ولیم! تم سمجھ کیوں نہیں رہے۔''

''آخر جو تم مجھے سمجھانا چاہتی ہو، صاف صاف کیوں نہیں کہتیں۔''

''بے وقوف تم بھی نہیں۔''

''آج تمہارے گھر والے میرے نان مسلم ہونے پر اعتراض کر رہے ہیں۔ کل

میرے معذور ہونے پر کریں گے۔نور! سوسائٹی کے پوائنٹ آف ویو سے میں کسی بھی طرح تمھارے قابل نہیں۔ آئی ایم ریجیکٹڈ بائے آل...... ہر کوئی مجھ سے نفرت کرتا ہے...... ہر کوئی مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میں بہت ہی گنہگار، ناپاک انسان ہوں۔ سب لوگ اتنے تنگ دل کیوں ہیں؟''

''ایسی بات نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مذہب...... مذہب...... سب لوگ مذہب کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ بس تم لوگوں کا ہی خدا اور رسول ہے باقی کسی کا نہیں۔تم لوگ دیوانے ہو چکے ہو۔'' ولیم کی آواز غصّے سے تھرتھرانے لگی اور اس نے فون بند کر دیا۔

نور ہیلو، ہیلو کہتی رہی مگر وہ فون بند کر چکا تھا۔نور کا دل شدت سے تڑپنے لگا۔اسے معلوم تھا کہ اب وہ رو رہا ہوگا اور وہ اسے دلاسا دینا چاہتی تھی۔اس کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس نے چابی اٹھائی اور باہر نکلنا چاہا۔انور چچا کی خشمگیں نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' انھوں نے غصّے سے پوچھا۔

''مارکیٹ تک، مجھے ضروری کام ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''اب جھوٹ بولنا بھی شروع ہو گئی ہو۔ میں جانتا ہوں تم کہاں جا رہی ہو۔''

''اگر جانتے ہیں تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''بکواس بند کرو اور اندر دفع ہو جاؤ۔'' وہ اس پر چلاتے ہوئے بولے۔اس کے لیے ان کا لہجہ اور یہ اندازِ بیاں اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ حیران رہ گئی۔ وہ تو انھیں ہمیشہ مضبوط پرسنالٹی سمجھتی آئی تھی اور وہ اب کیسے بدل رہے تھے۔

''مجھے جانے دیں، مجھے بہت ضروری کام ہے۔'' وہ لاؤنج عبور کرنے لگی تو انھوں نے زناٹے دار تھپڑ اسے جڑ دیا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

انور چچا اور ایسا رویہ...... وہ تو ان کو کبھی اتنی اہمیّت ہی نہیں دیتی تھی۔ پھپھو کے گھر پھوپا اور ان کے بچوں کا رویہ اس سے اچھا نہیں تھا تو اس نے مستقل چچا کے ہاں رہنے کا سوچا تھا اور اب وہ نہ جانے کیوں ایسا کر رہے تھے۔ یقیناً یہ سب اس کی محبّت اور بہتری کے لیے تو نہیں کر رہے تھے۔ یہ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ انھوں نے اسے کمرے میں دھکا دیا اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔اس لمحے وہ بہت روئی۔اسے اپنی ذات کی اتنی تحقیر محسوس ہوئی کہ

پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو اپنے آپ کو بولڈ سمجھتی تھی اور اپنے آپ کو اس قابل سمجھتی تھی کہ وہ ہر سچویشن ہینڈل کر سکتی ہے مگر یہ کیا...... وہ تو ذرہ خاک نکلی۔ ایک عورت جس کی کوئی پہچان نہیں تھی۔ وہ ان سب کے بغیر ادھوری تھی اور عورت چاہے معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھتی ہو یا نچلے سے، اسے اپنی ذات کی وابستگی اور شناخت کے لیے ہمیشہ سہارے کی ضرور ہوتی ہے۔ اب اسے رفتہ رفتہ اپنی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ نہ وہ ان لوگوں کو چھوڑ سکتی تھی اور نہ ان کے سامنے سرینڈر کر سکتی تھی۔ چچی تو کسی بات میں دخل نہیں دے رہی تھیں ورنہ وہ ہر بات میں چچا کو ڈانٹ کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ ایسی سچویشن میں وہ سخت ڈپریشن کا شکار ہو رہی تھی۔ کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ولیم کے لیے کیسے بات کرے جس کو اپنی منزل کا خود علم نہیں تھا۔ وہ تو راستے کے پتھر کی طرح خود اِدھر اُدھر لڑھک رہا تھا۔ کس طرح اس کی وکالت کرے۔ کوئی ٹھوس بنیاد ہی نہیں تھی۔ وہ کوئی مضبوط سہارا نہیں تھا جس پر وہ تکیہ کر سکتی۔

ولیم دو دن سے کمرے میں بند تھا۔ لائٹ آف کیے بالکل خاموش...... کبھی بستر پر لیٹ جاتا تو کبھی وہیل چیئر پر بیٹھ کر کمرے میں اِدھر اُدھر چکر لگانا شروع کر دیتا۔ شہلا بار بار اس کا پوچھ رہی تھیں اور آپا کمرے کی لائٹ آف دیکھ کر باہر سے ہی چلی جاتیں۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ اسے اس وقت نور کی بہت ضرورت تھی۔ نور ہی نے تو اس کی زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کی تھی۔ ہر قدم پر اسے اُمید کی کرن دکھائی تھی۔ اس کی مضطرب اور منتشر سوچوں کو سنوارنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ اس سے بچھڑ جائے گی۔ یہ تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طرح بھاگ کر اس کے پاس چلا جائے۔

اسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کس قدر منتشر انسان ہے۔ اس کا کیا فیوچر ہوگا؟ ادھوری شخصیت، معذور جسم، ادھوری تعلیم، ادھوری پہچان، وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اتنے نام والے، عزت و ناموس والے وقت کے بہاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں اور وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے شدید کمپلیکس ہونے لگا تھا۔ پہلے تو ہمیشہ اسے ڈپریشن ہوتا تھا اور اب کمپلیکس بھی، شدید احساسِ کمتری...... وہ حیدر انکل سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کے پاس کیا تھا۔ کس بنیاد پر ان سے بات کرے۔ وہ اپنے آپ سے لڑ لڑ کر تھک گیا تھا۔ ایک دم لائٹ آن ہوئی۔ کمرے میں ہر طرف روشنی سی پھیل گئی۔ تبسم آنٹی مسکراتی ہوئی اس کے سامنے کھڑی تھیں، وہ چونک سا گیا۔

''کیا بات ہے بیٹا! کیوں اس قدر پریشان ہو؟'' انھوں نے پیار سے اس کے سر

پر ہاتھ پھیرا۔

''آنٹی......نور......!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا ہوا نور کو؟''

''کچھ نہیں......'' اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کیا اور کیسے بتائے۔

''اس سے بہت محبت کرتے ہو، کیا وہ بہت اچھی لگتی ہے؟''

''ہاں۔'' وہ آہستہ سے سر جھکا کر بولا۔

''اور وہ؟''

''وہ بھی۔''

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''آنٹی! مسئلہ میں ہوں۔ اس کے چچا اس کی شادی کہیں اور کرنا چاہ رہے ہیں اور وہ نور پر بہت سختی کر رہے ہیں۔''

''ہائیں! یہ...... یہ کیا بات ہوئی۔ میں اور حیدر خود ان کی طرف جاتے ہیں۔'' وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

''نہیں آنٹی، وہ کسی معذور اور وہ بھی کرسچن سے ہرگز شادی نہیں کریں گے۔'' تبسم آنٹی کے قدم وہیں رک گئے اور وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''تو تم کیوں مسلمان نہیں ہو جاتے؟'' آنٹی ایک دم بولیں تو اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مجھے اسلام کی ابھی تک کسی بھی بات نے متاثر نہیں کیا کہ میں اسے فوراً قبول کرلوں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

''تو کیا تم نور سے متاثر نہیں اور کیا وہ مسلم نہیں؟''

''اس نے بحیثیت انسان مجھے متاثر کیا ہے۔ ہم دونوں نے کبھی مذہب کو اس طرح ڈسکس نہیں کیا جس طرح کرنا چاہیے۔ اگر کیا بھی ہے تو بہت کم۔''

''تو تم کیا چاہتے ہو، ہر نان مسلم کی طرح تم بھی کسی معجزے کے طلب گار ہو؟''

''لیکن کچھ تو ایسا ہو جو روح کو جکڑ دے اور انسان کو پھر راہِ فرار نظر نہ آئے۔ کیا مسلمانوں کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے۔ اگر آنکھیں کھول کر دیکھو گے تو سب کچھ ہے۔ اگر بند رکھ کر

دیکھنے کی کوشش کرو گے تو سامنے کا منظر بھی نظر نہیں آئے گا...... مسلمانوں کے پاس ان کا نبی ﷺ ہے۔ ایسا نبی ﷺ جس کی ذات معجزہ ہے۔ جو شخص پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو اور ساری دنیا کی مخلوق کے حقوق متعین کر دے جو رہتی دنیا تک ایک منشور کے طور پر مانے جائیں۔ کیا یہ معجزہ کسی سے کم ہے اور ہمارا کلام ایسا ہے جو پتھر سے بھی سخت دلوں کو موم کر دے۔''

''یہ بھی تو حیرت کی بات ہے کہ اتنے اعلیٰ نبی ﷺ کے ماننے والے دوسروں کو اتنا حقیر اور کمتر سمجھیں۔ مجھے اب تک جن رویوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، مجھے تو مسلمانوں نے بہت مایوس کیا ہے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''کیا ان سب میں سے کوئی ایک بھی اس قابل نہیں ملا جو تمہاری سوچ کو بدل سکے۔ اگر ایسا ہے تو گنہگار ہم ہیں نہ کہ ہمارا مذہب اور کلام۔''

''ہاں ملا ہے، صرف آپ، حیدر انکل اور نور۔''

''کیا اتنے بہت سوں میں سے یہ چند کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟''

''لیکن صرف اس بات کے لیے زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ بدلا بھی نہیں جا سکتا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''آخر تم کیا چاہتے ہو؟'' تبسم آنٹی نے حیرت سے پوچھا۔

''ایسا شعلہ جو میرے اندر بھڑکے تو میرے اندر کو جلا کر راکھ کر دے۔ میں کچھ ایسا...... محسوس کرنا چاہتا ہوں جو میرا ماضی، میرے اب تک کے عقائد اور میرا سب کچھ بہا کر لے جائے اور گھٹنے ٹیکنے کے سوا پھر مجھے کوئی راہ نظر نہ آئے۔'' تبسم آنٹی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئیں۔

شہلا کے بچے کتنے عجیب ہیں۔ شفق بھی انتہائی عجیب و غریب باتیں کرتی ہے، نہ جھکنے والی اور ولیم بھی...... شاید ان کی سرشت میں ایک ہی لمحے میں سرِ تسلیم خم کرنا شامل نہیں۔ وہ ہر ہر بات کے پس منظر اور اس کے ہر ہر پہلو پر مکمل بحث کرتے ہیں...... یا تو جینیئس ہیں یا پھر انتہائی ضدی۔ تبسم آپا کو ان کے رویے بہت عجیب لگے۔ پہلے شفق نے نہ جھکنے والی باتیں کی تھیں اور اب وہ بھی ایسی ہی بحثیں کر رہا تھا۔ وہ خود بھی الجھ گئیں اور اٹھ کر چلی گئیں۔

......۞......

شہلا کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی۔ شام سے ہی ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ اور پاؤں بستر پر زور زور سے مار رہی تھیں۔ آنکھیں قدرے باہر کو نکل آئی

تھیں۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ آپا تو گھبرا گئیں۔

''کیا بات ہے شہلا! کیا محسوس ہو رہا ہے؟'' وہ گھبرا کر بولیں۔

''آپا! بس میرا آخری وقت آ گیا ہے، پلیز شفق کو بلا لیں...... حیدر کو کہیں اس کو ایک دفعہ صرف...... صرف ایک دفعہ لے آئے۔'' ان کی سانس اکھڑ رہی تھی اور وہ شفق سے ملنے پر مصر تھیں۔

''اچھا، تم فکر نہیں کرو۔ میں ابھی حیدر کو فون کرتی ہوں۔'' انھوں نے حیدر کے موبائل پر رنگ کیا اور انھیں شفق کو لانے کو کہا۔

''اچھا، میں کوشش کرتا ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولے۔

''آپا! ولیم کو بھی میرے پاس لے آئیں۔''

''اچھا۔'' وہ اٹھ کر اسے لینے چلی گئیں۔

''آپ مجھے کہاں لے کر جا رہی ہیں؟'' ولیم نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید یہ تمہاری مما کے آخری لمحات ہیں اور وہ تمھیں اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہے۔'' آپا کی آنکھوں سے ایک دم آنسو بہہ نکلے۔

''نہیں، یہ کیسے...... اٹس امپاسیبل!'' وہ لرز سا گیا۔ موت کی موجودگی کا احساس تو تھا مگر یوں اس قدر اچانک سامنے آ کھڑی ہوگی اس نے سوچا بھی نہ تھا اور وہ بھی مما...... اگر مما کو کچھ ہو گیا تو اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ایک ہی لمحے میں بے شمار سوچیں اس کے دماغ کا احاطہ کرنے لگیں۔ آپا اسے لے کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ شہلا بستر پر تڑپ رہی تھیں۔

''ولیم! تم آ گئے۔'' شہلا نے اپنا لرزاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''ہاں مما، میں اِدھر ہی ہوں اور آپ بھی میرے پاس ہیں، آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے انھیں تسلی دینی چاہی۔

''نہیں، اب نہیں۔ اب میرے پاس وقت نہیں۔ ولیم! وعدہ کرو شفق کو کبھی تنہا نہیں چھوڑو گے۔ وہ بہت اکیلی ہے۔''

''مما! آپ کیسی بات کر رہی ہیں۔ آپ سب جانتی تو ہیں۔'' وہ حیرت سے بولا۔

''نہیں، میں کچھ نہیں جانتی، میں کچھ نہیں جانتی۔ بس تم دونوں حیدر انکل کے پاس رہو گے۔ کبھی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑو گے، وعدہ کرو۔'' وہ بے حد مضطرب ہو کر بولیں۔

''شہلا! ہمت کرو اور یہ سیرپ پی لو۔'' آپا نے سیرپ ایک چمچ میں ڈال کر اسے

پلانا چاہا۔

''نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں۔ آپ بس میرے پاس بیٹھ کر کچھ قرآن پاک سنا دیں تا کہ میری جان آسانی سے نکل سکے۔ آپا! اس وقت میں سخت تکلیف میں ہوں۔ شفق ابھی تک نہیں آئی اور حیدر کہاں ہے۔ اس کو کہیں جلدی آئے۔'' وہ دروازے کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''بس وہ آ رہے ہیں، میں نے فون کر دیا ہے۔''

''آپ مجھے قرآن سے کچھ سنا دیں۔ وقت بہت کم ہے، میری جان نکل رہی ہے۔'' ولیم ماں کی ایسی حالت دیکھ کر سخت مضطرب اور پریشان ہو رہا تھا۔

آپا جلدی سے قرآن پاک لے آئیں اور سورۂ یٰسین پڑھنے لگیں۔ ولیم خاموشی سے سنتا رہا اور اس دوران مما کو آبزرو کرتا رہا۔ وہ کس طرح ایک خوبصورت، صحت مند عورت سے ایک مضمحل، بیمار، ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گئی تھیں۔ نہ سر پر بال تھے، نہ جسم پر گوشت...... جلد کی رنگت بھی جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور اب تو ان کی حالت ایسی خوفناک ہو رہی تھی کہ وہ ڈر رہا تھا۔ وہ کبھی پاؤں کو زور سے جھٹکتی تھیں، کبھی ہاتھوں کو بستر پر مارتیں۔ کبھی منہ پر ہاتھ پھیرتی تھیں۔ چہرے پر شدید کرب اور اضطراب کے آثار تھے۔ اس سے ان کی یہ کیفیت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ شہلا! کلمہ پڑھ لو۔'' آپا نے آیت پڑھی تو ولیم کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ بہت دنوں سے اپنے آپ کو مصروف رکھے ہوئے تھا۔ نور کی ذات میں اور اس کے بارے میں گہری سوچوں نے اس کی توجہ اس طرف سے ہٹا رکھی تھی اور اب پھر سب کچھ عود کر باہر آ رہا تھا۔ وہ پھر مضطرب ہو رہا تھا۔ وہ پھر اسی کیفیت سے دوچار ہونے لگا تھا۔ راہِ فرار نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا اندر اتھل پتھل ہونے لگا۔ ایسا اضطراب اور بے چینی پیدا ہونے لگی جو شاید اس وقت مما کے چہرے پر نمایاں تھی۔

''شہلا! کلمۂ شہادت پڑھتی جاؤ۔ میرے ساتھ پڑھو۔'' آپا کلمہ پڑھنے لگیں تو شہلا کی آنکھوں سے جیسے دھارے پھوٹ پڑے۔

''اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔'' آپا نے ایک آیت کا ترجمہ پڑھا اور پھر اسے تسلی دی۔

''وہ معاف کرنے والا ہے اور اس کی رحمت انسان کو ہر جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ فکر

نہیں کرو، سب بہتر ہوگا۔'' آپا نے محبت سے کہا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ شدت سے رو رہی تھیں، جاں بلب تھیں۔ تڑپ رہی تھیں اس مچھلی کی طرح جسے سمندر سے نکالا گیا ہو اور وہ دوبارہ پانی میں جانے کے لیے تڑپ رہی ہو۔ دم توڑنے سے پہلے اپنے وجود کی ساری قوتوں کے ساتھ ہر ممکن زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہو۔ ان کے لب بھی آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ کلمہ پڑھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر کلمہ ادا کرنا انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ قوتِ گویائی زائل ہو رہی تھی۔ زبان اکڑ گئی تھی یا پھر کوئی غیر مرئی قوت اسے ان کے لیے مشکل بنا رہی تھی۔ ان کا ناتواں وجود کلمے کا بوجھ نہیں سہہ پا رہا تھا۔ وہ الفاظ کو گھسیٹ رہی تھیں۔ ساری زنجیریں توڑ کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ سکڑ رہے تھے، زبان خشک ہو رہی تھی۔ گلے میں کانٹے اور ان کی شدید چبھن تھی۔ شاید ایمان اور عقائد آپس میں برسرِ پیکار تھے یا پھر دوبارہ ازسرِنو روح میں حلول ہو رہے تھے۔ جس چیز کا اعادہ دنیا میں آسان تھا شاید اب اس ہستی کے سامنے اقرار مشکل ہو رہا تھا۔ بیماری کے دوران شہلا نے بارہا کلمہ پڑھا تھا اور اب ایک دفعہ کی ادائیگی بھی مشکل ہو رہی تھی۔ شاید جسم اور روح کی آپس میں چپقلش تھی۔ جسم کی ساری قوتیں، روح کی ساری سچائیاں، حواس کی ساری لطافتیں اور جذبات کی ساری نزاکتیں...... سب کچھ صرف ایک کلمے کی ادائیگی میں صرف ہو رہی تھیں مگر پورا کلمہ پھر بھی ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔ ''یااللہ! تیری رحمت کبھی مجھ پر کھل کر نہیں...... اب کی بار صرف آخری بار مجھے اس سے نواز دے۔'' شہلا نے دل میں گڑگڑا کر دعا کی۔

''اور ہم نے انسان کو احسن ترین صورت میں پیدا کیا پھر اسے اسفل ترین گھاٹی میں پھینک دیا۔''

وہ اس گھاٹی سے نکلنا چاہ رہی تھیں۔ اندر ہی اندر التجائیں کر رہی تھیں۔ سارے گناہ مجرم بنے ان کے سامنے کھڑے تھے اور وہ سر نہیں اٹھا پا رہی تھیں۔ ان کی حالت ناقابل بیان حد تک خراب اور مضطرب ہو رہی تھی۔ شاید وہ مسلمان ہونے کا اعادہ کر رہی تھیں۔ کلمہ اور مما کی جدوجہد...... آخری لمحوں کی اضطراری کیفیت...... رگوں میں گردش کرتے خون کی توانائی سے خارج ہونے والی اکھڑتی سانسوں کے ساتھ اعراب اور تلفظ کی قیود سے آزاد محض الفاظ ادا کرنا چاہ رہی تھیں۔ ایسا کلمہ جو شاید نامہ اعمال میں سب سے بھاری تھا۔ جس کا اقرار انسان کی راہیں متعین کرتا ہے، اس کی حد بندی کرتا ہے۔ اسے ذرۂ خاک سے ذرۂ آفتاب بنا دیتا ہے۔ اسے وحدہ لاشریک کی ہستی کے اسرار و رموز سے آشنا کرتا ہے اور عام حقیر انسانوں

کے ہجوم سے نکال کر اسے ایک قابل عزت امتی کا درجہ دیتا ہے۔

''اور ہم نے تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔'' انسان کے وجود کو اتنی جلا بخشنے والا کلمہ یقیناً بھاری تھا۔ نامۂ اعمال میں سب سے بھاری جس کا اقرار انھیں کہیں پہنچا رہا تھا، ان کی راہیں متعین کر رہا تھا۔ انھیں گناہوں سے پاک کر رہا تھا۔ وجود کی آلائشوں اور گندگیوں سے ان کو مصفا کر رہا تھا۔ ان کی منزل متعین ہو رہی تھی۔ وہ خطا و نسیان کے ادوار سے نکل کر اقرار کی منزلوں پر گامزن تھیں، محوسفر تھیں۔ وہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے اضطراب میں وہ سب کچھ بھول چکی تھیں۔ شفق، حیدر، ولیم، آپا کوئی بھی ارد گرد نہیں تھا۔ صرف ایک ہستی سامنے تھی اور وہ اس کے سامنے اقرار کرنے کی سر توڑ کوشش میں مصروف تھیں۔

''لا...... الا...... اللہ...... محمد......'' الفاظ سمجھ نہیں آ رہے تھے۔ سانس کی کھڑکھڑاہٹ، گلے کی گڑگڑاہٹ، آواز کی تھرتھراہٹ اور جسم کی کپکپاہٹ...... سب ہی قوتیں بہت مشکل سے ان الفاظ کا اعادہ کر رہی تھیں۔ ولیم حیرت سے آنکھیں کھولے دیکھ رہا تھا ایسا منظر جو روح فرسا تھا۔ انسان کو لرزا دینے والا، اس کا انجام بتا دینے والا، کس قدر تکلیف دہ اور کٹھن تھا۔ بس یہی ہے انسان، اس قدر بے بس، وہ الفاظ دُہرانے کی بار بار کوشش کر رہی تھیں، دل پھٹ رہا تھا، روح منتظر پرواز تھی۔ ساری قوتیں، توانائیاں اور لطافتیں زائل ہونے کو بے تاب تھیں۔ ولیم کا اپنا دل بے تاب ہو رہا تھا۔ اسے اچانک ایسی ہستی کا شعور ہو رہا تھا جسے وہ جھٹلاتا آیا تھا جس تک پہنچنے کے لیے اس نے غلط راہوں کا انتخاب کرنا چاہا تھا۔ شاید اس کے اپنے بھی زاویے درست ہو رہے تھے۔

''جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔'' اسے اس نور کی تابانیاں اپنے حصار میں لے رہی تھیں۔ اس کے اندر جذبات طوفان کی صورت میں امڈ رہے تھے، دل شق ہو رہا تھا، روح پھڑپھڑا رہی تھی۔ کچھ کرنے کو اُکسا رہی تھی۔ ایسا اقرار جو اسے حیات کے اسرار سے آشنا کر دے۔

''ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھا دیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی اور یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہی حق ہے۔''

ایسا اضطرار اور انتشار اس نے کبھی زندگی میں محسوس نہیں کیا تھا۔ اچانک فون کی بیل بجنے لگی۔ آپا بھی اندر ہی اندر پریشان تھیں۔ جلدی میں قرآن پاک کو رحل پر کھلا رکھ کر باہر نکل گئیں۔ ولیم پہلے ہی بے تاب ہو رہا تھا۔ مما کی کیفیت، آیات کا ترجمہ اس کے دل کو

شکنجے میں جکڑ رہا تھا۔ اس کا دل بھر رہا تھا جیسے کسی مائع سے لبریز ہو رہا تھا۔ وہ جی بھر کر رونا چاہ رہا تھا مگر آنسوؤں کو ضبط کیے ہوئے تھا۔ اس نے بغیر ہاتھ لگائے قرآن کے ایک کھلے ہوئے صفحے کو پڑھنا چاہا۔ عربی سمجھ نہ آئی تو ترجمے پر نظر دوڑائی۔

''اور جب عملوں کے دفتر کھولے جائیں گے اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی اور جب دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی اور بہشت جب قریب لائی جائے گی تب ہر شخص معلوم کرلے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔''

اس نے جیسے ہی ترجمہ پڑھا اس کا دل لرزنے لگا۔ اس نے ایک ٹک مما کی طرف دیکھا۔

''تب ہر شخص معلوم کرلے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے؟'' اس نے ایک لمحے کے لیے اپنے بارے میں سوچا۔ ''کیا لے کر آیا ہے؟ کچھ بھی نہیں...... خالی ہاتھ...... خالی دل...... خالی روح...... کچھ بھی نہیں...... کیا لے کر آیا ہے؟ کچھ بھی نہیں......'' اس کا دل پکار پکار کر اس سے سوال کر رہا تھا۔ اس کے اندر تلاطم سا برپا ہونے لگا۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ نہ جانے کہاں سے ایک آنسو گرا، دوسرا پھر تیسرا اور جھڑی سی لگ گئی۔ اشک بہنے لگے۔ مائع سے لبریز دل، اشکوں کی صورت میں اندر کے غبار کو خارج کرنے لگا۔ نہ جانے کون روح کو جھنجوڑ رہا تھا۔ جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ دل پھٹنے کو تھا۔ کہیں فرار کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ساری راہیں مسدود نظر آ رہی تھیں۔ بس گھٹنے ٹیکنے کو دل چاہ رہا تھا...... سر تسلیم خم کرنے کو مجبور کر رہا تھا۔ مما تڑپ رہی تھیں۔ عجیب بے چارگی اور بے بسی کا عالم تھا۔ وہ بری طرح سر اِدھر اُدھر مار رہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ ان کی جان جسم کے ایک ایک روئیں سے کھینچی جا رہی تھی۔ نزع کی کیفیت کس قدر تکلیف دہ تھی۔ وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ ان کی تکلیف محسوس کر سکتا تھا مگر مجبور تھا، بے بس تھا، کتنا قریبی رشتہ اور کس قدر مجبور، وہ اس وقت بالکل تنہا اور بے سہارا لگ رہی تھیں۔

''کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔''

''مما...... مما...... پلیز ہمت کریں۔'' اس نے سخت مضطرب ہو کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی دینی چاہی مگر وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھیں۔ بس شدید کرب میں مبتلا تھیں۔ کرب، اضطراب، ملال، دُکھ، رنج، فرار...... کبھی ہاتھوں کو بند کرتیں اور کھولتیں۔

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمھیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمھیں ہماری

طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔"

نہ کوئی دوا کام آ رہی تھی، نہ دعا۔ وہ بھی الفاظ بھول گیا تھا۔ دعائیہ الفاظ...... جو کبھی فادر نے اسے سکھائے تھے۔ وہ یاد کرنا چاہ رہا تھا مگر ذہن خالی ہو چکا تھا۔ اس میں اب کوئی پرانی یاد باقی نہ تھی۔ وہ پریشان ہو گیا پھر قرآن کی طرف نظر دوڑائی۔ شاید کہیں سے الفاظ مل جائیں جن سے وہ مما کو تسلی دے سکے۔

"اور تمھیں کس چیز نے اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈالا۔" اس کی انا پر کاری ضرب تھی۔ اس کا وجود کرچی کرچی ہو گیا۔ سامنے مما تھیں اور ان کا مکمل کلمہ...... ایک طرف وہ تھا خالی الذہن...... اس نے ایسا شعلہ مانگا تھا جو اندر کو بھڑکا دے۔ اس کی ہستی کا ثبوت مانگنے والا، اب ایک ہی وار میں چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔ بلند و بانگ دعوے ہوا ہو رہے تھے۔ منطق اور دلائل پر تکیہ کرنے والا خود ہی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ بس چند الفاظ نے شعلہ بھڑکایا تھا اور اس کے وجود کو خاکستر کر دیا تھا۔

انسان کے دعوے کتنے بودے ہوتے ہیں جیسے اس کا وجود، جیسے مما کا وجود، تڑپتا، ہانپتا کانپتا، لرزتا، سسکتا، بوڑھا، بیمار، انا اور زعم کے قیدی کیسے خود ہی دام میں آ جاتے ہیں۔ اپنے ہی لفظوں سے مات کھا جاتے ہیں۔ اپنے ہی وجود سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ دلوں کو پلٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ وہ چاہے تو ساری زندگی انھیں زنگ آلود رہنے دے اور چاہے تو لمحوں میں اپنے نور سے انھیں جلا بخش دے۔ سب کچھ بدل کر رکھ دے۔ آن ہی آن میں نیا وجود جنم لے لیتا ہے اور انسان کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ مما اس کی کیفیت سے بے خبر اپنے آپ سے برسرِ پیکار تھیں۔

تبسم آنٹی اسے سمجھا رہی تھیں۔ حیدر انکل کونیس کر رہے تھے مگر وہ مان ہی نہیں رہی تھی۔ "صرف ایک دفعہ آ جاؤ۔" تبسم آنٹی نے انتہائی ملتجیانہ انداز میں کہا تو اس نے فون رکھ دیا۔ بعض اوقات لمحوں کی کشمکش انسان کو خوفناک حد تک منتشر کر کے رکھ دیتی ہے۔ تبسم نے آہ بھر کر سوچا اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کی۔

"یا الٰہی! وقتِ رخصت کو لمحۂ وصال بنا دے۔ یا رب! تجھ سے تو کچھ بھی بعید نہیں۔ تیری رحمت کی نظر تو بیابانوں کو نخلستان بنا دیتی ہے۔ دلوں کو بدلنا تو تیرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کا دل بدل دے۔" وہ امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا اندر گئیں۔ وہ ابھی تک مضطرب تھی اور شاید منتظر بھی اس لیے جان لبوں پر آ کر رک گئی تھی۔

''شہلا! وہ آ رہی ہے۔'' تبسم آپا نے کہا۔ شہلا نے کچھ نہیں سنا اور نہ ہی جواب دیا۔ بس لب ہلتے رہے اور بند آنکھوں سے آنسو بہتے رہے جیسے کوئی کفارہ ادا کر رہی ہو۔ ولیم سر جھکائے آنسو بہا رہا تھا۔

''حوصلہ کرو بیٹا! بہادر بنو۔'' تبسم آنٹی نے اسے دلاسا دیا مگر وہ خاموش رہا۔ وہ بے تاب آنسو تو اندر کے غبار کو کم کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی کا ہارن بجا۔ تبسم آپا نے جلدی سے کھڑکی سے دیکھا۔ شفق، شہلا اور حیدر اندر آ رہے تھے۔ آپا نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

''شہلا! شفق آ رہی ہے۔'' وہ مسرت سے چلائی تھیں۔

شفق، شہلا اور حیدر انکل اندر آ چکے تھے۔ مما نے مشکل سے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا۔ شفق کی آنکھوں میں ماں کے لیے کسی قسم کے کوئی جذبات نہیں تھے البتہ چہرے پر افسردگی سی چھائی تھی۔ مما نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ تبسم آنٹی نے جلدی سے اسے ان کے بیڈ پر ہی بٹھا دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی بھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے مگر وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔

''شفق!'' شہلا نے بمشکل کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ولیم کی طرف بڑھا دیا۔ ''خیال رکھنا۔'' وہ بمشکل بولیں۔ شفق خاموش رہی اور ولیم کی طرف بالکل نہ دیکھا۔ ان کی سانس اُکھڑ رہی تھی جیسے وہ صرف اس کی آمد کی منتظر تھیں۔ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھیں مگر کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ ایک دم گلے میں کھڑکھڑاہٹ سی ہونے لگی۔ شہلا نے اشارہ کیا۔ آپا نے جلدی سے برتن آگے کیا۔ انھوں نے خون آلود قے کی اور نڈھال سی ہو کر لیٹ گئیں۔ ہر ایک کی آنکھوں میں خوف سا سما گیا تھا۔ ناقابل بیان منظر، انتہائی روح فرسا، دلوں کو شق کرنے والا۔

اس نے آخری بار اونچی آواز میں کلمہ پڑھنا چاہا تو آپا، حیدر، شہلا اور شفق بھی بلند آواز میں کلمۂ شہادت پڑھنے لگے...... سب حیران رہ گئے۔ ایک دم چونک گئے اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ ولیم کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کی آواز سب آوازوں سے منفرد لگ رہی تھی۔ اس کا کلمہ سب سے مختلف تھا۔ مما نے انتہائی اضطراری کیفیت میں ایک دم ولیم کی طرف دیکھا اور زیرِ لب مسکرانے کی کوشش کی۔ حیدر نے آگے بڑھ کر ولیم کو گلے لگایا۔ آپا نے بھی پیار سے اس کا ماتھا چوما۔ ایک شعلہ سا بھڑکا تھا اور اس کے اندر کو لمحوں میں خاکستر کر دیا تھا۔ اس نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔

سب کچھ بہہ چکا تھا۔لمحوں میں معجزہ رونما ہو گیا تھا۔ دلوں کو پلٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ انسان خود ہی حیران رہ جاتا ہے۔

وہ بھی مما کی طرح اٹک اٹک کر کلمہ دہرا رہا تھا اور آنسو بھی بہا رہا تھا۔ روح محو پرواز تھی۔ خون کی گردش میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایمان رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔جسم کا ایک ایک حصّہ، مسام اور ہر رواں سب اس کے ایمان کی تصدیق کر رہے تھے۔ سب حیران تھے معجزہ طلب کرنے والا جب خود ہی کسی معجزے کا سامنا کرتا ہے تو کیسے دنگ رہ جاتا ہے۔اس کی بے قرار روح کو ایک لمحے میں سکون مل گیا۔ مما کے چہرے پر سکون سا آ گیا تھا۔شاید وہ اسی لیے مضطرب تھیں۔اب ہر طرف سکوت اور ٹھہراؤ تھا۔ ان کی آنکھوں میں اطمینان اور مسکراہٹ کی لہر سی نمودار ہوئی۔ خدا کی رحمت نے ہر طرف احاطہ کر لیا تھا۔ان کی جان کب اور کیسے نکلی کسی کو احساس بھی نہ ہوا۔ وہ سب تو ولیم پر حیران ہو رہے تھے جس نے سب کو حیران کر دیا تھا۔سب اس کی طرف متوجہ تھے اور وہ سب سے منہ موڑ کر کہیں جا چکی تھیں۔

"ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

حیات کا ایک طویل سفر ختم ہو گیا تھا۔ زندگی کے اسٹیج پر ایک اور کردار اپنا رول ادا کر کے جا چکا تھا۔ دنیا محو تماشا تھی اور حیران تھی۔ ایک اور کردار کی آمد کی منتظر تھی جو قصہ پارینہ نہ بن سکے، جو ہمیشہ ذہنوں میں موجود رہے اور جس کی یاد سے اذہان منور رہیں۔

شاید کوئی ایسا ہو...... ہر نگاہ منتظر تھی...... ہر طرف ہجوم تھا اور افراتفری تھی...... کوئی تو ہو جو انسانیت کی بقا کے لیے کچھ کر سکے...... جس کی طرف نگاہیں اٹھیں تو اس کے انسان ہونے پر فخر محسوس ہو...... کوئی تو ہو......

......✿......

نور، انور چچا کے غصّے اور ڈانٹ پھٹکار کے باوجود حیدر کے فون کرنے پر آ گئی تھی۔ وہ کئی دنوں سے وہیں تھی۔ شہلا کی وفات کا دکھ تو تھا مگر ولیم کے یوں اچانک راستہ بدلنے اور سچائی قبول کرنے پر سخت حیرانی اور خوشی بھی تھی۔ گھر میں خوب مصروفیت تھی۔ کبھی گرد و نواح کے لوگ تعزیت کے لیے آ رہے تھے تو کبھی مسجد سے قرآن خوانی کے لیے حفاظ...... ورکنگ ویمن ہاسٹل سے بھی خواتین آ رہی تھیں۔ ہر کوئی آنے والا دعائے مغفرت کر رہا تھا اور اس کے لیے سب کچھ بہت عجیب تھا۔

جمعے کا دن تھا جب حیدر نے اسے غسل کرنے اور نئے کپڑے پہننے کے بارے میں کہا۔

''کیوں؟'' وہ حیران ہو گیا۔

''آج تم مسجد میں میرے ساتھ چلو گے اور اسلام قبول کرو گے اس لیے اور سنو! تمہارا اسلامی نام کیا رکھیں؟'' حیدر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جو آپ کو بہتر لگے، مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔''

''آپا! آپ کا کیا خیال ہے؟'' حیدر نے تبسم آپا سے رائے مانگی۔

''بھئی نور سے پوچھو، اسے جو نام پسند ہو۔'' وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''موحد......!'' وہ اچانک بولی تو سب مسکرا دیے۔

وہ دن انتہائی خوشی کا دن تھا جب وہ مسجد سے اسلام قبول کر کے لوٹا۔ اس کا دل اور روح انتہائی مسرور تھی۔ ایسی خوشی نصیب ہوئی تھی جس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ حیدر انکل، تبسم آنٹی اور باقی سب لوگ بھی بہت خوش تھے۔ حیدر انکل نے مسجد میں بھی مٹھائی بانٹی تھی اور اپنی فیکٹریز میں بھی...... یہ لمحہ کسی نعمت سے کم تو نہ تھا۔ جب انسان سر تسلیم خم کر دے اس ہستی کے سامنے جس کے سامنے کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی ہیچ ہے اور جو دلوں میں رہتا ہے۔ سب نے اسے مبارک باد دی سوائے شفق کے۔ وہ ماما کی وفات کے بعد بہت خاموش تھی۔ وہ جس کیفیت سے دوچار تھی یہ صرف وہی جانتی تھی۔ اس نے آخری لمحوں تک مما کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو دونوں کے درمیان ناراضی ختم ہونے کی علامت سمجھی جاتی۔ سب کے بہت سمجھانے کے باوجود وہ اپنی ضد پر اڑی رہی تھی۔ وہ موجود تو تھی مگر اس کی آنکھوں میں ان کے لیے محبت مفقود تھی اور اب اس کا دل بے حد پریشان تھا جیسے کسی بھاری بوجھ تلے آ گیا ہو۔ کسی طرح بے قراری کم ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ سخت پریشان اور بے چین تھی۔ سب آہستہ آہستہ خاک میں پنہاں ہو گئے تھے۔ کیا تھا اگر وہ مما کو معاف کر دیتی۔ ان کے آخری لمحوں میں ان کے لیے تسکین کا باعث بن جاتی مگر وہ اپنے دل کو نہ بدل سکی۔ وہ اسی طرح اُکھڑی رہی۔ وہ تو صرف تبسم آنٹی کی بہت زیادہ التجا اور حیدر انکل کی محبت میں چلی آئی تھی ورنہ وہ تو آنے سے گریزاں تھی اور اب جبکہ مما نہیں رہی تھیں، سب کا اصرار بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ کسی نے بھی اس کو اس کے رویے پر سرزنش نہیں کی تھی۔ کسی نے اس کو

زچ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سب خاموش تھے اور ان کی خاموشی کو وہ اپنے لیے کسی عذاب اور آزمائش سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ بہت بری ہے۔ اس کا اندر اسے بار بار کچو کے لگا رہا تھا اور وہ مزید مضطرب ہو جاتی۔

''ہاں ہاں، میں ہی بری ہوں۔ سب کی گنہگار...... قاتلہ...... اور...... اور......'' اس کی نظروں کے سامنے زویا اور عابد گھومنے لگے۔ وہ چیخنا چلانا چاہتی تھی۔ خوب رونا چاہتی تھی مگر اب سب کچھ بے سود لگ رہا تھا۔ باہر نور، شہلا، اسد، حیدر، موحد، تبسم آنٹی اور کرنل مغیث سب خوش اور مسرور بیٹھے تھے اور وہ تنہا کمرے میں دروازہ لاک کر کے اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ افضل اسے بلانے آیا تھا۔ حیدر انکل اسے بلا رہے تھے۔

''کہہ دو میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میں سو رہی ہوں۔'' اس نے دروازہ کھول کر اور اپنا موقف سنا کر دروازہ بند کر دیا۔ نہ جانے یہ اس کی خودسری تھی یا پھر اس کا ڈپریشن۔ سب نے خاموشی سے اس کے ایکسکیوز کو قبول کر لیا۔

''موحد! تم نے یہ فیصلہ بہت اچانک نہیں کیا؟ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ تم اچانک فیصلے کرنے کے عادی ہو......'' نور نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... تھا تو اچانک لیکن پروسیس بہت دنوں سے شروع ہو چکا تھا اور اس لمحے میں مزاحمت نہیں کر سکا...... نور میں اس وقت کی کیفیت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا...... اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید پھر ایسا بکھرتا کہ ختم ہو جاتا...... ان لمحوں کی شدت نے میرے جسم اور روح کو ایسا جکڑا تھا کہ فرار ممکن نہیں تھا۔ نور واقعی ایمان میں جو لطافت اور طاقت ہے وہ دنیا کی کسی اور شے میں نہیں...... تم نے ٹھیک کہا تھا کہ کوئی سچا مسلمان کبھی اپنا راستہ نہیں بدلتا۔ میں خوش ہوں اور تم سب لوگوں کا مشکور کہ اتنی بڑی نعمت کے حصول میں تم سب نے میری بھرپور مدد کی...... ورنہ میں نہ جانے کہاں اور کب تک بھٹکتا رہتا، اب میری روح بہت پرسکون ہے جیسے کسی منزل پر پہنچ کر کوئی پرسکون ہو جاتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں خوشی اور مسرت سے آنسو جھلملانے لگے۔

''کیا فادر کو کچھ نہیں بتاؤ گے......؟'' نور نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنا چاہا۔

''نہیں...... اب مجھے کسی کا ڈر نہیں اب مجھے اس ہستی تک پہنچنے کے لیے کسی رابطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں، کسی فادر کا خوف نہیں...... اور نہ ہی کسی مشن کے چھوٹنے کا ملال...... میرا راستہ تو اب صاف اور سیدھا ہے۔'' وہ اعتماد سے بولا۔

''موحد...... تم کتنے پُراعتماد لگ رہے ہو...... ایک دم مختلف اور مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ تم میں پھر وہ کونفیڈنس آ چکا ہے جو میں نے پہلی دفعہ ہاسٹل میں تم سے مل کر محسوس کیا تھا۔ اس وقت تم مجھے بہت اچھے اور پُراعتماد لگے تھے...... بعد میں تو تم......'' اس نے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ان دنوں بھی میں اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرتا تھا، صرف ایک لگن تھی کہ مجھے خدا تک پہنچنا ہے...... پھر میں جنونی ہوتا گیا جیسے ایک دم غبارے میں ہوا بھر کر پھر اس کا منہ کھول دیا جائے اور جب ہوا نکلتی ہے تو وہ پھر سے مریل سا پھس پھسا سا ہو جاتا ہے لیکن میں اس وقت کے اعتماد میں اور اب کے اعتماد میں بہت فرق محسوس کرتا ہوں۔ اب میرے پاس ٹھوس حقیقت اور سچ کی روشنی ہے، سیدھا راستہ ہے اور منظر صاف ہے...... میری منزل کیا ہے...... اب مجھے اس کا علم ہے، نور اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ اندھیرے اب میرا مقدر نہیں...... میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ خدا نے اپنے نور کی شمع میرے اندر روشن کی ہے اس کا مطلب ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بس یہی احساس کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے میرے لیے اس دنیا میں ہر شے سے بڑھ کر قیمتی ہے اور جب کسی کو یہ احساس ہو جائے کہ کوئی اس سے سچّی محبت کرتا ہے تو اس کا سر فخر سے کس قدر بلند ہو جاتا ہے اور اس کے احساسات کا کیا عالم ہوگا جسے یہ احساس ہو کہ کائنات کا مالک اس سے محبت کرتا ہے...... نور دیکھو میں مما کی ڈیتھ سے پہلے ان سے جدائی کا تصور کر کے ہی کانپ جاتا تھا۔ سوچتا تھا کس طرح زندہ رہ پاؤں گا لیکن اب مجھے دکھ تو ہے مگر خوف نہیں، کاش تم اس وقت ہوتیں جب مما صرف کلمے کی ادائیگی کے لیے اس قدر تڑپ رہی تھیں...... ایسی بے چینی میں نے آج تک کسی چہرے پر نہیں دیکھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت صرف اور صرف خدا کے سامنے کھڑی ہوں اور پوری قوت سے کلمہ ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں...... میں تو چونک ہی گیا انھیں کوئی فکر نہیں تھی، کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔ صرف ایک ہی جدوجہد تھی کہ کسی طرح کلمہ ادا ہو جائے اور پھر انھوں نے جس کیفیت میں کلمہ پورا کیا...... میرے اندر جیسے آگ سی لگ گئی اور پھر کیسے اور کس قوت نے میری زبان سے بھی کلمہ جاری کروا دیا میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔ کاش تم اس وقت ہوتیں......'' اس کی آنکھیں پھر فرطِ جذبات سے جھلملانے لگیں۔ نور کی آنکھوں میں بھی نمی سی تیرنے لگی۔

''شکر ہے موحد...... خدا نے میری بھی دعائیں سن لیں جب تم چرچ میں پیریئر

کے لیے گئے تھے نا...... اس وقت میں نے بخار میں جس طرح تمھارے لیے دعائیں کی تھیں تم اندازہ نہیں کر سکتے۔'' نور نے مسکرا کر کہا۔

''واقعی...... اور اس وقت میں اس قدر بے چینی اور بے بسی محسوس کر رہا تھا پہلی دفعہ چرچ سے میں اس قدر مضطرب لوٹا تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ نور اس کا مطلب ہے خدا کوئی دعا بھی رائیگاں نہیں جانے دیتا۔''

''ہاں بالکل نہیں...... اور تمہاری ٹانگیں بھی جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔'' نور نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... انشاء اللہ اب میں بہت پُر امید ہوں، الحمدللہ۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ہیں...... ہیں...... یہ تم نے اتنے سارے عربی کے الفاظ کہاں سے سیکھے؟'' نور نے حیرت سے پوچھا۔

''تبسم آنٹی سے...... شی از ویری نائس، لائک مدر......'' وہ مسکرا کر بولا۔

''یس شی از......'' اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

''تم آتی رہو گی نا......؟'' وہ اسے اٹھتے دیکھ کر بولا۔

''معلوم نہیں...... کیا بنتا ہے...... انور چچا خواہ مخواہ میں مجھے تنگ کر رہے ہیں، سمجھ میں نہیں آ رہا آخر وہ کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ بہت مشکل سے صرف حیدر انکل کے کہنے پر مجھے یہاں آنے کی اجازت ملی ہے ورنہ تو وہ باہر بھی نہیں نکلنے دیتے...... تم میرے لیے دعا کرنا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں اب تم ہمت نہ ہارنا۔'' وہ بولا تو اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، مسکرا دی...... اور باہر چلی گئی۔

وہ گھر پہنچی تو ڈرائنگ روم سے اونچی اونچی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی جھگڑ رہا ہو، چچی کچن میں مصروف تھیں۔ چچا کی کوئی اولاد تو تھی نہیں کہ گھر میں کسی قسم کا شور شرابا ہوتا، وہ تھوڑی دیر لاؤنج میں بیٹھی اور پھر کمرے میں جانے لگی تو اس کے قدم جیسے رک گئے۔

''راحیل...... مجھے تھوڑا سا وقت دو وہ مان جائے گی۔'' چچا ان سے التجا کر رہے تھے مگر وہ تو ایسے بھڑکے ہوئے تھے کہ ان کی کسی بات کو سننے کو تیار نہ تھے۔

''انور...... تم میرے ساتھ کب تک جھوٹ پہ جھوٹ بولتے رہو گے تم بہت دھوکے

باز انسان ہو......اب میں تمھارے فراڈ میں آنے والا نہیں۔"

"راحیل تم تو میرے کالج کے دوست ہو...... اور خدا گواہ ہے میں نے تمھارے ساتھ کوئی دھوکا کرنے کی کوشش نہیں کی، بس حالات ہی ایسے ہوتے گئے کہ میں تمھاری رقم لوٹا نہیں سکا اور قرضوں کے بوجھ تلے دبتا گیا مجھے بزنس کا خاک علم تھا تم نے ہی خوامخواہ مجھے پھنسا دیا......اور آج میں اس حالت کو پہنچ گیا ہوں۔ تم تو سارا بزنس سنبھال بیٹھے اور میں کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم مجھے میری بھتیجی کے ہاتھوں ہی ذلیل کروانا چاہتے ہو...... پہلے اس کے پیسے پر ہاتھ صاف کیا اور اب اس کی زندگی پر ڈاکا ڈالنا چاہتے ہو......تم کیسے دوست ہو وہ ایک یتیم بچی ہے اور یتیموں کا مال کھانا پیٹوں میں آگ ڈالنے کے برابر ہے۔" انور چچا قدرے اونچی آواز میں بولے تو راحیل انکل کھلکھلا کر ہنس دیے۔

"اسی لیے تو آسان راستہ بتا رہا ہوں کہ اس کی میرے بیٹے کے ساتھ شادی کر دو...... اس کے علاوہ تو کوئی اور آپشن تمھارے پاس ہے ہی نہیں اور یہ میں ہی ہوں...... انور جس نے تمھاری فضول بکواس سن لی، آئندہ اس لہجے میں مجھ سے بات کی تو جان لینا کہ وہ تمھاری زندگی کا آخری باعزت دن ہوگا۔ مجھے جلد از جلد اس رشتے کا مثبت جواب چاہیے......" وہ جواب کم دھمکی زیادہ دے رہے تھے۔

"لیکن شرجیل اور نور دونوں ہی اس رشتے میں اتنے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے۔"

"شرجیل تو بے وقوف ہے اسے کیا معلوم کہ بزنس چلانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور وہ جو گارمنٹس کی فیکٹری چلا رہا ہے وہ کس کی ہے...... ہونہہ...... پیسوں کے بغیر بزنس چلا کر تو دکھائے...... سارا دم خم نہ نکل جائے تو میرا نام بدل دے۔ اپنی بھتیجی کو بتاؤ کہ تم اس وقت پھانسی کے پھندے پر لٹک رہے ہو...... اگر وہ تمھیں بچا سکتی ہے تو بچا لے۔ شرجیل کی تم فکر نہ کرو...... میں اگر آج اسے عاق کر دوں تو کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جائے گا۔ اسے اس رشتے پر ہاں کرنا ہی ہوگی۔

"اس کے پاس بھی اور کوئی راستہ نہیں وہ یہ بزنس میرے بھروسے پر ہی تو کر رہا ہے ورنہ اس کے پاس ہے کیا۔ بی اے کی خالی خولی ڈگری...... کئی بی اے تو چپڑاسی بھرتی ہونے کے لیے بھی منتیں کرتے رہتے ہیں......" راحیل صاحب غصے سے پھنکارتے ہوئے بولے۔

اسے کچھ کچھ بات سمجھ میں آ گئی تھی اور وہ تقریباً بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس بات کے پیچھے اتنا پیچیدہ جال بچھا ہے اور شرجیل بھی یقیناً اس سے ناواقف تھا...... اس لیے تو اس نے آسانی سے اس رشتے سے انکار کو قبول کر لیا تھا...... اس کا دل جیسے پھٹنے کو تھا وہ بے حد پریشان تھی۔ اس سے وہاں رکنا محال ہو گیا وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ شدید شش و پنج کا شکار تھی...... اسی لیے انور چچا اس پر اتنی سختی کر رہے تھے ورنہ وہ اتنے سخت مزاج نہیں تھے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ پورچ سے گاڑی ریورس کرنے کی آواز آئی...... اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔

راحیل انکل گیٹ سے باہر جا چکے تھے اور انور چچا انتہائی مایوسی میں گیٹ کے پاس کھڑے تھے اور انھیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے ہی اندر آئے سلمٰی چچی ان پر برسنے لگیں، وہ ہمیشہ ان کی خوب بے عزتی کرنے کی عادی تھیں۔

”سنو...... انور تمہاری حماقتوں نے ہمیں آج یہ دن دکھا دیا ہے...... آئندہ اس شخص کو گھر نہ آنے دینا ورنہ تم دونوں کو دھکے مار کر باہر نکال دوں گی۔ بیوقوفیاں تم کرو اور سزائیں ہم بھگتیں......“ سلمٰی چچی غصے میں بولیں، چچا خاموش تھے۔ نور کمرے کے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باتیں سن رہی تھی۔

”کہاں گیا وہ سب پیسہ نہ جانے کس کس کو عیش کروائے اور اب اتنا قرضہ چڑھا لیا ہے۔“

”خدا گواہ ہے سلمٰی ایسی کوئی بات نہیں...... بس میری ناتجربہ کاری مجھے لے ڈوبی۔“ چچا روہانسے لہجے میں بولے۔

”تم تو ہو ہی ایک نمبر کے بیوقوف، گاؤدی...... تم جیسے شخص کے ساتھ تو شادی کرنا ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی...... تم تو اس قابل ہی نہ تھے۔“ نور کو بہت افسوس ہو رہا تھا سلمٰی چچی ان کی اتنی بے عزتی کر رہی تھیں اور وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ نور کو ان پر ترس آنے لگا پھر ایک دم خاموشی چھا گئی...... چچا اس کے پاس بھی نہیں آئے وہ بھی کمرے میں بند رہی۔

”دو دن بعد راحیل انکل کا فون پھر آ گیا...... وہ شاید دوبارہ انھیں ان کا وعدہ یاد دلا رہے تھے اور چچا ’ہوں‘ ہاں کر کے سن رہے تھے۔

اس کے بی۔ اے کے فائنل ایگزامز ہونے والے تھے اور وہ کتابیں بیڈ پر پھیلائے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب دروازے پر دستک ہوئی اور چچا کمرے میں

داخل ہوئے۔ وہ بہت شکستہ اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ نور انھیں دیکھ کر چونک گئی۔

''نور بیٹی...... آج میں تم سے کچھ بات کرنے آیا ہوں اور پھر فیصلہ تمہارا ہوگا...... یوں سمجھو آج تمھارے سامنے تمہارا چچا نہیں تمہارا مرحوم باپ ہے جس سے تم بہت پیار کرتی تھیں اور میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں...... میری کوئی اولاد نہیں لیکن خدا گواہ ہے تمھیں میں نے اپنی اولاد سے کم نہیں سمجھا......'' انھوں نے اسے راحیل انکل کے ساتھ کی گئی ساری ڈیل بتادی۔

''اب تمھارے ہاتھ میں میری عزت ہے...... کیا تم چاہو گی کہ میں یوں بے عزت ہو کر مر جاؤں۔ اگر راحیل کو اس کا پیسہ واپس نہ ملا تو تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کس حد تک گر جائے گا اور میں اگر اپنے جسم کا ایک ایک بال بھی بیچ دوں تو اس کا قرض نہیں اتر سکے گا...... پلیز...... مجھے بچا لو مجھے معلوم ہے تم ولیم کو پسند کرتی ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے اور مجھے تمھارے رشتے پر قطعی کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں بہت مجبور ہوں...... بہت مجبور...... اور اس گھر کی بات بھی باہر نہ جائے میں یہی چاہتا ہوں...... کیا تم میرے لیے یہ قربانی دے سکتی ہو...... کیا تم یہ کر سکتی ہو؟'' چچا نے روتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے...... وہ انتہائی بے بس لگ رہے تھے۔

''پلیز...... انور چچا...... آپ کیا کر رہے ہیں ہمت کریں کچھ نہیں ہوگا ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور یقیناً اس کا بھی ہوگا، آخر آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں مجھے تو اس ساری بات کے بیک گراؤنڈ کا علم ہی نہیں۔ آپ پلیز مجھے کچھ بتائیں تو سہی آخر بات کیا ہے......؟'' نور نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''راحیل ان دنوں لاہور میں تھا اور اس کی ریٹائرمنٹ قریب آ رہی تھی جب تمھارے ڈیڈی کا انتقال ہو گیا...... تمھاری جائداد تمھارے نام منتقل کرواتا رہا تھا۔ خدا گواہ ہے میرے دل میں رتی بھر بھی بے ایمانی نہیں تھی میں بے وقوف ضرور ہوں مگر بے ایمان نہیں...... جب اسے تمھارے ڈیڈی کی وصیت کا بھی علم ہو گیا جس میں مجھے تمہارا گارڈین بنایا گیا تھا، مجھے تب بھی قطعی علم نہیں تھا اس نے کیا پلاننگ کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے کنوینس کر لیا کہ میں تمہارا سارا پیسہ کاروبار میں لگا دوں تا کہ تمہارا مستقبل محفوظ کیا جا سکے اس ضمن میں، میں نے تمہارا گھر بھی بینک میں رہن رکھ دیا۔ اس نے چیچو کی ملیا میں شوگر مل لگانے کو کہا پھر خود ہی ارادہ بدل لیا اور کیمیکلز فیکٹری لگا لی۔ اس نے نقصان میں مجھ سے ففٹی پرسنٹ پر ڈیل

کی جبکہ پرافٹ میں ٹونٹی پرسنٹ پر۔ جب میں نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا تو کہنے لگا کہ تم تو صرف پیسہ انویسٹ کر رہے ہو جبکہ میں پیسہ بھی انویسٹ کر رہا ہوں اور اپنی محنت بھی۔

ایک سال تو آرام سے گزر گیا۔ پرافٹ بھی ٹھیک ٹھاک ملا...... وہ میں نے تمھارے اکاؤنٹس میں جمع کروا دیا پھر نہ جانے کیا ہوا ایک سال بعد مجھے خبریں ملنا شروع ہو گئیں کہ بزنس خسارے میں جا رہا ہے، کیسے خسارے میں جا رہا ہے مجھے علم نہ ہو سکا۔ سوائے اس کے کہ کنسائنمنٹ کینسل ہو گئی۔ یہ ہو گیا وہ گیا...... انہی دنوں بینک سے نوٹس ملنے شروع ہو گئے کہ جو لون لیا تھا مارک اپ سمیت اسے واپس کیا جائے میں تو شدید الجھ گیا پھر راحیل نے مجھے پینتیس لاکھ روپے دیے کہ میں بینک کا قرضہ واپس کر دوں میں نے کر دیا۔ پھر وہ سب کچھ بیچ کر کراچی چلا گیا۔ اب دو سال بعد اس نے وہ پیسہ اور پچھلا پیسہ ملا جلا کر میری طرف اسی لاکھ نکال دیے ہیں...... اور تم تو جانتی ہو میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی۔ مشکل سے یہ دس مرلے کا گھر بنایا ہے اور جاب بھی کیسی ہے تم سب جانتی ہو...... میں سخت پریشان تھا تو اس نے ایک اور آفر دی کہ میں اس کے بیٹے شرجیل کے ساتھ ففٹی پرسنٹ لاس اینڈ پرافٹ پر گارمنٹس فیکٹری لاہور میں لگاؤں میں نہ مانا تو کہنے لگا کہ اب تمہاری بھتیجی اس قابل ہو چکی ہے اس کو کاروبار میں شریک کر لو...... میں نے پہلے تو نہ کر دی اس نے مجھے ایکسپلائیٹ کرنا شروع کر دیا کہ یا تو میں اس شیئر پر رضامند ہو جاؤں یا اس کی رقم واپس کروں...... مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا کیونکہ راحیل کو تمہاری امریکا والی جائیداد کا بھی علم تھا، میں نے جب سرمائے کی کمی کی بات کی تو اس نے خود ہی امریکا والی پراپرٹی یاد دلائی اور مجھے چاروناچار ایسا کرنا پڑا۔ مجھے پھر بھی یقین تھا کہ وہ دوست ہو کر مجھ سے کوئی ایسی ویسی ڈیل نہیں کرے گا۔ جب ڈیل ہو گئی تو اس نے تمہارا رشتہ مانگ لیا میرے تو قدموں تلے زمین نکل گئی۔ میں تو قطعی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا گمبھیر جال بچھائے گا اور تم نے وہاں نوٹ کیا ہوگا کہ اس نے ڈاکومنٹس پہلے سے ہی بنوا کر رکھے تھے، ہمیں ڈسکس کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اب میں نے یہاں وکیل سے ڈسکس کیے ہیں تو میں حیران رہ گیا ہوں کہ ہم تو بری طرح پھنس چکے ہیں۔

''انکل...... یہ آپ نے کیا کیا......؟'' اتنا بڑا نقصان...... ڈیڈی نے آپ پر ہی تو اعتماد کیا تھا اور آپ نے اتنے بڑے بلنڈرز کیے ہیں۔'' نور پریشانی سے بولی۔

''ہاں...... لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں ہمارے پاس تو کوئی راستہ نہیں اس نے ہماری ساری کشتیاں جلا دی ہیں۔''

''آخر شادی کیوں ضروری ہے...... مجھے زندگی میں پیسے سے زیادہ اپنا سکون چاہیے......اپنی خوشی عزیز ہے میں ایسے مکار لوگوں میں کیسے زندہ رہ پاؤں گی جنھیں پیسے کی اتنی ہوس ہے......انکل یہ ناممکن ہے...... میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی، مجھے تو ایسے لوگوں کے سائے سے بھی خوف آتا ہے اس قدر لالچی اور مکار لوگ ہیں...... اور ویسے بھی میری کسی اور کے ساتھ کمٹمنٹ ہے۔''

''بیٹا میں سب جانتا ہوں لیکن پھر بھی میں مجبور ہوں اگر تم شادی سے انکار کرتی ہو تو سارا پیسہ تو جائے گا ہی ساتھ ساتھ اس نے جو قرضوں کے بوجھ ہم پر لاد دیے ہیں وہ ہم کہاں سے ادا کریں گے...... ہمارے پاس تو اس شخص نے ایک کوڑی تک نہیں چھوڑی...... تمھیں ہر صورت میں یہ شادی کرنا ہوگی۔''

''انکل اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شادی کے بعد وہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔''

''بیٹا تم سمجھ کیوں نہیں رہیں...... وہ سب جانتا ہے کہ ہمارے پاس کچھ نہیں، دراصل جو ففٹی پرسنٹ شیئرز پر فیکٹری کی ڈیل ہوئی ہے وہ اپنے ففٹی پرسنٹ میں تمھارے ففٹی پرسنٹ ملا کر مکمل طور پر مالک بننا چاہتا ہے، وکیل نے مجھے یہی بتایا ہے۔''

''اُف......آپ نے یہ کیا کیا......؟''

''میں تمہارا گنہگار ہوں لیکن ایک امید ہے کہ شرجیل باپ سے بہت مختلف ہے اور اچھا انسان ہے......وہ تمھیں خوش رکھے گا۔''

''انکل مجھ سے میری ساری خوشیاں چھیننے کے بعد آپ کن خوشیوں کی بات کر رہے ہیں...... آپ نے تو میرا سارا کچھ چھین لیا، مجھے کنگال کرنا چاہ رہے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''بیٹا پلیز ان سفید بالوں کی لاج رکھ لو مجھے اس شخص کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے بچا لو...... میں مانتا ہوں کہ میں تمہارا مجرم ہوں اور شاید میں اپنے آپ کو ساری زندگی معاف نہ کرسکوں......آئی ایم اے گریٹ فیلیئر ...... بٹ یو......'' چچا نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور موٹے موٹے آنسوان کا چہرہ تر کرنے لگے......وہ تڑپ اٹھی۔

''انکل بس کریں۔'' وہ ان کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے بولی تو وہ باہر نکل گئے اور وہ شدید الجھن کا شکار ہوگئی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات اس قدر خراب ہو جائیں گے۔ وہ بری طرح جکڑی جا چکی تھی...... ہر طرف گرداب تھے اور وہ سراسیمگی کے عالم میں

اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کر رہی تھی...... کبھی کبھی حالات کیسے انسان کی گرفت سے نکل جاتے ہیں اسے اندازہ بھی نہیں ہو پاتا...... وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی مگر اب وہ بھی لحہ بہ لحہ بکھر رہی تھی...... جب سے صورتِ حال کھل کر سامنے آئی تھی۔ سلمٰی چچی ہر وقت چچا کی بے عزتی کرتی رہتیں اور وہ خاموشی سے سب کچھ سنتے جاتے۔ چچا کے ساتھ وہ اسے بھی باتیں سنانے سے گریز نہ کرتیں۔ وہ بہت تلخ ہو جاتی تھیں مگر دل سے ہمدردی بھی بہت کرتی تھیں......اسی لیے تو اس نے ان کے پاس رہنے کا فیصلہ کیا تھا وہ ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی تھی مگر چچا کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا دماغ سوچ سوچ کر تھک جاتا تھا...... ہر وقت موحد آنکھوں کے سامنے گھومتا جس سے اس نے زندگی کی آخری سانسوں تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ انسانی دعوے کتنے بودے ہوتے ہیں اور وجود کتنے کھوکھلے......وہ انتہائی بے بسی سے سوچ رہی تھی۔

......✿......

شفق بہت پریشان تھی......مما کے آخری لمحات اور اس کی ہٹ دھرمی سب کچھ اندر ہی اندر اسے جھنجوڑ رہا تھا...... اسے سرزنش کر رہا تھا اس نے جو کچھ بھی کیا غلط کیا......وہ تو ماں تھیں اور شاید ایک مجبور ماں وہ کیوں اتنی کٹھور ہو گئی...... سب کے سمجھانے کے باوجود...... کاش اسے اندازہ ہوتا کہ بعد میں وہ اتنی مضطرب ہو جائے گی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتی۔ اسے مما کے الفاظ شدت سے یاد آ رہے تھے...... جب وہ ولیم کا خیال رکھنے کے بارے میں کہہ رہی تھیں......

میں کیسے اسے بھائی مان لوں...... میرا بھائی تو صرف آفاق تھا...... یہ...... یہ تو مما کا بیٹا ہے...... میرا اپنا بھائی مجھ سے روٹھ کر چلا گیا تو یہ کیسے میرا بھائی بن سکتا ہے...... بھائی تو دکھوں کو سمجھنے والے اور انھیں شیئر کرنے والے ہوتے ہیں...... جو بہنوں کے لیے مضبوط ڈھال ہوتے ہیں، ان کی آہوں پر تڑپنے اور لپکنے والے...... ان کے آنسوؤں کو پونچھنے والے جو دلوں کے قریب رہتے ہیں...... جس کے بارے میں سوچنے سے روح بھی مسرور ہو جاتی ہے......محبتوں بھرا یہ رشتہ کس قدر انمول ہے مگر میں اس رشتے کی لطافت سے بے بہرہ رہی۔ آفاق کبھی بھی ایسا بھائی نہ بن سکا جو میرے لیے کبھی ڈھال بنتا...... جس کی موجودگی سے میری روح بھی سرشار ہو جاتی جو میرے کبھی آنسو بھی پونچھتا...... وہ تو کچھ بھی نہ کر سکا لیکن وہ تھا تو طمانیت کا اک احساس تھا کہ پوری دنیا میں میری ماں کی نشانی میرے پاس ہے...... ہمارے

وجودوں میں ماں کی آغوش کی خوشبو ایک جیسی تھی اور میں اسے اپنے لیے قیمتی سرمایہ سمجھتی تھی...... پوری دنیا میں میرا اپنا بھائی...... یہ میرا بھائی کبھی بھی نہیں بن سکے گا اور میں اسے کبھی بھی آفاق کی جگہ نہیں دے سکوں گی...... یہ کیسے ممکن ہے......؟ وہ اپنے آپ کو جھٹلاتی اور پھر مما کا چہرہ نظروں کے سامنے گھومنے لگتا جنھوں نے آخری لمحات میں بس یہی اک آرزو کی تھی۔ انھوں نے اس سے کچھ بھی طلب نہیں کیا تھا اور اس کے کندھوں پر کتنی بڑی ذمے داری ڈال دی تھی۔ مما نے ایسا کیوں کیا......؟ وہ سب کچھ جانتی بھی تھیں پھر بھی انھوں نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا۔ وہ جھنجلانے لگی تھی، مما پر اسے غصہ آنے لگا انھوں نے مر کر بھی مجھے آزمائش میں ڈال دیا...... لیکن اگلے ہی لمحے کسی نے بری طرح سرزنش کی۔ یہ مما کی آرزو تھی...... اور مجھے یہ پوری کرنی ہے...... لیکن...... نہیں...... یہ ناممکن ہے وہ ایک دفعہ اپنے آپ کو سمجھاتی تو دوسرے ہی لمحے جھنجلا جاتی۔ وہ سخت کشمکش اور شش و پنج میں مبتلا تھی پھر وہ اچانک اٹھی اور موحد کے کمرے کی طرف بڑھی...... دروازہ کھولنے سے پہلے ایک دفعہ اس کے قدم وہیں رک گئے...... وہ جھنجلا گئی...... پھر زور سے دروازہ کھول دیا۔ موحد ایک اسلامی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا اس نے سر اٹھا کر اور قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ......؟ آ جائیں......'' وہ قدرے آہستگی سے بولا مبادا وہ کہیں پھر ناراض نہ ہو جائے۔

''نہیں...... میں جا رہی ہوں......'' وہ پھر مڑ گئی موحد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا وہ پھر جھنجلا گئی...... اور اس کی طرف مڑ کر دیکھا وہ حیرت سے ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا...... وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ قطعی نارمل رویہ نہیں تھا۔

''کیا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟'' وہ اس کی بے چینی اور جھنجلاہٹ دیکھ کر بولا۔

''سنو...... کیا تم مما سے بہت محبت کرتے تھے؟'' اس کے اس اچانک سوال پر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہاں...... اور...... آپ......؟''

''نہیں...... میں بالکل نہیں...... میں ان سے محبت نہیں کرتی تھی۔''

''کیا اب بھی نہیں...... جبکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔''

''ہاں...... اب بھی نہیں وہ ہمارے لیے تب ہی مر گئی تھیں جب ہمیں چھوڑ کر......''

''میرے ڈیڈی سے شادی کر لی۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ہاں......''

''بار بار اس بات کو دُہرانے سے فائدہ...... اب آپ مجھے کیا بتانے آئی ہیں؟''
موحد نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''میں...... میں، کچھ بھی نہیں......'' وہ پھر مڑنے لگی۔

''آپی آپ کیوں پریشان ہیں آپ کو مجھ سے اگر کچھ کہنا ہے تو آپ کہہ سکتی ہیں۔''

''تم میرے بھائی نہیں ہو اور میں تمہاری آپی بھی نہیں......سنا تم نے!''

''آپ کی دونوں باتیں غلط ہیں...... میں آپ کا بھائی بھی ہوں اور آپ میری آپی بھی ہیں، میں سگا نہ سہی سوتیلا تو ہوں...... اور خدا نے جو ہمارے درمیان رشتہ بنایا ہے آپ اس کو کبھی مٹا نہیں سکتیں۔

''میرا بھائی صرف آفاق تھا اور وہ مر گیا ہے......'' وہ قطعیت سے بولی۔

''لیکن آپ میری بہن ہیں اور جب تک میں زندہ ہوں آپ میری بہن رہیں گی اور میں آپ کو دل سے اپنی بہن مان کر عزت کرتا رہوں گا۔'' وہ بھی پُرسکون لہجے میں بولا۔

''شفق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا...... اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی کے پیچھے رقصاں سچائی کو محسوس کیا اور اس کے قریب صوفے پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''یہ محبت ہے جو بالکل انجانے لوگوں کو بھی دل کے اتنے قریب لے آتی ہے کہ رشتے داریاں بھی پیچھے رہ جاتی ہیں اور میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں...... آپ کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری مما میرے سامنے آ گئی ہیں آپ کو سنتا ہوں تو لگتا ہے مما مجھ سے بات کر رہی ہیں...... کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنے دل سے ساری نفرتیں ختم کر دیں...... ساری رنجشیں...... اور ہم دونوں بہن بھائی ایسے رہیں جیسے تبسم آنٹی اور حیدر انکل ہیں...... وہ دونوں بھی تو سگے بہن بھائی نہیں لیکن آنٹی، انکل سے کس طرح محبت سے ملتی ہیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں اکثر خدا سے دعا کرتا تھا کہ وہ مجھے بھی ایسی بہن دے، سچی محبت کرنے والی، بلائیں لینے والی...... کیا آپ میری ایسی بہن نہیں بن سکتیں؟'' موحد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بہت محبت سے سوال کیا۔

''یہ ناممکن ہے......''

''لیکن میں اس کو ممکن بناؤں گا......'' موحد نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محبت سے انھیں اپنی آنکھوں کے ساتھ لگایا۔ شفق چونک گئی، اس

کے لیے محبت کا یہ لمس، یہ احساس اتنا نیا اور لطیف تھا کہ وہ حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیسے اور کہاں سے ڈھیروں آنسو بھر آئے وہ اس کی محبت کے آگے کوئی بند نہ باندھ سکی اور بالکل مزاحمت نہ کر سکی۔ آفاق تو اس کا سگا بھائی تھا مگر اس نے کبھی ایسے نہیں کیا تھا...... اس نے تو کبھی محبت سے اسے چھوا بھی نہیں تھا اور جسے وہ بھائی ماننے کو تیار ہی نہیں تھی اس نے کیسے ایک ہی منٹ میں اجنبیت کی ساری دیواریں مسمار کر دیں تھیں، اسے اپنی محبت کے حصار میں لے لیا تھا...... اور اسے چونکا دیا تھا...... اس کے اندر اتنی محبت اور وارفتگی کہاں سے عود آئی تھی، شاید اس کے اندر محبت کا چشمہ فراوانی سے بہتا تھا جس نے اسے ایک ہی لمحے میں سیراب کر دیا تھا کہ اس کی روح بھی سرشار ہو گئی تھی...... اس کا بھی ہاتھ محبت سے اس کی طرف بڑھا اور اسنے اس کے سر پر ہاتھ رکھا...... وہ اس کے قریب آیا اور اس کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا...... اس نے محبت سے اس کی پیشانی کو چھوا اسے یوں محسوس ہوا جیسے آفاق اس کے سامنے تھا اس کا چھوٹا، پیارا سا بھائی، اس کا ماں جایا...... وہ بھی بے حد مسرور ہو رہا تھا...... اسے اس سے مما کی خوشبو آ رہی تھی...... اس کی بہن، مما جیسی کتنا خوبصورت رشتہ تھا، کتنا قریبی اور کتنا منفرد...... قدرت نے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت بھر دی تھی اور دونوں اس محبت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فرطِ جذبات سے دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

......۞......

وہ سخت مخمصے میں تھی جب اچانک شرجیل کا فون آ گیا وہ کچھ روز کے لیے ہانگ کانگ، فیکٹری کی نئی مشینری خریدنے کے لیے گیا تھا اور جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ نور نے کئی دفعہ اسے رنگ کیا تھا تو اس نے فوراً ہی اس سے رابطہ کیا وہ ہر بات سے لاعلم تھا یہ جان کر وہ حیران رہ گئی۔

''شرجیل...... آپ کے ڈیڈی ہر ممکن یہ چاہ رہے ہیں کہ ہماری شادی ہو جائے۔'' وہ بہ مشکل بولی۔

''لیکن وہ کیوں بضد ہیں...... میں نے تو انھیں آرام سے سمجھا دیا تھا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے پھر بھی...... نہ جانے کیوں......؟'' وہ خود ہی حیرت سے بولا۔

''کیا واقعی آپ سے انھوں نے کچھ ڈسکس نہیں کیا......؟''

''بخدا بالکل نہیں...... میں تو آج ہی ہانگ کانگ سے لوٹا ہوں اب آپ مجھ سے

کیا چاہتی ہیں......؟''

''معلوم نہیں......'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''نور...... میں نہیں جانتا کہ قدرت نے ہمارے لیے کیا فیصلہ کیا ہے میں پوری کوشش کروں گا کہ ایسا نہ ہو لیکن اگر خدا نے ہماری قسمتوں میں کچھ ایسا لکھ دیا ہے تو یقین رکھنا میں تنگدل انسان نہیں...... آپ کی جو بھی کمٹمنٹ کسی سے ہے وہ میرے لیے محترم رہے گی......اور میں وعدوں پر نہیں حقیقت اور عمل پر یقین کرنے والے بندہ ہوں۔ آئی ایم ہنڈرڈ پرسنٹ پریکٹیکل'' نور خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ فیکٹری کا پیپر ورک مکمل ہو چکا تھا اور اب اسٹیبلشمنٹ کے مراحل میں تھی لیکن جب سے یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تھی اس کا دل ٹوٹ سا گیا تھا...... گو کہ چچا نے ہی یہ کام شروع کیا تھا مگر اس کی دلچسپی بھی بزنس میں تھی اور اب نہ دلچسپی رہی تھی نہ کسی قسم کا جذبہ...... ہر چیز جیسے تباہی کی طرف گامزن تھی...... سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا تھا......وہ جو لمحوں میں معاملات حل کرنے کی دعوے دار تھی اور اسے اپنی صلاحیتوں پر بہت اعتماد تھا اب خود ہی کشمکش کا شکار ہو گئی تھی۔

انور چچا اس کی طرف ایسی بے بس نگاہوں سے دیکھتے کہ اس کا دل کٹنے لگتا...... انھوں نے گھر سے باہر جانا چھوڑ دیا تھا ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتے اور جب اس کی طرف دیکھتے تو آنکھوں میں اَن گنت سوال اور التجائیں ہوتیں۔ سلمیٰ چچی اٹھتے بیٹھتے ان کو صلواتیں سناتی رہتیں...... ایسا لٹا پٹا شخص جس کی سادہ لوحی نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا، اب کسی معجزے کا منتظر تھا۔ راحیل انکل کا جب بھی فون آتا ان کے اوسان خطا ہو جاتے...... اور اس وقت ان کی بے بسی ناقابلِ بیان ہوتی۔ ایسی صورتِ حال میں فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا خاموش تماشائی بن کر وقت گزارنا بہت کٹھن ہو گیا تھا...... زندگی نے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں ہر طرف کانٹوں کا جال بچھ گیا تھا اور اسے دامن بچائے بغیر اس جال کو پھلانگنا تھا...... وہ کس طرح اپنے آپ کو بچائے یہ فکر دامن گیر تھی...... اس کی ساری صلاحیتیں جیسے منجمد ہو گئی تھیں۔

......✿......

تبسم آپا دسویں کے بعد واپس جا رہی تھیں اور حیدر سمیت گھر کے سب افراد بہت افسردہ تھے۔ ان کے وجود سے گھر بھر میں اجالا سا پھیل گیا تھا اور سب ان کی موجودگی سے

اک حرارت سی محسوس کرتے اک مہربان بزرگ کی جن کی آنکھوں سے صرف اور صرف محبت کی شعاعیں ہی پھوٹتی تھیں، لہجے کی مٹھاس اور محبت کی شیرینی سننے والے کے کانوں میں رس گھولتی تھی...... انھوں نے ان دنوں جس طرح شفق اور موحد سے محبت کی تھی وہ کبھی بھی انھیں بھلا نہیں سکتے تھے۔ کرنل مغیث اینا اور شیم انھیں لینے آئے تھے، وہ بھی انہی کی طرح بہت محبت کرنے والے تھے...... شفق اور موحد ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اینا ویسے تو ڈاکٹر تھی مگر اس کی عادتیں بالکل بچوں والی تھیں...... وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھرپور قہقہے لگاتی اور جان بوجھ کر احمقانہ حرکتیں کرتی تا کہ مما اور پاپا اس کی باتوں کو انجوائے کریں لیکن وہ اتنی احمق نہیں تھی جتنا وہ ظاہر کرتی تھی...... ان سب کی موجودگی میں وہ اپنی ساری تلخیاں تھوڑی دیر کے لیے بھلا بیٹھے تھے...... شفق اور موحد میں آہستہ آہستہ بے تکلفی پیدا ہو رہی تھی...... اجنبیت کی دیواریں گر رہی تھیں...... وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ڈسکس کرنے لگے تھے، شفق بھی کافی حد تک نارمل ہو رہی تھی۔ کبھی اس کی وہیل چیئر لے کر لاؤنج میں لے آتی تو کبھی کمرے میں اور اکثر اس کے لیے کھانا بھی لے جاتی...... تبسم آپا اور حیدر اس میں یہ تبدیلی دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور خدا کا شکر ادا کرتے۔

تبسم آنٹی کے بچوں کے قیام کے دوران تو وہ بہت خوش رہنے لگے تھے...... اب جب آنٹی جا رہی تھیں تو دونوں پھر افسردہ ہو گئے تھے اور وہ انھیں بار بار تسلیاں دے رہی تھیں کہ وہ ان سے ملنے آتی رہیں گی۔ انھوں نے جس طرح موحد کو اسلامی آدابِ زندگی سکھائے تھے وہ ان سے بہت متاثر ہوا تھا...... خدا نے کیسے اس کے لیے خود بخود بندوبست کر دیا تھا وہ اکثر سوچ کر حیران رہ جاتا۔ اس نے ہلکی ہلکی داڑھی بھی رکھ لی تھی......

وہ پکا اور سچا مسلمان بننا چاہتا تھا۔ سنت نبوی ﷺ پر مکمل طور پر عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔ اسلام اور ایمان کی تابانیوں سے اپنے وجود کے ایک ایک گوشے کو منور کرنا چاہتا تھا وہ نام نہاد مسلمان بن کر زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا...... وہ ابدیت اور لافانیت کے وسیع بحر میں غوطہ زن ہونا چاہتا تھا...... ان کے جانے کے بعد دونوں افسردہ ہو رہے تھے اور حیدر، شفق کے کہنے پر دونوں کو گاؤں لے کر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شفق موحد کو حویلی اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں سب کچھ مزے لے لے کر بتا رہی تھی اور وہ حیرت سے سن رہا تھا۔

"شفق آپی...... نور کو بھی ساتھ لے لیں......" اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں تم اسے فون کرو...... خوب مزہ آئے گا اور وہ اتنے

دنوں سے آئی بھی نہیں۔'' شفق پیکنگ کرتے ہوئے بولی۔

''اس کے بی۔ اے کے ایگزامز ہونے والے ہیں نا...... پڑھائی میں بہت مصروف ہے میں ابھی اسے فون کرتا ہوں وہ ہمارے ساتھ جانے پر ضرور تیار ہو جائے گی۔'' اس نے خوشی خوشی اسے فون کر کے آنے کو کہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اس کے سامنے تھی مگر کچھ کچھ خاموش سی تھی۔ موحد اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کچھ دبلی بھی لگ رہی تھی، اس کی سفید رنگت بھی پیلاہٹ کا شکار ہو گئی تھی اور آنکھیں ایسے سوجی تھیں جانے کب سے سوئی نہیں تھی۔

''کیا بات ہے نور...... تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟'' موحد نے حیرت سے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... تمہارا وہم ہے...... اور تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے اردگرد پیک سامان دیکھ کر پوچھا۔ شفق اس سے مل کر دوسرے کمرے میں تیار ہونے چلی گئی تھی۔

''ہم لوگ گاؤں جا رہے ہیں...... تم بھی ہمارے ساتھ چلو نا......!'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''نہیں...... میں نہیں جا سکتی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کیوں......؟'' نور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اپنے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا موحد حیرت سے اس کو آبزرو کر رہا تھا اس نے ویڈنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ...... یہ کیا ہے......؟'' اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

''کھول کر دیکھ لو......'' وہ آہستہ سے بولی۔ اس نے بے صبری سے لفافہ کھولا...... اس کے ہاتھ مسلسل کانپ رہے تھے۔ اس نے مشکل سے کارڈ کھولا...... اس کے جذبات میں شدید تلاطم پیدا ہونے لگا...... سارا جسم پسینے میں نہا گیا اس نے گھبراتے ہوئے کارڈ کھولا تو ایک دم چیخ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا...... نور سر جھکائے بیٹھی تھی...... اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

''تم ایسا نہیں کر سکتی ہو...... تم...... نور...... تم نے جو مجھ سے وعدہ کیا تھا کیا تم بھول گئیں...... اتنی جلدی......'' اس کی آنکھوں سے آنسو بس چھلکنے کو ہی تھے۔ نور نے اس کی آواز کے ارتعاش سے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

''موحد...... تم کھڑے ہو گئے! کیا تم جانتے ہو کہ تم ٹھیک ہو گئے ہو!'' وہ حیرت اور خوشی سے چلا رہی تھی مگر وہ اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔

''اس بات کو چھوڑو...... اور مجھے جواب دو۔'' وہ کچھ اور سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''کیا...... اس بات کو چھوڑ دوں جس کے لیے میں نے اتنے وظیفے اور دعائیں کیں اور خدا نے کیسے لمحوں میں یہ معجزہ کر دیا...... آئی ایم رئیلی سوہپی۔''

''پلیز نور...... میرے لیے اس وقت کچھ اہم نہیں سوائے تمھارے...... تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا بولو...... جواب دو۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''رشتوں کو بچانے کے لیے کبھی کبھی بہت بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں اور مجھے بھی یہ کرنا پڑا......'' وہ منہ دوسری طرف کر کے بولی۔

''تم ایسا نہیں کر سکتیں...... اور مجھ سے جو وعدہ کیا تھا۔''

''میں ہمیشہ یہ بھی تو کہتی تھی بشرطیکہ خدا بھی ایسا چاہے اور موحد اب خدا ایسا نہیں چاہ رہا...... وہ ہمارا ساتھ نہیں دے رہا...... میں نے اس کے آگے بہت ہاتھ جوڑے ہیں، بڑی دعائیں کی ہیں...... بہت واسطے دیے ہیں مگر...... مگر نہ جانے وہ یہ دعا کیوں نہیں سن رہا...... میں کیا کروں۔'' وہ بھی روہانسے لہجے میں بولی۔

''کیوں...... وہ کیوں نہیں سن رہا...... کیا وہ ہم سے محبت نہیں کرتا...... کیا وہ نہیں جانتا کہ ہم بھی کتنی محبت کرتے ہیں...... وہ کیوں ایسا چاہ رہا ہے؟''

''شاید وہ ہماری آزمائش کرنا چاہ رہا ہے......'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''نہیں...... وہ ہمیں توڑنا چاہتا ہے...... منتشر کرنا چاہتا ہے وہ...... وہ کیوں ایسا کر رہا ہے اور میرے ساتھ ہر دفعہ ایسا کیوں کرتا ہے پہلے مما اور اب تم...... نہیں یہ نہیں ہوگا۔ میں بکھر رہا ہوں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''موحد...... مجھے رونے والے مرد پسند نہیں میرے سامنے مت رویا کرو...... مجھ سے تمھارے آنسو برداشت نہیں ہوتے کبھی بھی نہیں۔'' وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ چہرہ دوسری طرف کر کے بولی۔

''اور تم بھی تو رو رہی ہو۔''

''لیکن میں تمھیں مضبوط دیکھنا چاہتی ہوں...... ایسا مضبوط کہ پہاڑ بھی تم پر ٹوٹ پڑیں تو تم گھبراؤ نہیں...... یہ میری خواہش ہے شاید آخری خواہش۔'' موحد پھر رونے لگا۔ وہ سسکیاں بھر رہا تھا اور وہ بھی نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی مگر کچھ بول نہیں رہی تھی۔

''نور...... خدا ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے؟'' وہ روتے ہوئے بولا۔

''شاید ہم زندگی میں جس شے اور جس ہستی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ زندگی میں ایک بار ضرور اسے ہمارے سامنے آزمائش بنا کر کھڑا کر دیتا ہے...... کبھی محبتوں میں آزماتا ہے تو کبھی جذبوں میں اور کبھی رشتوں میں...... اور میں تو ہمیشہ رشتوں میں آزمائی جاتی رہی ہوں اور اب جذبے سے بھی ہار گئی۔''

''ایسی کیا قیامت آ گئی ہے کہ شرجیل سے تمہاری شادی بہت ضروری ہے۔''

''میں کیا کہوں...... میرے پاس کہنے کو کچھ بھی تو نہیں جب خدا ہی کسی بات کو ہمارے لیے بہت ضروری بنا دے تو فرار کہیں ممکن نہیں...... میرے لیے بھی فرار کا کوئی راستہ نہیں میں اس کو چیلنج نہیں کر سکتی۔''

''تو پھر مجھے بتاؤ...... میں کیا کروں...... میں تو زندگی کا تصور بھی تمھارے بغیر نہیں کر سکتا میری سوچوں پر، میرے جذبوں پر، میرے دل و دماغ پر، میری روح پر ہر جگہ تو تم ہو......صرف تم، میں کیا کروں گا، میں پاگل ہو جاؤں گا یا پھر مر جاؤں گا۔''

''نہیں موحد، تمھیں کچھ نہیں ہوگا یاد ہے جب ہم ملے تھے تو میں ایک بات کہا کرتی تھی کہ معلوم نہیں ملاپ ہونا قسمت میں ہے کہ نہیں مگر میں اپنی زندگی میں اور ماضی میں ایک ایسی کھڑکی ضرور رکھنا چاہتی ہوں...... جب زندگی کے درد و غم سے گھبرا جاؤں تو اس سے تازہ جھونکے لینے کے لیے اسے کھول دوں......کبھی کبھی نادانستہ کہی ہوئی باتیں کیسے پوری ہو جاتی ہیں۔ میں وہ بات بھول گئی تھی اور خدا سے ہمیشہ اپنے اور تمھارے ملاپ کی دعا کرتی تھی لیکن وہ بھولی ہوئی بات کیسے سامنے آ گئی اور موحد...... یاد ہے وہ اسکٹ بروکن ہارٹس جس میں پرنس محبت میں ناکام ہوتا ہے تو پادری بن جاتا ہے اور لڑکی نن...... مائی گاڈ...... دیکھو وہی اسکٹ، وہی تھیم، وہی سب کچھ ہمارے ساتھ ہو گیا ہے اور اس وقت اسٹیج پر ہم کیسے سراہے گئے تھے صرف جذبات سے بھرپور ایکٹنگ کی وجہ سے اور اب حقیقت میں بھی ہم جذبوں کی شدت کے ساتھ...... رخصت ہو رہے ہیں......موحد کیسے کوئی غیر مرئی قوت ہم سے سب کچھ کرواتی ہے ہم پتلیاں ہیں اور کچھ نہیں۔''

''میں کچھ نہیں سننا چاہتا...... میں تمھیں جانے نہیں دوں گا...... یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے سارا کچھ آہستہ آہستہ دے کر اب سارا کچھ ایک دم چھین رہی ہو۔ میرا نام...... میرا اعتماد...... میرے اندر پھیلی روشنی...... یہ سب تمہاری دین ہی تو ہے......نہیں، میں تمھیں نہیں جانے دوں گا'' وہ بہت بے صبرا ہو رہا تھا۔

''موحد...... خدا شاید تمھیں کندن بنانا چاہتا ہے...... ہم دونوں کا وقتی ملاپ شاید ایک دوسرے کی آزمائش تھا۔''

''میں کچھ نہیں جانتا...... تمہاری کوئی لاجک، کوئی ریزن کچھ بھی نہیں بس تم ایسا کچھ نہیں کرو گی...... نور...... ایسا کرتے ہیں کہ نہ تم شادی کرو اور نہ میں...... ہم دونوں تنہا تنہا زندگی گزار لیں گے، کیا یہ بھی ممکن نہیں؟''

''نہیں...... کبھی کبھی کسی کو زندگی بچانے کے لیے اپنی سانسیں بھی قربان کرنا پڑتی ہیں، بس سمجھ لو اب میں بھی ایسی ہی مجبور ہوں۔''

''کس کی خاطر...... کون ہے وہ جو تمھیں مجھ سے بھی بڑھ کر عزیز ہو گیا...... کون ہے وہ خوش قسمت......؟''

''میرے چچا...... میرے ڈیڈی کے بھائی، میرے رشتے دار...... جو مجھے اپنی بیٹی کہتے ہیں۔''

''ان کے لیے......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... انہی کے لیے۔''

''کیا وہ تمھیں مجھ سے زیادہ عزیز ہیں؟''

''نہیں......'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''تو پھر...... کیوں مجھے الجھا رہی ہو...... تم ہمیشہ سے مجھے الجھاتی آئی ہو......''

''تم سے تو میرا دل کا رشتہ ہے، دل کے رشتے تو اندر ہی اندر روح تک کو کھوکھلا کر دیتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی...... زہر میں بجھے خنجر کے مانند...... جو رگوں میں بہتے خون کو آہستہ آہستہ زہر آلود کر دیتا ہے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا...... مگر دنیا کی نظر میں یہ رشتے بالکل بھی اہم نہیں...... دنیا کو تو وہ رشتے چاہئیں جو نظر آتے ہیں وہ ان کو مضبوط دیکھنا چاہتی ہے، موحد دل کے رشتے ہار جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی مگر ہم چل پھر رہے ہوتے ہیں...... صحت مند انسانوں کے مانند ہنستے، قہقہے لگاتے ہیں جبکہ ہمارے دل اس وقت بھی سسکیاں لے رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے یہ کس کا المیہ ہے انسانوں کا...... جذبوں کا...... یا پھر رشتوں کا......'' اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ اس کے سامنے یوں روئی تھی اور اس سے اس کے آنسو بھی برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ نور جیسی لڑکی بھی رو سکتی ہے۔ جب دوسروں کی ہمت بندھانے والا خود ریزہ ریزہ ہوتا ہے اور شکستہ پر طائر

کی طرح پھڑ پھڑاتا ہے، روتا ہے اور سسکتا ہے تو پوری کائنات تھم سی جاتی ہے، ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتی ہے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے...... ہر انسان رک کر اسے دیکھتا ہے ایسا مضبوط انسان بھی یوں ٹوٹ سکتا ہے......اشک بہا سکتا ہے جیسے مضبوط سنگلاخ پتھروں سے بھی چشمے جاری ہو سکتے ہیں۔ دونوں رونے لگے زندگی میں آخری بار یا پہلی بار ایسی شدت سے جس سے دل بھی شق ہوتے ہوئے محسوس ہوں اور کلیجے پھٹتے ہوئے......شفق اچانک کمرے میں آئی تو چونک گئی موحد کھڑا تھا اور رو رہا تھا، نور بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔

''کیا ہوا...... خیریت تو ہے......تم دونوں کیوں رو رہے ہو......؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' نور بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ وہ وہیں ساکت سا کھڑا رہا پھر اس کے پیچھے بھاگا...... وہ گیٹ سے باہر نکل رہی تھی...... اس نے اسے آواز دی وہ رکی اور سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''نور...... میں...... تمہارے لیے کیا دعا کروں؟'' اس نے گہرے دکھ سے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں چاہیے...... کوئی دعا نہیں جب دنیا کی قیمتی شے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جائے تو ساری زندگی انسان کیا دعا کر سکتا ہے۔ اس کے پاس تو کوئی آپشن ہی نہیں ہوتا اب تو زندگی کا سفر ہے جیسے تیسے اس کا مسافر تو بننا ہی ہے مگر کیا تم میری ایک خواہش کو پورا کرو گے؟'' اس نے استفہامیہ نگاہوں سے پوچھا۔

''کیا......؟''

''یہ آنکھیں کبھی بھیگنے نہ پائیں، کبھی بھی نہیں، چاہے کسی دن میری موت کی خبر بھی سنو تب بھی نہیں......''

''دل میں خنجر پیوست ہو...... اور کوئی قطرۂ خون بھی نہ بہے یہ ناممکن ہے میں یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا......'' وہ نم آلود آنکھوں سے بولا۔

''تو کیا تمہارے در سے میں یونہی خالی ہاتھ چلی جاؤں...... وقت رخصت کوئی تحفہ لیے بغیر......'' اس نے زخمی لہجے میں پوچھا تو وہ دل مسوس کر رہ گیا اور نم آنکھوں کے ساتھ بے تاب ہو کر اندر لوٹ آیا...... اس سے ضبط نہیں ہو رہا تھا وہ لمحہ لمحہ پگھل رہا تھا ایسی بے قراری اور بے تابی کہ اس کا دل پھٹنے کو تھا...... وہ جا چکی تھی اور شفق پریشان تھی۔ اس نے حیدر انکل کو فون کیا اور جیسے ہی وہ آئے نور کا کارڈ ان کے سامنے رکھ دیا وہ تو چونک ہی گئے اور لرزتے

ہاتھوں کے ساتھ کارڈ کھولا...... کارڈ پڑھا تو دو آنسو نہ جانے کہاں سے آ کر کارڈ پر گرے...... انھیں اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ دکھ دینے لگے۔

''خدا کرے...... جسے تم چاہتی ہو وہ تمہارا نصیب بھی بنے اور کتنے نصیب والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا خدا یوں ملاپ کرا دے انسان سوچے تو اسے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔''

وہ بھی انہی کی طرح نکلی تھی کیا وہ دونوں بھی ایسے ہی تڑپتے رہیں گے، یا خدایا...... یہ کیسی آزمائش ہے نہ جانے یہ محبت کی معراج ہے یا پھر...... آزمائشوں کی...... ان کی دل کرچی کرچی ہو رہا تھا اور شہلا آنکھوں کے سامنے نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی...... ''دل کی دنیا کن ناموں سے آباد ہوتی ہے کسے خبر ہوتی ہے؟'' انھوں نے آہ بھری۔

حیدر انکل نے اس کے چچا سے رابطہ کیا اور انھیں روکنے کی کوشش کی مگر انھوں نے ذاتی معاملہ کہہ کر انھیں خاموش کرا دیا۔ انھوں نے نور سے بھی بات کی مگر وہ بھی خاموشی سے سنتی رہی اور پھر اچانک خدا حافظ کہہ دیا۔

''یا خدایا! تو کیوں ایسے لوگوں سے ملا دیتا ہے جو کسی اور کا نصیب ہوتے ہیں......''

موحد رات کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر خدا سے دعا کرتا، جب وہ تڑپ رہا ہوتا...... وہ بھی بے قراری محسوس کرتی تھی...... جب وہ سکتی تو اسے لگتا جیسے کوئی اسے یاد کر رہا ہو...... جب وہ تنہائی میں چونک جاتی تو لگتا وہ اسے دیکھ رہا ہے اور بلا رہا ہے اور جب وہ آہیں بھرتا تو اسے لگتا کہ وہ بھی اس کے لیے یونہی بے قرار ہے۔ دل کے رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں نہ سمجھ میں آنے والی داستاں جو دل کے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ دکھ سہتا ہے...... یہ فلسفہ تھا یا حقیقت!

شفق اس کا بہت خیال رکھتی...... وہ گاؤں نہیں گئے تھے یا پھر کہیں بھی جانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ شفق اس سے ڈھیروں باتیں کرنے لگی تھی مگر وہ کہیں گم ہو جاتا...... بات کرتے کرتے رک جاتا...... آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے نمی آ جاتی تو جلدی سے ضبط کرنے کی کوشش کرتا...... کسی کی آواز کی بازگشت سنائی دیتی ''میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی......'' وہ جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو رگڑنے لگتا مبادا کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اور اس سے روٹھ نہ جائے...... شفق چونک کر اس کی طرف دیکھتی اور سوچتی، کوئی اتنا دور ہونے کے بعد بھی اتنا قریب ہو سکتا ہے۔ یہ سراب تو نہیں اور یہ تخیل بھی تو نہیں...... یہ تو دل کی دنیا ہے اور دل کی باتیں ہیں...... نہ سمجھ میں آنے والی...... نہ نظر آنے والی شفق اسے یوں افسردہ اور دکھی دیکھتی تو سہیل نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ اس کے دل

سے بھی آہ نکلتی اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی۔

حیدر اسے دیکھتے تو ان کا دل بھی کٹنے لگتا...... اپنا زمانہ یاد آنے لگتا انسان کہیں چلا جائے...... مشرق ہو یا مغرب...... بااختیار ہو یا بے اختیار اس کا نصیب کہیں نہیں بدلتا...... شہلا اور نور...... شہلا نے شناخت کے ہاتھوں مار کھائی تھی اور اپنے نصیب سے لڑنے کی کوشش کی تھی، کرچی کرچی بکھر گئی...... خاک میں پنہاں ہوگئی...... اور نور رشتوں کے ہاتھوں ہار گئی جیسے میں اور موحد جذبوں کے ہاتھوں شکست کھا گیا اور شفق اس کے پاس تو کچھ بھی ایسا نہ تھا جو آزمائش بنتا مگر پھر بھی وہ ہار گئی۔ قدرت انسان کو کیسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہے اور ہر ہر چیز میں آزماتی ہے جن کا اس نے وعدہ کیا ہے......

نہ حیدر اسے سمجھاتے، نہ شفق اسے سمجھاتی...... سب جانتے تھے کہ دلوں کے یہ زخم قدرت خود ہی بھرتی ہے نہ لفظ مرہم بنتے ہیں نہ حوصلہ افزائیاں، تینوں اپنی اپنی جگہ منتشر اور بکھرے ہوئے تھے اور سسک رہے تھے...... جس دن نور کی شادی تھی...... وہ سارا دن کمرے میں بند رہا اور نصرت فتح علی خاں کی آواز پورے زیر و بم کے ساتھ سارے گھر میں گونجتی رہی۔

''سانوں اِک پل چین نہ آئے سجناں تیرے بنا۔''

حیدر انکل صبح سویرے ہی گھر سے نکل گئے...... ان کا دل بھی بہت پریشان تھا۔ نہ جانے انھوں نے بھی دل میں کتنی دعائیں ان کے لیے مانگی تھیں۔ کسی ایسے معجزے کے لیے جو دونوں کو پھر سے ملا دے...... شفق نے بھی بہت گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں، خود اس کے پاس تو سوائے آہوں اور دعاؤں کے کچھ بھی نہ تھا جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں۔ وہ دن اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا...... اس نے فون ملایا...... نور کی آواز سنی وہ ہیلو ہیلو کرتی رہی۔

''میں جانتی ہوں یہ تم ہو، کیا تم مجھے بھول نہیں سکتے؟''

''اپنے نام کو کیسے بھولوں...... جو تم نے دیا ہے اور اپنی سوچوں کو کیسے جھٹکوں جن پر صرف تم حاوی ہو۔''

''پلیز...... ہمت کرو...... میں بھی تو اس وقت...... اس وقت خوش ہوں۔'' اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھرتھراہٹ پیدا کرنے لگی...... اور اس نے فون رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو پوری شدت سے آنسو بہنے لگے۔ وہ شدت سے رونے لگا پلکیں بھی جھپکتا تو آنسو گر پڑتے آج تو نہ جانے کہاں سے اتنی فراوانی سے آنسو آ گئے تھے...... سارا دن اور ساری رات مسلسل آنکھیں جھپکانے کے ساتھ آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے...... اس کی آنکھوں

کے گوشے اس قدر متورم ہو گئے تھے کہ آنکھیں بند کرنے میں بھی تکلیف ہونے لگی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے صدیوں سے آنکھیں خراب ہوں اور بند ہی نہ ہو رہی ہوں۔ ساری رات بے خوابی میں گزری...... کروٹیں بدلتے ہوئے، سسکیاں بھرتے ہوئے اور روتے ہوئے۔

اگلے دن شفق اس کی حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوئی۔ ''موحد...... کیا تم میرے ساتھ کہیں چل سکتے ہو؟'' اس نے اس کی توجہ بٹانے کے لیے اسے کہیں باہر لے جانا چاہا۔

''کہاں......؟'' وہ بے زاری سے بولا۔

''کہیں...... ضروری کام ہے......؟''

''کیا آج ہی ضروری ہے......؟''

''ہاں......''

''اچھا...... چلیے۔'' وہ اسی طرح اٹھتے ہوئے بولا۔

''کم آن...... کپڑے تو چینج کر لو۔''

''یہی ٹھیک ہیں...... کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ اس کے ساتھ باہر نکلا۔ شفق گاڑی ڈرائیو کرنے لگی اور وہ خاموشی سے سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ وہ سب سے پہلے سہیل کے گھر گئی...... اس کے گھر والوں کو پیسے دیے اور ان کا ایڈریس لیا کہ آئندہ وہ انھیں منی آرڈر بھجوا دیا کرے گی...... اس کی ماں ابھی تک بستر پر پڑی موت کی منتظر تھی...... اس کی بہنیں اس کا بہت شکریہ ادا کر رہی تھیں موحد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اردگرد پھیلی یاسیت کو چارپائی پر ایڑیاں رگڑتے وجود کو...... زندگی کو یوں سسکتے دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا اس کا دل کٹنے لگا۔

''کون تھے یہ لوگ......؟'' اس نے شفق سے گاڑی میں پوچھا۔

''ہمارا ایک ڈرائیور تھا اس کے گھر والے وہ مارا گیا...... اور اب یہ تنہا ہیں بالکل تنہا کوئی بھی تو آسرا نہیں۔'' شفق آہ بھر کر بولی۔

''کیا...... وہ ایک ہی آسرا تھا اور وہ بھی مارا گیا...... یہ پھر بھی زندہ ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... زندگی تو گزارنی ہی پڑتی ہے نا...... ہر کوئی اندر سے اتنا ہی دکھی ہے جتنے تم ہو۔''

''کیا آپ بھی......؟''

''ہاں...... میں بھی......'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''کس کے لیے......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''بہت سوں کے لیے......'' وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔ پھر آصف کے گھر اس نے پیسے دیے...... شام گہری ہو رہی تھی جب اس نے بڑے سے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور باہر نکل کر گیٹ کھولا ہر طرف گہری اداسی اور تاریکی سی چھائی تھی...... یوں جیسے کوئی شہر خموشاں ہو، نہ جانے زندگی کے آثار کب کے مٹ چکے تھے...... اس نے گاڑی پورچ میں داخل کی، اس کی لائٹ آن کی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی وہ اس کے ساتھ تھا...... لاؤنج میں ہلکی ہلکی روشنی تھی اور ٹی وی انتہائی آہستہ آواز میں چل رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹیوب لائٹ آن کی شزا ایک صوفے پر چادر لیے بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ وہ شفق اور موحد کو دیکھ کر چونکی۔

''شزا آنٹی...... یہ...... یہ آپ کو کیا ہوا ہے......؟'' وہ شزا کی بری حالت دیکھ کر بولی۔ اس کی صحت بہت خراب لگ رہی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے جیسے نہ جانے کب سے جاگ رہی تھیں۔

''شفق...... تم...... کہاں سے آئی ہو......؟'' شزا نے حیرت سے پوچھا۔

''میں...... میں...... میری چھوڑیے، آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے...... آپ کو کیا ہوا ہے اور شمائل کہاں ہے؟'' شمائل کے نام پر موحد نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کے سامنے خوبصورت نیلی آنکھوں والی ماڈرن سی خاتون گھوم گئی جو اب اپنی ذات سے بھی بے نیاز عجیب سے حلیے میں بیٹھی تھی۔

''کیا آپ شمائل کی مما ہیں......؟'' موحد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... میں ہی اس بدنصیب کی ماں ہوں۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''کیوں...... کیا ہوا...... اور شمائل کہاں ہے......؟'' اس نے یکدم چونک کر پوچھا۔

''وہ...... فونٹین ہاؤس میں ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''اوہ...... نو......'' موحد اور شفق دونوں ایک دم چونک کر بولے۔

''اس کے حواس کام نہیں کر رہے، وہ بالکل پاگل ہو گئی ہے۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

''مگر کیسے......؟'' شفق بوکھلا کر بولی۔

''اس گھر میں نہ جانے کون سی نحوست ہے یہاں کسی کا بھی اپنے حواسوں پر قابو نہیں ہے اور شمائل کے اندر تو بہت سے طوفان اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ...... وہ...... ان کا مقابلہ نہ کر سکی

اور ٹوٹ گئی...... بکھر گئی...... میری بیٹی ریزہ ریزہ ہو گئی۔'' شزا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''آئی ایم سوری...... اور اس نے مجھ سے بھی رابطہ نہیں کیا۔'' موحد بولا تو شزا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی جیسے کچھ پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

''تم...... تم...... ولیم ہو......'' شزا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... پہلے تھا...... اب موحد ہوں۔''

''کیا تم مسلمان ہو گئے ہو......؟''

''ہاں......'' شزا کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

''اور تم شفق کے ساتھ...... کیسے؟''

''یہ میری بہن ہیں......'' موحد نے جواب دیا۔

''کیا مطلب...... تم شہلا کے بیٹے ہو......؟''

''جی......''

''اوہ...... مائی گاڈ...... یہ سب کیا ہے تو وہ مری میں شہلا تھی اور میں اسے پہچان ہی نہ سکی۔ یہ کیسے ممکن ہے......؟'' وہ بڑبڑائی۔

''مما کی اب ڈیتھ ہو چکی ہے۔'' شفق نے اسے بتایا۔

''کب......؟''

''ایک ماہ ہو چکا ہے اور آپ سمیر کو ادھر ہی کیوں نہیں بلا لیتیں تنہا زندگی کیسے گزرے گی؟'' شفق نے کہا۔

''وہ...... یہاں نہیں رہنا چاہتا، اسے اس گھر کے در و دیوار سے نفرت ہے میں نے اس کے لیے فلیٹ بھی لیا تھا لیکن وہ نہ میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے اور نہ ہی اس گھر میں...... آئی ایم آل الون...... نوکر ہیں اور میں ہوں۔''

''آنٹی آپ فکر نہیں کریں، ہمت کریں ہم یہاں آتے رہیں گے۔'' شفق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''سچ......'' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کوئی جگنو اچانک بھٹکتا ہوا کہیں سے آ گیا ہو اور وہ ایک لمحے کے لیے دم بخود رہ گئی ہو......

''ہم...... شمائل سے ملنے فونٹین ہاؤس بھی جائیں گے اور شمائل ٹھیک ہو جائے گی۔'' موحد نے اسے تسلی دینا چاہی۔

''کیا وہ واقعی ٹھیک ہو جائے گی...... کیا تم واقعی سچ کہہ رہے ہو۔'' انتہائی مایوسی میں اس جملے نے جیسے مرہم کا کام کیا...... ''خدا...... تمھیں ہمیشہ سلامت رکھے۔'' اس نے موحد کے سر پر پیار دیا...... شزا کے منہ سے انتہائی بے بسی سے نکلی ہوئی دعا نے جیسے اس کے اندر حرارت بھر دی...... اسے اپنے قدموں تلے زمین اور سر کے اوپر آسمان مسکراتے ہوئے محسوس ہوئے...... ایک ٹوٹے دل کی دعا کتنا اثر رکھتی ہے اس کا دل بھی مسرور ہونے لگا۔

''ہم کل اس سے ملنے جائیں گے......'' موحد نے شفق سے کہا تو وہ خوش ہو گئی۔

''آنٹی اپنا خیال رکھیں...... سب ٹھیک ہو جائے گا مجھے اپنی کچھ چیزیں چاہیے تھیں وہ لینے آئی ہوں۔'' وہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

''تم بہت خوش نصیب ہو کہ خدا نے تمھیں ایک اچھی بہن دے دی ہے۔'' شزا نے اس سے کہا تو وہ کہیں کھو سا گیا۔ خدا ایک رشتہ دیتا ہے تو دوسرا چھین لیتا ہے۔ نور کو چھینا تو شفق کو دیا...... مما کو چھینا تو حیدر انکل کو دے دیا...... خدا کی مصلحتیں وہی جانے لیکن شزا آنٹی کی بات نے اسے قدرے سکون سا دیا۔

''چلو...... موحد......'' اس نے بیگ پکڑتے ہوئے کہا۔

''لائیں یہ مجھے پکڑا دیں۔'' اس نے آگے بڑھ کر اس کا بیگ پکڑا اور باہر نکل گیا...... اسے واقعی آج کسی بھائی کی بہن ہونے پر فخر ہونے لگا۔ اس کا بوجھ اٹھانے والا اس کے ساتھ قدم بہ قدم چل رہا تھا اسے ایک عجیب سی طمانیت اور تحفظ کا احساس ہو رہا تھا...... وہ قدرت کی اس نعمت پر حیران ہو رہی تھی...... تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا...... جہاں ہر طرف تارے جھلملا رہے تھے جیسے ان کے ملاپ پر خوش ہو رہے ہوں......

دونوں اگلے دن فونٹین ہاؤس گئے تو شزا بھی وہاں پہنچی ہوئی تھی آج وہ قدرے بہتر لگ رہی تھی۔

''آنٹی آپ کب آئیں......؟'' شفق نے حیرت سے پوچھا۔

''صبح سے یہاں بیٹھی ہوں...... تم لوگوں کی منتظر تھی کہ ہو سکتا ہے ہم تینوں کو دیکھ کر میری شمائل کچھ پازیٹوری ایکٹ کرے۔'' وہ پُر امید لہجے میں بولی۔

تینوں شمائل سے ملنے گئے...... شمائل کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں کسی بھی جذبے سے بالکل عاری تھیں نہ چہرے پر کسی قسم کے تاثرات تھے نہ آنکھوں میں...... وہ حیرت سے تینوں کی طرف دیکھتی رہی اور پھر جیسے موحد کی طرف دیکھتے دیکھتے وہ کسی سوچ میں

ڈوب گئی...... وہ زبان سے کچھ نہ بولی...... بس دیکھتی رہی اور پھر نہ جانے کہاں سے اس کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی...... اتنے عرصے بعد خوبصورت سی مسکراہٹ آنکھوں میں بھی ان کا عکس لہرا سا گیا...... شزا، شفق اور موحد تینوں چونک گئے جیسے کسی کو نزع کے عالم میں زندگی کا پروانہ مل گیا ہو...... وہ بغیر کچھ کہے مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔

''موحد...... وہ...... وہ دیکھا تم نے...... آج...... اتنے عرصے بعد مسکرائی ہے وہ...... میری شمائل ٹھیک ہو جائے گی نا...... وہ زندگی کی طرف لوٹ آئی گی نا...... اے میرے خدا اس کو بس ایک بار زندگی کی طرف لوٹا دے۔'' شزا کی مسرت دیدنی تھی۔ آنکھوں سے خوشی کے آنسو برسنے لگے۔

''موحد شاید اس نے تمھیں پہچان لیا ہے۔'' شفق بولی۔ خوشی کے مارے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''معلوم نہیں......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''ہاں...... یقیناً...... وعدہ کرو...... تم یہاں آتے رہو گے پلیز میری بیٹی کو زندگی کی طرف واپس لے آؤ، تمہارا یہ احسان میں کبھی بھی نہیں بھولوں گی۔ ایک ٹوٹے دل کی یہی دعا ہے کہ خدا تمھیں ایسی خوشیوں سے نوازے کہ ساری زندگی کسی بھی شے کی تمنا نہ رہے......'' شزا کے لہجے کی بے بسی اور ملتجیانہ لہجے نے اس کے دل کے زخموں کو ہرا کر دیا۔ اس نے سر جھکایا تو نور آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔

''میں انسانیت کی ایسی خدمت کرنا چاہتی ہوں کہ جب میں مروں تو میرے لیے زمین بھی روئے اور آسمان بھی......'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ تمہاری کس کس بات کو بھولوں...... تم بن زندگی کیسے گزر پائے گی۔ شمائل نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی اور نور کا مشن اسے کچھ کرنے پر آمادہ کرنے لگا نہ جانے خدا کڑیاں کہاں سے کہاں ملاتا ہے...... ہم سوچتے رہ جاتے ہیں اور ان راستوں اور نشانیوں کو کھوجتے رہ جاتے ہیں کہ اس نے ہمارے لیے کیا کچھ پلان کیا ہے، کیا کیا مصلحتیں...... کیا کیا حکمتیں اور کیا کیا راز پوشیدہ ہیں...... اتنی دنیاؤں کا خالق انسانوں کو بھی کیسے کیسے الجھاتا ہے...... اور انسان زندگی کی آخری سانسوں تک ان الجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتا رہتا ہے...... سمجھ پھر بھی نہیں آتی۔

''وعدہ کرو...... تم انسانیت کے ناتے یہاں آتے رہو گے میری مدد کرو گے...... ایک بے بس، کمزور ماں کی جس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا اور تمھارے لیے صرف میرے پاس

دعائیں ہیں۔'' اس نے فرطِ جذبات سے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ اس کے اندر خوشی کا گہرا احساس جاگزیں ہو گیا...... ایسی خوشی جس کا زندگی میں پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے مگر چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

''ہاں...... میں انشاء اللہ یہاں آتا رہوں گا...... شمائل اور اس طرح کے بہت سے لوگوں کے لیے میں جو کچھ بھی کر سکا، ضرور کروں گا۔'' وہ آہستہ سے بولا تو شہزامسرور سی لوٹ گئی جیسے اس کے سر سے کوئی بوجھ وقتی طور پر ہٹ گیا ہو اور اس نے چند ساعتوں کے لیے سکون کا سانس لیا ہو۔ انسان کانٹوں کی کیسی چبھن اندر ہی اندر محسوس کرتا رہتا ہے مگر پھر بھی چہرے پر مسکراہٹیں سجائے شاداں رہتا ہے۔ شاید ہر ایک کے اندر کہیں نہ کہیں ایک کھڑکی ضرور ہوتی ہے...... جہاں زندگی کے درد و الم سے گھبرا کے وہ چند لمحوں کے لیے اسے کھولتا ہے تو تازہ ہوا کے جھونکے اسے چند ساعتوں کے لیے پُرسکون کر دیتے ہیں...... ایسا سکون جس کا پوری کائنات میں کوئی نعم البدل نہیں ہوتا...... جس سے صرف روح معطر ہوتی ہے، دل کی دنیا مسرور رہتی ہے مگر پھر بھی نہ جانے نمی کہاں سے آ کر آنکھوں میں تیرنے لگتی ہے اور گونج دار قہقہوں کے سنگ اِک سرد آہ نہ جانے کہاں سے ابھر کر سارے وجود کا احاطہ کرنے لگتی ہے۔ آنکھیں سامنے کوئی اور منظر دیکھتی ہیں مگر نہ جانے کہاں کھو سی جاتی ہیں، باتوں باتوں میں ہنستے ہوئے نہ جانے آنکھیں کیوں برسنے لگتی ہیں۔ جسم سے جذبوں اور روح سے آشنا سائی کے سفر میں اتنی مات کھانے کے بعد انسان پل بھر کو رک کر سوچتا ہے......

جب تک کسی ایسی ہستی کا دکھ دل میں بسیرا نہ کرلے اور روح میں سرایت نہ کر جائے جو دنیا بھر سے محبوب ہو...... جو عزیز از جان ہو...... جس پر سارے سچے جذبے قربان ہوں، جو ہمیشہ سانسوں کے سنگ زندہ رہے، جو دل میں آنے والے خیالوں سے بھی ہم کلام ہو اور جو سوچوں پر بھی حاوی ہو...... ایسی ہستی سے جدائی کا دکھ انسان کے روئیں روئیں میں جب تک حلول نہ کر جائے تو یہ آنکھیں دنیا والوں کے دکھوں پر یوں اچانک کبھی نہ بھر آئیں...... اشک اچانک کبھی نہ بہہ نکلیں، کسی کو مضطرب دیکھ کر دل کبھی بے قرار نہ ہو کسی کی تڑپ کبھی اپنی تڑپ نہ محسوس ہو۔ جذبوں کی ایسی آبیاری کے لیے پہلے انہی کے خون سے تو انھیں سینچنا پڑتا ہے۔

کس قدر دکھ ہے زندگانی میں
جیسے گھل جائے زہر پانی میں
کتنی صدیوں کا درد شامل ہے
ایک انسان کی کہانی میں

وہ دنیا کے اسٹیج پر کھڑا تھا۔

ہر کوئی پُرشوق نگاہوں سے محو تماشا تھا......اس کے وجود کی روشنی سے گرد و نواح بھی روشن ہو رہے تھے......نہ جانے کتنے اذہان منور ہو رہے تھے...... کتنے لب دعا گو تھے......اور آنکھیں محبت سے جھکی جا رہی تھیں۔ اس کی حیاتِ جاوداں کے لیے کتنے ہی دل محو دعا تھے......انسان جنم لیتا ہے اور پھر راہی عدم ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں وہی کامیاب ہوتا ہے جو قدم بڑھاتا ہے شکستہ ہاتھوں کو تھامنے کے لیے......ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کے لیے......اور برستی آنکھوں کو پونچھنے کے لیے...... جو زمانے کے دھتکارے ہوؤں کو خارِ خزاں نہیں بننے دیتا۔ قدرت اس پر حیاتِ جاوداں کے راز منکشف کرتی ہے۔ دنیا کا اسٹیج ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے وجود کی رعنائیوں سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔

قدرت ان کے وجود کی خوشبو پوری کائنات میں بھر دیتی ہے۔ وہ ایسا ہی ایک کردار بننے جا رہا تھا......جیسا نور نے چاہا تھا۔ جو نور کا مشن تھا اسے اب وہ اپنانے جا رہا تھا......اور اس نے پہلا قدم رکھ دیا تھا......شاید قدرت بھی ایسا ہی چاہ رہی تھی۔

''اور تم کچھ چاہ بھی نہیں سکتے مگر جو جہانوں کا پروردگار چاہے۔''

انسان نابلد ہوتا ہے...... اس کی حکمتوں سے اور اس کے منصوبوں سے اسرار ہمیشہ اسرار ہی رہتے ہیں۔

......✿......